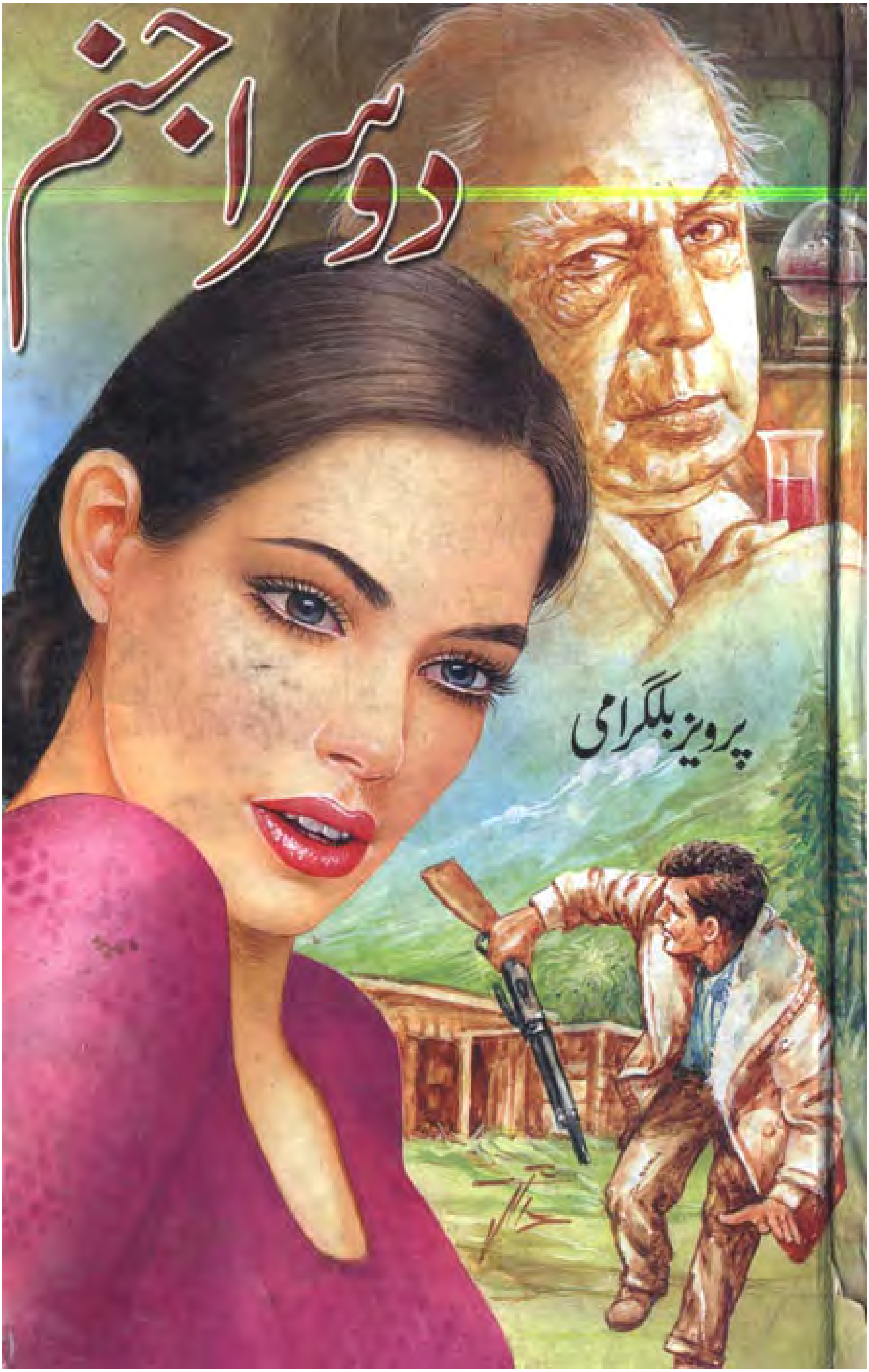
دوسرا جنم
پرویز بلگرامی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عرضِ مصنف

میں نے ہر موضوع پر کہانیاں لکھیں، محبت کی میٹھی آگ میں سلگتی ہوئی کہانیاں، معاشرے کے سلگتے ہوئے سوالوں پر کہانی، ہنستی مسکراتی کھلکھلاتی کہانی، اسرار و تجسس میں ڈوبی خوفناک کہانی، مار دھاڑ، تھرل و سسپنس والی کہانی یعنی کہ ہر قسم کی کہانیاں لکھیں مگر اس ''دوسرے جنم'' جیسی کہانی پھر نہ لکھ سکا۔ اس کہانی کو لکھنے کے لیے میں نے پانچ سو سے زائد کتابوں سے مدد لی تھی۔ قرآن پاک کے ترجمے کئی کئی بار پڑھے تب جا کر یہ طویل کہانی لکھی جا سکی۔ اس کہانی کو اپنی دیگر کہانیوں سے فوقیت اس لیے دیتا ہوں کہ اس کہانی میں اسرار و تجسس بھی ہے اور سائنس و قرآن پر بحث بھی۔ ان لوگوں کے لیے ہی میں نے یہ کہانی لکھی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سائنس کا دور ہے اس دور میں مذہب کا اثر کم سے کم ہوتا چلا جائے گا۔ ایسا کہنے والے کسی حد تک غلط ہیں میں نے اسی نکتے کو مرکز بنایا ہے۔ سائنس و اسلام پر ایسی کوئی کہانی شاید ہی آپ نے پڑھی ہو۔ اس کہانی میں تھرل بھی ہے اور سسپنس بھی، پُراسراریت بھی ہے اور سائنس بھی۔ یعنی ایک کہانی میں کئی قسم کی کہانیاں ہیں۔ میرا یہ تجربہ آپ کو کیسا لگا ضرور لکھئے گا۔

والسلام

پرویز بلگرامی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"May I healp You?"

کھلے ہوئے بونٹ پر جھکے ہوئے پروفیسر عثمان اس طرح اچھلے تھے جیسے انہیں بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اس اجاڑ، بیابان میں جہاں ہر طرف برفیلی چوٹیاں ہوں، کھڈ اور نالے ہوں جن پر برف کی تہیں جمی ہوئی ہوں۔ جہاں تعلیم کا فقدان ہو۔ سکول کالج کا نام و نشان نہ ہو ایسے علاقے میں اتنی شستہ انگریزی، جیسے کسی انگریز کا بچہ بول رہا ہو جو ابھی ابھی لندن سے آیا ہو۔

پروفیسر عثمان آواز سنتے ہی جھٹکے سے مڑے تھے اور بولنے والے پر نظر پڑتے ہی ساکت رہ گئے تھے۔ انہیں حیرت نے دبوچ لیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی عمر بہ مشکل دس گیارہ سال ہو گی۔ پیروں میں ٹوٹی ہوئی چپل تھی اور بدن پر پھٹا ہوا پرانا لباس لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہ پروفیسر کو جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے سامنے کسی واقف کار کا بچپن آ کھڑا ہوا ہو اسی لیے وہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"May I help you?"

لڑکے نے دوبارہ پوچھا تو پروفیسر عثمان کو جیسے ہوش آ گیا۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولے۔ ''تم نے مجھ سے کچھ کہا؟''

"Yes I ask may I help you?" لڑکے نے تیسری بار کہا۔

پروفیسر نے اردو میں پوچھا تھا مگر جواب انگریزی میں ملا تھا۔ اتنی دیر میں پروفیسر نے اپنی حیرت پر قابو پا لیا تھا، وہ بولے۔ ''کیا تم کہیں باہر سے آئے ہو؟''

"No Nangar is my birth place."

''پھر تم نے یہ انگریزی کہاں سے سیکھی؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"From a village named Oxford." لڑکے نے سر کو خم کر کے ادب سے جواب دیا۔

''اچھا تو تم آکسفورڈ میں رہتے تھے؟'' پروفیسر کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ وہ بچہ بلتستان کے اس دور افتادہ گاؤں ننگار کا رہنے والا ہے۔ وہ کوئی اور سوال کرتے کہ انہیں اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ ان کے پیچھے ایک عمر دراز عورت کھڑی تھی۔ اس کے کپڑے بھی عسرت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ یوں بھی اس علاقے میں غربت و تنگ دستی معراج پر تھی۔ ایسے بہت کم گھر تھے جن میں خوش حالی ہو۔ انہوں نے آنکھیں جھکا لی تھیں مگر وہ انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ بالکل ایسے جیسے اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں گی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے حیرت و تجسس نے اسے پتھر کا مجسمہ بنا دیا ہو۔ منہ کھلا تھا تو کھلا ہی رہ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔

''آ...... آپ...... آپ کون ہیں؟'' اس نے شینے زبان میں پوچھا۔

پروفیسر نے یہاں آنے سے پہلے ''شینے'' زبان سیکھ لی تھی تا کہ اسے زیادہ پریشانی نہ ہو۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی شینے میں جواب دیا۔ ''میں پروفیسر عثمان ہوں۔ حویلی میں آیا ہوں۔''

''او...... اچھا...... تو آپ ہی گوہر امان کی حویلی میں آئے ہیں۔'' عورت نے کہا۔

''گوہر امان!'' پروفیسر سوچ میں پڑ گئے۔ یہ حویلی گلزار شاہ سے انہوں نے خریدی تھی۔ گلزار شاہ کے والد قمر شاہ ان کے والد حیات شاہ، یہ گوہر امان کہاں سے آ گیا؟ وہ یہی کچھ سوچ رہے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ نام انہوں نے پہلے بھی سنا ہے مگر کب اور کہاں یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ جب سے وہ یہاں آئے تھے انہیں عجیب عجیب سی باتیں محسوس ہو رہی تھیں۔ ان کا بچپن گوجرانوالہ میں گزرا۔ بہت چھوٹی عمر میں وہ اپنے والدین کے ساتھ اپنے دادا کے پاس لندن چلے گئے پھر وہاں سے امریکہ، وہیں پروفیسر ہاورڈ کے ساتھ مل کر تجربات کرتے رہے اور آہستہ آہستہ ان کی شہرت بڑھتی رہی۔ اس شہرت کی وجہ ان کا تجربے گاہ سے باہر نہ نکلنا تھا۔

جو اپنی تجربے گاہ سے باہر نہ نکلتا ہو، وہ اتنی دور کیسے آئے گا؟ وہ تو پہلی بار یہاں آئے تھے مگر انہیں یہاں کا ایک ایک ذرہ پہچانا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں پہلے بھی آ چکے ہیں۔ یہاں کی ایک ایک پہاڑی، ایک ایک درہ سب کچھ پہچانا پہچانا

سا لگتا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ اور اس کیوں کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ ابھی وہ اس سوال کا جواب تلاش کر ہی رہے تھے کہ ایک نیا سوال سامنے آ گیا۔ وہ عورت انہیں اس طرح حیرت بھری نظروں سے کیوں دیکھ رہی ہے۔

''آ...... آپ...... کا نام کیا ہے؟'' اس عورت نے پوچھتے ہوئے الٹی ہتھیلی اپنی پیشانی پر پھیری کیونکہ وہاں پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تھے۔

''بتایا تو تھا، میرا نام پروفیسر ایس اے عثمان ہے۔ میں آرام کے لیے یہاں آیا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں ناں!'' پروفیسر نے کہا مگر یہ جھوٹ تھا۔ حقیقت تو کچھ اور تھی۔ وہ ایک خاص مقصد سے یہاں آئے تھے اسی لیے انہوں نے اپنے آنے کی بات راز رکھی تھی۔ یہاں تک کہ حکومت کو بھی پتا نہیں تھا کہ پروفیسر عثمان امریکہ سے پاکستان منتقل ہو گئے ہیں۔ اگر ان کے آنے کی خبر اخبار والوں کو ہو جاتی تو یہ خبر پہلے صفحے پر چھپتی کیونکہ وہ عالمی شہرت کے حامل تھے۔

''آپ کب تک یہاں رہیں گے؟'' عورت نے پھر ایک نیا سوال کیا۔

''ایک ڈیڑھ مہینے۔'' جواب دے کر انہوں نے پوچھا۔ ''یہ بچہ آپ کا ہے؟''

''یہ میرا پوتا ہے۔''

''اس کے والد آکسفورڈ میں رہتے ہیں؟''

''نہیں، ان کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''اچھا، باپ کے انتقال کے بعد آپ لوگوں نے اسے لندن سے بلوایا ہے؟''

''جی نہیں، ہم لوگ شین شکن نسل کے ہیں۔ اپنے علاقے سے باہر نہیں جاتے۔''

پروفیسر کو معلوم تھا کہ شین شکن، ڈوم اور کمین، کوہ ہندوکش سے وادی کش گنگا تک کے پرانے باشندے ہیں۔ یہ لوگ اپنی روایت کی پابندی سختی سے کرتے ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی پرانی رسوم کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ایسے سخت ماحول میں سانس لیتا یہ بچہ اتنی روانی سے انگریزی کے لہجے میں انگلش کیسے بول رہا ہے؟ یہی بات ان کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ انہوں نے بڑی بی سے پوچھا۔ ''آپ اسی گاؤں میں رہتی ہیں ناں؟''

''جی ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کسی روز اپنے شوہر کو میرے پاس بھیجئے گا۔''

''وہ حویلی نہیں جا سکتے ہیں۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''کیوں؟'' پروفیسر چونک گئے۔ انہیں لگا کہ وہ دانستہ وہاں جانے سے کترا رہی ہے۔ اس گاؤں میں آنے کے بعد سے وہ محسوس کر رہے تھے کہ لوگ اس حویلی سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے اسی لیے انہوں نے سوال کیا۔ ''وہ وہاں کیوں نہیں جا سکتے ہیں؟ کوئی خاص وجہ؟''

''جی ہاں! ان کا وہاں جانا ناممکن سی بات ہے کیونکہ وہ پیروں سے معذور ہیں۔''

''اوہ! مجھے افسوس ہوا۔ کیا کسی حادثے کا شکار ہوئے تھے؟''

''جی ہاں! وہ کھڈ میں گر گئے تھے۔''

''کیسے؟ وہ کیسے گر گئے تھے؟''

''ہمارے خاندان پر کسی بزرگ کی بددعا ہے کہ ہمارے گھرانے کا ہر بڑا بیٹا ایک خاص کھائی میں ضرور گرتا ہے۔ اس کے گرنے سے ہاتھ پیر کا ٹوٹنا ضروری ہے۔''

''عجیب بات ہے، کیا آپ کے خاندان میں سب معذور ہیں؟'' پروفیسر نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''سب نہیں خاندان کے لڑکے کا بڑا بیٹا اس مخصوص کھائی میں ضرور گرتا ہے۔ چھوٹے بیٹوں کو کچھ نہیں ہوتا۔''

''تو پھر بڑا بیٹا اس کھائی کی طرف جاتا ہی کیوں ہے؟''

''اس بات کا علم سب کو ہے اس لیے لوگ بڑے بیٹے کو ادھر جانے نہیں دیتے مگر زندگی تو طویل ہے ناں۔ کبھی نہ کبھی وہ ادھر چلا ہی جاتا ہے۔ بس یوں سمجھ لیں قسمت کا لکھا ٹالا نہیں جا سکتا۔ عام طور پر یہ حادثہ چالیس اور پچاس سال کی درمیانی عمر میں پیش آتا ہے۔''

''آپ نے بڑی پُراسرار باتیں بتائی ہیں۔ میں آپ کے شوہر سے ضرور ملوں گا۔''

''تو آج ہی چلیے۔ وہ بھی آپ سے مل کر ضرور خوش ہوں گے۔ یوں بھی میں گھر ہی جا رہی ہوں۔ اس شیطان کے خالو کی تلاش میں یہاں آئی تھی ورنہ میں گھر سے بہت کم باہر نکلتی ہوں۔''

''بڑا پیارا بچہ ہے، کیا نام ہے اس کا؟''

''جی اس کا نام علی مدد شاہ ہے کیونکہ باپ کا نام اللہ مدد شاہ تھا۔ دادا کا نام حسین مدد شاہ اور ان کے والد کا نام رسول مدد شاہ تھا۔ یہ ہے ہمارے خاندان کا شجرہ۔''

ساری مدد تمہیں ہی حاصل ہیں، پروفیسر کے دماغ میں جملہ گونجا مگر اس نے کہا کچھ

نہیں۔

''کیوں ہمارے ہاں چلیں گے؟'' عورت نے پوچھا۔

''کیوں نہیں، ضرور چلوں گا۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''آیئے!'' کہہ کر اس نے گاؤں کی طرف قدم بڑھا دیا۔ اس نے بچے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور یوں چل رہی تھی جیسے اسے یقین ہو کہ اس کے پیچھے پیچھے پروفیسر آ رہے ہوں۔ واقعی پروفیسر کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ وہ اس راستے پر پہلی بار آئے تھے پھر بھی انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ راستہ، یہ پگڈنڈی ان کی جانی پہچانی ہے۔ وہ اس کے ہر موڑ سے واقف ہیں۔ گاؤں میں پہنچے تو وہاں کی گلیاں بھی انہیں جانی پہچانی سی لگیں جبکہ وہ اس گاؤں میں پہلی بار آئے تھے۔

وہ عورت بغیر رکے آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ پروفیسر نے کہا۔ ''ذرا رکیں۔''

وہ عورت رک گئی پھر اس نے مڑ کر دیکھا۔

''اس گھر میں اصغر رہا کرتے تھے؟'' پروفیسر نے تجسس بھری آواز میں کہا۔

''ہاں، یہ گھر اصغر بھائی کا ہے مگر انہیں تو مرے ہوئے سولہ سال گزر گئے۔ آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟'' عورت نے پوچھا۔

''بس، مجھے ایسا ہی لگا تھا جیسے یہ گھر ان صاحب کا ہے۔'' پروفیسر نے کہا اور آگے کی جانب بڑھنے لگے۔

وہ عورت ایک بڑے سے مکان کے دروازے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ ''یہ ہے میرا گھر۔'' اس نے کہا اور اندر چلی گئی۔ اس کے ساتھ لڑکا بھی اندر کی طرف بڑھ گیا۔

''اندر آئیں ناں۔'' عورت نے باہر آ کر کہا۔

پروفیسر اندر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس کمرے میں کپڑوں والی آرام کرسی پر ایک معمر شخص نیم دراز تھا۔ برابر میں بیساکھی رکھی تھی۔ پروفیسر نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہی اس بچے کے دادا ہیں۔ پروفیسر نے سلام کیا تو انہوں نے سر اٹھا کر پروفیسر کو دیکھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی وہ ایسے چونک پڑے جیسے انہوں نے بھوت دیکھ لیا ہو۔ وہ آدھے دھڑ سے اٹھ گئے تھے۔ ''آ...... آپ...... آپ...... آپ۔'' وہ بڑبڑا رہے تھے۔

''مجھے پروفیسر عثمان کہتے ہیں۔'' پروفیسر نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

''آپ...... آپ کہاں سے آئے ہیں؟'' اب تک اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''میں گوجرانوالہ سے آیا ہوں۔'' پروفیسر نے اپنے اصل وطن کا نام لیا۔

''آپ کا چہرہ......آپ نے......آپ نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟''

''پروفیسر عثمان......میرا نام پروفیسر احسن عثمان ہے۔''

''آپ کے والد کا نام؟''

''میرے والد کا نام ڈاکٹر ذوالفقار تھا۔''

''ہوں......اور آپ کے دادا کا نام؟''

''میرے دادا کا نام شبیہہ الحسن تھا۔''

''اور ان کے والد کا نام؟''

''یہ آپ میرا شجرہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' پروفیسر نے ہنس کر کہا۔

''اچھا یہ بتائیں آپ کے دادا وغیرہ کہاں کے تھے؟''

''گوجرانوالہ کے، کیوں؟''

''وہ لوگ گوجرانوالہ میں کہاں سے آئے تھے؟''

''میں شیخ ہوں۔ اس کا سیدھا مطلب ہے کہ میرے اجداد مدینہ سے ایران کے شہر وسط اور وسط سے افغانستان کے راستے برصغیر آئے تھے۔''

''یاد کر کے بتائیں۔ شجرۂ نسب میں تو ضرور لکھا ہو گا کہ وہ لوگ وسط سے آ کر کہاں ٹھہرے تھے؟''

''اس سلسلے میں مجھے علم نہیں ہے۔ رہا شجرہ نسب تو شاید یہ گوجرانوالہ میں کسی کے پاس موجود ہو۔''

''پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ کا تعلق اس سرزمین سے ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیوں؟''

''جی نہیں۔''

''دماغ پر زور دیں۔ آپ کے بزرگوں میں سے کوئی یہاں آ کر ٹھہرا ہو؟''

''جی نہیں جناب! میرے والد اور دادا کی زندگی انگلینڈ میں گزری اور میری امریکہ میں۔'' پھر انہوں نے سوال کیا۔ ''اچھا یہ بتائیں کہ آپ کا پوتا کبھی انگلینڈ گیا ہے؟''

''جی نہیں، ہم تو یہاں اس گاؤں سے کبھی باہر بھی نہیں گئے۔ جب ہم نہیں گئے تو یہ کیسے جا سکتا ہے؟''

''پھر وہ اتنی روانی سے انگلش کیسے بول رہا تھا؟''

''بھائی میرے! وہ تو اردو بھی نہیں بول سکتا۔ انگریزی تو دور کی بات ہے۔''

''جی نہیں! اس نے مجھ سے انگریزی میں بات کی ہے۔''

''آپ کو مغالطہ ہوا ہو گا۔ ٹھہریے میں ابھی اسے بلاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے بچے کو آواز دی۔ بچے کے آ جانے پر انہوں نے شینے میں کہا۔ ''اچھا بیٹے! یہ بتاؤ تم انگلش جانتے ہو؟''

''جی نہیں!'' اس نے صاف انکار کیا۔

بچے کے اس جھوٹ نے پروفیسر کو حیران کر دیا تھا۔ انہیں اس جھوٹ پر غصہ آ گیا تھا اور وہ واپس اپنے گھر چلے آئے تھے۔ اس شخص نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ رکے نہیں تھے۔

☆======☆======☆

پروفیسر عثمان اپنی تجربہ گاہ میں مصروف تھے۔ خوردبین کے ویو فائنڈر پر آنکھیں تھیں۔ ہاتھ کمپیوٹر کے ''کی بورڈ'' پر تھے۔ وہ ویو فائنڈر سے جو کچھ دیکھ رہے تھے اسے اسکرین پر دیکھے بغیر ٹائپ کرتے جا رہے تھے۔ کی بورڈ پر لہراتی انگلیاں اپنا کام کر رہی تھیں کہ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے دماغ میں درد کی تیز لہر سی اٹھی ہو۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''شاید کسی نرو پر دباؤ بڑھ گیا ہے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولے اور کرسی پر کھڑے ہو گئے۔ وہیں ایک جانب دیوار کے پاس بڑا سا صوفہ پڑا تھا۔ وہ اس صوفے پر نیم دراز ہو گئے مگر بے چینی تھی کہ انہیں کسی طرح بھی چین لینے نہیں دے رہی تھی۔ عجیب سا احساس دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ جب بے چینی حد سے بڑھ گئی تو انہوں نے ہینگر پر لٹکا ہوا اوورکوٹ اتارا اور اسے پہن کر اوپر سے کنٹوپ چڑھایا اور واکنگ اسٹک لے کر باہر نکل آئے۔

باہر گہرا اندھیرا تھا۔ انہوں نے کوٹ کی جیب کو تھپتھپا کر ٹارچ کے موجود ہونے کو محسوس کیا اور آگے بڑھنے لگے۔

وہ کہاں جا رہے ہیں، یہ بات خود انہیں بھی معلوم نہ تھی۔ بس ایک عجیب سی بے معنی کشش تھی جو انہیں کھینچ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ انہیں اندھیرے کی بھی فکر نہیں تھی جبکہ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زمانے بھر کی سیاہی اس وادی میں انڈیل دی گئی ہو۔ آسمان پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ستارے بھی نہ تھے کہ ان کی روشنی سے مداوا ہوتا۔

اس وادی میں اندھیرے کو بڑھانے میں پہاڑوں کا کردار نمایاں تھا۔ یہ ایک پیالہ نما وادی تھی جسے چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا۔ ان پہاڑوں کی وجہ سے یہ وادی ایک قلعہ کی مانند محفوظ تھی۔

پروفیسر عثمان وادی سے نکل کر پہاڑوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس وقت بھی انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی نامعلوم سی کشش انہیں کھینچ رہی ہے۔ وہ کچھ اوپر چڑھنے کے بعد ایک پیڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ان کی سانسیں پھول چکی تھیں۔ محنت کے عادی نہ تھے۔ امریکہ میں رہتے ہوئے تو وہ سال چھ مہینے میں ہی تجربہ گاہ سے باہر آتے تھے۔ پیدل چلنے کا بھی موقع کبھی کبھی ہی ہاتھ آتا تھا اسی لیے تھوڑی سی چڑھائی میں ان کی سانسیں پھول گئی تھیں اور وہ پیڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔

وہ پیڑ بہت گھنا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کئی دہائی سے وہاں کھڑا ہے۔ اس پیڑ کے سائے میں آ کر انہیں ایسا لگا جیسے وہ پیڑ انہیں لوری دے رہا ہو۔ ان کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے نیند نے انہیں پوری طرح اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

☆======☆======☆

پہاڑ کے اوپر ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اس جھونپڑی میں رات دن چار آدمی مستقل رہتے تھے۔ ان کا بس ایک ہی کام تھا کہ وہ دوسری طرف نظر رکھیں۔ وہ علاقہ میدانی تو نہیں پھر بھی میدان نما تھا، کافی دور تک پھیلا ہوا۔ اس میدان میں ہمہ وقت برف کی سفید تہہ جمی رہتی پھر بھی اس پر سفید ریچھ بھی چلتا تو انہیں نظر آ جاتا۔ چاروں طرف دشمنوں کی سرحدیں تھیں۔ کبھی چینی حملے کی نیت سے چڑھ دوڑتے اور کبھی قازق و تاتاری اور کبھی تبتی، اسی لیے یہ پہرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اگر کوئی فوج ادھر بڑھتی نظر آتی تو وہ نقارہ بجا کر وادی والوں کو ہوشیار کر دیتے۔

اس وقت صبح کا اجالا پھیل رہا تھا کہ مغربی پہاڑوں پر نقارے بجنے لگے۔ نقارے کی آواز سنتے ہی وادی میں ہلچل مچ گئی۔ عورت، مرد، بچے سب کے سب اوپر کی طرف بھاگنے لگے۔ ہر ایک نے اپنے ہاتھوں میں ہتھیار بلند کر رکھے تھے جبکہ عورتوں کے ہاتھوں میں چربیوں کے تھیلے اور آگ جلانے والے چقماق پتھر تھے۔ بچوں نے تھیلیوں میں چھوٹے بڑے پتھر جمع کر رکھے تھے جنہیں لے کر وہ اوپر چڑھ رہے تھے۔

اوپر پہنچتے ہی لوگوں نے بڑے بڑے چولہے جلا لیے تھے۔ چولہوں پر کڑھاؤ چڑھے

ہوئے تھے جن میں برف اور چربی گرم کی جا رہی تھی۔ دونوں چیزیں گرم ہو کر مائع میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ ہر کوئی کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا تھا مگر پروفیسر عثمان آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجہ بنائے ادھر دیکھ رہے تھے جدھر سے دشمن آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ انہیں اگر اس حالت میں کوئی امریکی دیکھ لیتا تو پہچان نہ پاتا اس لیے کہ ان کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جسم پر کسی جانور کی کھال کی فرغل تھی اور سر پر ریچھ کی کھال کی ٹوپی جس نے کانوں کو بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ ان کے عقب میں ایک چوڑے سے پتھر پر طرح طرح کے سفوف مٹی کے پیالوں میں بھرے ہوئے رکھے تھے۔

''محترم استاد! ہم نے ڈھیر سارے سفوف تیار کر لیے ہیں۔'' ایک نوجوان نے آ کر کہا۔

''انہیں کڑھاؤ میں ڈال دو۔'' پروفیسر نے کہا۔ وہ نوجوان مڑ گیا۔ اس نے مڑ کر کسی سے یہی بات بلند آواز میں کہی۔ اسی وقت ایک نوجوان دوشیزہ آ کر پروفیسر کے عقب میں کھڑی ہو گئی۔ وہ لگاوٹ بھری نظروں سے پروفیسر کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کچھ آگے بڑھ کر پروفیسر عثمان سے کہا۔ ''پیارے عرب! تم تھک گئے ہو گے۔ کچھ دیر آرام کر لو۔''

''نہیں، جب تک میں دشمنوں کو پیچھے نہیں دھکیل دیتا آرام نہیں کروں گا اور ہاں! میں نے کتنی بار منع کیا ہے کہ مجھے عرب مت کہا کرو۔ میرا نام اسد الغازی الکبیر ہے۔''

''اُف! یہ نام ہے یا ہزار پیرا۔ تمہارا یہ نام سنتے ہی مجھے ہزار پیرا یاد آ جاتا ہے جو اپنے بہت سارے پیروں سے رینگتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اتنا لمبا نام مجھ سے نہیں لیا جاتا۔''

''تو ایسا کرو کہ مجھے ابن جعفر کہہ لیا کرو۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''نہیں یہ بھی نہیں ہو گا۔ میں تو تمہیں اسی نام سے پکاروں گی، ہاں!'' لڑکی نے پیار بھرے انداز میں اس کی پیٹھ پر سر رکھ کر کہا۔

''اے زونو! دور ہٹو۔ سب کی نظریں ہم پر ہیں۔ تمہارا بابا پہلے ہی دھمکی دے چکا ہے کہ میں تم سے دور رہوں۔ وہ یہ منظر دیکھے گا تو مجھے زندہ گاڑ دے گا۔'' پروفیسر نے ہنس کر کہا مگر لڑکی الگ نہ ہٹی۔ وہ اس وادی کے سردار احسن الملک گوہر امان تاشی بلور کی بیٹی تھی۔ اس کا نسب راجا بلور سے ملتا تھا۔ اس کے دادا علاقے کے دیگر لوگوں کی طرح بت پرست تھے۔ اس کا ثبوت وہ بڑا سا پگوڈا تھا جو وادی کے درمیان میں سب سے خوبصورت جھونپڑے میں تھا اور جس میں بہت پرانا سیاہ بلوط کی لکڑی سے بنا مہاتما بدھ کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجسمہ تھا۔ اسلام قبول کرنے سے قبل بستی والے اس بدھ کے مجسمے کی پوجا کرتے تھے۔ اس کے قدموں میں بیٹھ کر ''پرارتھنا'' گاتے تھے، چرخی گھما کر اشلوک پڑھتے تھے مگر جب سیّد علی ہمدانی کی آمد ہوئی اور انہوں نے اسلام کا آفاقی پیغام گھر گھر پہنچایا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے اس کفر سے توبہ کر لی اور خدائے واحد کے آگے سر جھکانے لگے۔ اس پگوڈا کو مسجد میں بدلنے کی بجائے اس کے برابر میں نئی عمارت بنا لی گئی۔ لکڑی کے تختوں سے بنی اس عمارت کو مسجد کا نام دیا گیا اور یہاں اذانیں گونجنے لگیں۔

اسد الکبیر کو اس مسجد کے برابر میں گھر ملا تھا۔ یہ گھر اسے احسن الملک گوہر امان تاشی نے دیا تھا۔ تاشی کی بیٹی زونو نے جس روز اسد کو دیکھا تھا، اسی روز کیوپڈ کا تیر چل گیا تھا۔ وہ اسے دل و جان سے چاہنے لگی تھی مگر اپنے باپ سے مجبور تھی۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ اس کی شادی ''نگر'' میں ہو۔ نگر کے ''دور'' قبیلہ کا سردار بھی زونو کا متمنی تھا۔ اس وادی پر جتنی بار بھی آفات کا حملہ ہوا، اس نے بھرپور مدد کی تھی۔ اسی احسان کا بدلہ احسن الملک تاشی بیٹی دے کر اتارنا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی تبتی حملہ آور آفت بن کر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ تبتیوں کا ٹڈی دل بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ احسن الملک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ تیر انداز اپنی اپنی جگہ مستعد کھڑے تھے۔ انہیں حکم کا انتظار تھا۔ جیسے ہی حکم ملتا وہ تیروں کی برسات کر دیتے۔

تبتی لشکر ابھی دور تھا۔ احسن الملک تاشی نے اپنے مشیر سے پوچھا۔ ''اسد کی تیاری مکمل ہے؟''

''جی ہاں، اس نے یہی بتایا ہے۔'' مشیر نے جواب دیا۔

''اتنے دنوں سے ہم اس کی خاطر داری کر رہے ہیں۔ پتا نہیں اس کے پاس علم ہے بھی یا نہیں۔'' احسن الملک تاشی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''نہ جنگ دور ہے نہ گھوڑا، ابھی معلوم ہو جائے گا کہ اس کے پاس کتنا علم ہے۔ اس نے جو دعویٰ کیا ہے، اس کا پتا ابھی لگ جائے گا۔''

''پھر بھی تم اپنے سپاہیوں کو تیار رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اس اجنبی کے بھروسے پر بیٹھے رہیں اور دشمن اندر آ جائے۔''

''آپ کے حکم دینے سے پہلے ہی ہم نے مکمل تیاری کر لی ہے۔''

وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ تبتی لشکر شور مچاتا ہوا نزدیک پہنچ گیا۔ وہ لوگ جوش میں بھرے جلدی جلدی پہاڑی پر چڑھ رہے تھے کہ اسد نے اشارہ کیا۔ آگ پر چڑھے

ہوئے ایک کڑھاؤ کے اندر کھولتے ہوئے مائع کو ڈھلان پر الٹ دیا گیا۔ وہ گرم مائع جیسے ہی برف پر گرا، وہ پگھلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑی ڈھلان پر جمی برف پانی بن کر بہہ گئی۔

پگھلی ہوئی برف نے پہاڑی پر چڑھنے والوں کو نیچے دھکیلنا شروع کر دیا۔ اس پانی میں کچھ ایسا تھا جس کی وجہ سے جن جن سپاہیوں کی جلد سے پانی ٹکرایا تھا، وہ چیخنے چلانے لگے جیسے بہت زیادہ جلن ہو رہی ہو۔

اس کھولتے ہوئے پانی نے تبتی حملہ آوروں کی پیش قدمی روک دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیچھے ہٹ گئے۔

حملہ پسپا ہوتے دیکھ کر احسن الملک تاشی کے سپاہیوں نے زوردار نعرہ لگایا۔ نعرہ اتنا شدید تھا کہ پوری وادی گونج اٹھی۔ گھروں میں سوئے ہوئے بچے بھی گھبرا کر اٹھ گئے ہوں گے۔

☆======☆======☆

پروفیسر کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ اب تک اسی پیڑ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔

''کیا میں سو گیا تھا؟ کیا وہ سب خواب تھا؟'' پروفیسر بڑبڑاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

مگر اس خواب میں یہ پیڑ بھی تو تھا؟ ایسا خواب میں نے کیوں دیکھا؟ انہوں نے خود سے سوال کیا۔ ذہن پر طاری کوفت کی علامت ختم ہو گئی۔ تھوڑی سی دیر کی نیند نے قنوطیت کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ وہ گھر کی طرف لوٹ چلے۔

حویلی میں پہنچنے کے بعد بھی وہ اسی بات پر غور کرتے رہے کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ خواب تھا یا حقیقت؟ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے خود کو یقین دلا دیا کہ انہوں نے یہ سب کچھ نیند کی حالت میں دیکھا ہے۔ نیند میں کچھ بھی نظر آ سکتا ہے۔ وہ تخیل بھی جو تحت الشعور میں چھپا ہو۔ یوں بھی وہ کوئی عام انسان تو تھے نہیں۔ دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ میڈیکل سائنس میں ان کے تجربات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ صدیوں سے رائج فرسودہ خیالات کو انہوں نے تجربات کی کسوٹی پر غلط ثابت کر دیا تھا۔ ان کی قابلیت دیکھ کر ہی حکومت امریکہ نے انہیں امریکی شہرت دے رکھی تھی۔ وہ ''خلیہ'' پر تحقیق کر رہے تھے۔ Cell پر تحقیق کرتے کرتے انہوں نے زندگی کی بنیاد کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ انسان کس کے اشارے پر چلتا پھرتا ہے۔ کون اسے ہدایت دیتا ہے۔ اس راز سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انہوں نے پردہ ہٹا دیا تھا۔ انسانی ''جنین کوڈ'' کو ''ڈی کوڈ'' کرنے کا سہرا انہی کے سر تھا۔ اب تک لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ اس صدی کی سب سے اہم ایجاد کمپیوٹر، انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یہی سب سے بڑی ایجاد ہے مگر پروفیسر نے ثابت کر دیا تھا کہ کمپیوٹر کچھ بھی نہیں ہے۔ کمپیوٹر تو جنین کی بھونڈی نقل ہے۔ انسانی جسم میں اللہ تعالیٰ نے ایک دو نہیں، کروڑوں چھوٹے بڑے کمپیوٹر بنا رکھے ہیں جو خود کار ہیں۔ انسان کے بنائے ہوئے کمپیوٹر میں تو ''پروگرام فیڈ'' کرنا پڑتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے کمپیوٹر، پروگرامر بھی ہیں۔ خود ہی ''پروگرام'' بنا کر ''فیڈ'' کر لیتے ہیں۔

ان کے اس انکشاف پر دنیا حیران رہ گئی تھی مگر وہ خوش نہ تھے۔ ان کے اس تجربے کا فائدہ، نیک نامی، شہرت امریکہ کے حصے میں آئی تھی۔ ان کی رگوں میں پاکستانی خون تھا اور اصل پاکستانی کے خون کا ہر ذرہ حب الوطنی سے سرشار ہوتا ہے اسی لیے وہ تمام مراعات، تمام آسائشیں تج کر نہایت خاموشی سے پاکستان آ گئے تھے۔ یہاں آنے میں انہوں نے بھرپور راز داری برتی تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی کہ وہ کہاں گئے۔

وہ امریکہ سے ترکی پھر ترکی سے ایران آئے تھے۔ ایران پہنچ کر اپنی پاکستان آمد کو مخفی رکھنے کے لیے انہوں نے پاسپورٹ پر سفر نہیں کیا تھا۔ بغیر پاسپورٹ کے، غیر قانونی طور پر اپنے ہی ملک میں آ گئے تھے۔ اس سفر میں ان کے ساتھ غلام رسول بھی تھے۔

غلام رسول کہنے کو ان کے پشتی نوکر تھے۔ غلام رسول کے والد گوجرانوالہ سے پروفیسر کے والد کے ساتھ لندن چلے گئے تھے۔ لندن کی آزاد فضا میں یہی ہوتا ہے کہ آدمی یا تو بگڑ جاتا ہے یا سنبھل جاتا ہے۔ غلام رسول کے والد نے بھی اپنے بیٹے کو سنبھال لیا تھا۔ وہ پنج وقتہ نمازی تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت ان کا معمول تھا۔ وہ کلام الٰہی کو صرف ثواب ہی کے لیے نہیں بلکہ اس میں مخفی رموز کو جاننے کے لیے پڑھتے تھے۔ سمجھ سمجھ کر غور کرتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ ایک ایک آیت کو پڑھ کر گھنٹوں غور کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ کہتے تھے پروفیسر عثمان کی طرح یہ بڑھا بھی ''سنکی'' ہے۔ قرآن کریم کو سامنے رکھ کر سوچ میں ڈوبا رہتا ہے۔ دونوں کی عمر برابر تھی۔ دونوں ہی بغیر بیوی والے تھے۔ پروفیسر نے بیوی کو طلاق دے دی تھی اور غلام رسول کی بیوی مر چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں میں خوب نبھتی تھی۔ ان کے درمیان ایک اور ہستی تھی۔ وہ تھی ڈورتھی، پروفیسر کی شاگردہ لیکن پروفیسر نے امریکہ سے آتے وقت اسے بھی اپنے راز میں شریک نہیں کیا تھا۔

امریکہ چھوڑنے سے پہلے انہوں نے اپنے ایک دوسرے نوکر باقر شاہ کو پاکستان بھیج دیا تھا۔ وہ گلگت کے ''نگر ہو پر'' کا رہنے والا تھا۔

جب وہ پاکستان آئے تو بجائے گوجرانوالہ جانے کے سیدھے نگر ہو پر آ گئے۔ باقر شاہ نے ہی انہیں اس گاؤں تک پہنچایا۔ اسی کی معرفت حویلی کا سودا ہوا۔

یہ علاقہ شہر کے ہنگاموں سے دور تھا۔ راستہ دشوار گزار تھا اس لیے یہاں تک کوئی آ نہیں سکتا تھا جو ان کے کام میں مخل ہوتا اس لیے وہ بڑے آرام سے تجربات کر رہے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ اب ان کی نئی تحقیق پاکستان کے نام پر آئے مگر یہاں آتے ہی وہ الجھ گئے تھے اور انہیں الجھایا تھا اس چھوٹے سے بچے نے، علی مدد شاہ نے۔

اس وقت بھی وہ اسی بچے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ بچہ ان کے لیے معمہ بن گیا تھا لیکن اس سے بھی بڑا معمہ یہ تھا کہ یہاں کی فضا انہیں عجیب سی لگ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ سب کچھ ان کا جانا پہچانا ہے۔ وہ پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں مگر یہ حقیقت نہیں تھی۔ ان کی بات تو دیگر ہے، ان کے والدین بھی اس دور افتادہ علاقے میں کبھی نہیں آئے تھے۔

''عثمان! چائے بھجواؤں؟'' دروازے پر کھڑے غلام رسول نے کہا تو وہ چونک گئے۔

''نہیں، تم یہاں آ کر بیٹھو۔'' پروفیسر نے کہا تو غلام رسول اندر آ گیا اور سامنے بچھے صوفے پر بیٹھ کر اس کا جائزہ لینے لگا پھر بولا۔

''تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟''

''یار! میرے دماغ کی چولیں ہل گئی ہیں۔ یقین کرو گے، آج میں نے ایک ایسے بچے کو دیکھا ہے جس نے اس گاؤں سے باہر قدم نہیں نکالا ہے مگر فر فر انگلش بول رہا تھا۔''

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟''

''حیرت کی بات نہیں ہے؟ ایک بچہ انگریزوں کے لہجے میں انگلش بولے وہ بھی اس علاقے کا جہاں کے لوگوں نے انگلینڈ کی کیا بات لاہور، کراچی بھی نہیں دیکھا۔''

''وہ جو اوپر بیٹھا ہے ناں، اس سے کچھ بعید نہیں۔ وہ کسی سے بھی کچھ کرا سکتا ہے۔'' غلام رسول نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''اس سے بھی حیرت کی بات یہ ہے کہ آج مجھے کچھ ایسے لوگ ملے جو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہو سکتا ہے کہ تمہاری شباہت کسی سے ملتی ہوئی ہو۔"

"شباہت ملنے پر لوگ اس طرح نہیں چونکتے۔"

"شباہت کی بجائے صورت مل رہی ہو۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"ہوں۔" پروفیسر نے ہنکارا بھرا۔

"مٹی کے انسان کو وہ مالک جیسا چاہے بنا دے۔"

"یار غلام رسول! انسان کی اتنی توہین تو نہ کرو۔ انسان گوشت اور ہڈیوں کا مجموعہ ہے۔ سب کی شکلیں ایک جیسی کیسے ہو سکتی ہیں؟"

"سب سے پہلے یہ سنو کہ قرآن کریم کہہ رہا ہے، اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے بنایا۔ پھر تم آدمی بن کر چلنے لگے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "جو کچھ زمین میں موجود ہے، وہ انسانی جسم میں ہے۔" یعنی کہ انسانی جسم میں فلورو فین، کوبالٹ، میگانیز، تانبا، آیوڈین اور زنک موجود ہے۔ اس کے علاوہ میگنیشیم، سوڈیم، پوٹاشیم، فاسفورس، کلورین، سلفر اور لوہا بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن اور نائٹروجن بھی جسم کا حصہ ہے اور یہی مٹی کا جز ہے یعنی انہی اجزا سے مٹی بنی ہے۔ اگر دور جاہلیت میں یہ سائنسی اصطلاحات بتائی جاتیں تو شاید ہی کسی کی سمجھ میں آتا اسی لیے سیدھے سیدھے مٹی کہہ کر بات ختم کر دی گئی۔"

"بھائی غلام رسول! میں مسلمان ہوں اس لیے میرا یقین ہے کہ قرآن پاک الہامی کتاب ہے اور الہام اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ بعض باتیں خود میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" پروفیسر نے کہا۔

"ہر بات کو سمجھنے کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن پاک کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا نور بھیجا جسے دنیا والوں نے ہمارے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے پہچانا۔ "میرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہیں کہتا سوائے میرے حکم کے۔" جب اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ دیا تو ہم پر لازم ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک بات کو پرکھیں۔ اس پر غور کریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا، اس میں کیا بات مضمر ہے تاکہ قرآن پاک خود بخود سمجھ میں آتا چلا جائے۔ سورۃ الانبیاء میں آیت 33 میں بتایا گیا کہ "ہم نے آسمان و فضا کو محفوظ چھت بنایا۔" یا سورۃ ملک 17 "کیا تم اس بات سے بے خوف ہو کہ آسمان میں (بھی سلطنت) کرتا ہے وہ تم پر پتھر برسائے۔"

اب غور کریں، کیا آسمان گیسوں کا مجموعہ نہیں ہے؟ آسمان اور فضا، اسے دھیان میں رکھ کر سوچیں۔ فضا یعنی دنیا سے کچھ اوپر، کیا اوزون اور دیگر گیسیں نہیں ہیں جو ہر وقت برستے پتھر (شہاب ثاقب) سے ہماری حفاظت کرتی ہیں؟ دور جاہلیت میں لوگ نہ تو کشش سے واقف تھے اور نہ ہر طرف پھیلی گیس سے اور نہ شہاب ثاقب سے۔ بتائی پہلے ہیں، انکشاف بعد میں کرایا ہے۔ مسند احمد ابن حنبل جلد سوم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مروی ہے۔ "تم ایسے امور دیکھو گے کہ جن کی قدر تمہارے نزدیک بہت ہو گی اور تم آپس میں سوال کرو گے کہ کیا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے بارے میں کچھ فرمایا ہے؟"

غلام رسول کی تقریر جاری تھی کہ ایک نوجوان لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں بری طرح چونک گئے۔ وہ مقامی نہیں تھی۔ شکل ہی سے فرنگن لگ رہی تھی۔ اس نے کندھے پر بیگ لٹکا رکھا تھا اور ہاتھوں میں بڑے سے سوٹ کیس کی بیلٹ تھی جس کی مدد سے وہ سوٹ کیس کو گھسیٹ کر لائی تھی۔ سوٹ کیس پر ہوائی کمپنی بی او اے سی کا ٹیگ لگا ہوا تھا۔ شاید وہ ائیر پورٹ سے سیدھی وہیں آئی تھی۔ اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "بالآخر میں نے آپ لوگوں کو ڈھونڈ ہی لیا۔"

"مگر تمہیں یہاں کا پتا بتایا کس نے؟" غلام رسول نے پوچھا۔

"میں علی شاہ کے گھر گئی۔ وہاں جا کر میں نے کہا کہ میرا بیگ چوری ہو گیا ہے۔ اس بیگ میں وہ ڈائری تھی جس میں پتا تھا۔ پلیز! مجھے پروفیسر صاحب تک پہنچا دیں۔ وہیں سے معلوم ہوا کہ آپ لوگ اس گاؤں میں رہ رہے ہیں۔" لڑکی نے کہا۔

"تو تم نے یوں ہمیں ڈھونڈا۔" پروفیسر نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"لیکن سر! آپ نے ایسا کیوں کیا۔ یہ چوروں کی طرح چھپتے چھپاتے سفر کرنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میری اطلاع کے مطابق آپ ترکی کے انقرہ میں آخری بار دیکھے گئے پھر آپ دونوں ہوٹل کا کمرا بند کر کے سیر کے لیے نکلے۔ اس دوران میں آپ پر سب کی نظریں جمی رہیں۔ ایک ایک پل کی رپورٹ بنتی رہی پھر آپ چار میں سے تین گھنٹے تک تو نظر آئے لیکن درمیان میں ایک گھنٹہ آپ نے کہاں گزارا، کسی کو پتا نہیں۔ پھر دو دن تک آپ دونوں ہوٹل میں ہی رہے۔ کہیں بھی باہر نہیں نکلے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں ناں؟" لڑکی نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل صحیح تم نے سچ کہا۔" پروفیسر نے غلام رسول کی طرف دیکھ کر لڑکی سے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''دو دنوں کے بعد آپ دونوں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور ایک مضافاتی علاقے میں چلے گئے پھر وہاں سے کہاں اور کس طرف گئے کسی کو خبر نہیں ہے۔ میرا دوست مارٹن جو سی آئی اے کے سول سروس ڈیپارٹمنٹ میں ہے، وہ خود پریشان ہے۔ مجھے لگا تار اپنے دفتر بلا بلا کر تنگ کرتا رہا کیونکہ ان کا خیال ہے کہ آپ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔''

''تو تم اسی کے مشورے پر مجھے ڈھونڈنے نکلی ہو؟'' غلام رسول نے سوال کیا۔

''جی نہیں میں تو اپنے ادھورے تجربے کو پورا کرنے کے لیے پروفیسر کی گائیڈ لائن کی متلاشی تھی۔''

''ہم چوروں کی طرح نہیں کھلے عام نکلے تھے۔'' غلام رسول نے کہا۔ ''یہ اور بات ہے کہ ہمارے بدخواہوں کی نظروں سے ہم مخفی رہے۔ بالکل اسی طرح، یاد کرو ایک سرتاپا گناہوں میں ڈوبے ہوئے ملک میں جب اسلامی انقلاب آیا تو سب سے زیادہ تمہارے ملک کو دھچکا پہنچا کیونکہ اسی کے اشاروں پر وہاں کے مسلمانوں کو گناہوں کی دلدل میں دھکیلا گیا تھا۔ یاد کرو وہاں کے بادشاہ نے قانون بنا دیا تھا کہ ان تمام لوگوں کو ایکسٹرا الاؤنس ملے گا جو اپنی بیویوں کو نائٹ کلب لے کر جائیں گے۔ شراب پینے والے کو ایکسٹرا رقم ملے گی۔ سکول کا بچہ اگر کلب کا ممبر بنے گا تو اس کی فیس معاف ہو جائے گی۔ اسی قسم کے سینکڑوں قانون بنا کر حکومت نے وہاں کے مسلمانوں کو اسلامی احکام سے غداری پر اکسایا تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ 1925ء میں انگریزوں نے تین ملکوں میں بیک وقت اپنے خرچے پر امام مہدی پیدا کرائے تھے۔ سوڈان، ایران اور ہندوستان۔ سوڈان اور ہندوستان کے مہدیوں نے جو کچھ کیا، سو کیا۔ سب سے بڑا فتنہ ایران کے خود ساختہ مہدی باب اور اس کے شاگرد بہاء اللہ نے برپا کیا۔ ایران کے شاہ قاچار نے جب انہیں نکال باہر کیا تو اسرائیلی شہر حیفہ کے اکہ میں ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ انہیں وہاں سے امریکہ منتقل کیا اور ان کے ماننے والوں کو دوبارہ ایران بھیجا گیا۔ ان پر وہاں کے شہنشاہ نے مراعات کی بارش کر دی تا کہ وہ مسلمانوں کے ایمان کو مزید خراب کر سکیں مگر مسلمانوں کا ایمان بھی کبھی خراب ہوا ہے؟ خیر، میں بتا رہا تھا کہ اس ملک میں جب اسلامی انقلاب آیا تو مجھے یاد ہے کہ امریکہ نے وہاں پھنسے ہوئے اپنے خاص بندوں کو نکالنے کے لیے ایک خاص اسکواڈ بھیجا۔ یقین کرو گی کہ وہ تمام طیارے اس ملک کی فضا میں داخل ہونے کے بعد خود بخود تباہ ہو گئے، کیسے؟ یہ آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا کیسے ہوا تھا۔ اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ جو اللہ تعالیٰ کا مقرب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد

کرتا ہے۔ جب تک اس ملک کے سربراہ اللہ تعالیٰ کے مقرب رہے، اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل رہی۔ اب وہی ملک ریورس میں ہے۔'' غلام رسول نے پوری تقریر کر ڈالی۔

''آپ کی باتیں دلچسپ تو ہوتی ہیں مگر ایک خاص فکر سے مغلوب ہیں یعنی اسلام ازم کے گرد گھومتی ہیں اس لیے ان باتوں کو چھوڑیں اور یہ بتائیں کب واپس جانا ہے؟''

''فی الحال تو کچھ دن آرام کرنا ہے تا کہ تجربات کے لیے نئی توانائی ملے۔'' غلام رسول نے کہا۔

''مگر یہاں بھی تو آپ لوگوں نے تجربہ گاہ بنا رکھی ہے۔ لگتا ہے کافی دن کا پروگرام ہے۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ یہ لیبارٹری تو پروفیسر صاحب کے ایک دوست کی ہے۔'' غلام رسول نے دروغ گوئی کی۔

''آپ پھر جھوٹ بولے، شیم! شیم! آپ خود کو سچا مسلمان بھی کہتے ہیں اور جھوٹ بھی بولتے ہیں۔''

''یہ جھوٹ نہیں ہے۔ تم یہودی تو ہر بات میں جھوٹ بولتی ہو۔''

''نو نو، یہ آپ پھر میری قوم سے مجھے ملانے لگے۔ میں یہودی گھر میں ضرور پیدا ہوئی ہوں مگر میری فطرت ویسی نہیں ہے۔''

''یہی بات یاسر عرفات کی بیوی بھی کہتی ہے۔'' غلام رسول نے پھر چوٹ کی۔

''تم لوگ پھر نٹ کھٹ بچوں کی طرح لڑنے لگے۔ وہ لمبے سفر سے آئی ہے۔ اسے آرام کرنے دو۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔'' پروفیسر نے آخری جملہ لڑکی سے کہا۔

غلام رسول نے علی شاہ کو بلا کر لڑکی کو اوپر والے کمرے میں لے جانے کے لیے کہا۔ اس کے جانے کے بعد غلام رسول نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ یہ واقعی آگے بڑھنا چاہتی ہو؟''

''آپ کچھ بھی کہہ لیں مگر مجھے ان یہودیوں پر بھروسہ نہیں۔ یہ دنیا کی واحد قوم ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے ٹھکرایا ہے۔ یہ وہ احسان فراموش قوم ہے جس نے من و سلویٰ کو بھی ٹھکرا دیا تھا۔ ''یوم سبت'' کی پابندی عیاری سے ٹھکرانے والی یہ قوم کبھی اعتبار کے قابل نہیں ہے۔''

''جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اگر یہ یہودیوں کی ایجنٹ ہے تو ہونے دو۔ میں اپنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نوٹس بچائے رکھوں گا۔"

"ہاں، اسی میں بہتری ہے۔" کہہ کر غلام رسول اٹھ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا تھا۔

پروفیسر وہیں صوفے پر بیٹھے ان تمام باتوں پر غور کر رہے تھے۔ اس چھوٹے سے لڑکے کا انگریزی بولنا اس کے گھر والوں کا اسے دیکھتے ہی چونک جانا۔ بڑے میاں کی کرید، اس کی زندگی کے بارے میں پوچھنا۔ ماضی کی یادوں کو کریدنا۔ یہ سب مل کر ایسے الجھے ہوئے سوالات بن گئے تھے جو ان کے دماغ کو ہلائے دے رہے تھے۔ آج کا دن انہی سب باتوں نے انہیں الجھائے رکھا تھا۔ تجربہ گاہ میں بھی نہیں گئے تھے اور اس وقت بھی ان کا ذہن صحیح طور پر کام نہیں کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں "فریزڈ سیل" (Freezed Cell) کو نکالتے تو آنکھیں ضرور اس پر رہتیں مگر ذہن کہیں اور ہوتا، نتیجتاً نوٹس بن نہ پاتے۔ نئی بات معلوم نہ ہو پاتی اسی لیے وہ اوور کوٹ پہن کر باہر نکل گئے تھے۔

حویلی سے باہر آنے کے بعد ان کے قدم خود بخود ایک خاص سمت میں اٹھنے لگے۔ انہیں خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ بس آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جب وہ رکے تو یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ نکل آئے تھے۔ اس وقت وہ اسی پرانے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ پتا نہیں کس خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر وہ دھیرے دھیرے بیٹھتے چلے گئے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، ایسے جیسے وہ سو رہے ہوں۔

☆======☆======☆

وہی منظر تھا۔ وہی لوگ تھے۔ وہی پہاڑ تھا۔ .... اور اس میں وہ خود بیٹھے ہوئے تھے ان کے پیچھے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہی لڑکی جو اس علاقے کے سردار کی بیٹی تھی۔

"میں نے کہا ناں تم چلی جاؤ۔ اگر تمہارے باپ نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ بابا اس وقت دشمنوں کو پسپا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ادھر نہیں آئیں گے۔"

"اُدھر تمہارے بابا تبتیوں کو پسپا کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور اِدھر تم میرے کردار کو۔ نہیں تم چلی جاؤ۔"

عین اسی وقت شور بلند ہوا۔ شاید بھاگتے ہوئے تبتی پھر پلٹ آئے تھے اور اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شور سن کر وہ بھی خیمے سے نکل آئے اور پہاڑ کے کنارے

پر پہنچ کر نیچے جھانکنے لگے۔

نیچے وادی میں ٹڈی دل سپاہی لگاتار کوشش میں لگے ہوئے تھے جبکہ اوپر سے منجنیق کے ذریعے بڑے بڑے پتھر برسائے جا رہے تھے۔ کڑھاؤ میں گرم کیے گئے پانی جس میں مختلف قسم کے سفوف ملائے گئے تھے، اسے بہایا جا رہا تھا۔ وہ پانی جہاں جہاں سے گزر رہا تھا، وہاں کی برف کٹ رہی تھی۔ یہ کٹی ہوئی برف سلوں کی صورت میں نیچے گرتی جا رہی تھی۔ ان سلوں کے نیچے، منجنیق کے پتھروں کے نیچے، غلیلوں کی زد میں آ کر اور تیروں سے چھد کر تبتی گر رہے تھے، دب رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سب قسم کھا کر نکلے ہوں کہ انہیں ہر حال میں اوپر چڑھنا ہے۔ وہ سب ٹکڑیوں میں بٹ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر ٹکڑی کے ساتھ ایک لمبے بالوں والا نوجوان تھا۔ نوجوانوں کے ہاتھوں میں لمبے لمبے ڈنڈے تھے اور ان ڈنڈوں میں سے ہر ڈنڈے پر ایک ہاتھ چوڑا اور چھ ہاتھ لمبا کپڑے کا رنگین ٹکڑا بندھا ہوا تھا۔ اسے وہ ہلا ہلا کر نعرے لگا رہے تھے۔ گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔

"اے عربی سنگدل! کس خیال میں ڈوبے ہو؟" لڑکی وہاں بھی پہنچ گئی تھی۔

"یہ عشق گاہ نہیں، رزم گاہ ہے۔ اس وقت دشمن اوپر آنے کی پوری کوشش کر رہا ہے اور تمہیں ہری ہری سوجھ رہی ہے خدا کے لیے تم چلی جاؤ۔"

"مجھے اپنے عقلمند محبوب اور بہادر باپ، دونوں پر بھروسہ ہے۔ بابا کی بہادری اور تمہاری عقلمندی دشمنوں کو آگے بڑھنے نہیں دے گی۔" لڑکی نے شوخ لہجے میں کہا۔

"تم کیسی لڑکی ہو۔ یہاں زندگی اور موت کا کھیل ہو رہا ہے اور تم ٹرٹر کیے جا رہی ہو۔" اسد الکبیر نے جھنجلا کر کہا۔

"میرے پیارے عرب! زندگی موت کی بانہوں میں پلتی ہے، موت کی کوکھ سے جنم نہیں لیتی۔ میں جب تمہارے بچے کو جنم دوں گی نا تو موت کے جبڑے تک پہنچ کر لوٹوں گی۔" زونو تاشی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ! شرم تم کو مگر نہیں آتی، بے شرم کہیں کی۔" اسد الکبیر جھنجلا گیا۔

"اے لو! اس میں بے شرمی کی کیا بات ہے۔ جب تم مجھ سے شادی کر لو گے تو میں بھی ہر عورت کی طرح ماں بنوں گی، یہ تو عورت کی معراج ہے۔ اس سے بلند مقام اور کوئی نہیں۔ یہی ہر عورت کی تمنا ہوتی ہے۔"

"خدا کے لیے میرے کان نہ کھاؤ۔" کہہ کر وہ مڑا ہی تھا کہ ایک سنسناتا ہوا تیر آ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کراس کے سر پر سے گزرتا ہوا خیمے میں دھنس گیا۔

''لو تمہاری مراد بر نہ آئی کیونکہ تم نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی پھر بھی میں بچ گیا۔'' اسد الکبیر نے ہنس کر کہا۔

''تم جنگ پر توجہ دو ورنہ میں شادی سے پہلے بیوہ ہو جاؤں گی۔'' لڑکی ہنستی ہوئی وادی کی طرف بھاگ گئی۔ اسد الکبیر نے پوری توجہ تبتیوں کی فوج پر لگا دی۔ احسن الملک تاشی کی فوج کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ چوٹی پر تھے جبکہ تبتی حملہ آوروں کی آدھی فوج تباہ ہو چکی تھی لیکن ان کے حوصلے ابھی بھی جوان تھے۔ سنگ و تیر کی بارش میں بھی وہ اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے تھے۔

اسد الکبیر کی نظر تبتی حملہ آوروں کے عقب میں کھڑی ایک گھوڑا گاڑی پر ٹکی ہوئی تھی۔ وہ گھوڑا گاڑی سونے کے پتروں سے سجی ہوئی تھی۔ اس پر ایک گول مٹول سا شخص بیٹھا تھا جس نے بڑی سی چھتری نما ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس ٹوپی کے چاروں طرف موتیوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ اسد الکبیر منجنیق کے پاس پہنچا۔ اس نے کچھ دیر تک غور کیا اور جب اسے زاویے کا اندازہ ہو گیا تو اس نے منجنیق میں پتھر رکھ کر نشانہ لیا اور اس زاویے پر اچھالا کہ وہ سیدھا جا کر اس گھوڑا گاڑی پر گرے۔ وہی ہوا۔ پتھر ہوا میں پرواز کرتا ہوا اس شخص کے سر پر گرا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تبتیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اپنے سردار کو مرتے دیکھ کر وہ لوگ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ان کے قدم کیا اکھڑے، تاشی کے سپاہیوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ وہ نعرہ لگاتے ہوئے ان کا پیچھا کرنے لگے۔

یہ تو سب سے بڑی حقیقت ہے کہ میدان جنگ میں اگر سپاہی کے پیر اکھڑ جائیں تو پھر انہیں موت کے چنگل سے چھڑانا مشکل ہے۔ وہ لوگ بھی تاشی کے سپاہیوں کا شکار ہونے لگے کیونکہ تاشی کے سپاہی پہاڑیوں سے نیچے اتر آئے تھے اور اب وہ انہیں گھیر کر مار رہے تھے۔ ان کی قوت بکھر گئی تھی اس لیے وہ تر نوالہ ثابت ہو رہے تھے۔ اسی دوران میں تاشی نے فتح کا بگل بجا دیا۔ چار ہاتھ لمبے قوس کی شکل میں مڑے بگل جسے مقامی زبان میں سنگھا کہا جاتا تھا کے بجتے ہی تاشی کے فوجی رک گئے اور واپس مڑنے لگے۔

تاشی، اسد الکبیر کے خیمے میں آ گیا تھا۔ وہ اسے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ اس نے اسے سینے سے بھینچتے ہوئے کہا۔ ''شیخ زادے! مجھے تم پر فخر ہے کہ تم نے مجھے فتح دلوائی۔ یہ فتح صرف اور صرف تمہاری وجہ سے ہمیں ملی ہے۔''

''نہیں سردار! فتح و شکست دینے والا صرف اللہ ہے۔ حق کی فتح ضروری ہے۔ اگر تم

حق پر نہ رہتے تو تمہیں شکست ہوتی۔'' اسد الکبیر نے کہا۔

''لیکن گزشتہ بار تو مجھے شکست ہوئی تھی تبھی تو میں نے تمہیں اس امید پر جگہ دی ہے کہ شاید تم میرے کام آ سکو۔''

''کامیابی اور ناکامی میں بہت سے عوامل ہوتے ہیں۔ انسان کا ہر لمحہ احتساب کی زد میں ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے تبتیوں کے گزشتہ حملے سے پیشتر تم نے کوئی ایسی غلطی کی ہو جو اللہ تبارک و تعالیٰ کو پسند نہ آئی ہو۔ کاتبین کی تحریر انسانی زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور اس کا بدل بھی اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ ذرا انداز مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو مظلوموں کی موت یقینی ہے۔''

''ارے سنبھلنا.....'' تاشی چیخا کیونکہ اسد الکبیر کے پیچھے وہی منجنیق تھی جس نے جنگ کا نقشہ بدل دیا تھا۔

تبتی جو ہر سال لوٹ مار کرنے آتے تھے اور ان لوگوں کی سال بھر کی کمائی لوٹ کر لے جاتے تھے، اس بار شکست کا داغ اپنی پیشانی پر سجائے شرمندہ شرمندہ سے لوٹ گئے تھے۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس شکست کی خبر چینیوں اور قازق کو بھی ہوشیار کرتی اور وہ بھی ادھر آنے سے کتراتے۔ یہ علاقہ ان سبھوں کے لیے تر نوالہ تھا اسی لیے ہر کوئی ظلم ڈھانے کے لیے اپنی ہوس ملک گیری کے لیے اسی علاقے کو منتخب کرتے تھے۔ تاشی بھی جنگ و جدل سے دور رہنے کی کوشش کرتے تھے اس لیے بھی چینی لٹیروں کے حوصلے فزوں تھے۔ پہلے تاشی کا قبیلہ ترائی میں آباد تھا مگر پے در پے کے حملوں نے انہیں نقل مکانی پر مجبور کر دیا تھا۔ یہاں، اس وادی میں پہنچ کر بھی انہیں چین نہ ملا تھا۔ کبھی چینی تو کبھی قازق اور کبھی تبتی لوٹ مار کرنے آ جاتے تھے۔ یہ علاقہ حد سے زیادہ دشوار گزار تھا۔ نزدیکی شہر بھی تقریباً آٹھ دن کی مسافت پر تھا اس لیے اسلحہ بھی خرید کر نہیں لا سکتے تھے۔ نہتے لوگوں پر ظلم ڈھانا زیادہ آسان ہے لیکن جب اسد الکبیر اس علاقے میں آیا تو اس نے یہاں کا نقشہ ہی بدل دیا۔ وہ مشہور ماہر علم کیمیا جابر بن حیان کے شاگرد جعفر بن حسین کندی کا شاگرد تھا۔ حکمت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ بغداد کے نامور لوگوں میں اس کا شمار ہوتا تھا لیکن اس کی اسی شہرت نے اس کے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا اور وہ اپنی جان بچا کر وسط کے راستے کہاں آیا پھر باکو جانے کے لیے نئے سفر پر روانہ ہوا اور بھٹک کر یہاں پہنچ گیا۔ اس علاقے کی مظلومیت نے اسے متوجہ کر لیا اور وہ یہیں ٹھہر گیا۔ تیغ و تبر کے لیے فولاد کی ضرورت تھی جو اس علاقے میں ناپید تھا۔ اس کی جگہ اس علم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیمیا کا استعمال کیا اور ایسے ایسے ہتھیار بنالیے جس کے بارے میں کبھی کسی نے سنا بھی نہ تھا۔ مختلف پیڑ پودوں کے رس اور معدنیات سے جو اس علاقے میں بہ آسانی دستیاب تھے، اس نے کئی ایسی چیزیں بنائیں جو گرتے ہی دھماکے سے پھٹ جاتیں اور دور دور تک آگ بکھر جاتی۔ یہ منجنیق بھی اسی نے بنوائی تھی۔

اس کی بنوائی ہوئی منجنیق نے اب اس جنگ کی بساط پلٹ دی تھی۔ وہی لٹیرے جو آتے ہی اس علاقے کو لوٹ لیتے تھے اس بار لٹ کر بھاگے تھے۔ ان کی وجہ سے عقبی بستیاں محفوظ ہوگئی تھیں اور اب اسی منجنیق میں رکھا پتھر اس کے سر پر گر رہا تھا۔ تاشی نے چیخنے کے ساتھ اسے دھکا دیا تھا جس کی وجہ سے اس کا سر تو محفوظ رہا تھا مگر اس کا کندھا بچ نہ پایا تھا۔ وہ بھاری پتھر اس کے کندھے کو چھوتا ہوا نیچے گرا تھا پھر بھی اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کا شانہ شل ہوگیا ہو۔ درد کی تیز لہر نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆======☆======☆

اس چیخ نے پروفیسر کو بیدار کر دیا۔ انہوں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ اسی پیڑ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے چونک کر اپنا داہنا شانہ ٹٹولا۔ وہاں درد کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ پیڑ انہیں کیوں رات کے ایک مخصوص حصے میں اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ وہ یہاں آتے ہی کیوں سو جاتے ہیں؟ بار بار ایک ہی خواب کیوں دکھائی دے رہا ہے اور خواب بھی اپنے آپ میں عجوبہ ہے۔ یہ قسط وار خواب کیوں نظر آ رہا ہے؟ انہوں نے اس بات پر بھی غور کیا تھا کہ خواب آنا بند ہوتے ہی اور نیند سے بیدار ہوتے ہی انہیں اس پیڑ سے وحشت سی ہونے لگتی ہے اور وہ جلد سے جلد وہاں سے بھاگ جانے کے لیے پر تولنے لگتے تھے۔

پروفیسر نے اٹھتے ہی ادھر اُدھر دیکھا۔ دور و نزدیک کوئی نہ تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اپنی حویلی کی جانب چل پڑے۔

''آپ کہاں تھے؟ میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔'' حویلی میں داخل ہوتے ہی انہیں ڈورتھی کی آواز سنائی دی۔

پروفیسر نے لڑکی کی طرف دیکھا پھر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔ ''چہل قدمی کے لیے گیا تھا۔''

''پروفیسر! میں پوچھنا چاہتی تھی کہ اس بڈھے نے میرے نوٹس کو برباد کیوں کیا، میں نے اتنی عرق ریزی کے بعد یہ مضمون تیار کیا تھا جسے اس نے کاٹ پیٹ کر برابر کر

دیا۔''

''کس بڈھے نے؟ میں تو باہر تھا؟'' پروفیسر اس کی بات سمجھ چکے تھے کہ وہ غلام رسول کے بارے میں کہہ رہی ہے پھر بھی انجان بن کر بولے۔

''میں مسٹر غلام رسول کے بارے میں کہہ رہی تھی۔''

''ایسا اس نے کیا کیا؟''

''اس نے میرے نوٹس پر لکھ دیا کہ انسانی خلیہ موجودہ دور کی دریافت نہیں۔ آج سے چودہ سو سال پہلے خلیہ پر دیا گیا سیدنا امام جعفر صادقؒ کا ایک پورا لیکچر کتابوں میں موجود ہے۔ انہوں نے اپنے لیکچر کے دوران میں بتایا ہے کہ قرآن پاک میں 100 سے زائد بار آیا ہے کہ مٹی، ہوا، پیڑ، پودے، پہاڑ، دریا یہاں تک کہ انسانی جسم میں بھی ایک اور جہان آباد ہے جس کے شہری زندہ حرکت میں ہیں۔ نہایت نظم و ضبط سے اپنا کام انجام دیتے ہیں۔ پروفیسر ڈیوڈ فیلڈ کا نظریہ غلط ہے۔ خلیہ انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ انسان خلیہ کی کارگزاری کا محتاج ہے اور خلیہ حکم خداوندی کا۔ یہ بات اس نے کیوں لکھی؟ میرے تمام نوٹس کو اس نے غلط ٹھہرا دیا ہے۔'' کیتھی نہایت غصے میں بول رہی تھی۔

پروفیسر صاحب جانتے تھے کہ غلام رسول کو منع نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ میں تبلیغی ادارہ تھا۔ اسے لاکھ روکا جائے مگر وہ قرآن پاک اور اسلام کی تبلیغ کرنے سے باز نہیں آئے گا۔ امریکہ میں تو اس نے دشمنوں کی ایک پوری جماعت اپنے پیچھے لگا لی تھی اس لیے انہوں نے کیتھی کو ہی ٹھنڈا کرنے کا سوچا اور اپنا شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر پھیر کر کہا۔ ''تم جانتی ہو ناں کہ بادل میں موجود ایک مکعب سینٹی میٹر میں پانی کے ایک ارب باریک قطرے ہوتے ہیں۔ برگر مین فنڈیسن کے نظریہ کے مطابق پانی کے باریک قطرے پہلے ایک تکثیفی مرکز NUCLEI CONDENSATION بناتے ہیں پھر بارش کے قطرے اس سے مربوط ہو جاتے ہیں۔''

''جی ہاں!'' لڑکی نے جواب میں سر ہلایا۔

''ابھی ابھی نیا نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ پانی کا ایک قطرہ NUCLEAR STATE بن کر صفر سے چالیس ڈگری کم کی حالت کو سہار سکتا ہے۔ یہ قطرہ ایک انتہائی پیچیدہ مساوات پیدا کرتا ہے یعنی یہ چھوٹے ذرے پہلے تکثیفی مرکز کے گرد جمع ہوتے ہیں پھر پانی کے قطرے بڑا ہونا شروع ہوتے ہیں اور ان کی سطح اس وقت بڑھتی ہے جب وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زمین کے نزدیک پہنچتے ہیں۔اس بڑھنے کے عمل سے بارش کے قطرے پر ہوا کی رگڑ کے نتیجے میں رفتار پر رکاوٹ پڑ جاتی ہے۔نتیجہ کے طور پر یہ قطرے حلیم طریقے سے زمین پر پہنچتے ہیں۔ یہ متواتر طریقہ ایک معجزہ ہے۔ اس Atmospheric Physics پر رابرٹ بائیرز نے Element of Cloud Physics نامی کتاب میں بھرپور طریقہ سے بحث کی ہے موقع ملے تو پڑھنا۔"

"ضرور پڑھوں گی مگر سر! میں کہہ رہی تھی۔"

"ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی ہے۔" پروفیسر نے کہا۔"زمین جب خشک ہوتی ہے،اس وقت بھی اس کے نیچے ایک سلطنت آباد ہوتی ہے جو محوِ خواب ہوتی ہے۔مٹی کے ایک گرام میں کھربوں جراثیم Bacteria خوابیدہ ہوتے ہیں یعنی غیر حیاتیاتی جینی کوڈ Genetic Codes رکھتے ہیں۔ جو بے انتہا چھوٹے (Microbes) ہوتے ہیں۔ بارش کے قطرے پڑتے ہی نائیٹروجنی عمل Nitrogen Fixation سے پیداواری شروع کر دیتے ہیں۔تمہیں اس کا علم تو ہوگا کہ زندہ چیزوں کے بنیادی کیمیائی اجزاء میں ہائیڈروجن کا ایک پُل سا ہوتا ہے جسے Hydrogen Bond کہتے ہیں۔"

"جی ہاں! میں نے یہ پڑھا ہے۔"

"یہ بھی پڑھا ہوگا کہ پانی سے عاری عضو ایک سوکھے ہوئے ڈھانچے کی مانند ہے۔ اگرچہ D.N.A اور جینیاتی فارمولے Genetic Code کو محفوظ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ جب پانی ملتا ہے تو اسے اپنے H اور OH Code آئن سے ہائیڈروجن مہیا کرتا ہے تو حیاتیاتی فارمولا (Code) کام شروع کر دیتا ہے۔ اسی Formulae کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سورۃ زخرف کی گیارہویں آیت میں یوں بیان فرمایا۔"جس (اللہ) نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا، اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندہ کیا۔ اسی طرح تم بھی برآمد کیے جاؤ گے۔" ہم نے چودہ سو سال بعد جس فارمولے کو جانا، اسے اللہ تعالیٰ نے چودہ سو سال قبل بیان کر دیا۔ غلام رسول نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اپنی جگہ صحیح ہے۔ اگر تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو تم اسے کاٹ دو۔"

"آپ کے مذہب میں کیا کہا گیا ہے، یہ آپ جانیں مگر خدا کے لیے، انہیں منع کر دیں۔ ان سے کہہ دیں کہ وہ میرے نوٹس پر قلم نہ چلائیں۔ میں تجربہ کے بعد نوٹس لکھتی ہوں۔ میری تھیوری میں وہی کچھ ہوتا ہے جو میں دیکھتی ہوں۔"

"اچھا، اچھا، منع کر دوں گا۔ جاؤ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" یہ کہہ کر پروفیسر عثمان

اسٹڈی روم کی طرف چلے گئے۔

وہ اکیلے بیٹھ کر ان واقعات پر غور کرنا چاہتے تھے جو ان کے ساتھ رونما ہو رہے تھے کیونکہ وہ ایک سائنس دان تھے اور سائنس دان سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ وہ تو تجربہ کے بعد ہی سچ کو سچ مانتا ہے۔ اگر یہ لڑکی انہیں ڈسٹرب نہ کرتی تو وہ اب تک بات کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ انہیں اس پر غصہ آ رہا تھا مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ انہیں حضرت عمرؓ کا یہ قول یاد تھا کہ انسان کی پہچان غصے میں ہوتی ہے کیونکہ اس کے اندر کا شیطان کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ اپنے اندر کے شیطان کو باہر آنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ اب جب وہ لڑکی سامنے نہیں تھی تو انہیں بھی یکسوئی حاصل ہوگئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ بند آنکھوں میں بھی اسد الکبیر کا چہرہ انہیں نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ اپنا ہی چہرہ ایک دوسرے نام کے ساتھ نظر آ رہا ہے۔ اس تخیلاتی شخص کے کارنامے انہیں خواب میں کیوں نظر آ رہے ہیں؟

ابھی وہ انہی باتوں پر غور کر رہے تھے کہ باہر سے شور کی آواز آئی۔ وہ کھڑکی پر کھڑے ہوگئے۔ باہر کے منظر نے انہیں چونکا دیا۔ حویلی کے باہر کئی عورت اور مرد کھڑے چوکیدار سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اتنی دور سے ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی مگر پروفیسر کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اندر آنا چاہتے ہیں۔ ان میں سب سے آگے وہی عورت تھی جو انہیں اپنے شوہر سے ملوانے اپنے گھر لے گئی تھی۔ اس کے ساتھ وہ بچہ بھی تھا جس نے انہیں حیران کر دیا تھا۔ اس کی انگلش ابھی بھی انہیں کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس بچے سے پھر ملنا چاہتے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بچہ اپنے آپ میں منفرد ہے ورنہ اتنی روانی سے انگلش کیسے بولتا؟ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس بچے کا D.N.A حاصل کر لیں تاکہ اس پر ریسرچ کر سکیں۔ وہ اس کے Genetic Code کو توڑ کر دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے کوڈ کو ڈی کوڈ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انہوں نے ایسا کر لیا تو اسی انداز پر کسی دوسرے بچے کے D.N.A کو سیٹ کر کے دیکھیں گے کہ وہ بچہ بھی ایسا ہی جینئس (Genius) ہوتا ہے یا نہیں۔ ایسا کرنے کے لیے انہیں اس بچے کو قریب کرنا تھا اور اس بچے کو اپنے قریب کرنے کے لیے اس کے گھر والوں سے قریب ہونا ضروری تھا اسی لیے وہ انہیں اپنے دروازے پر دیکھ کر خوش ہو اٹھے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی گاؤن پہنا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر انہوں نے وہیں سے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔ ''شیر خان! کیا بات ہے؟''

''یہ لوگ اندر آنا مانگتی۔ ام بولا، صاحب ابی سوتی ہے۔ بعد میں آؤ۔'' خان صاحب نے وہیں سے جواب دیا۔

''انہیں اندر آنے دو۔'' پروفیسر نے کہا۔

''جی آنے دیتا!'' کہہ کر خان نے دروازہ کھول دیا۔

وہ سب تیز تیز قدموں سے پروفیسر کی جانب بڑھتے آ رہے تھے۔ سب سے آگے عورت تھی۔ اس کے پیچھے دو خاصی عمر کے آدمی جن میں سے ایک نے اپنے ہاتھوں پر کچھ اٹھا رکھا تھا۔ کپڑے میں لپٹی ہوئی وہ کیا چیز تھی، پروفیسر سمجھ نہ پائے۔ ان کی نظریں اسی آدمی پر ٹکی ہوئی تھیں۔

اتنی دیر میں وہ سب ان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے جس نے وہ چیز اٹھا رکھی تھی، آگے بڑھ کر پروفیسر کو سلام کیا۔

پروفیسر نے سلام کا جواب دیا پھر حیرت سے ان کی حرکتیں دیکھنے لگے۔ اس عورت اور بچے کے علاوہ تقریباً سبھی پروفیسر کے گرد گھوم گھوم کر انہیں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ ان کے جسم کا ایک ایک انچ دیکھنا چاہتے ہوں۔

''کیوں بھئی! انہیں کیا قربانی کا جانور سمجھ لیا ہے؟'' غلام رسول نے باہر آ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم...... ہم یقین کرنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی یہ وہی ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''نہیں بھائی! یہ سو فیصد پروفیسر عثمان ہیں۔'' غلام رسول نے کہا۔

''جی نہیں! یہ اسد الکبیر بن داؤد بن صالح الاسدی ہیں۔ عرب کے کسی شہر سے یہاں آئے ہیں اور ہمارے لیے فرشتہ ہیں۔'' ایک بوڑھے نے پروفیسر کے ہاتھ کو عقیدت سے اپنی آنکھوں سے لگا کر کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ بھائی میرے! میں انہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ یہ پروفیسر عثمان ہیں۔''

''آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے کہا تھا کہ اسد الکبیر پھر آئیں گے اور یہ واپس آ گئے۔ ایک باپ کبھی اپنے بچوں سے دور نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی ہمارے باپ ہیں۔ ہم ان کی اولادیں ہیں۔ یہ پوری وادی ان کی غلام ہے۔''

''شاید آپ لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے۔''

''جی نہیں! ہمارے پاس ثبوت ہے کہ یہی اسد الکبیر ہیں۔''

''ذرا میں بھی تو دیکھوں۔''

''ضرور، ضرور! یہ ان کے پہلے جنم کی تصویر ہے۔'' کہہ کر اس نے کپڑوں میں لپٹا بڑا سا فریم آگے بڑھایا۔ ''اگر میری بات غلط ہے تو آپ تصویر دیکھ لیں۔''

غلام رسول نے تصویر سے کپڑا ہٹا دیا۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی وہ گویا اچھل پڑا۔ پروفیسر عثمان جواب تک خاموش کھڑے تھے، ان کی آنکھیں بھی پھٹی رہ گئیں کیونکہ وہ قلمی تصویر خود ان کی تھی۔

اپنی ہی قلمی تصویر دیکھ کر کوئی چونکتا نہیں ہے لیکن پروفیسر عثمان بری طرح چونک گئے تھے۔ ان کا چونکنا ضروری تھا کیونکہ انہوں نے کبھی بھی کسی مصور کو اپنی تصویر نہیں دی تھی اور نہ کبھی کسی مصور کے لیے ماڈل بنے تھے پھر یہ علاقہ پاکستان کا انتہائی پسماندہ علاقہ تھا۔ مہذب دنیا سے بالکل کٹا ہوا علاقہ جہاں آنا جانا بھی دشوار تھا۔ ان کی جوانی لندن میں گزری پھر وہ امریکہ منتقل ہو گئے۔ تصویر کے خدوخال اس دور کے عکاس تھے جب وہ لندن میں ہوں گے یا پھر نئے نئے امریکہ منتقل ہوئے ہوں گے۔ اتنی دور سے کوئی شخص ان کی تصویر یہاں کیوں بھیجنے لگا؟ پھر اس تصویر میں ان کے جسم پر جو کپڑے تھے، ویسے کپڑے پہننا لوگوں کو ہنسنے کا موقع دینا تھا۔ پیروں تک ڈھلتی قمیض، سر پر چوگوشی ٹوپی، پھر تصویر کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ کافی پرانی ہے۔ گو کہ اس کی حفاظت بھرپور انداز میں کی گئی تھی پھر بھی موسم کے اثرات آ گئے تھے۔

اس تصویر کو دیکھ کر پروفیسر عثمان پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اس عورت نے کہا۔ ''اب تو آپ کو یقین آ گیا؟''

''جی، میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' پروفیسر نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''مگر میری تصویر آپ کو کہاں سے ملی؟''

''یہ تصویر آپ کی نہیں، اسد الکبیر کی ہے۔ ہمارے محسن اسد الکبیر! ان کے بارے میں ہمارا یقین ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی ہماری مدد کر رہے ہیں۔ بزرگوں کا کہنا تھا کہ جب بھی نگار کو ضرورت پڑے گی، آپ تشریف لے آئیں گے۔ اب دیکھیے ناں! بھارت کس طرح ہر روز ہمارے نہتے لوگوں پر خواہ مخواہ فائرنگ کر رہا ہے۔ اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہمارے وہ بھائی بند جن کے علاقے پر اس نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے، ان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر تو ظلم کے پہاڑ توڑتا ہی ہے، ہمیں بھی نہیں بخشتا۔ آئے دن فائرنگ کر کے ہمارے کھیتوں کھلیانوں کو اجاڑتا رہتا ہے تاکہ ہم بھی اس کے عوام کی طرح ''بھک مری'' کا شکار ہو جائیں۔'' ایک بوڑھے آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔

پروفیسر کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے اندر ہلچل مچا رہا ہے۔ بار بار اکسا رہا ہے، کہہ رہا ہے کہ تُو ان کی مدد کر۔ انہیں بھارتی درندوں سے جو خطرہ ہے، اس خطرے سے بچا۔ اگر تُو ایسا نہیں کرے گا تو یہ بات تیرے ضمیر پر بوجھ بن جائے گی۔ یہ معصوم لوگ ہیں۔ مظلوم ہیں اور ظالموں سے ان کو بچانا تجھ پر فرض ہے کیونکہ یہ تیرے اسلامی بھائی ہیں۔ اگر کوئی مسلمان، کفار کے ظلم کا شکار ہو اور اس کی مدد نہ کی جائے تو یہ سراسر اسلام کے منافی ہے۔ کچھ بھی ہو، تُو نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا ہے۔ بے شک تُو راسخ العقیدہ مسلمان نہ بن سکا مگر مسلمان تو ہے...... اس لیے تجھے ان لوگوں کی مدد کرنا ہی چاہیے۔

''آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''ہمیں یقین ہے کہ آپ ہماری مدد کے لیے آئے ہیں۔ تین پہاڑ کے فاصلے پر کارگل ہے۔ وہاں ان درندوں نے طوفانِ بدتمیزی مچا رکھا ہے۔ ہم نے وہاں کے مظلوم لوگوں کو بھی آپ کی آمد کی خبر بھیج دی ہے۔ آج کل میں وہ لوگ بھی آپ سے ملنے آ جائیں گے۔''

''او بھائی! ہم یہاں چھٹیاں گزارنے آئے ہیں پھر ہمارا کام کچھ اور ہے۔ لڑائی بھڑائی ہم کیا جانیں؟'' غلام رسول نے کہا۔

''ہمیں معلوم ہے۔ آپ چھٹیاں گزارنے آئے ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔''

''تو پھر سچ کیا ہے؟'' غلام رسول کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

''یہ سرزمین بڑی پُراسرار ہے۔ اتنی پُراسرار جس کی تشریح کرتے کرتے برسوں لگ جائیں گے۔'' اس بوڑھے نے کہا۔ ''یہاں کی مٹی میں خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے نجات دہندہ کو خود ڈھونڈ لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کنفیوشس کے دور میں ''اجاتا'' کو سمراٹ اشوک کے دور میں ''بھیرو'' کو، بلور کے دور میں حضرت سید علی ہمدانی کو اور گوہرامان کے دور میں اسد الکبیر کو تلاش کر لیا تھا۔ اب پھر سے اس سرزمین کو ایک نجات دہندہ کی ضرورت ہے تو آپ کو کھینچ بلایا۔ یہی ہوتا آیا ہے۔''

''محترم! اگر ایسی بات ہے تو ہم آج ہی بوریا بستر سمیٹ لیتے ہیں کیونکہ ہم نہ تو

فوجی ہیں اور نہ جوان! ہماری عمر کے لوگوں پر تو جہاد کا اولین دور بھی ساقط ہے۔''

''اولین اور آخر دور کوئی نہیں ہوتا۔ جب مسلمانوں پر کفار کا ظلم بڑھ جائے تو جہاد فرض بن جاتا ہے خواہ مجاہد کتنی ہی عمر کا کیوں نہ ہو۔ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ انصاریؓ کی عمر کا شخص جب جہاد میں حصہ لے سکتا تھا تو کیا ہم ان کی عمر یاد کریں۔ جہاد کا حکم ہو تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ عمر کتنی ہے، جذبہ دیکھا جاتا ہے۔''

''بھائی میرے! ہمیں معاف کرو۔ ہمارے پاس جذبہ نام کا کچھ نہیں ہے۔'' غلام رسول نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

''آپ کو میدان میں کون بھیج رہا ہے۔ ہمیں فقط مشورے دیں جس طرح اسد الکبیر دیتے تھے۔''

وہ بوڑھا تو گویا پیر تسمہ پا بن گیا تھا۔ انہیں چھوڑنے پر تیار ہی نہیں تھا۔ غلام رسول جیسے شخص کو اس نے زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کی بے بسی دیکھ کر پروفیسر عثمان کو ہنسی آ رہی تھی۔ ان کا کھلا ہوا چہرہ دیکھ کر غلام رسول بھنا اٹھا۔ اس نے نو واردوں کی طرف سے نظریں ہٹا کر کہا۔ ''میں تو اس خیال سے مرا جا رہا ہوں کہ یہ لوگ آپ کے قیمتی وقت کو برباد کریں گے۔ تحقیق کے کام میں روڑے اٹکائیں گے اور آپ ہیں کہ میرا ہی مذاق اڑانے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''برا نہ ماننا، پتہ نہیں کیوں میں جو کہنا چاہتا ہوں، کہہ نہیں پا رہا اور جو نہیں کہنا چاہیے، وہ زبان سے نکل رہا ہے۔'' پروفیسر عثمان نے بے بسی سے کہا۔

''یعنی کہ آپ خود پر قابو نہیں رکھ پا رہے ہیں؟'' غلام رسول کے لہجے میں حیرت تھی۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔'' پروفیسر بولے۔

''لیکن میں نے تو ابھی ایسا کوئی جملہ نہیں کہا ہے؟'' غلام رسول نے تعجب سے کہا۔

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور کیا کہہ جاتا ہوں۔''

''شاید ان کی بات سچ ہے۔'' غلام رسول نے جواب دے کر نو واردوں سے کہا۔

''ابھی آپ لوگ جائیں۔ بعد میں بلا لیں گے۔''

غلام رسول کے کہنے پر وہ لوگ لوٹ گئے۔ ان کے جانے کے بعد اس نے پروفیسر سے کہا۔ ''آئیں، اندر چلیں۔''

وہ دونوں برآمدے سے آ کر اسٹڈی روم میں بیٹھ گئے۔

☆======☆======☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دونوں ہی خاموش تھے اور سوچ میں گم! ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں اس گتھی کو سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک اگر مشہور سائنس دان تھا تو دوسرا اس کا سایہ! گلاب کے درمیان رہنے والا بھی خوشبو کا حامل بن جاتا ہے۔ غلام رسول تو جیتا جاگتا انسان تھا۔ پروفیسر کی طرح اس نے تعلیم تو زیادہ حاصل نہیں کی تھی مگر تجربے میں وہ بھی کم نہ تھا اس لیے کہ ریسرچ ورک Research Work میں وہ بھی شریک رہتا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ پروفیسر عثمان کو مرکزیت حاصل تھی اور غلام رسول نائب تھا۔

''کس نتیجے پر پہنچے؟'' غلام رسول کی آواز نے خاموشی کا سینہ چاک کر دیا۔

''دماغ ماؤف ہے۔ ایسی حالت میں نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے۔'' پروفیسر کی آواز میں بے چارگی تھی۔

''تم نے ایک لڑکے کا ذکر کیا تھا جو انگلش بول رہا تھا؟'' غلام رسول نے سوال کیا۔

''ہاں، ایسا عجیب وغریب لڑکا مجھے ملا تھا۔''

''تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ آج کل تم ایک عجیب وغریب خواب دیکھ رہے ہو۔ ایسا خواب جسے ''قسط وار خواب'' کہا جا سکتا ہے۔''

''ہاں! آج کل میں ایک ایسے شخص کو خواب میں دیکھ رہا ہوں جس کی شکل مجھ سے ملتی ہے۔ بالکل ہو بہو میری کاپی ہے۔''

''اس کا نام کیا بتایا تھا؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''اسد الکبیر!'' پروفیسر عثمان نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''اسد الکبیر! اس بوڑھے نے بھی تو یہی نام لیا تھا۔''

''ہاں! مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اسد الکبیر اور اس لڑکے میں کہیں نہ کہیں کوئی رشتہ ہے۔''

''وہ شخص خواب میں ملتا ہے جبکہ لڑکا حقیقت ہے۔ اسی گاؤں میں رہتا ہے۔'' غلام رسول نے مسکرا کر کہا پھر پروفیسر کی طرف جھک کر بولا۔ ''میں نے جو کچھ سیکھا ہے، تم سے سیکھا ہے۔ تمہی نے تو بتایا تھا کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے جسم میں پچاس ٹریلین (50,00,00,00,00,00,00,00,00) خلیے (Cells) موجود ہوتے ہیں۔''

''ہاں!'' پروفیسر نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جب ماں اور باپ ملتے ہیں تو ان کے 23+23 کروموسومز آپس میں جڑ جاتے

ہیں اور ایک خلیہ وجود میں آ جاتا ہے۔ انسانی خلیہ وجود میں آتے ہی اپنی کا پیاں سرعت سے بنانا شروع کر دیتا ہے یعنی ایک سے دو، دو سے چار، چار سے آٹھ، آٹھ سے سولہ! اس طرح نو ماہ میں ایک مکمل انسان وجود میں آ جاتا ہے جس کے جسم میں پچاس ٹریلین خلیے موجود ہوتے ہیں۔''

''بھئی! میں انہی خلیوں پر تحقیق کرتا ہوں۔ تم مجھے میرا سبق کیوں پڑھا رہے ہو؟''

''ایک خاص نکتے کی طرف میں تمہارے ذہن کو لے جانا چاہتا ہوں۔'' غلام رسول نے کہا۔ ''اس لیے خاموشی سے سنتے رہو۔''

''بولو!'' پروفیسر نے اکتا کر کہا۔

''لوگ کہتے ہیں کہ ''خلیہ'' (Cell) برطانوی سائنس دان کی دریافت ہے اس لیے کہ ان کا علم محدود ہے۔ تاریخ کے صفحات پر تعصب کی گرد ہٹا کر یورپین دیکھتے تو انہیں بہت پہلے ایک نام مل جاتا۔ اتنے سال بعد فرنچ رائٹر پروفیسر آرمان بل، یونیورسٹی آف برسلز نے ''سپر مین ان اسلام'' کے صفحہ نمبر 375 پر لکھا ہے کہ (سیدنا امام) جعفر صادق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ابو شاکر دیصانی کے سوالوں کے جواب میں کہتے ہیں۔ ''کیا تم اللہ تعالیٰ کی اس مخلوق کو جانتے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کر کے تمہارے جسم کے اندر کام پر لگا دیا ہے اور جس کی وجہ سے تم زندہ ہو؟ تمہارے جسم میں اس قدر زندہ مخلوقات ہیں جن کی تعداد بیابان کی ریت کے ذرات جتنی ہے۔ یہ جاندار جو تمہارے جسم کے اندر زندگی بسر کر رہے ہیں، افزائش نسل کرتے اور مر جاتے ہیں۔ (یعنی پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں) ان کی تعداد اس دنیا کے انسانوں کی تعداد بلکہ ریت کے ذرات سے بھی زیادہ ہے۔ یہ وجود میں آتے، پھلتے پھولتے اور مر جاتے ہیں تاکہ تم زندہ رہو۔ اگر یہ مخلوق اپنا کام چھوڑ دے تو تم مر جاؤ گے۔''

غلام رسول نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ پروفیسر عثمان اچھل پڑے۔ وہ پھرتی سے کھڑے ہو گئے اور ہینگر کی طرف بڑھے۔ داہنی جانب کی دیوار کے پاس ہیٹ اسٹینڈ جس پر ان کا چیسٹر لٹک رہا تھا۔

انہیں یوں لپکتا دیکھ کر غلام رسول نے پوچھا۔ ''کہیں باہر جا رہے ہیں؟''

''ہاں! تمہاری باتوں نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے صحیح راستہ نظر آ گیا ہے۔ اب میں اسی خط پر آگے بڑھوں گا۔ اس امید پر کہ شاید گتھی کا سرا مل جائے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یعنی تم نے میرے خیال سے اتفاق کیا ہے؟"

"شاید تم صحیح سمجھ رہے ہو۔ سیدنا حضرت امام جعفر صادقؒ کی اس بات نے اندھیرے میں کرن کا کام کیا ہے اسی لیے میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔" پروفیسر عثمان بولے۔

"کس قسم کا تجربہ؟"

"اس گنجلک مسئلے کا تعلق خلیے سے ہے۔ انسانی جسم میں سب سے اہم چیز خلیہ ہے جو دل، دماغ، گردے، پھیپھڑے، کلیجی، آنت، آنکھ، ناک، کان وغیرہ وغیرہ یعنی تمام اعضاء کو بناتے ہیں پھر انہیں قائم رکھتے ہیں۔ انہیں زندگی دیتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ خلیہ کس طرح کام کرتا ہے مثلاً آنکھ کے Retina میں موجود Rod کی شکل کے تیرہ کروڑ خلیے مدھم روشنی وصول کرتے ہیں پھر ایک پیچیدہ برقی کیمیائی عمل کے ذریعے ایک مخصوص سگنل میں تبدیل ہوکر Optic Nerves تک پہنچتے ہیں۔"

"جی ہاں، معلوم ہے۔" غلام رسول نے کہا۔

"تو میں بتا رہا تھا کہ یہ سگنل جب مناسب مقدار میں دماغ کو موصول ہوتے ہیں تو انسان دیکھنے لگتا ہے۔ ہر خلیے میں تیرہ کروڑ مالیکیولز ہوتے ہیں۔ اسے "Molecules of light Catching" کہتے ہیں۔ اسے فعال رکھنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ توانائی خود خلیے فراہم کرتے ہیں۔ ہر خلیے میں کم و بیش ایک ہزار Power Plants کام کرتے ہیں۔ یہ ننھے منے ذرے سے بھی چھوٹے خلیے میں قائم پلانٹ جنہیں Mitocondria (مائی ٹوکونڈریا) کہتے ہیں۔ یہ پلانٹ ایک خاص قسم کے جز پیدا کرتے ہیں۔"

پروفیسر عثمان لیکچر دینے کے انداز میں بتا رہے تھے اور غلام رسول ہمہ تن گوش تھا۔

"یہ جز ایڈنو سائن ٹرائی فاسفیٹ (Adnosine tri-phosphate) کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ ہر جاندار کا "ایک پاور سورس" ہے۔ یہی جسم کے درجہ حرارت کو برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کرتا ہے تاکہ دل دھڑکتا رہے۔ خون رواں اور اعصابی نظام فعال رہے اور اس سے بھی ایک اہم چیز Deoxyribo Nucleic Acid ہے۔ ماں اور باپ کے کروموسومز سے جو خلیہ وجود میں آتا ہے، اس میں DNA ایک دوسرے پر لپٹی ہوئی دو ڈوریوں کی مانند ہوتا ہے۔ بچے کے مستقبل کے لامحدود امکانات، ناقابلِ شمار اطلاعات اور معلومات اسی DNA میں جمع رہتی ہیں۔ اتنی معلومات کہ اگر انہیں لفظوں کی

شکل میں کاغذ پر لکھا جائے تو پانچ پانچ سو صفحات کی کئی کتابیں بنیں گی۔ اعضاء کی تیاری، بناوٹ، تعمیر، تنصیب، کارکردگی، سروس کوالٹی یہ سب کچھ تفصیل سے ہر خلیے میں کوڈ (Code) کی شکل میں موجود ہوتا ہے۔"

"اچھا تو میں اب سمجھا کہ تم اس بچے کا DNA ٹیسٹ لینا چاہتے ہو۔ اس کے Cells کا تجزیہ (Analysis) کرو گے؟" غلام رسول ہنس کر بولا۔

"ہاں! میں اس بچے کے DNA کوڈ کو ڈی کوڈ کرنا چاہتا ہوں۔"

"یعنی تم کنفرم کرنا چاہتے ہو کہ اس کے دادا، پردادا یا نانا، پرنانا میں سے کوئی پاگل پن کا شکار تو نہیں تھا؟ یعنی تم اس بچے کو پاگل سمجھ رہے ہو؟"

"ہاں! کیونکہ پاگل پن کی بہت ساری قسمیں ہیں۔ گرم مزاجی، سنک، نیم پاگل پن، یہ سب بھی پاگل پن کی قسمیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بچہ بھی موروثی پاگل پن کا شکار ہو۔" پروفیسر عثمان بولے۔

"صاب! یہ ڈینا صاب کب آئیں گے؟" باورچی اختر علی نے چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر کہا۔ عثمان جو باہر جانے والے تھے، چائے دیکھ کر رک گئے۔

"یہ ڈینے صاحب کون ہیں؟" غلام رسول نے پوچھا۔

"ابھی آپ بولے، بچے کا ڈینے آئے گا۔" نوکر نے چائے کا کپ تھما کر کہا تو غلام رسول ہنس پڑا۔

"اختر صاحب! ہم ڈینے نہیں D.N.A کی بات کر رہے تھے۔"

"یہ ڈین کون ہے؟"

"اللہ تعالیٰ بچے کو پیدا کرنے سے پہلے اس کے بارے میں معلومات فراہم کر دیتا ہے۔ وہ معلومات کا خزانہ D.N.A ہے۔"

"اچھا تو بچہ لوگ کے اندر خزانہ ہوتا ہے؟" نوکر نے حیرت سے کہا۔

"تم نہیں سمجھو گے۔ جاؤ، رات کے کھانے کا انتظام کرو۔" کہہ کر پروفیسر عثمان نے چائے کی پیالی کو ٹیبل پر رکھا اور گھر سے باہر نکل گئے۔

غلام رسول نے ستارہ شناسی کی ایک کتاب کھول لی اور اس کے مطالعے میں ڈوب گیا۔ D.N.A کے خیال نے اسے مطمئن کر دیا تھا اسی لیے وہ اب اپنے پرانے شوق کی طرف لوٹ آیا تھا۔

ابھی اس نے پہلا صفحہ ختم کیا تھا کہ کیتھی اندر داخل ہوئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''مسٹر حسین! میں نے سنا ہے کہ سر D.N.A پر کوئی نئی تھیوری پیش کرنے والے ہیں؟'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔

''یہ...... یہ کیسی آواز تھی؟'' کیتھی نے چونک کر کہا۔

''ویسی ہی جیسی رائفل کی ہوتی ہے۔'' کہہ کر غلام رسول کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ ابھی چاند طلوع نہیں ہوا تھا اس لیے اندھیرا کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ گیٹ پر کھڑا پٹھان چوکیدار بندوق تھامے ایسے کھڑا تھا کہ پتہ کھڑکتے ہی گولی چلا دے گا۔

''کیا ہوا؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''صاحب! باہر گولی کا آواز آیا۔ ام دیکھتی کدھر گولی چلتی۔''

''تم اپنی جگہ مستعد رہو۔ میں پتا کرتا ہوں۔'' کہہ کر وہ باہر آ گیا۔ اس کے قدم گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے تبھی اس نے دیکھا کہ گیٹ سے باہر ڈھلان کی طرف سڑک کے بیچوں بیچ ایک سفید رنگ کی پجیرو کھڑی ہے۔ اس کے باہر تین چار مقامی افراد ہاتھوں میں روایتی ہتھیار پکڑے کھڑے تھے۔ غلام رسول تیز تیز قدموں سے ان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ نزدیک پہنچ کر اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''ہونا کیا ہے۔ یہ لوگ کسی غلط نیت سے ادھر آ رہے تھے۔ ہم نے انہیں روکا تو انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔'' ایک پُر جوش نوجوان نے بتایا۔

''کون لوگ تھے؟ کچھ اندازہ ہے؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''جی نہیں! صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ وہ لوگ دور تھے۔''

''کدھر بھاگے ہیں؟''

''وہ...... اس ترائی کی طرف پھسلتے ہوئے اترے تھے۔ ہم ان کے پیچھے دوڑے ضرور تھے مگر پکڑ نہ سکے کیونکہ نیچے سڑک پر ایک اور کار کھڑی تھی۔ وہ لوگ اس میں سوار ہو گئے۔''

''وہ کار کدھر گئی؟''

''وہ لوگ گلگت والی سڑک پر بھاگے ہیں۔''

غلام رسول مڑ کر پجیرو کے پاس آیا پھر اس نے دروازہ کھولا۔ ڈیش بورڈ میں چابی لگی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ افراتفری میں کچھ بھی لے جا نہیں سکے تھے۔ غلام رسول نے ڈیش بورڈ کے خانوں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ ایک خانے سے

پاکستانی کرنسی اور برٹش پاؤنڈ برآمد ہوئے۔ اسی خانے سے ایک امریکن پاسپورٹ بھی نکلا جس پر پاک امیگریشن کی مہر بھی لگی ہوئی تھی۔ پاسپورٹ وان بریٹو نامی شخص کا تھا جو تین دن پہلے پاکستان آیا تھا۔ تصویر سے وہ خاصا تندرست لگ رہا تھا۔ چہرے پر کرختگی تھی۔ غلام رسول نے پاسپورٹ، پاکستان کا نقشہ اور کرنسی کو اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو حویلی میں لے آیا۔

''پجیرو کو پورچ میں کھڑی کر کے وہ کمرے میں داخل ہوا تو حیرت سے اچھل پڑا۔ سامنے صوفے پر پروفیسر عثمان بیٹھے تھے۔

''تم کب آئے؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''میں گیا ہی کب تھا؟ جیسے ہی میں باہر نکلا، پجیرو میں بیٹھے شخص نے مجھ پر گولی چلا دی۔ قسمت اچھی تھی کہ کچھ لوگ دوڑ پڑے اور وہ حملہ آور فرار ہو گئے۔''

''حملہ آور کون ہو سکتے ہیں؟''

''مقامی نہیں تھے۔ دور سے مجھے انگریز لگے ہیں۔''

''لگتا ہے کہ کچھ لوگ تمہیں منظر نامے سے غائب کرنا چاہتے ہیں۔''

''یہ تو ہونا ہی ہے۔ زمانے نے اپنی چال بدل لی ہے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کو کچلنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ کوئی بھی مسلمان کسی بھی میدان میں ذرا سا آگے بڑھے تو اقوام عالم میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ بعض مسلم سربراہان کی طرح تلوے چاٹنے والا ہوا تو معافی ورنہ پھانسی!'' پروفیسر عثمان نے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ جیسے ہی اغیار کو احساس ہوا کہ اب آپ اپنے ملک کے لیے کام کریں گے، وہ جان لینے پہنچ گئے۔'' غلام رسول نے کہا۔

''اس لیے ہمیں اب مزید ہوشیار رہنا ہوگا۔ سیکیورٹی کے لیے کچھ مقامی آدمیوں کو ملازم رکھ لو مگر سب کے سب اسی گاؤں کے ہوں کیونکہ میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ لوگ میری کچھ زیادہ ہی عزت کرتے ہیں۔ ضرورت پڑی تو جان دینے پر بھی تیار ہو جائیں گے۔''

''مگر سوال یہ ہے کہ یہ لوگ یہاں تک پہنچے کیسے؟''

''جب کیتھی عورت ہو کر مجھے ڈھونڈ سکتی ہے تو کیا وہ لوگ نہیں ڈھونڈ سکتے؟ تم بھی کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''میں صبح ہی گاؤں کے کچھ آدمیوں کو ملازمت پر رکھ لوں گا۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ایسے لوگوں کو ترجیح دینا جن کے پاس بندوق ہو کیونکہ ہم ہتھیار تو لائے نہیں ہیں۔''

''سنا ہے، یہاں غیر قانونی ہتھیار آسانی سے مل جاتے ہیں۔ کچھ ہتھیار بھی خرید لوں گا۔''

''جیسا مناسب سمجھو۔'' یہ کہہ کر پروفیسر عثمان اپنے کمرے میں چلے گئے۔

☆======☆======☆

پروفیسر کے قدم اس طرح اٹھ رہے تھے جیسے وہ خود نہیں چل رہے بلکہ انہیں کوئی اور کھینچ رہا ہے اور وہ بڑھتے چلے جا رہے ہیں یا پھر وہ نیند میں چل رہے ہوں۔

کچھ دیر پہلے تک وہ اپنے بیڈ پر تھے۔ بے خبر سو رہے تھے پھر پتا نہیں کیسے وہ بیڈ سے نیچے اتر آئے اور پھر کمرے سے بھی باہر نکل آئے۔ آنکھیں ہنوز بند تھیں مگر قدم اٹھ رہے تھے۔ وہ اس طرح آگے بڑھتے جا رہے تھے جیسے ٹہلنے کے لیے نکلے ہوں۔

وہ چلتے چلتے اس پیڑ تک پہنچ گئے تھے جس کے نیچے بیٹھ کر وہ قسط وار خواب دیکھا کرتے تھے۔ پیڑ کا گھنا سایہ چاندنی میں اور زیادہ پھیل گیا تھا۔ اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ کر وہ تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ انہیں وہاں بیٹھے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ان کا سر گھٹنوں پر جھک گیا جیسے انہیں گہری نیند نے دبوچ لیا ہو۔ وہ بیٹھے بیٹھے خراٹے لینے لگے تھے۔

تبھی انہوں نے دیکھا کہ وہی پہاڑ ہے۔ وہی لوگ ہیں اور پہاڑ کی ترائی میں دور دور تک بکھری ہوئی لاشیں ہیں۔ یہ لاشیں تبتیوں کی ہیں، شکست خوردہ تبتیوں کی، تاشی کے سپاہی نیچے جا کر لوٹ مار کر رہے تھے۔ لاشوں کے جسموں سے زرہ بکتر اتار رہے تھے۔ تلواریں اور تیر کمان چھین رہے تھے۔ میدان جنگ میں یہی کچھ قیمتی ہوتا ہے۔

اسد الکبیر پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا نیچے دیکھ رہا تھا کہ جھٹکے سے پلٹا اور مڑ کر بولا۔ ''تم پھر آ گئیں؟''

''کیا کروں، دل نہیں مانتا۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

''خدا کے لیے، مجھے بخش دو۔ کیوں میری زندگی کے خاتمے کا سامان کر رہی ہو؟'' اسد الکبیر بولا۔

''دل کی بستی عجیب بستی ہے۔ یہ تو بستے بستے ہی بستی ہے۔ ابھی ابھی تو بسی ہے اور تم اسے اجاڑنے کا کہنے لگے۔'' لڑکی نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے سوچ لیا

ہے، تمہیں اگر نہ پا سکی تو جانتے ہو کیا کروں گی؟''

''کیا کرو گی؟''

''وہ جو سامنے...... ادھر...... اس پہاڑ کے پیچھے ایک کھائی ہے ناں، اس میں کود کر جان دے دوں گی۔''

''اور تمہارا باپ میری جان لے لے گا۔''

''تو کیا ہوا۔ میں اس جنم میں تو تم سے مل نہ سکی، اگلے جنم میں مل لوں گی۔''

''یہ اگلا جنم ونم کچھ نہیں ہوتا۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے لیے دنیا کے تمام راز اللہ تعالیٰ نے کھول دیے ہیں۔ بس ہمیں قرآن پاک کو سمجھنا ہے۔ قرآن پاک میں تمام بحر و بر کے راز ہیں۔ اگر اگلا جنم، پچھلا جنم ہوتا تو قرآن پاک ہمیں ضرور بتاتا۔ اللہ تعالیٰ یہ نہ کہتا کہ ہم ایک دن تمہیں اٹھائیں گے۔'' وہ کہتا۔ ''پھر ہم تمہیں نیا جنم نئی شکل میں دیں گے۔'' اسد الکبیر نے جھڑک کر کہا۔

''اچھا! میں تمہیں ایک ایسے بچے سے ملواؤں گی جس نے اپنے دادا کا جنم لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میرا دماغ مت چاٹو۔ جاؤ مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو۔'' یہ کہہ کر وہ مڑ گیا۔

''اچھا بابا! میں جا رہی ہوں۔'' کہہ کر وہ لوٹ گئی۔ اسد الکبیر اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ اس کہانی کا انجام کیا ہوگا؟ لڑکی اس پر ڈورے ڈال رہی ہے جبکہ یہاں کی رسم ہے کہ لڑکیوں کی شادی خاندان سے باہر نہیں کرتے پھر اس لڑکی کی نسبت طے ہے۔ اس کا منگیتر یہیں اس گاؤں میں موجود ہے۔ وہ سنے گا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی جبکہ یہ لڑکی پاگل ہو رہی ہے۔ آج یا کل یہ بات طشت از بام ہو کر رہے گی اور اس وقت یہی لوگ جو آج میری پذیرائی میں لگے ہیں، میرے جانی دشمن بن جائیں گے۔ میں کیا کروں، کیسے اسے سمجھاؤں؟

''اے! کس سوچ میں ڈوبے ہیں؟''

اس آواز نے اسد الکبیر کو چونکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے حسن کھڑا تھا۔ حسن اس لڑکی کا بھائی تھا۔ اس نے اسد کو اپنی طرف دیکھتے پا کر کہا۔ ''چلیں! آپ کو بابا جان بلا رہے ہیں۔''

اسد الکبیر اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ دونوں اس بڑے سے مکان پر پہنچے جہاں گاؤں کے مسئلے نمٹائے جاتے، فیصلے کیے جاتے اور علاقے کی ترقی کے بارے میں غور کیا جاتا۔ آس پاس کے علاقوں سے بھی لوگ آتے تھے۔ تمام سردار سر جوڑ کر بیٹھتے تھے۔ اس وقت بھی وہاں آس پاس کے تقریباً تمام سردار موجود تھے۔ وہ سب اسد کو دیکھ کر خوش ہو اٹھے۔ انہوں نے اسے تاشی کے برابر میں جگہ دے دی۔ وہ بیٹھا ہی تھا کہ تاشی نے کہا۔ ''اسد الکبیر صاحب! ہم سب یہاں اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ اس فتح کی خوشیاں سمیٹ سکیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' اسد نے جواب دیا۔

''ہم نے قبائلی رقص کا اہتمام کیا ہے۔''

''برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں؟''

''ضرور! ضرور!'' اس نے کہا۔

سرداران قبلہ کی اجازت ملتے ہی وہ بولا۔ ''ہم مسلمان ہیں اور مسلمانوں کی الگ پہچان ہے۔ ہر غم وخوشی میں ہم صرف اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتے ہیں اور رقص وسرود، یہ کام اہل شرک کا ہے۔ ہمارے ہاں جائز نہیں ہے۔''

تمام سرداروں کے سر جھک گئے۔ ایسی خاموشی چھا گئی کہ سانسوں کی آواز بھی صاف سنی جا رہی تھی۔ تب تاشی نے بلند آواز میں کہا۔ ''واقعی ہم نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ ہم نے سجدہ شکر ادا کرنے کی بجائے رقص وسرود کی محفل سجانی چاہی تھی۔ کل ہم سب مل کر تمام گاؤں کے لوگ یہاں اکٹھا ہو کر اجتماعی طور پر نماز شکرانہ پڑھیں گے۔ سب مل کر اس خدائے بزرگ وبرتر کا شکر ادا کریں گے جس نے ہماری شکست کو فتح میں بدل دیا۔''

وہاں بیٹھے کئی سرداروں کے منہ بن گئے تو کئی چہرے کھل اٹھے۔

کچھ دیر تک صلاح مشورہ کرنے کے بعد تاشی نے اعلان کیا کہ کل عید گاہ میں نماز شکرانہ ادا کی جائے گی۔

اعلان کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا سیدھا مطلب یہ تھا کہ محفل برخاست کی جاتی ہے۔ دوسرے لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اسد الکبیر بھی اٹھ گیا اور اب اپنے خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک بڑے سے پیڑ کے نیچے پہنچ کر اسے ٹھوکر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔

پروفیسر عثمان نے حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ اوندھے منہ اسی مخصوص پیڑ کے نیچے پڑے تھے۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اپنی حویلی کی طرف بڑھنے لگے۔

☆======☆======☆

اس نے دائیں پھر بائیں دیکھا۔ شاید وہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ اتنے چھوٹے سے بچے کو اس طرح حفظ ماتقدم کے اصول کو مدنظر رکھ کر قدم اٹھاتے دیکھ کر غلام رسول حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ اس وقت چھت پر کھڑا تھا۔

جس طرح پروفیسر عثمان نے خود کو ''جینین'' کے لیے وقف کر رکھا تھا، اس ننھے ذرے میں مخفی جادوگری کے ایک ایک راز کو جان لینے میں کوشاں رہتا تھا۔ اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب ٹھہرا تھا اور اس نے نیا جہان دریافت کر لیا تھا۔ اسی طرح غلام رسول پرانے جہان میں نیا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے ستاروں سے دلچسپی تھی۔ وہ علم نجوم کے ذریعے مخفی راز کو جاننے میں کوشاں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ستارے بہت کچھ کہتے ہیں صرف گوش بر آواز رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر انسان کا دماغ یکسو ہو، سماعت حساس ہو تو وہ اس خاموش زبان کو بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کیونکہ کائنات کا نظام خود ایک جادوگری ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے صدیوں کی ضرورت ہے یا پھر اسے قرآن پاک کی زبان سے سمجھا جائے۔

وہ نظام افلاک کو قرآن پاک کی رہنمائی میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صبح ہی صبح اس سے کیتھی کی بحث ہو چکی تھی۔ کیتھی نے کہا تھا کہ یہ ستارے وسیارے کچھ نہیں کہتے۔ لوگ صرف اندازے لگا لیتے ہیں۔ دس باتیں بتاتے ہیں جن میں ایک دو اتفاقی طور پر صحیح ہو جاتی ہیں۔

اس کی بات پر جل کر غلام رسول نے کہا تھا۔ ''جو تم خلیے پر ریسرچ کر رہی ہو ناں، یہ بھی ستاروں کے محتاج ہیں۔ اس میں جتنے سیارے، ستارے ہیں، ان سب کا اثر خلیے پر پڑتا ہے اور تب یہ خلیہ اپنی راہیں متعین کرتا ہے۔''

''ہاں! ہاں! D.N.A میں Feed تمام باتیں تو ستارے لکھتے ہیں۔'' کیتھی نے طنز کیا تھا۔

''بے وقوف لڑکی! D.N.A میں Feed کی گئی باتیں اسی طرح ہیں جیسے زمین اور اس پر بنا ایک دو منزلہ مکان لیکن مکان میں کتنے کمرے ہوں گے، یہ انسان کی اپنی کوشش ہوتی ہے۔ انسان اگر چاہے تو تمام کمرے ڈیکوریٹ کر لے یا انہیں خالی چھوڑ دے یعنی ذیلی کام انسان کی عادات واطوار اور مزاج پر منحصر ہے اور مزاج کی راہیں متعین کرتی ہیں ستاروں کی شعاعیں۔ جس انسان پر ستارہ زحل یعنی Saturn کی شعاعیں پڑتی ہیں، اس کے دل و دماغ پر قنوطیت چھا جاتی ہے کیونکہ زحل کے آٹھ چاند ہیں اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آٹھوں کا زاویہ ایک ہے جو سیدھے حرام مغز (Spinal Cord) کی ایک خاص شریان کو متاثر کرتا ہے جس کی وجہ سے طبیعت میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ زحل کی شعاعیں انسان پر اس وقت اثر ڈالتی ہیں جب انسان کالے لباس میں ہو۔ ان شعاعوں کو کچا لوہا بھی کھینچتا ہے اس لیے کچھ لوگ زحل کو راغب کرنے کے لیے گھوڑے کی نعل پہنتے ہیں۔ عورتوں کے جذبات بروختہ نہ ہوں۔ اس لیے انہیں کالے برقعے میں رہنے کی ترغیب دی گئی کیونکہ عورتوں کے جذبات بروختہ ہو جائیں تو زیادہ خرابی ہے۔ دنیا میں برائی حد سے زیادہ پھیل سکتی ہے جیسا کہ تمہارے ملک میں ہے۔'' غلام رسول نے آخر میں دل کے پھپھولے بھی پھوڑ لیے۔

''ہاں! ہاں! ہم لوگ گناہ میں ڈوبے ہیں اس لیے کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے، بار بار نہیں۔ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔'' کیتھی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''کس نے کہا، زندگی ایک بار ملتی ہے؟ زندگی ایک نہیں، دو بار بلکہ تین بار ملتی ہے۔ یہ ہم نہیں ہمارا مذہب کہتا ہے اور ہمارا مذہب کبھی غلط نہیں کہتا۔ کبھی سوچا ہے، ہمارے مذہب میں پانچ وقت کی نمازیں کیوں فرض کی گئی ہیں؟ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل جتنے نبی و رسول مبعوث ہوئے، ان کی امت پر ہر عبادت اتنی سختی سے فرض کیوں نہیں کی گئی؟ وہ مذاہب بھی سچے تھے۔ پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام پھر حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت ایوب علیہ السلام و حضرت یونس علیہ السلام، حضرت عذیر علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ کی امتوں میں سے کچھ کو رکوع تو کسی کو سجود، کسی کو قرأت کا حکم ملا۔ ایسا صرف اس لیے کہ اس زمانے میں زمین کی گردش اور تھی۔ ماحول کی آلودگی اتنی نہ تھی۔ انسانی نظام جسم میں خرابی کے اتنے زیادہ امکانات نہ تھے مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ آلودگی کا عفریت ہر جانب سے منہ کھولے ابن آدم و بنت حوا کو نگلنے کے لیے بڑھا آ رہا ہے۔ وہ خطرناک عفریت پانی سے سر ابھار رہا ہے۔ ہوا میں منہ پھاڑ رہا ہے۔ غذا میں ڈکرا رہا ہے غرضیکہ آلودگی بیماری کو ہوا دے رہی ہے اور بیماری انسانی صحت کو کتر رہی ہے۔'' غلام رسول گویا تقریر کے موڈ میں آ چکا تھا۔ وہ کلی طور پر کیتھی

کو قائل کرنے کے لیے کمر کس چکا تھا۔ اسے رکتے دیکھ کر کیتھی نے کہا۔

''تو تمہاری بات ختم ہوئی۔ میں کمرے میں جاؤں؟''

''نہیں! ابھی اصل بات تو بتائی نہیں ہے۔ یہ تو ٹریلر تھا۔'' غلام رسول نے ہنس کر کہا۔

''تو کیا میں پین کلر Pain Killer لے لوں؟''

''ہر کند ذہن اسٹوڈنٹ لیکچر سے گھبراتا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ تمہارا تجربہ اب تک تکمیل تک کیوں نہیں پہنچ رہا ہے۔''

''طنز نہیں۔ جو کہنا ہے کہو لیکن یاد رکھو، میں متوجہ بالکل نہیں ہوں کیونکہ تمہارے لیکچرز دماغ میں بھونچال اٹھا دیتے ہیں۔ تم ایسے ایسے نکتے اٹھاتے ہو کہ دماغ کی چولیں بھی لرز کر رہ جاتی ہیں۔''

''بھئی! میں تو چوٹ پر چوٹ مارنے کا قائل ہوں۔ صرف اس امید پر کہ کوئی نہ کوئی بات تو دل پر اثر کرے گی۔''

''یقیناً یہ نظریہ صحیح ہے۔ اب بتاؤ کیا بتانا چاہ رہے تھے؟'' کیتھی نے کہا۔

''میں بتا رہا تھا کہ آج سے چار ہزار سال پہلے زمین کی آب و ہوا کچھ اور تھی۔ ماحول میں اتنی آلودگی نہ تھی۔ اوزون (Ozone) میں سوراخ بھی نہ تھا کہ الٹرا وائلٹ ریز سیدھی زمین پر آئیں۔ یہی وجہ تھی کہ عام آدمی بھی ہر کیولیس (Hercules) تھا مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ انہی بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے عبادات کا حکم سختی سے دیا گیا ہے تاکہ انسانی ذہن و جسم چست و درست رہے۔ مدافعتی نظام سو فیصد کام کرتا رہے اور جب مدافعتی نظام صحیح رہے گا تو بیماریاں انسانی جسم سے خوفزدہ رہیں گی۔ دور دور رہیں گی اور ٹیرامائی سین، سائکلو مائی سین کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بیماریاں دور کرنے کے لیے تم اسی قبیل کی دوائیں استعمال کرتی ہو ناں؟''

''ہاں!'' کیتھی نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''کبھی غور کیا ہے کہ صوتی طور پر ان دواؤں کے معنی کیا ہیں؟''

''کیا ہیں؟''

''سائکلو کے معنی کیا ہیں؟''

''گھومتا ہوا۔'' کیتھی نے جواب دیا۔

''اور مائی سین (Mysin) کا کیا مطلب ہوا؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''میرا گناہ، میری اخلاقی خطا!'' کیتھی جلدی سے بولی۔

''یعنی کڑوی کسیلی دوائیں ہمارے ہی گناہوں کی سزا ہیں۔''

''ہا! ہا! ہا! بھئی خوب کہا کیا نکتہ نکالا ہے۔'' کیتھی نے ہنس کر کہا۔

''تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ بیماریاں ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم عبادات میں وقت صرف کریں گے تو ہمارا اندر کا مدافعتی نظام صحیح رہے گا۔ یہ میرا اپنا نظریہ ہے کسی عالم دین کا نہیں۔ اگر یہ نظریہ غلط ہے تو وہ رحیم و کریم اور عفو و درگزر کرنے والا ہے کیونکہ انسان کو عقل کم دی ہے اور وہ سوچتا زیادہ ہے اس لیے غلط نظریہ بھی صحیح لگنے لگتا ہے۔ خیر، میں بتا رہا تھا کہ عبادت کا سختی سے حکم، رکوع و سجود کے لیے مخصوص اوقات اس لیے بتائے گئے کہ Galaxy کے مخصوص Planets سے خاص شعاعیں (Rays) نکلتی ہیں جو سیدھی ان اوقات میں ہی زمین پر آتی ہیں کیونکہ زمین اس وقت ایک خاص زاویے پر ہوتی ہے اور وہ شعاعیں سیدھی آ کر جسم سے ٹکراتی ہیں۔ جسم کے کن حصوں کے لیے کتنی شعاعیں ضروری ہیں، وہ شاید رکوع و سجود اور قیام کے ذریعے ممکن بنتی ہیں۔''

''میں تمہاری باتوں پر غور کروں گی۔ اب جاؤں؟'' کیتھی نے کہا۔

''ہاں! جا سکتی ہو مگر ذہن میں کوئی بات تشنہ ہے تو پوچھ سکتی ہو۔''

غلام رسول کی بات پر کیتھی ''اللہ معافی، اللہ معافی'' کی گردان کرتی ہوئی بھاگ اٹھی تھی۔ اس کے انداز کا غلام رسول نے خوب لطف لیا تھا۔ وہ چھت پر کھڑا دوربین سے ستارے کو دیکھ رہا تھا مگر ذہن کے اسکرین پر کیتھی رقصاں تھی اور اس نے ادھر سے نظریں ہٹا کر سڑک کو دیکھا تھا کہ اسے وہ بچہ نظر آ گیا تھا۔ یعنی علی مدد شاہ!

علی مدد شاہ بڑے ہی پُراسرار انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ غلام رسول جو اس وقت ستاروں کی چال دیکھنے کے لیے چھت پر آیا تھا اور اپنی جان سے بھی پیاری دوربین سے ستاروں کی چال دیکھ دیکھ کر ''ڈیجیٹل میموری بک'' میں نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ حویلی کی سڑک پر سائے کو بڑھتے دیکھ کر چونکا تھا اور اس نے دوربین کا رخ ادھر کر لیا تھا۔ وہ طاقتور دوربین جو ستاروں کے مطالعے میں کام آتی تھی، اس میں چند سو گز کا نظارہ آنکھوں کے بہت قریب لگ رہا تھا اسی لیے غلام رسول نے بچے کو پہچان لیا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ بچے کے ہاتھ میں تیغہ ہے۔ ایسا چاقو جو زمانہ قدیم میں سپاہی اپنے ساتھ رکھتے تھے جس کا اگلا حصہ گول ہوتے ہوئے بھی چوڑا ہوا کرتا تھا۔ وزن بھی زیادہ ہوتا۔ اسے عام طور پر سپاہی پھینک کر مارتے تھے۔ وہ ایسا چاقو لے کر حویلی کی طرف کیوں آ رہا

ہے، یہ بات غلام رسول کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس نے دوربین کا فوکس لڑکے کے چہرے پر کیا تو گویا اچھل پڑا کیونکہ وہ بات ہی ایسی تھی، ذہن کو چکرا دینے والی۔ لڑکے کے چہرے پر تناؤ تھا۔ عضلات ابھرے ہوئے تھے ایسے جیسے اس نے جبڑا بھینچ رکھا ہو۔ گال کی ہڈی بھی ابھر آئی تھی لیکن یہ بات حیرت کی نہ تھی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نیند میں چل رہا ہو۔

غلام رسول اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے گویا دوربین کے ویو فائنڈر سے آنکھیں چپکا دی تھیں۔ وہ ایک ٹک لڑکے کو دیکھے جا رہا تھا۔ لڑکا تیز تیز قدموں سے حویلی کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ ادھر چوکیدار ہر جانب سے بے خبر گیٹ پر بنے کیبن میں بیٹھا تھا۔ لڑکا گیٹ پر پہنچا پھر یکا یک بائیں جانب مڑ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ شاید وہ بند دروازے کو کھلوانا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ رک گیا۔ اس نے چہرہ گھما کر بند آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اچھال بھری، حیرت انگیز طور پر وہ مینڈک کی طرح اچھلا تھا۔ ایک ہی اچھال میں وہ دیوار کے اوپر چڑھ گیا تھا۔ کچھ لمحے تک وہ وہیں بیٹھا رہا پھر اندر لان میں کود گیا۔ اس کے کودنے سے دھمک پیدا ہوئی۔ دھمک سنتے ہی چوکیدار چونک گیا اور پھرتی سے باہر نکل آیا۔ اس کا رخ ادھر ہی تھا جدھر وہ لڑکا کودا تھا۔

غلام رسول خوفزدہ ہو گیا۔ چوکیدار کے ہاتھ میں بندوق تھی اور اس بچے کے ہاتھ میں چاقو۔ دونوں کا ٹکراؤ ہوتا تو ایک کا مرنا یقینی تھا۔ غلام رسول نے دوربین کو سامنے سے ہٹایا اور پوری قوت سے سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا تھا پھر اس نے بستر کے سرہانے کو اٹھا کر نیچے رکھا پستول نکالا تھا۔ وہ پستول لے کر باہر کی طرف دوڑا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ علی مدد شاہ کس جگہ چھپا ہو گا۔ وہ ادھر ہی دوڑا تھا۔ چوکیدار بھی ادھر ہی آ رہا تھا تبھی غلام رسول نے چیخ کر کہا تھا۔ ''علی مدد! میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ جھاڑیوں میں سے نکل آؤ۔''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔ اس کا داہنا پیر ایک گڑھے میں آ گیا تھا اسی لیے وہ لڑکھڑایا تھا۔ یہی لڑکھڑاہٹ اس کی زندگی کی ضامن بن گئی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے کوئی پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا اس کے کان کے قریب سے گزر گیا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ برآمدے میں کسی لوہے کی وزنی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ آواز سنتے ہی چوکیدار نے ہوائی فائر کیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چیخا تھا۔ ''اے کون ہے؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بندوق کی آواز کے ساتھ ہر طرف ہلچل مچ گئی تھی۔ اندر کے دونوں نوکر باہر نکل آئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں بھی اسلحہ تھا۔

"کیا ہوا صاحب جی؟" اختر علی باورچی نے پوچھا۔ اس نے ہاتھوں میں بندوق تو پکڑ رکھی تھی مگر اتنی دور سے بھی غلام رسول نے تاڑ لیا کہ اس کے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا ہے۔ وہ بری طرح سے کانپ رہا ہے۔

"کچھ نہیں! تم لوگ اندر جاؤ۔" یہ کہہ کر غلام رسول اس جھاڑی کی طرف بڑھا جہاں اسے شبہہ تھا کہ علی مدد شاہ چھپا ہوگا۔ اب اسے کسی بات کا خوف بھی نہیں تھا کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بچے کے ہاتھ میں جو تیغہ تھا، اسے اس نے پھینک مارا تھا اور اب وہ خالی ہاتھ ہوگا۔

غلام رسول، بچے کی تلاش میں اس جھاڑی کے پیچھے پہنچ گیا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔ علی مدد شاہ کا بے سدھ وجود کنٹیلی جھاڑیوں کے درمیان پڑا تھا۔ غلام رسول نے اس کے کندھے کو ہلا کر آواز دی مگر وہ کسمسا کر رہ گیا۔ اتنی دیر میں چوکیدار قریب آ چکا تھا۔ غلام رسول نے اس سے کہا۔ "خان صاحب! اسے اٹھا کر اندر لے چلیے۔"

چوکیدار نے اسے گود میں اٹھا لیا پھر بولا۔ "صاحب جی! وہ چور کہاں گیا؟"

"وہ تو بھاگ گیا۔" کہہ کر غلام رسول برآمدے میں آ گیا۔

پھر اس نے چوکیدار سے پوچھا۔ "کتے کیوں نہیں کھولے؟"

"بڑا صاحب باہر ہے، اس وجہ سے۔" یہ کہہ کر وہ لڑکے کو اٹھا کر کمرے میں لایا۔ اسے بستر پر لٹانے کا کہہ کر غلام رسول نے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور چلو میں پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ لڑکا کسمسا کر اٹھ گیا پھر حیرت بھری آواز میں بولا۔

"میں...... میں یہاں کیسے آ گیا؟ میں تو گھر میں سو رہا تھا۔"

لڑکے کے لہجے میں تصنع بالکل نہیں تھا۔ وہ خوف و حیرت سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیوں تمہیں یہاں آنے کی بات یاد نہیں ہے؟" غلام رسول نے پوچھا۔

"جی نہیں! کبھی کوئی سونے کے بعد بھی کہیں جاتا ہے؟ میں تو سرِ شام سو گیا تھا۔ آج بہت دنوں بعد گھڑ سواری کی تھی اس لیے بدن تھک کر چور تھا۔" لڑکے نے جواب دیا۔

غلام رسول کا ذہن الجھ گیا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ وہ تیغہ لے کر یہاں تک آیا اور اسے اپنے آنے کی بات یاد نہیں ہے تبھی اس نے باورچی اختر علی سے کہا۔ "باہر برآمدے میں

دیکھو، ایک بڑی سی چھری پڑی ہوگی۔ اسے اٹھا لاؤ۔"

"یہ والی چھری؟" وہیں کھڑے ایک دوسرے نوکر نے ٹیبل پر رکھے تیغہ کو اٹھا کر دکھایا۔

"ہاں یہی! لاؤ ادھر دو۔" کہہ کر اس نے تیغہ لے لیا پھر لڑکے سے پوچھا۔ "بیٹے! اس تیغہ کو پہچانتے ہو؟"

لڑکے کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں تھیں۔ وہ بہت زیادہ ڈرا ہوا تھا۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جی...... جی ہاں! یہ ہمارا خاندانی تیغہ ہے۔ دادی بتاتی ہیں کہ اسے میرے دادا کے ابا کو نانگار کے سلطان نے دیا تھا۔ یہ ہمارے گھر میں دیوار پر لٹکا رہتا ہے مگر یہ یہاں کیسے آیا؟ آپ مانگ کر لائے ہیں؟"

وہاں کھڑے تمام لوگوں کے چہروں پر حیرت چھا گئی۔ خود غلام رسول بھی حیرت زدہ رہ گیا تھا مگر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر بولا۔

"بیٹے! یاد کرو، کہیں یہ تیغہ تم ہی تو نہیں لائے؟"

"نہیں جناب! میں اتنا وزنی تیغہ کیسے لا سکتا ہوں؟ میں تو اپنے گھر میں سو رہا تھا اور آنکھ کھلی تو یہاں تھا۔"

"یعنی کہ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں ہے؟"

"جی ہاں!" لڑکے نے جواب دیا اور ادھر اُدھر رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگا پھر بولا۔ "مجھے گھر پہنچا دیں ناں۔"

"کیوں؟ تم اکیلے نہیں جا سکتے؟ راستے تو دیکھے بھالے ہیں ناں۔" غلام رسول نے کہا۔

"جا تو سکتا ہوں مگر اندھیرا ہے ناں! مجھے رات میں بہت ڈر لگتا ہے۔" وہ روہانسی آواز میں بولا۔

غلام رسول اس کے چہرے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کی تیز نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ ایسی پختہ اداکاری کسی بچے کے بس کی بات نہیں ہے۔

"کیوں چاچا جی! مجھے گھر پہنچا دیں گے ناں!" بچے نے پھر پوچھا۔

غلام رسول نے مڑ کر باورچی اختر علی کو دیکھا پھر کہا۔ "اسے گھر تک پہنچا آؤ۔"

اختر علی، بچے کو لے کر باہر نکل گیا۔ ان دونوں کے جاتے ہی غلام رسول نے گھڑی دیکھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ گاؤں دیہات، وہ بھی نانگار ایسا ویران علاقہ!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہاں تو سورج غروب ہوتے ہی لوگ سو جاتے ہیں۔ کہیں کوئی نظر نہیں آتا۔ ایسے وقت میں پروفیسر کا گھر سے باہر رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ دو اجنبیوں کا حویلی کے سامنے فائرنگ کرنا۔ علی مدد شاہ کا تیغہ لے کر حویلی میں گھس آنا، یہ سب اشارہ تھا کہ پروفیسر کی جان خطرے میں ہے۔

''کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''میں پروفیسر کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ پتا نہیں، وہ کہاں رہ گئے۔''

نوکروں کو انہیں ڈھونڈنے کے لیے بھیج دو۔''

''میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' غلام رسول نے کہا ہی تھا کہ پروفیسر عثمان پہنچ گئے۔ انہوں نے اندر آتے ہی پوچھا۔

''یہاں کیا ہوا تھا؟''

''پہلے فائرنگ ہوئی تھی پھر علی مدد شاہ تیغہ لے کر گھس آیا۔ اگر یہی حالت رہی تو میں لوٹ جاؤں گا۔''

''لوٹ کر کہاں جاؤ گے، وہیں، گوروں کی غلامی کرنے جہاں ہمیں پاؤں کی دھول سمجھا جاتا ہے۔ جہاں ہر کوئی ہمیں شک کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ جہاں ہمارے ہر نوجوان کو ہیروئن کا اسمگلر اور ہر عورت کو جسم فروش سمجھا جاتا ہے۔ اپنا ملک پھر اپنا ہی ہوتا ہے۔''

''مگر ان حالات میں ہم کیسے رہیں گے؟''

''انسان حالات کا محتاج ہے۔ جیسے حالات ہوتے ہیں، انسان اسی طرح زندگی گزارتا ہے۔ اب تک حالات نے ہمیں اونچے تخت پر بٹھائے رکھا، ہم خوش رہے۔ اب اگر تختہ ملتا ہے تو رونا کیسا؟ بس چپ چاپ دیکھتے رہو، حالات ہمیں کدھر لے جا رہے ہیں۔''

''حالات تو بندوق سنبھالنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ تم نے اس بوڑھے کی بات نہیں سنی تھی کہ کارگل میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے اور اسی ظلم سے نجات دلانے کے لیے اس سرزمین کی کشش نے ہمیں کھینچا ہے۔ تو کیا تم یہ مائیکرو اسکوپ، ٹیسٹ ٹیوبز، کمپیوٹرز وغیرہ میں آگ لگا کر رائفل اٹھا لو گے؟ کبھی رائفل چلائی ہے؟''

''مجبوری ہر کام کروا لیتی ہے۔ اگر قسمت میں بندوق چلانا لکھا ہے تو یہی سہی۔''

''یعنی تم واپس نہیں جاؤ گے؟''

''میں نے کہا ناں، پتا نہیں، مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں، وہ کر نہیں پاتا۔ جو کہنا چاہتا ہوں۔ وہ کہہ نہیں پاتا اور جو کچھ زبان سے نکلتا ہے، اس بارے میں پہلے سے میرے دماغ میں کوئی سگنل نہیں ہوتا۔''

''ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ تقریباً گیارہ سال پہلے تم نے اپنا D.N.A انالائسیز کیا تو تھا۔ اس میں بھی ایسی کوئی بات نکلی تھی جو سمجھ میں نہ آئی ہو؟''

''تم بھی بچوں جیسی باتیں کرنے لگے۔ ارے بے وقوف آدمی! آج تک کوئی D.N.A کے Code کو مکمل طور پر ڈی کوڈ کر سکا ہے؟ جنیاتی کوڈ کو ابھی تک میں خود بھی نہیں سمجھ پایا ہوں۔ شاید کوئی ایسا نکتہ رہ گیا ہو جسے میں سمجھ نہیں پایا اور وہی نکتہ اس پورے مسئلے کا مرکز ہے۔''

''D.N.A کے کس کیمیکل پر تمہیں شک ہے جس میں کوئی اہم نکتہ رہ گیا ہو؟''

''وہی ہیں......'' ابھی پروفیسر عثمان نے اتنا ہی کہا تھا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ پروفیسر نے یہاں آتے ہی چار قیمتی کتے راولپنڈی سے منگوا لیے تھے۔ یہ چاروں نہ صرف خطرناک تھے بلکہ حد سے زیادہ چست و چالاک بھی۔ جب وہ باہر تھے تو ان کے گرد مضبوط حفاظتی حصار تھے۔ ان کی حفاظت پر ہزاروں ڈالرز خرچ کیے جاتے تھے جبکہ انہیں خطرہ ذرہ برابر بھی نہ تھا مگر اب جب وہ اپنے ملک میں لوٹ آئے تھے تو خطرہ بڑھ گیا تھا کیونکہ اب ان کی خدمات کا فائدہ سیدھے مسلمانوں کو پہنچتا اور دشمنان مسلمان کو یہ بات گوارہ نہ تھی۔ وہ تو مسلمانوں کو ہر محاذ پر ذلیل و خوار دیکھنا چاہتے ہیں پھر یہ بات کیسے گوارہ کر لیتے کہ ایک مسلمان ملک میں سائنسی میدان کا شہسوار نئے میدان سر کرے۔ وہ جلا کر انہیں ہی ختم کرنے کی کوشش کرتے۔ اسی خطرے کے پیش نظر حفظِ ماتقدم کے تحت انہوں نے کتوں کا بندوبست کر لیا تھا کیونکہ کتے انسانوں سے زیادہ وفادار ہوتے ہیں۔ انہی کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی تھی۔ کتے گویا پاگل ہو اٹھے تھے۔ بری طرح بھونک رہے تھے جیسے احاطے میں کوئی انجان آدمی گھس آیا ہو۔

''دروازے لاک کر دو۔ ہری اپ!'' پروفیسر نے کہا۔ غلام رسول اس طرح سے بھاگ بھاگ کر دروازے کھڑکیاں بند کرنے لگا جیسے اس کے بدن میں بجلی بھر گئی ہو۔ اس نے بہ مشکل دو منٹ میں چاروں کھڑکیاں اور دونوں دروازوں کو بند کیا اور تہہ خانے کا خفیہ دروازہ کھول کر تیار ہو گیا۔

پروفیسر عثمان بھاگ کر تہہ خانے میں اتر گئے۔ غلام رسول نے سیڑھیوں پر اتر کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دروازہ اندر سے بند کیا اور نیچے اتر گیا۔

وہ ایک وسیع و عریض تہہ خانہ تھا جس میں ضروریاتِ زندگی کی تقریباً تمام چیزیں تھیں۔ ایک جانب بڑا سا بیڈ بھی رکھا ہوا تھا جس پر آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ وہ دونوں اس بستر پر جا کر بیٹھ گئے۔ انہیں یقین تھا کہ آنے والوں سے باہر والے نمٹ لیں گے۔ چوکیدار کی آواز پر گاؤں والے دوڑے آئیں گے پھر کتے بھی حقِ نمک ادا کریں گے۔ دشمن پھر بھی نہ رکا اور کسی نہ کسی طرح اندر آ گیا تو اسے تہہ خانہ نہیں ملے گا۔ اس سوچ نے انہیں تقویت دی تھی اس لیے وہ مطمئن ہو کر بیٹھے تھے۔

''کون لوگ ہو سکتے ہیں؟'' غلام رسول نے سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جو بھی ہے، اس کے پاس آتشیں ہتھیار ہیں کیونکہ ان کتوں میں سے دو اسی مقصد کے لیے ٹرینڈ ہیں۔ وہ بارود کی بو محسوس کر لیتے ہیں۔ اپنے اوسان کھو دیتے ہیں۔ اس شخص کو جس کے پاس بارود ہو اور وہ اجنبی ہو تو اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔''

''یعنی آنے والے یقیناً ہمارے دشمن ہیں۔''

''بالکل! یہی بات ہے۔'' پروفیسر عثمان نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ تہہ خانے کے بند دروازے پر چوٹ پڑی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دروازہ توڑا جا رہا ہو۔ وہ لوگ بری طرح سہم گئے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر بولے۔ ''فکر نہ کرنا۔ ہماری قسمت میں اگر یوں ہی مرنا ہے تو یہی سہی۔''

دونوں کی نظریں سڑھیوں کے آخر میں بنے دروازے پر جمی ہوئی تھیں جس پر پڑنے والی چوٹیں دل ہلا رہی تھیں تبھی پروفیسر عثمان کو ایسا لگا جیسے ان کا سر چکرا رہا ہے پھر وہ بے ہوش ہوتے چلے گئے۔

☆======☆======☆

وہ دیکھ رہے تھے کہ اسد الکبیر اپنے خیمے میں بیٹھا ہے۔ یہ خیمہ پہاڑ کی چوٹی پر نصب ہے۔ پہاڑ کی ترائی میں ابھی تک حملہ آوروں کی باقیات پڑی ہیں۔ نانگار کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہیں۔ تاشی نے اسے بھی واپس چلنے کو کہا تھا مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک دو روز بعد وہ نیچے اترے گا۔ اس کے ساتھ علاقے کی چوکیداری کرنے والے جوان بھی تھے جو آس پاس بنے چھوٹے بڑے جھونپڑوں میں رہ رہے تھے۔

اسد الکبیر علم کیمیا پر ایک مشہور کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ کتاب اس کے استاد

جابر بن حیان کی لکھی ہوئی تھی۔ اس کتاب میں سورج کی شعاعوں پر بحث تھی۔ (یورپی سائنسدانوں نے تو بہت بعد میں شعاعوں کی افادیت دریافت کی تھی جبکہ جابر بن حیان نے ایک سو دس ہجری میں ہی یہ کتاب لکھ کر مسلمانوں کے علم کا سکہ بٹھا دیا تھا)

اسد اس کتاب میں پوری طرح کھویا ہوا تھا کہ خیمے کا پردہ ہٹا۔ سورج کی تیز روشنی اندر در آئی۔ اسد نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور حیرت زدہ رہ گیا۔

اسد کے سامنے زونو کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی پوٹلی تھی۔

''ارے تم! تم کیوں آ گئیں؟ کسی کو بھی بھیج دیتیں۔'' اسد نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

''جو مزہ اپنے ہاتھوں سے محبوب کو کھانا کھلانے میں ہے، وہ کھانا بھیجنے میں نہیں۔'' زونو نے شوخ انداز میں کہا۔

''خدا کے لیے مجھے معاف رکھو۔'' اسد نے اس روایت شکن لڑکی کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''میں اڑتا پنچھی ہوں۔ کبھی اس ڈال پر تو کبھی اس ڈال پر، کیوں میرا وقت کھوٹا کر رہی ہو۔''

''اچھا، میں وقت کھوٹا کر رہی ہوں؟ تو لو، وقت ''کھرا'' کر لو۔'' یہ کہہ کر اس نے ایسی حرکت کی جس کی اسد نے کبھی توقع بھی نہیں کی تھی۔ اس کا مرتعش وجود بکھرنے لگا۔ اس کی نس نس میں بجلی سی دوڑ گئی تھی۔ اس کے سینے میں وہ گوشت کا لوتھڑا جسے ''دل'' کہتے ہیں، اتنی زور سے دھڑکا تھا کہ اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ حلق میں آ گیا ہو۔ اس کے گلے میں گرہیں پڑنے لگی تھیں۔ زونو نے دونوں ہاتھ اس کے گلے میں ڈال دیئے تھے۔

اسد کے چوڑے چکلے سینے میں سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ منجمد سا ہو کر زونو کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کی نظریں تو زونو کے چہرے پر چپک کر رہ گئی تھیں۔

''اے! کچھ بولو، یہ پتھر کی مورت کیوں بن گئے ہو؟''

اس آواز نے اسے سہارا دیا۔ اپنے ٹوٹتے بکھرتے وجود کو اس نے سنبھال لیا اور پھرتی سے کھڑا ہو گیا کہ کہیں اس کی قربت اسے پاگل نہ کر دے مگر اب بھی اس کی ٹانگیں کسی احساس سے کانپ رہی تھیں اور اسے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا دشوار سا معلوم ہو رہا تھا۔

''اے! یہ تمہیں تپ لرزاں کیوں ہو گیا ہے؟ حکیم صاحب کو خبر کروں یا خود

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"علاج" کی کوشش کروں؟" زونو نے کھلکھلاتی آواز میں کہا۔ وہ جس بات کو مذاق سمجھ رہی تھی، وہی بات اسد کے لیے صورِ اسرافیل تھی جس نے اس کے اندر اٹھتے ہوئے حشر کی قیامت خیزی کو بڑھا دیا تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"یہ تم اپنا سر کیوں پکڑے ہوئے ہو؟ کیا سر میں درد ہے؟" وہ ہنس کر بولی۔

"تم...... تم خدا کے لیے چلی جاؤ۔ میں...... میں مرد ہوں۔ اکیلے میں عورت اور مرد جب اکٹھے ہوتے ہیں تو شیطان خود بخود کھنچ آتا ہے۔" اسد نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ اس کی زندگی میں پہلا اتفاق تھا کہ گوشہ تنہائی میں ایک لڑکی بہکتی اداؤں کے ساتھ بہار کے بھولے بھٹکے جھونکے کی طرح چلی آئی تھی۔ ان بہکتی اداؤں نے اسے بھی بہکانا شروع کر دیا تھا۔

"نہیں! میں آج اقرار لے کر ہی جاؤں گی۔" زونو نے اپنا ہاتھ پھر سے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اسد نے اس کی خوبصورت کلائی تھام لی۔ یہ لمس اسے رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ زونو میں غضب کی کشش ہے۔ اس کی بغیر کاجل آنکھیں متجسس اور بے چین ہیں۔ گھنی پلکوں کے پپوٹے اس کے دل کی طرح دھڑک رہے ہیں۔ لبوں کا گلابی پن اس قدر گہرا ہے کہ انؔ پر دنداسے کا گمان ہو رہا تھا۔ اس کے لب گلاب کی پنکھڑیاں لگ رہے تھے۔ رخسار سیب کی سی سرخی لیے ہوئے تھے۔ سر پر سیاہ بال بڑی نفاست سے جمے ہوئے تھے۔ اسد کے دل کے کسی کونے میں نہ جانے کیوں یہ عجب سی خواہش سرسرا اٹھی کہ اس لڑکی سے اسے محبت کرنا چاہیے۔

"تم...... تم چلی جاؤ" اس نے دل کی بغاوت کو فرو کر کے التجائیہ انداز میں لڑکی سے کہا کیونکہ اسے حالات کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ تصور کے آئینے میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی محبت کا راز عیاں ہو گیا ہے اور سب نے جان لیا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے پر مرتے ہیں۔ یہ خبر زونو کے باپ اور منگیتر تک پہنچ چکی ہے۔ تاشی کی زبان غصے میں شعلے اگلنے لگی ہے۔ منگیتر کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا ہے۔ اس نے کمر سے بندھا ایک چمکتا ہوا تیز اور نوکیلا خنجر اٹھایا اور تاشی کے ساتھ اس کے کمرے میں گھس آیا ہے۔ تاشی نے اسے پیچھے سے جکڑ لیا ہے۔ اس کے منگیتر کا چہرہ کسی درندے کی طرح نظر آنے لگا ہے اور اس نے وہ خنجر بڑی بے رحمی سے اسد کے سینے میں اتار دیا ہے۔

اس کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلتے نکلتے سینے میں گھٹ گئی۔ اس کا چہرہ ہی نہیں،

سارا بدن پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔

"واقعی تمہاری تو طبیعت بگڑ رہی ہے۔" زونو نے کہا۔

"اگر تم نہیں گئیں تو واقعی میری طبیعت بگڑ جائے گی۔" اسد کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر زونو کھڑی ہو گئی۔

زونو کے جانے کے بعد بھی اسد الکبیر سوچ میں گم رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے کیونکہ اس کے دل میں ایک نئی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہی اسد الکبیر جو عورتوں کے نام سے بدکتا تھا، اس شہر سے بھاگ رہا تھا۔ بغداد کی سیاست نے اس سے وطن چھینا تھا اور خود اس نے اپنے آپ پر چھت حرام کر لی تھی۔ کہیں بھی ٹک کر بیٹھتا نہیں تھا مگر اب...... اب اس لڑکی نے اس کی سوچ بدل دی تھی۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ پیٹ کی بھوک کے علاوہ بھی ضروریات ہیں۔ ان میں سب سے بڑی ضرورت "اپنا خاندان" ہے۔ اب وہ اپنا خاندان بسانے پر غور کر رہا تھا لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ تاشی یہاں کا حاکم تھا اور زونو اس کی اکلوتی بیٹی! وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ کبھی بھی کسی غریب الدیار شخص کے ہاتھ میں دینا گوارہ نہیں کرے گا پھر زونو کی شادی طے تھی۔ اس کا منگیتر کبھی بھی اسے چھوڑنے پر راضی نہ ہوتا۔

اس کانٹوں بھری راہ کا سفر وہ کیسے طے کرے، یہ مسئلہ اسے جکڑے ہوئے تھا۔ اس کا ذہن ماؤف تھا۔ عقل کند ہو چکی تھی۔ ایسے میں وہ اس مسئلے کا حل کیسے ڈھونڈتا؟ اس لیے الجھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ جب اسے کوئی راہ سجھائی نہ دی تو وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

☆======☆======☆

پروفیسر عثمان کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے تہہ خانے میں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اپنے ہم شکل اسد الکبیر کو اس نے خواب میں دیکھا ضرور تھا مگر کوئی حل وہ بھی بتا نہیں سکا تھا۔ اس کا مسئلہ جوں کا توں تھا۔ ایک گمبھیر مسئلہ اور بھی تھا۔ دروازے پر لگا تار چوٹ پڑ رہی تھی۔ اندر کی طرف لگی ہوئی چٹخنی کمزور تھی۔ پے در پے پڑنے والی چوٹ نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اب تب میں وہ اکھڑنے والی تھی۔ پروفیسر عثمان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ دشمن نے اوپر موجود تمام افراد پر قابو پا لیا ہے اور اب وہ اندر داخل ہو کر انہیں ختم کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا خطرہ تھا جس سے رہائی کا کوئی راستہ نہ تھا کیونکہ تہہ خانے میں آنے اور جانے کا فقط ایک ہی راستہ تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟" پروفیسر نے گویا خود سے سوال کیا۔

"انگریز ہیں اس لیے ان پر شک کیا جا سکتا ہے کہ یہ "موساد" کے ایجنٹ ہوں گے یا پھر مافیا کے کیونکہ عام طور پر مافیا ٹھیکے پر کام کرتی ہے۔" غلام رسول نے جواب دیا۔

"یعنی کہ دونوں صورتوں میں نقصان ہمارا ہے۔" پروفیسر نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ وہ حد سے زیادہ مایوس ہو چکے تھے۔

"آپ بیڈ کے نیچے چلے جائیں میں اوپر رہوں گا۔ دشمن مجھے قابو کر کے خوش ہو جائے گا۔" غلام رسول نے آخری راستہ بتایا۔ وہ بھی مایوس ہو چکا تھا اور تم سے آپ پر آ گیا تھا۔

"نہیں میں اپنی جان بچانے کے لیے تمہاری قربانی نہیں دے سکتا۔ بچپن سے ہم ساتھ رہے ہیں اور ساتھ ہی مریں گے۔" پروفیسر عثمان نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"وقت بہت کم ہے۔ کسی بھی وقت اندر والی کنڈی اکھڑ سکتی ہے۔ میرا کیا ہے، میں جاہل مطلق آدمی! قوم کو آپ کی ضرورت ہے۔ بنی نوع انسان کے لیے آپ جیسے لوگ بہت قیمتی ہیں۔ میری فکر چھوڑیں اور بیڈ کے نیچے چلے جائیں۔ اوپر رہیں گے تو دونوں مارے جائیں گے۔ اس طرح کم سے کم ایک آدمی تو بچ جائے گا۔"

"اس کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ بیڈ کے نیچے نہیں جھانکیں گے؟"

"ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے، یہ کوشش بار آور ثابت ہو۔" کہہ کر غلام رسول نے پروفیسر عثمان کو دھکا دیا اور وہ پھسلتے ہوئے جا کر بیڈ سے ٹکرائے۔

"ہری اپ! جلدی نیچے گھس جائیں۔" غلام رسول نے کہا تو پروفیسر عثمان نیچے جا کر لیٹ گئے۔ اسی وقت دروازے کی کنڈی ٹوٹی اور کواڑ پاٹوں پاٹ کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے کے باہر جو شکلیں نظر آئیں، انہیں دیکھ کر غلام رسول کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے "دشمن" نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "صاحب جی! آپ دروازہ کیوں نہیں کھول رہے تھے؟"

"بے وقوف آدمی! تمہیں پکارنا چاہیے تھا لیکن تم نے دروازے پر لات مارنا شروع کر دی تھی۔" غلام رسول کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

"صاحب جی! مس صاحبہ نے ایک نہیں، کئی بار پکارا لیکن جواب نہیں ملا تو انہوں نے کہا کہ دروازہ توڑ دو یقیناً اندر کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔" باورچی اختر علی نے کہا۔ اس

ساتھ چوکیدار بھی کھڑا ہانپ رہا تھا۔ شاید اسی نے لات مار مار کر دروازہ کھولا تھا۔ ان کی آوازیں پہچان کر پروفیسر بیڈ کے نیچے سے نکل آئے تھے۔ ان کی پیشانی پر گومڑ ابھرا ہوا تھا۔ غلام رسول نے انہیں دھکا دیا تھا شاید یہ چوٹ اسی وقت لگی تھی۔ وہ بھی جھلائے ہوئے تھے کیونکہ اس دوران میں انہوں نے سخت ذہنی کوفت جھیلی تھی۔

وہ سب ایک دوسرے کے پیچھے اوپر آئے۔ اوپر پہنچ کر اختر علی سے پوچھا۔ "تمہیں تہہ خانے کا راستہ کس نے بتایا؟"

"مس صاحبہ نے۔"

پروفیسر عثمان نے کیتھی کی جانب مڑ کر پوچھا۔ "اور تمہیں؟"

"جب باہر شور شرابا ہو رہا تھا اور کتے بھونک رہے تھے تو میں اپنے کمرے سے نکل آئی تھی اور اس وقت آپ لوگ نیچے اتر رہے تھے اس لیے میں نے اس خفیہ راستے کو دیکھ لیا۔"

کیتھی کا جواب سن کر غلام رسول نے پروفیسر کی طرف دیکھا۔ پروفیسر کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ شاید وہ بھی کیتھی کے جواب سے مطمئن نہیں تھے۔ انہیں بھی شک ہو گیا تھا کہ کیتھی ان کی جاسوسی کر رہی ہے۔ غلام رسول کو تو وہ یوں بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس کی وجہ وہ نفرت تھی جو ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ کیتھی یہودی تھی اور وہ مسلمان! پھر کیسے یہودیوں کی چالبازی، ان کے ظلم، فلسطین میں رونما واقعات کو وہ بھول جاتا؟ لبنان میں ان یہودیوں نے جو ظلم و بربریت پھیلائی تھی، اسے وہ کیسے بھول جاتا؟ یہ تو "حزب اللہ" کے جانبازوں کا کارنامہ تھا جس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ یہودیوں کو ان کی اوقات بتا دی تھی اور بری طرح بے عزت کر کے اپنے علاقے سے نکال باہر کیا تھا۔ یاسر عرفات کی طرح حسن نصر اللہ نے گھٹنے نہیں ٹیکے تھے بلکہ ہر ظلم کا بھرپور جواب دیا تھا اور لاتوں کے بھوتوں کو لاتوں سے سمجھایا تھا جس کی وجہ سے یہودیوں میں کھلبلی مچ گئی تھی اور وہ مسلمانوں کی اس بہادری پر بری طرح خوفزدہ ہو گئے تھے۔ تل ابیب اور واشنگٹن میں لگاتار میٹنگیں ہو رہی تھیں کہ مسلمانوں کے جذبۂ جہاد پر قدغن لگائی جائے۔ کسی بھی چھوٹے سے واقعے کو بہانہ بنا کر دنیا بھر کی تمام مسلم تنظیموں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جائے۔ یہ خبر انہیں بھی تھی پھر غلام رسول بھی "حزب اللہ" کے قائد حسن نصر اللہ کے خیال سے متفق تھا کہ یہودی پر کبھی اعتبار نہ کرو پھر وہ کیتھی پر کیسے اعتبار کر لیتا؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پروفیسر عثمان نے بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں لوٹ آئے تھے۔ ان کے ساتھ غلام رسول بھی وہاں سے ہٹ گیا تھا۔

غلام رسول اپنے کمرے میں آ کر لیٹا ہی تھا کہ اسے اس شور کا خیال آ گیا۔ کتے کس پر بھونکے تھے؟ وہ کون تھا جس کی وجہ سے یہ افراتفری پھیلی تھی؟ ان سب باتوں نے اسے گھنٹی بجانے پر مجبور کر دیا۔

''جی صاحب!'' اختر علی گھنٹی کی آواز سن کر آ گیا۔

''کتے کیوں بھونکے تھے؟''

''پتا نہیں، کیا بات تھی؟ ان کتوں میں سے ایک نے گلاب کی کیاری کو پوری طرح اجاڑ دیا۔ اسے بھونکتے دیکھ کر باقی کتے بھی بھونکنے لگے تھے۔''

''کیاری میں کوئی گلہری یا چوہا ہو گا؟''

''جی نہیں! وہاں سے ایک گولی ملی ہے جسے اس کتے نے ڈھونڈا تھا۔ اسے ہی تلاش کرنے میں اس کتے نے پنجے مار مار کر کیاری کا ستیاناس کیا ہے۔''

''وہ گولی وہاں آئی کیسے؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ یہاں کئی آدمیوں کے پاس کلاشنکوف ہے۔ ریوالور بھی ہے مگر وہ گولی چھوٹے پستول کی ہے جسے یہاں رکھنا کسرِ شان سمجھا جاتا ہے۔ ایسے پستول کی گولی کیسے وہاں پہنچی، اسی بات پر ہم سب حیران ہیں۔''

کہیں کیتھی کے پاس تو پستول نہیں ہے؟ عورتیں عام طور سے چھوٹے پستول رکھنا پسند کرتی ہیں۔ غلام رسول نے سوچا، پھر خود ہی تردید کر دی کہ وہ کتا کیتھی کو پہچانتا ہے۔ گولی میں بھی اس کی بو شامل ہو گی پھر اس پر کیسے بھونکے گا؟

وہاں کس نے وہ گولی پھینکی ہو گی، غلام رسول اسی بات پر غور کرنے لگا۔ تبھی چوکیدار نے اختر علی کو باہر سے آواز دی۔ اس کی پکار پر اختر علی چلا گیا لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ پھر لوٹ آیا۔ اس بار اس کے ساتھ دو آدمی بھی تھے۔ وہ دونوں ہی مقامی لباس میں ملبوس تھے۔ انہوں نے اندر آتے ہی سلام کیا۔

سلام کا جواب دے کر غلام رسول نے پوچھا۔ ''کہیے، کیسے آنا ہوا؟''

''جی! ہم لوگ کارگل سے آئے ہیں۔ اس علاقے سے جس پر بھارتیوں نے قبضہ جما رکھا ہے۔ میرا نام حسن ہے اور اس کا نام عابد! ہم دونوں اپنے سردار کا پیغام لے کر آئے ہیں۔'' ان میں سے ایک جس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سفید داڑھی تھی، وہ بولا۔

''لائیے، وہ پیغام کیا ہے؟'' غلام رسول نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

''جی...... یہ خط ہم صرف انہیں دیں گے جو جناب اسد الکبیر کا دوسرا جنم ہیں۔ اسد الکبیر کا نیا روپ ہیں۔ جنہوں نے ہمیں مشکلات سے نکالنے کے لیے پھر سے جنم لیا ہے۔'' حسن نے جواب دیا۔

''میرے بھائی! ہم سب مسلمان ہیں۔ ان جاہلانہ باتوں پر یقین رکھنا بھی کفر ہے۔ انسان صرف ایک بار پیدا ہوتا ہے اور جب مرتا ہے تو اسے برزخ میں بھیج دیا جاتا ہے پھر وہ قیامت کے روز ہی اٹھے گا۔ دوسرے جنم کی بات صرف اس لیے گھڑی گئی کہ لوگ اچھے کام کرتے رہیں۔ انہیں ڈرانے کے لیے یہ جملہ گھڑا گیا کہ اگر برے کام کریں گے تو اگلے جنم میں گندا جانور بنا دیا جائے گا۔''

''مگر جناب! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی تو کہا گیا ہے کہ وہ پھر سے جنم لیں گے۔''

''اسے دوسرا جنم نہیں کہا جا سکتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ اٹھا لیا گیا ہے۔ جب ان کی ضرورت پڑے گی تو اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ بھیج دیں گے۔''

''بھائی صاحب! ہمارے پڑوسی گاؤں میں بھی ایک ایسا بچہ ہے جو پہلے جنم کی بات کرتا ہے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔'' عابد نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

''اس کا راز کیا ہے، میں جانتا ہوں مگر اسے بیان کرنے میں کافی وقت خرچ ہو جائے گا اس لیے کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ آپ لوگ میرے ساتھ آئیں۔'' یہ کہہ کر غلام رسول ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑا۔ وہ دونوں بھی اس کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ پروفیسر عثمان کو بلانے چلا گیا۔

اکیلے کمرے میں بیٹھے وہ دونوں کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

''کہیں ہم غلط اطلاع پر تو نہیں آ گئے؟'' حسن نے عابد کو مخاطب کیا۔

''نہیں اطلاع صحیح ہے۔ ہم بالکل صحیح جگہ پر آئے ہیں۔'' عابد نے سر ہلا کر کہا اور کمر میں اڑسے ہوئے فوجی ریوالور کو نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''پروفیسر عثمان کی آمد غیر متوقع ضرور ہے مگر......''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ پروفیسر عثمان اور غلام رسول کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جناب! ہم اپنے سردار کا خصوصی پیغام لے کر آئے ہیں۔" کہہ کر حسن نے اپنے موزے میں ہاتھ ڈال کر ایک تہہ کیا ہوا خط نکالا اور اسے پروفیسر کی جانب بڑھا دیا۔

پروفیسر نے کاغذ کی تہہ کھول کر خط پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ خط پڑھتے جا رہے تھے ان کے چہرے کی رنگت بدلتی جا رہی تھی۔

خط پڑھ کر پروفیسر نہ صرف چونک پڑے تھے بلکہ ان کی آنکھیں بھی پھیل گئی تھیں۔ یہی حالت ان دونوں نوواردوں کی تھی۔ ان کی آنکھیں بھی حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں۔ انہوں نے مؤدب لہجے میں کہا۔ "اب ہمیں سو فیصد یقین آ گیا ہے کہ ہمارے مصائب کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ ہم بہت جلد ان زنجیروں کو توڑ دیں گے جو مہاراجا رنجیت سنگھ نے ہمارے پیروں میں ڈالی ہیں۔"

"آپ لوگ ہم سے کس قسم کی مدد کے خواہاں ہیں؟" خط کو تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے پروفیسر عثمان دھیرے سے بولے۔ ایسے جیسے وہ خواب میں بول رہے ہوں۔

"آپ کی آمد کے بارے میں ہمیں خبر دی گئی، ہم اسی بات کی تحقیق کے لیے آئے ہیں۔" ان میں سے ایک بولا۔

"کس قسم کی تحقیق؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"دنیا کی نظروں میں یہ علاقہ اور قصبے کا علاقہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ درمیان میں کنٹرول لائن ہے۔ ہم پر ہندوؤں کی حکومت مسلط ہے جبکہ یہاں والے آزاد ہیں۔ ہم آزاد اور محکوم ضرور ہیں مگر ایک دوسرے کے غم و خوشی میں برابر شریک رہتے ہیں۔ آپس میں شادی بیاہ بھی کرتے ہیں۔ یعنی دو ہوتے ہوئے بھی ہم ایک ہیں کیونکہ ہمارا ماضی ایک ہے۔ خاندان ایک ہے۔ اسی لیے درمیانی لائن کو ہم نہیں مانتے۔" وہی شخص جوشیلے لہجے میں بولا۔

"یہ سب تو آپ لوگوں کے درمیان کی بات ہے۔ مجھے دیکھنے کیوں آئے، لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں۔" پروفیسر بولے۔

"ہمارے ہاں یہ روایت سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہی ہے کہ ہمارے نجات دہندہ اسد الکبیر بار بار آئیں گے، جب جب کوئی ہمیں ستائے گا ہمیں اس ظالم کے ظلم سے نجات دلانے کے لیے اسد الکبیر پھر نیا جنم لے کر آئیں گے۔ ہندو غاصبوں کا ظلم پھر سے بڑھ گیا ہے اسی لیے ہم سب منتظر تھے کہ آپ آ گئے۔ آپ کی آمد کی خبر ہمیں حسین مدد شاہ

نے بھیج دی۔ ہمارے ہاں کے مولوی صاحب نے تحقیق کے لیے ہمیں بھیجا ہے۔"

"اب آپ جا کر کیا بتائیں گے؟"

"یہی کہ اسد الکبیر ہمیں آزادی دلانے کے لیے آ گئے ہیں؟"

"لیکن بھائی! ہم نہ تو جنگجو ہیں اور نہ جنگ کا کوئی تجربہ رکھتے ہیں۔ آدھی صدی ہونے والی ہے اور یہ مسئلہ جوں کا توں ہے پھر ہم کیسے سب کچھ ٹھیک کریں گے؟" غلام رسول نے آگے بڑھ کر کہا۔

"یہ ہم پہ چھوڑ دیں، فی الحال تو ہم جا رہے ہیں۔ کل یا پرسوں وہاں سے کوئی آئے گا، آپ اس کے ساتھ جا کر ہمارے علاقے کا دورہ کر لیں تاکہ ہمارے لوگوں کا حوصلہ بڑھ جائے۔" یہ کہہ کر وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

☆======☆======☆

پروفیسر عثمان نے علی مدد شاہ کے گھر کا کئی مرتبہ چکر لگایا تھا مگر وہ انہیں نہ ملا۔ اس کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کے ہاں "نگر ہو پر" گیا ہوا ہے۔ دراصل پروفیسر عثمان اس بچے کا D.N.A ٹیسٹ کرنا چاہتے تھے تاکہ معلوم کر سکیں کہ اس میں یہ غیر معمولی حس کیسے پیدا ہو گئی۔ اس بچے کی حقیقت کیا ہے۔ وہ اتنے فراٹے سے انگلش کیسے بولتا ہے؟

ادھر پروفیسر بچے کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اور ادھر غلام رسول اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بلتستان آ کر اس نے غلطی کی ہے۔ اب ایک ہی راستہ ہے کہ کسی طرح اس علاقے سے نکل جایا جائے۔ کیونکہ یہاں رہ کر تحقیق کو آگے بڑھانا ناممکن ہے۔ مقامی لوگ خواہ مخواہ ہمیں اپنے پھڈے میں کھینچ رہے ہیں۔ لڑنا بھڑنا فوجیوں کا کام ہے، ہمارا کام تو انسانیت کی بقاء کی راہ ڈھونڈنا ہے۔ انسانی زندگی پر تحقیق کرنا ہے۔ ابھی تو D.N.A کے Code میں کئی ایسے کیمیائی اشارے باقی ہیں جنہیں پڑھا نہیں جا سکا۔ D.N.A یہ تو بتاتا ہے یعنی اس میں تحریر ہے کہ چہرے پر پیشانی سے کچھ نیچے دو طرف مخصوص حصوں میں اتنے سائز کی دو آنکھیں ہوں گی، درمیان میں کچھ نیچے اتنے فاصلے پر اتنے ملی میٹر کی ناک ہو گی، اتنے ملی میٹر کے ہونٹ اور ایسا دہانہ ہو گا، اتنی لمبی زبان، اتنے اور اس سائز کے اس کیمیکل کے دانت ہوں گے، حلق کا ڈیزائن ایسا ہو گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب تو ڈی کوڈ ہو چکا ہے مگر ابھی یہ پتا نہیں چل سکا ہے کہ ایک ہی Cell دانت میں جو کیمیکل استعمال کرتا ہے وہ ناک بنانے میں استعمال کیوں نہیں کرتا؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان باتوں پر تحقیق کرنا باقی ہے۔ اسی لیے یہاں کے پھڈے میں ٹانگیں اڑانا درست نہیں واپس امریکہ چلے چلتے ہیں۔

پروفیسر عثمان پھر اس پیڑ کے نیچے کھنچ آئے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بند آنکھوں سے رہے تھے کہ ایک پہاڑی پر خیمہ نصب ہے۔ اس خیمے میں بچھے قالین پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اسد الکبیر بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے زونو بیٹھی ہے۔ وہ دو زانو ہے۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ وہ اس کے داہنے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی ہے۔ ''اسد الکبیر! میں کیا کروں کہ دل ہاتھوں سے نکل چکا ہے جس سینے میں یہ دل دھڑکتا ہے وہ سینہ تو میرا ہے مگر دھڑکن پر نام تمہارا ہے۔ میں تمہیں بھلا نہیں سکتی۔ تم میری رگِ جاں میں اتر گئے ہو، تمہاری چاہت میرے خون کے ہر قطرے میں رچ بس گئی ہے۔ میں کتنی ہی کوشش کر لوں مگر تمہارے بغیر جی نہیں سکتی۔''

''زونو! جذبات سے کام نہ لو، عقل سے سوچو۔ اس محبت کا انجام کیا ہوگا؟ یہی فکر مجھے کھائے جا رہی ہے اسی لیے میں نے سوچا ہے......'' اسد نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کیا سوچا ہے؟''

''یہی کہ میں اب کسی اور طرف نکل جاؤں۔''

''نہیں ایسا نہ کہو'' زونو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ اس کی رنگت زرد پڑ گئی تھی اور پورا وجود تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ شاید وہ اس جملے کی تاب نہ لا سکی تھی۔ وہ رندھے گلے سے بولی تھی۔ ''جانتے ہو اسد! عورت کی زندگی میں محبت کا کیا مقام ہے؟ یہ تین حرفی لفظ اس کی اجڑی ہوئی دنیا میں بہار لے آتا ہے۔ وہ قربان ہو کر اس لفظ کی قیمت ادا کرتی ہے۔''

''میں خود کب انکاری ہوں۔ اس دن کی غلطی پر اب تک پشیمان ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اب میں چاہوں بھی تو تم سے الگ ہو کر جی نہیں سکتا مگر......''

''مگر کیا؟'' زونو نے آنسوؤں کو ہتھیلی سے پونچھا۔

''مگر تم کسی اور کی امانت ہو۔ تمہاری نسبت طے ہے۔ تمہارا منگیتر ایک بہادر سپاہی ہے پھر وہ تمہیں دل و جان سے چاہتا بھی ہے۔''

''مگر میں تو اسے نہیں چاہتی۔'' زونو کی آواز بتا رہی تھی کہ اسد کے اس چھوٹے سے جملے نے اس کے زخمی دل کو تیز نشتر بن کر ادھیڑ دیا ہے۔ وہ اندر ہی اندر لہو لہو ہو رہی

ہے اور زخمی دل سے رسنے والا لہو اس کے کلیجے پر گر گر کر ناسور بنا رہا ہے۔ اس کا وجود مر رہا ہے، دل مر رہا ہے، وہ بے حس ہو رہی ہے۔

اسد نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا پھر دھیرے سے بولا۔ ''تمہارے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔''

''مجھے اپنے عشق کی سچائی پر فخر ہے۔ اس کی قوت پر یقین ہے، شاید تمہیں احساس نہیں عشق رنگ ہے، آہنگ ہے، لحن ہے، سوز ہے، قوت ہے، توانائی ہے، گرمی ہے، آگ ہے یہ آگ ہر رسم و رواج کو جلا دیتی ہے۔''

''عشق بہت کچھ ہے مگر کچی مٹی کا کوزہ ہے۔ ایسا کوزہ جو ایک وار، ایک بوچھار نہیں سہہ پاتا، ٹوٹ جاتا ہے، چٹخ جاتا ہے۔ حالات کی نزاکت یہی کہہ رہی ہے کہ تم مجھ سے دور ہٹ جاؤ ورنہ تمہارا دل ٹوٹ جائے گا۔''

''یاد رکھو! دل ٹوٹ جائے تو نگاہوں میں حسن آ جاتا ہے، انگلیاں محتاط ہو جاتی ہیں، ہونٹ ہوشیار ہو جاتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے زونو کے جھلملاتے دانت قطار باندھے ہونٹوں کے درمیان آ گئے۔

''زونو! تیرا بابا...... تیرا بابا ادھر ہی آ رہا ہے۔'' باہر سے ایک کھنکتی ہوئی آواز آئی اور زونو خیمے کے پچھلی طرف باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

صبح ہی صبح کارگل سے ایک نوجوان آیا تھا۔ اسے مولانا احمد علی نے بھیجا تھا۔ ساتھ میں ایک خط بھی تھا، وہ قصبہ کارگل کی واحد جامع مسجد کے پیش امام تھے۔ مجاہدین کو امداد پہنچانا، لوگوں میں جذبہ آزادی کی آگ کو تیز کرنا اور بھارتی درندوں کا منہ توڑ جواب دینا ہی ان کا مقصد حیات تھا مگر وہ یہ کام نہایت ہوشیاری سے کرتے تھے تاکہ غاصب حکومت کے ٹاؤٹ کی نظروں میں نہ آ سکیں۔ انہیں نگار سے خبر ملی تھی کہ اس علاقے کے لوگ جس شخص کی آمد کے منتظر ہیں، جو آ کر ان کی قسمت بدلے گا۔ یعنی سینہ بہ سینہ چلنے والی روایت کا ہیرو اسد الکبیر! وہ آ گیا ہے۔ بس انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچ لیا۔ انہیں یقین تھا کہ اگر وہ ایک اشارہ کر دے تو پورے علاقے کے لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اسی لیے انہوں نے خط لکھ کر پروفیسر کو بلایا تھا اور اب پروفیسر، سید علی نامی اس نوجوان کے ساتھ وہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

وہ گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ عین اسی وقت ان کے ذہن میں اس لڑکی کی تصویر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

منعکس ہوئی جس کے دانت بات بے بات قطار باندھے ہونٹوں کے درمیان آ جاتے تھے۔ وہ اس کے ہونٹوں کے گلابی پن کو یاد کرتے ہوئے زیرِ لب بولے۔ ''دنو!''

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' سید علی نے پوچھا۔

''جی ہاں! پوچھ رہا تھا کہ یہاں سے بارڈر کتنی دور ہے؟'' غلام رسول نے سرگوشی سن لی تھی اسی لیے وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے بولا۔

''وہ بارڈر نہیں ہے۔'' سید علی تقریباً چیخ اٹھا۔ ''وہ ظلم کی لکیر ہے، ناانصافی کی ریکھا ہے، ایک ایسا آگ کا دریا ہے جس نے ہمیں بانٹ دیا ہے۔''

سید علی کا چہرہ جذبات کی حدت سے سرخ پڑ گیا تھا۔ کہیں بات بگڑ نہ جائے اس خیال سے پروفیسر نے کہا۔ ''تم غلط سمجھ رہے ہو، ان کا بھی یہی کہنا ہے۔ الفاظ پر مت جاؤ جذبات پر غور کرو۔''

''چلیے!'' سید علی نے سپاٹ لہجے میں کہا، شاید اس کا دل ابھی تک صاف نہیں ہوا تھا، کدورت کی گرد باقی تھی۔ غصے کا ابال کم ہوا تھا ختم نہیں ہوا تھا۔

پروفیسر عثمان، علی کو لے کر باہر آ گئے۔ باہر پورچ میں لینڈ کروزر کھڑی تھی مگر اس پر نمبر پلیٹ نہیں تھی۔ پروفیسر نے لینڈ کروزر کے نزدیک پہنچ کر جائزہ لیا۔ گاڑی بالکل نئی تھی۔ اوبڑ کھابڑ، اونچے نیچے راستوں پر سفر کے لیے نہایت موزوں تھی۔

- ''شاید آپ اسے جاپانی لینڈ کروزر سمجھ رہے ہیں؟'' سید علی نے ہنس کر کہا۔

''ہاں!'' غلام رسول نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

''نہیں، یہ ہندوستانی فورڈ ہے۔ باڈی میں ہلکی سی تبدیلی کی ہے۔'' کہہ کر علی اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ اس کے برابر میں پروفیسر بیٹھے۔ غلام رسول نے ہاتھ ہلا کر الوداع کیا اور گاڑی بھاگنے لگی۔ اس کا رخ کنٹرول لائن کی طرف تھا۔ جگہ جگہ گولہ باری کے نشانات تھے۔ ادھ جلے پیڑ جھلسی ہوئی چٹانیں اور گرے ہوئے مکان خاموش زبان سے ظلمِ ناروا کی کہانی سنا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ ''دیکھو! دیکھو! اونچے مکانوں کے نرم بستروں پر سونے والو، ہم پاک سرزمین کا حصہ ہیں، پھر بھی ظلم کا شکار ہیں۔ وہ ہمارا جینا عذاب کیے جائیں اور تم ان کے چینلز پر وقت برباد کرتے رہو۔ رقص و سرور میں ڈوبے رہو، تمہیں کب ہوش آئے گا۔ تم تو طارق بن زیاد بن کر آگے بڑھنے والے تھے، پھر تم میں میر جعفر و میر صادق کی روح کیسے گھس آئی؟ کب جاگو گے، کب ہمیں آزاد کراؤ گے؟''

پروفیسر عثمان جن کی زندگی مائکرواسکوپ سے بندھ کر رہ گئی تھی۔ تجربہ گاہ کے باہر کیا ہو رہا ہے، اس پر غور کرنے کی انہوں نے کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی مگر جب ان کی جیپ ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچی تو ان کا دل ہل کر رہ گیا۔ وہاں اپاہجوں کا بازار سا لگا ہوا تھا۔

''یہ وہ معصوم بچے ہیں جو بھارت کی ریاستی دہشت گردی کا شکار ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے اعضاء گولہ باری کھا گئی، کچھ بارودی سرنگوں کا شکار ہوئے اور کچھ کو ظالموں نے باپ، بھائیوں کو ڈرانے کے لیے عقوبت خانوں میں اس انجام تک پہنچایا۔'' سید علی کی آواز جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

ایسے مناظر دیکھ کر تو حیوان بھی چیخ اٹھے، پروفیسر عثمان تو پھر بھی انسان تھے۔ ان کے چوڑے سینے میں دھک دھک کرتا خون کا وہ لوتھڑا جسے دل کہتے ہیں، لہولہو ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''یہ تو نمونہ ہے، آگے دیکھئے گا، بھارت کے زیر تسلط علاقے میں ظلم کی اصل تصویر نظر آئے گی۔ تب اس نام نہاد جمہوری ملک کا اصل چہرہ نظر آئے گا۔'' سید علی نے غم آلود لہجے میں کہا۔

☆======☆======☆

اب وہ لوگ اس علاقے میں تھے جس پر غاصبانہ قبضہ تھا، احتیاط کی سخت ضرورت تھی۔ سید علی نے لینڈ کروزر احتیاط سے پہاڑی نالے میں اتار دی۔ شفاف نالے کی تہہ میں ابھی تک کنکریٹ کے ٹکڑوں کا فرش نظر آ رہا تھا۔ شاید کبھی یہ ایک مضبوط پُل رہا ہو گا جو اب ٹوٹ پھوٹ کر نالے کی تہہ میں بیٹھ چکا تھا۔ پانی میں لینڈ کروزر کا سائیلنسر کچھ ایسی آواز پیدا کر رہا تھا جیسے گلے کا مریض غرارے کر رہا ہو۔ سید علی دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ پانی سائیلنسر میں داخل نہ ہونے پائے ورنہ انجن بند ہونے کا خطرہ تھا۔

قصبہ قریب تھا، قصبے کے درمیان مسجد امیر المومنین شان سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ اس مسجد کا مینار نظر آنے لگا تھا۔ مینار دیکھ کر ان کے دل و دماغ پر ایک عجیب سا ہیجان طاری تھا۔

نالہ عبور کرنے کے بعد سامنے چڑھائی تھی۔ پگڈنڈی پر دونوں طرف کٹیلی جھاڑیاں تھیں جن کے نکیلے خنجر نما کانٹے تیز دھار چاقو سے کم نہ تھے۔ مٹی پر جانوروں کے پنجوں، کھروں کے لاتعداد نشان دکھائی دے رہے تھے۔ تھوڑی سی چڑھائی کے بعد ڈھلان آ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گئی۔ سید علی نے انجن نیوٹرل کر لیا۔

ڈھلان کے اختتام پر ایک موڑ تھا، سید علی نے موڑ کے قریب پہنچ کر بڑے اعتماد سے بریک لگاتے ہوئے موڑ کاٹنا چاہا تھا لیکن نالہ عبور کرتے ہوئے جیپ کے اندر پانی آ گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا جوتا بھی گیلا ہو گیا تھا۔ بریک پر سے اس کا پاؤں پھسل گیا اور توازن برقرار نہ رہنے کی وجہ سے لینڈ کروزر ایک چھوٹے سے کھڈ میں جا گری لیکن خوش قسمتی سے وہ الٹی نہیں، صرف ترچھی ہو گئی تھی۔ قریبی درخت پر بیٹھی چڑیوں نے پر پھڑپھڑائے، اڑنے کا ارادہ کیا مگر گھڑگھڑاہٹ کی آواز معدوم ہوتے ہی دوبارہ بیٹھ گئیں۔

سید علی گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ قریباً بتیس سال کا ایک میانہ قامت مگر مضبوط آدمی تھا۔ عرصہ آٹھ سال سے وہ حزب المومنین کا کمانڈر تھا۔ موت سے آنکھ مچولی کھیلنا اس کا شوق تھا۔ اس کے نام سے بھارتی درندے کانپ اٹھتے تھے۔ ابھی پچھلے دنوں جب حزب المومنین اور حرکت الانصار کے مجاہدین نے مشترکہ حملہ کیا تو اکیلے اس نے پورے سولہ ظالموں کو جہنم کا راستہ دکھایا تھا مگر اس وقت وہ قہر بن کر ٹوٹنے والا مجاہد، پروفیسر عثمان کے ساتھ بیٹھا معصوم، کھلنڈرا نوجوان لگ رہا تھا۔ وہ لینڈ کروزر سے اترا اور اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پروفیسر عثمان عمر کے اس حصے میں تھے جب محنت جان کا عذاب لگتی ہے مگر اس وقت وہ بھی اس کی مدد کر رہے تھے لیکن لینڈ کروزر کا زاویہ کچھ ایسا تھا کہ گاڑی کو سیدھا کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ سید علی نے پروفیسر عثمان سے کہا۔

''پچھلے حصے میں کلہاڑی ہے اسے نکال لیں۔''

پروفیسر نے ترپال ہٹا کر کلہاڑی ڈھونڈ لی اور لا کر اسے دی۔ اس نے قریبی درخت سے ایک مضبوط شاخ کاٹی اور لیور کے اصول پر عمل کرتے ہوئے گاڑی کو سیدھا کر لیا مگر خاصی دیر کی کوشش کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ کئی آدمیوں کے دھکا لگائے بغیر وہ گاڑی کھڈ سے نہیں نکال سکتے ہیں۔

''پروفیسر صاحب! آپ ایسا کریں کہ یہیں انتظار کریں، میں قصبے میں سے کسی کو لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے کپڑوں پر لگی مٹی کو جھاڑا اور سڑک پر چل پڑا۔ چار قدم چلنے کے بعد وہ رک گیا پھر مڑ کر بولا۔ ''نہیں۔ آپ کا یہاں رکنا مناسب نہیں ہے آپ میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو مولانا صاحب تک پہنچا دوں پھر آ کر گاڑی لے جاؤں گا۔''

پروفیسر عثمان اس کے ساتھ چل پڑے۔ اونچے نیچے راستے پر وہ ہانپتے ہوئے آگے

بڑھ رہے تھے، اس وقت وہ اپنے پسندیدہ لباس بلیک سوٹ وائٹ شرٹ میں نہیں تھے بلکہ انہوں نے مقامی لباس پہن رکھا تھا۔ بڑے سے فرغل میں وہ عجیب مضحکہ خیز لگ رہے تھے لیکن یہ ضروری بھی تھا تاکہ کوئی انہیں پہچان نہ سکے اس لیے ہی انہوں نے اس لباس کو پسند کیا تھا۔

''اگر اس وقت آپ کا کوئی دیرینہ شناسا مل جائے تو شاید وہ بھی آپ کو پہچان نہیں سکے گا۔'' سید علی نے چلتے چلتے کہا۔

''وہ تو مجھے پیدل چلتے دیکھ کر ہی حیرت سے مر جائے گا۔'' پروفیسر عثمان نے ہنس کر جواب دیا۔

''اچھا پروفیسر صاحب! یہ تو بتائیں ہمارا یہ علاقہ کیسا لگا؟''

''واقعی! جہانگیر بادشاہ نے سچ کہا ہے کہ اگر زمین پر کہیں جنت ہے تو یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے۔ یہ واقعی جنت نظیر دھرتی ہے جسے کفار کے ناپاک قدموں نے جہنم میں بدلنے کی بھرپور سازش کی ہے۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ انہیں گھڑگھڑاہٹ کی آواز سنائی دی اور وہ دونوں چونک گئے۔ یہ آواز قصبے کی طرف سے آ رہی تھی اور آہستہ آہستہ انہی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ دونوں پگڈنڈی چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گئے۔ تبھی انہیں دور سے ایک جیپ آتی نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی دونوں نے پہچان لیا کہ وہ انڈین ملٹری کی جیپ ہے۔

☆======☆======☆

''غلام رسول! پروفیسر صاحب نظر نہیں آ رہے ہیں، کیا کہیں گئے ہیں؟'' کیتھی نے غلام رسول کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! وہ ایک ضروری کام سے گلگت گئے ہیں، کل پرسوں تک لوٹ آئیں گے۔'' غلام رسول نے آس پاس بکھری ہوئی کتابوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''کیا پڑھ رہے ہو؟ وہی ستاروں کی اقسام، ان کی رفتار! ہیں نا؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''ہاں! کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کی صناعی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''یہ سب بکواس ہے، سچ صرف مائکرو اسکوپ سے نظر آتا ہے اس سے دیکھو کہ جاندار کا جنم کیسے ہوتا ہے۔ کیسے ایک Cell سے پچاس کروڑ سیل بنتے ہیں۔ خلیوں کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جادونگری کو دیکھو اسے سمجھو جو حقیقت ہے۔''

''اس کائنات کا ہر ذرہ اپنے آپ میں جادونگری ہے، جس پر تجربہ کرو گی وہی تمہیں عجوبہ لگے گا کیونکہ سب کا صانع وہی ایک ہے تبھی تو سورہ نساء آیت 82 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔''کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے کہ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت ہوتا۔''

''تمہاری یہی بات مجھے زہر لگتی ہے کہ کوئی بھی بات کرو اسے سیدھے لے جا کر قرآن پر ٹھہراؤ گے۔ مذہب کو درمیان میں لانا ضروری ہے کیا؟''

''بالکل ضروری نہیں مگر کیا کروں کہ قرآن وہ کتاب ہے جو درس شش جہات ہے، جس میں ہر وہ بات ہے جو ہم معلوم کرنا چاہیں۔ اس میں تاریخ بھی ہے اور جغرافیہ بھی، علم نباتات بھی ہے اور جمادات بھی، تخلیق انسانی کی حقیقت و فلسفہ بھی ہے اور حقوق انسانی کے اصول بھی، علم منطق و فلسفہ بھی ہے اور علم النفس بھی اور علم تعبیر رویا بھی۔ علم زراعت و مساحت بھی ہے اور علم خیاطت وحدادیت بھی۔ علم معانی و بیان بھی ہے اور علم بدیع وعروض بھی۔ علم باطن و علم تقدیر بھی ہے اور علم حساب و علم نجوم بھی۔ علم کیمیا بھی ہے اور علم قیافہ اور علم معمہ بھی۔ غرضیکہ تمام علوم اسی میں ہیں۔''

''چلو مان لیا کہ اس میں تاریخ ہے، پرانے دور کے بہ کثرت قصے ہیں۔ علم الاجسام ہے جیسا کہ تم نے Cell کے بارے میں بتایا تھا مگر Botney کہاں ہے؟''

''آنکھیں کھول کر پڑھو وہ بھی مل جائے گا۔ سورہ واحد کی تیسری آیت ''اللہ نے زمین پر ہر قسم کے پھلوں کے جوڑے بنائے'' یا سورہ ٹیسین کی آیت نمبر 36 ''پاک ہے وہ ذات جس نے زمین پر اگنے والی ہر چیز کے جوڑے بنائے اور خود ان لوگوں کے بھی اور ان چیزوں کے بھی جن کو یہ نہیں جانتے۔'' یا سورہ حجر آیت نمبر 22 ''ہم ہی بارور کرنے والی ہوائیں بھیجتے ہیں...... (مکمل آیت قرآن میں دیکھیں)'' آخر الذکر آیت کے معنی پر غور کرو۔ بادل اور بارش کو ہوائیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں کیونکہ وہ ہلکی ہیں، اس لیے لفظ اٹھانا عام نظروں میں صحیح نہیں ہے۔ اس لفظ کا صحیح مطلب ''شاید'' نباتات کے ماہرین بتا سکیں کیونکہ زرگل ان کی دریافت ہے۔ Botney کے مطابق درختوں اور پودوں کو باروری کے لیے زرگل کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بعض اوقات ہوا ہی کے ذریعے صحیح جگہ پر پہنچتا ہے۔ خوبانی، صنوبر، انار، سنترہ اور کپاس کی مثال زیادہ واضح ہے۔ جب زرگل تیار ہو جاتا ہے اور کلیاں کھل جاتی ہیں تو نر پھولوں کا زیرہ ہوا سے

اڑ کر خود بخود مادہ پھولوں کے بقچہ میں جا گرتا ہے، سمجھیں محترمہ! اسی لیے لفظ لے جانے کی بجائے اٹھانا استعمال ہوا ہے۔'' غلام رسول نے کیتھی کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''تم سے بحث کرنا صرف وقت کا زیاں ہے۔''

''یہ تمہارا خیال ہے جب کہ مجھ سے بحث کر کے تم اپنی تھیسس میں نیا موڑ دے سکتی ہو۔ تمہارا مقالہ دنیا بھر میں انفرادیت کا حامل بن جائے گا۔'' غلام رسول نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ باورچی اختر علی نے اندر آ کر کہا۔

''صاحب جی! باہر علی مددشاہ کی دادی آئی ہے۔''

''اوہ! ان سے کہو، ہم ابھی آ رہے ہیں۔''

''یہ اسی بچے کے بارے میں بتا رہا تھا ناں جو انگلش بولتا ہے جس کے D.N.A ٹیسٹ کی بات ہو رہی تھی؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''ہاں! چلو تم بھی اسے دیکھ لو۔''

''میں اسے ضرور دیکھوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ بھی غلام رسول کے ساتھ باہر آ گئی۔ باہر علی مددشاہ کی دادی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانیوں کے لرزتے سائے صاف محسوس ہو رہے تھے۔ رہ رہ کر اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے وہ بے چین نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں باہر آ کر اس کے سامنے کھڑے تھے مگر وہ ایک ٹک دروازے ہی کو دیکھے جا رہی تھی۔ غلام رسول نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر بھی وہ نہ چونکی۔ تب اس نے سیدھے سیدھے اسے مخاطب کیا۔

''کیا بات ہے اماں! ادھر کیا دیکھ رہی ہو؟''

غلام رسول کی آواز پر بڑی بی نے چونک کر اسے دیکھا، کچھ دیر تک خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''بیٹا! وہ...... وہ والے صاحب جی کہاں ہیں؟''

غلام رسول نے سمجھ لیا کہ وہ پروفیسر عثمان کے بارے میں پوچھ رہی ہے اور اسے نہیں معلوم ہے کہ انہیں اسی کے شوہر کے کہنے پر بلایا گیا ہے اس لیے اس نے سچ بتانے کی بجائے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ''وہ ایک ضروری کام سے گلگت گئے ہیں۔''

''کب تک آئیں گے؟''

''پانچ چھ دن لگیں گے۔ خیریت؟ ایسی کیا بات ہو گئی؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''وہ صاحب جی! علی مددشاہ زخمی ہو گیا۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''علی مدد شاہ زخمی ہو گیا؟ کیسے کب؟ جلدی چلیں۔'' غلام رسول نے کہا۔

''وہ جی...... وہی منحوس کھائی ہے ناں جہاں ہمارے خاندان کا ہر فرد گر کر اپنی ٹانگیں تڑوا لیتا ہے۔ وہ اسی کھڈ میں گر گیا تھا۔'' علی مدد شاہ کی دادی نے کہا۔

''مگر آپ نے تو اس دن کہا تھا کہ اس کھڈ میں صرف پختہ عمر کے لوگ گرتے ہیں؟'' غلام رسول حیرت بھری آواز میں بولا۔

''ہاں! آج تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ پہلی بار اس کھڈ میں کوئی بچہ گرا ہے۔'' علی مدد شاہ کی دادی باہر جانے کے لیے مڑ گئی۔ غلام رسول اور کیتھی اس کے ساتھ چل دیے۔

''پتا نہیں کیا ہونے والا ہے؟'' بڑی بی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ غلام رسول اور کیتھی کو اس کا ساتھ دینے کے لیے دوڑنے کی حد تک اپنی رفتار تیز رکھنا پڑ رہی تھی۔

چڑھائی اترائی پار کرتے ہوئے وہ دونوں بڑی بی کے ساتھ اس کے گھر پہنچے۔ ان کا شوہر برآمدے میں کرسی ڈالے نیم دراز تھا۔ غلام رسول کو دیکھتے ہی بولا۔ ''صاحب جی! کچھ کیجیے پتا نہیں کیا ہونے والا ہے۔ پہلے تو وہ منحوس کھائی صرف مردوں کی بلی لیتی تھی اب بچوں کی قربانی بھی لینے لگی۔ پتا نہیں اور کتنے اپاہج بڑھیں گے۔''

''بچہ کہاں ہے؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''اندر ہے۔'' پھر اس نے بڑی بی سے کہا۔ ''صاحب جی غیر نہیں ہیں۔ اندر لے جاؤ۔''

بڑی بی نے کیتھی کا ہاتھ پکڑا اور غلام رسول کو اندر چلنے کا اشارہ کیا پھر اندر کی طرف بڑھنے لگی۔

وہ ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ کمرے میں بڑی سی مسہری بچھی ہوئی تھی۔ اس چھپرکھٹ پر وہ بچہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا یا پھر بے ہوش تھا۔

کیتھی نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا پھر بولی۔ ''ارے اسے تو بخار ہے۔''

غلام رسول نے اس کے پیر کو ٹٹولا، ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی جسے سہارا دینے کے لیے لکڑی باندھ کر سیدھا رکھا گیا تھا۔ معائنے کے بعد اس نے بڑی بی سے کہا۔ ''بچے کو بھرپور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اسے حویلی میں لے جائیں۔''

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ہمارے بزرگ اس حویلی سے دور رہنے کی تلقین

کیا کرتے تھے۔ آپ اس کے دادا سے پوچھ لیں۔'' بڑی بی بولیں۔

''آپ ان اس سے ذکر کر دیں۔ انہیں قائل کرنا میری ذمے داری ہے۔''

بڑی بی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ غلام رسول اس بچے پر جھک گیا۔ ابھی وہ اس کا معائنہ کر ہی رہا تھا کہ دو شاخہ ڈال سے بنی بیساکھی کا سہارا لیے ہوئے وہ بوڑھا اندر آ گیا۔

''صاحب جی! وہ حویلی ہمارے لیے منحوس ہے۔ ہم ادھر جانے سے کتراتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں برسوں سے یہ ریت چلی آ رہی ہے کہ اس حویلی میں کوئی نہیں جاتا۔ آپ لوگوں کی وجہ سے میں نے کسی کو روکا نہیں تھا۔ شاید اسی وجہ سے یہ بچہ زخمی ہوا ہے۔''

''نہیں جناب! یہ سب وہم ہے۔ آپ فکر نہ کریں بچے کی ذمے داری مجھ پر ہے۔ میں اس کی حفاظت کروں گا۔'' غلام رسول بولا۔

''اگر ایسی بات ہے تو آپ بچے کو لے جا سکتے ہیں۔'' حسین مدد شاہ نے اجازت دے دی تھی۔

غلام رسول نے بچے کو گود میں اٹھا لیا تھا اور حویلی کی طرف چل پڑا تھا۔ حویلی میں ٹریٹمنٹ کا پورا سامان تھا۔ وہ ڈاکٹر نہیں تھا مگر کیتھی آدھی ڈاکٹر تھی یعنی اس نے ڈاکٹری کی باضابطہ پڑھائی نہیں پڑھی تھی لیکن اس کی لائن میڈیکل سائنس کی تھی۔ وہ Cell پر Resurch کر رہی تھی۔ اس لیے اسے دواؤں کے بارے میں پوری آگہی تھی۔ وہ بچے کو ٹریٹمنٹ دے سکتی تھی اسی بھروسے پر غلام رسول بچے کو حویلی میں لے آیا تھا۔

حویلی پہنچ کر کیتھی نے بچے کے پیر پر پلاسٹر چڑھایا پھر تھکن سے چور ہو کر صوفے پر ڈھے سی گئی۔

''جانتی ہو میں بچے کو کیوں لے کر آیا ہوں؟'' غلام رسول نے کہا۔

''کیوں؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''پروفیسر اس بچے کا D.N.A ٹیسٹ کرنا چاہتے تھے۔''

''تو اب تم یہ بھی کرو گے؟ ٹشو کو پہچانتے بھی ہو؟'' کیتھی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''یہ کام میں نہیں تم کرو گی D.N.A کو انلائسیز کرنے کی ذمے داری تمہاری ہے۔ پروفیسر کے آنے تک رپورٹ مکمل ہو گی تو انہیں آسانی رہے گی۔''

''ہاں! یہ ہوئی نا بات۔ میں اتنی باریک بینی سے انلائسیز کروں گی کہ کوئی نکتہ باقی نہیں رہے گا۔ بچے کا مزاج، خاندان کا رواج و مزاج، اس نے اتنی معلومات کہاں سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حاصل کی۔ اس کے باپ دادا کی دماغی سطح کیا تھی۔ یہ سب کچھ میں پتا کرلوں گی۔ بلکہ بھی رپورٹ میں لکھ دوں گی کہ اسے کون کون سی بیماریوں کا خطرہ ہے۔ شادی کے لیے کا کون سا حصہ مناسب ہے۔"

"ٹھیک ہے تم ٹشو ٹیسٹ کرو، میں اپنی دلچسپی کا سامان کرنے جارہا ہوں۔"

"جاؤ جاؤ خلا میں تیرتی پتھر کی چٹانوں کو دیکھو جنہیں تم اسرار سے بھرے ستارے کہتے ہو۔" کیتھی نے ہنس کر کہا اور نشتر اٹھا کر علی مدد شاہ کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

☆======☆======☆

غلام رسول نے رات کا آدھا پہر چھت پر گزار دیا تھا۔ حویلی میں آنے کے بعد کوئی پہلی رات نہ تھی جو اس نے چھت پر گزاری ہو۔ وہ ہر رات دو ڈھائی گھنٹے تک چھت پر نصب دوربین سے آنکھ ٹکائے گزارتا تھا لیکن آج اسے مشرقی افق سے ذرا اوپر ایک نیا ستارا نظر آیا تھا۔ اس ستارے کی روشنی اتنی مدہم تھی کہ وہ نظر انداز کر دیتا مگر جب اس نے فوکس میں لیا تو اچھل پڑا کیونکہ اس ستارے کی روشنی سبزی مائل تھی۔ چمکدار نیلی روشنیوں والے ستاروں کے جھرمٹ میں یہ سبزی مائل ستارا کون سا ہے، رفتار کیا ہے، گردش کا محور کہاں ہے۔ یہی کچھ وہ دیکھتا رہا تھا۔ اتنا وقت گزارنے کے بعد وہ اس کے بارے میں کچھ بھی جان نہ سکا تھا۔ ہر بار حساب غلط ہو رہا تھا اور تب اس نے ڈیجیٹل نوٹ بک میں "پُراسرار ستارا" لکھ کر کل کے لیے نوٹس تیار کر لیے تھے۔

کام بند کر کے نیچے آیا تب اسے احساس ہوا کہ وہ ہر روز سے زیادہ وقت گزار آیا ہے۔ اتنی دیر تک کام کرنے کا نتیجہ بھی جلد سامنے آ گیا۔ اسے بہت زیادہ تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر ڈھے سا گیا تھا۔

اتنی تھکن کے بعد تو آنکھیں بند ہو جانی چاہیے تھیں مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ آنکھیں ہنوز نیند کے خمار سے کوسوں دور تھیں۔ وہ بستر پر لیٹا اسی ستارے کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ اسے اندھیرے میں سونے کی عادت تھی۔ اس لیے اس نے لائٹ بھی بند کر رکھی تھی۔ اس پورے علاقے میں یہ واحد حویلی تھی جہاں بلب جلتے تھے کیونکہ آزادی کے پچاس سال بعد بھی یہاں تک بجلی نہیں پہنچی تھی۔ پروفیسر نے متبادل انتظام کیا تھا۔ انہوں نے دو طاقتور جنریٹر منگوا کر تہہ خانے میں لگوا دیے تھے۔ جنریٹر تہہ خانے میں تھا اس لیے اس کی آواز بھی باہر سنائی نہیں دیتی تھی حویلی میں بس ہلکی ہلکی گھر گھر گونجتی تھی۔ اس وقت بھی جنریٹر کی گھر گھر گونج رہی تھی۔ یہ شور سماعت پر گراں نہ تھا اس لیے غلام رسول آرام

سے لیٹا اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ تبھی وہ بری طرح چونک اٹھا۔ اسے اپنی بصارت پر شبہ ہوا۔ اس نے آنکھیں مل مل کر دیکھیں مگر وہ منظر نظر کا دھوکا نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھتا رہا۔

کمرے کی کھڑکی آدھی کھلی تھی۔ اس ادھ کھلی کھڑکی سے چاندنی لمبی لکیر کی صورت میں اندر آ رہی تھی۔ وہ لکیر ایک چوڑی پٹی کی شکل میں زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس چمکدار پٹی پر ایک سایہ حرکت کرتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پہلے اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ سایہ کسی درخت کی ٹہنی کا ہے اس لیے اس نے نظر انداز کر دیا تھا مگر اب جب اس نے چونک کر بغور دیکھا تو اسے صاف محسوس ہوا کہ وہ کسی ہاتھ کا سایہ ہے۔ انسانی ہاتھ حرکت کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی استخوانی ہاتھ کا سایہ تھا۔ انگلیاں مڑی تڑی سی بد وضع تھیں۔

اتنی رات گئے اس ویران حویلی میں ایک مکروہ ہاتھ، وہ بری طرح گھبرا اٹھا تھا۔ اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر سی دوڑ گئی تھی پھر اچانک ہی وہ استخوانی ہاتھ غائب ہو گیا اور اب صرف چاندنی کی لمبی اور قدرے چوڑی پٹی رہ گئی تھی۔

غلام رسول نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے کھڑکی کے باہر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلا رہا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اس نے باہر جھانکا۔ یہاں سے وہاں تک وسیع و عریض سنسان باغیچے میں کوئی نہیں تھا۔ احاطے کی دیوار تک اس نے دیکھ لیا مگر کوئی بھی نظر نہ آیا۔ وہ ناکامی کا بوجھ اٹھائے بستر پر لوٹ آیا۔ ابھی وہ لیٹا ہی تھا کہ اسے خیال آیا، اگر کوئی واقعی مجھے خوف زدہ کر رہا ہے تو وہ یقینی طور پر سامنے والے پیڑ پر چڑھ گیا ہو گا۔ وہ پیڑ کھڑکی کے بالکل سیدھ میں تھا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے ٹارچ نکالی اور دوبارہ کھڑکی پر جا پہنچا۔ پیڑ پر ٹارچ کی روشنی پھینک کر اچھی طرح معائنہ کر لیا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ مطمئن ہو کر وہ بستر پر لوٹ آیا۔ تبھی اس کی نظر چاندنی کی پٹی پر پڑی۔ وہی ہاتھ اب اور زیادہ صاف نظر آ رہا تھا پھر ایک چہرہ بھی نظر آنے لگا۔ اگرچہ وہ ایک پرچھائیں تھی مگر چہرے کے خطوط اتنے واضح تھے کہ اس کی جزئیات و کیفیات کو با آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ چاند کی روشنی میں حرکت کرتا ہوا وہ انسانی چہرہ انتہائی بدوضع اور بدصورت و کراہیت والا تھا جو چاند کی پٹی پر عجیب انداز میں حرکت کر رہا تھا۔

اس چہرے میں ایسی کوئی بات ضرور تھی جس نے غلام رسول جیسے فولادی اعصاب کے مالک کو بھی ہلا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئی تھیں اور سینے میں دھڑکتا ہوا دل بے قابو ہونے کے لیے زور زور سے اچھلنے لگا تھا۔ اسے ریڑھ کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہڈی میں سرد لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے بیڈ سوئچ دبا کر لائٹ جلا لی تھی۔ لائٹ جلتے ہی چاندنی کی پٹی کا وجود مٹ گیا تھا۔ اب نہ وہ مکروہ چہرہ تھا نہ استخوانی ہاتھ۔

کچھ دیر بعد اس کے اندر پھر سے تجسس نے سر اٹھایا۔ وہ سوچنے لگا کہ لائٹ بجھا کر دیکھنا چاہیے۔ اب وہ ہاتھ دکھائی دیتا بھی ہے یا نہیں۔ اس خیال کے تحت اس نے سوئچ آف کیا۔ کمرے میں اندھیرے کی سیاہ چادر تن گئی اور اس کے ساتھ ہی چاندنی کی لمبی پٹی فرش پر جھلملا اٹھی۔ وہ پٹی پہلے سے زیادہ نمایاں تھی کیونکہ چاند اب کافی اونچائی پر آ گیا تھا اور اس کی چمک بھی بڑھ گئی تھی۔

چاند کی روشنی اب اس زاویے سے کھڑکی کے راستے اندر پڑ رہی تھی کہ فرش پر پڑنے والی چاندنی کی پٹی مزید چوڑی ہو گئی تھی اور اسی تناسب سے اس ہیولے کا حجم بھی بڑھ گیا تھا۔ اب وہ ایک مکمل خوفناک چہرہ بن چکا تھا اور پہلے سے زیادہ نمایاں تھا۔ وہ پھولا پھولا سا کریہہ چہرہ غلام رسول کو گھور رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کمرے میں بھیگی ہوئی تیز سردی کا احساس در آیا تھا اور شدید تعفن بھی پھیل گیا تھا۔ ایسی بدبو جو کسی سڑی ہوئی لاش سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ بو اتنی تیز تھی کہ ناک پھٹنے لگی تھی لیکن یہ بو زیادہ دیر نہ رہی جس طرح اچانک پھیلی تھی اسی طرح اچانک غائب ہو گئی لیکن چاندنی کی پٹی پر وہ مکروہ چہرہ اسی طرح قائم تھا۔ اب اس کے کھنچے ہوئے موٹے موٹے بھدے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بھی کھیل رہی تھی۔

غلام رسول کے دل میں تجسس کا جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ ایسا مدوجزر جو اس کے تجسس کو بڑھا رہا تھا وہ اس راز کو جاننے کی خاطر دل میں اٹھنے والے خوف کو تھپک تھپک کر سلا رہا تھا۔

☆======☆======☆

پروفیسر، سید علی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے کہ ان کی نظر اس جیپ پر پڑی جو کارگل کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس جیپ میں انڈین ملٹری سوار تھی۔ انہوں نے بھی شاید ان دونوں کو دیکھ لیا تھا کیونکہ اب ایک فوجی کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دوربین تھی۔ وہ انہی دونوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

جیپ ان کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔ ”اے تم لوگ کون ہو؟ ادھر کیا کرنے گئے تھے؟“ افسر نے سوال کیا۔

”ہم قصبے میں رہتے ہیں، یہ میرے چاچا ہیں، دلی سے آئے ہیں۔ انہیں اپنی زمین دکھا رہا تھا۔ وہ ادھر جو سیبوں کا باغ نظر آ رہا ہے وہ ہمارا ہے۔“ سید علی نے پُراعتماد لہجے

میں جواب دیا۔

علی کے لب و لہجے اور پروفیسر کے چہرے پر پھیلی شرافت نے فوجیوں کو مطمئن کر دیا تھا وہ مطمئن تو ہو گئے تھے مگر ان کے چہروں پر چھائی خباثت کم نہ ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک بولا۔ ”سر! مجھے یہ دونوں گھس بیٹھیے لگتے ہیں۔ تلاشی لے لوں؟“

تلاشی کا سن کر پروفیسر عثمان لرز اٹھے کیونکہ ان کی جیب میں پاکستانی برانڈ کا سگریٹ تھا اور پرس میں پاکستانی کرنسی، اسے دیکھتے ہی وہ سمجھ جاتے کہ یہ لوگ پاکستان سے آ رہے ہیں۔

”او بڈھے!“ افسر نے پروفیسر عثمان سے کہا۔ ”تم دلی میں کیا کرتے ہو؟“

پروفیسر عثمان نے خواب میں بھی دلی نہیں دیکھی تھی اور نہ انہیں دلی کے گلی کوچوں کا پتا تھا وہ کیا جواب دیں، اسی پر غور کر رہے تھے کہ سید علی نے کہا۔ ”یہ رہے ان کے کاغذات، یہ ایک پرائیویٹ ادارے میں کلرک ہیں۔“

افسر نے کاغذات دیکھے پھر بولا۔ ”یہ اور کتنے دن یہاں رہیں گے؟“

”اپنا گھر ہے جب تک چاہیں گے رہ سکتے ہیں، ہر بھارتی کو یہاں رہنے کا حق حاصل ہے۔“

”یہی بات پاکستانی گھس بیٹھیے بھی کہتے ہیں۔ پاکستان کے ہوتے ہیں مگر جب پکڑو تو خود کو بھارتی کہنے لگتے ہیں۔“

”مگر میرے چاچا ایسے آدمی نہیں ہیں۔ یہ بہت معصوم ہیں۔ جب سے ان کے ساتھ حادثہ پیش آیا ہے، انہوں نے دوسروں کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے۔“

”کیسا حادثہ؟“

”ان کی کار ایک ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔ اس حادثے میں ان کی بیوی بچے بچ نہ سکے، خود یہ بھی بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ خدا نے انہیں بچا تو لیا مگر ان کی آواز کھو گئی ہے۔ یہ بول نہیں سکتے۔“

”اوہ! اچھا مگر سنو میاں بھائی تم اپنے علاقے کے لوگوں کو سمجھا لو۔ اب اس علاقے کا انچارج میں ہوں۔ اگر ان لوگوں نے اپنی روش نہ بدلی تو میں پورے قصبے میں آگ لگا دوں گا۔“ افسر نے سخت لہجے میں کہا پھر ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا اشارہ دیا۔

ڈرائیور نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور ایکسیلیٹر پر دباؤ ڈالا ہی تھا کہ افسر بولا۔

”اے بڈھے!“

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پروفیسر نے مڑ کر دیکھا۔

''اے......تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو، جو گونگے ہوتے ہیں وہ کم سنتے ہیں۔''

اس کی بات پر سید علی گھبرا اٹھا مگر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور مسکرا کر بولا ''وہ گونگے کم سنتے ہیں جو پیدائشی گونگے ہوں، یہ تو حادثے کی وجہ سے گونگے ہو ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے جاؤ مگر یاد رکھنا میں آتنک وادیوں کا کٹر ویرودھی ہوں۔ ذرا شک بھی ہو جائے تو میں اس کے خاندان کی ایسی تیسی کر دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ آ بڑھ گیا۔

سید علی اور پروفیسر گاڑی کو آگے جاتے ہوئے دیکھتے رہے جب وہ نظروں اوجھل ہوگئی تو پروفیسر نے کہا۔ ''معاذ اللہ! یہ افسر تو حد سے زیادہ بدذات ہے۔''

''ایک اس پر ہی موقوف نہیں، یہاں کا ہر غیر مسلم اسی ذہنیت کا ہے۔ ذرا سی با پر طعنے دیتا ہے کہ جاؤ پاکستان جاؤ یہاں کیا ہے۔''

''واہ! ایک تو مسلمانوں کی زمین پر قبضہ کیے بیٹھے ہیں اوپر سے دھونس بھی ہیں۔''

''اسی ظلم کے خلاف تو ہم سینہ سپر ہیں لیکن کیا کریں۔ ہمارے آگے پیچھے بھی تو نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود ہمارے پاکستانی بھائی اپنی حمیت کو گنوا ہیں۔ ہم یہاں ظلم وستم سہہ رہے ہیں اور وہ ہمارے قاتلوں کے میڈیا وار میں مددگار رہے ہیں۔''

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے قصبہ کے نزدیک پہنچ چکے تھے کہ انہیں ایک کار آنے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ جدھر سے وہ آ رہے تھے۔ ادھر ایک سوزوکی کیری آتی دکھائی دی۔ سید علی نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ دیا۔ ان کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے سر باہر نکال کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''تم کہاں سے آ رہے ہو؟''

''جی میں آیا تو لداخ سے ہوں لیکن تین دن سے اسی قصبے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

''کس کے ہاں ٹھہرے ہو؟''

''جی میں باقر شاہ کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔''

''ہمیں بھی انہی کے ہاں جانا ہے لے چلو گے؟'' سید علی نے پوچھا۔

''کیوں نہیں بیٹھ جائیے!'' اس نے دروازہ کھول کر کہا۔

وہ دونوں اس وین میں بیٹھ گئے اور وین چل پڑی۔ تب سید علی نے پروفیسر سے انگلش میں کہا۔ ''یہ آدمی اجنبی ہے اس لیے میں شک میں پڑ گیا تھا۔ باقی سوالات وہاں پہنچ کر کروں گا۔ دراصل وقتاً فوقتاً بھارتی ایجنٹ مخبری کے لیے یہاں آتے رہتے ہیں ناں۔''

''ویسے یقین کریں میں مخبر نہیں ہوں۔'' ڈرائیور نے مسکرا کر انگلش میں کہا۔ انگریزی سنتے ہی دونوں کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ ڈرائیور حلیے سے پڑھا لکھا نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆======☆======☆

غلام رسول چاندنی کی اسی پٹی پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ وہ اس راز سے پردہ ہٹانے پر آمادہ تھا مگر اس روشن پٹی پر سے وہ مکروہ چہرہ غائب تھا۔ جب کافی دیر ہوگئی تو اس نے کروٹ لے کر رخ تبدیل کرنا چاہا لیکن تبھی وہ مکروہ چہرہ پھر سے اس روشن پٹی پر نمودار ہوگیا۔ وہ اپنی سپاٹ اور بے نور آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس کی نظریں مقناطیسی تھیں۔ غلام رسول کو اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان آنکھوں سے مقناطیسی لہریں نکل کر اس کے جسم میں سرایت کرتی جا رہی ہیں۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان لہروں نے اس کے ذہن کو جکڑ لیا ہے اور جسم میں دوڑتے خون کو منجمد کر دیا ہے۔ اس کا مکروہ ہاتھ اس کی جانب اس طرح اٹھا ہوا تھا گویا اسے دبوچ لینے کے لیے بے تاب ہو۔ آہستہ آہستہ وہ مکروہ ہاتھ چاندنی کی پٹی سے نکل کر اس کی جانب بڑھنے لگا تھا۔ اس حالت میں خوف کا سوا ہو جانا یقینی تھا۔ اس پر شدید دہشت طاری ہونے لگی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور اس نے لائٹ آن کر دی۔ کمرے میں روشنی پھیلتے ہی چاندنی کی پٹی ختم ہوگئی اور......مکروہ چہرہ بھی غائب ہوگیا۔

اب اسے کچھ اطمینان نصیب ہوا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ روشنی آف نہیں کرے گا۔

ابھی اس نے کروٹ بدلی ہی تھی کہ دروازے کے باہر ہلکے قدموں کی چاپ اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ وہ ایک بار پھر چونک اٹھا اور کان لگا کر سننے لگا۔ قدموں کی آہٹ واضح اور صاف تھی۔ کون ہوسکتا ہے۔ اس نے سوچا، تبھی اس کے دل میں خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کیتھی کسی کام سے آئی ہو۔ اس نے دیوار گھڑی پر نظر ڈالی۔ وال کلاک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں رات کے دو بج رہے تھے۔ اتنی رات گئے وہ کس کام سے آسکتی ہے۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ دروازے پر پہنچا اور جھٹکے سے اس نے کواڑوں کو الگ الگ کر دیا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ پلٹنے والا تھا کہ اسے لان میں لگائی گئی جھاڑیوں کے پیچھے ایک سایہ سا نظر آیا۔ شاید اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس علاقے کی عورتیں ساڑھی باندھنا جانتی ہی نہیں تھیں پھر یہ سایہ، یہ ساڑھی والی عورت کہاں سے آ گئی؟ اس نے سوچا پھر خود ہی تردید کر دی۔ ”نہیں، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔ یقیناً وہ کیتھی ہی ہو گی جو کسی ضرورت کے تحت میرے کمرے کی طرف آئی ہو گی اور مجھے سویا ہوا دیکھ کر لوٹ گئی ہو گی۔“ اس خیال کا ذہن میں پیدا ہونا تھا کہ اسے اطمینان ہو گیا اور وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ابھی اس نے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ اسے پھر سے آہٹ سنائی دی۔ آہٹ واضح اور صاف تھی اگرچہ اس پر شدید خوف طاری تھا مگر تجسس اس سے بڑھ کر تھا اور خوف بھی کچھ اس نوعیت کا تھا جسے بزدلی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ دل کو مضبوط کر کے دوبارہ دروازے کی طرف بڑھا۔

☆======☆======☆

ڈرائیور کی بات پر دونوں چونک گئے تھے اور اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ وہ ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے لاتعلق سا بیٹھا تھا۔

”اے تم کون ہو؟“ سید علی نے پستول نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

”ان کھلونوں سے مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرو، اسے کمر میں ہی لٹکا رہنے دو۔ جب تم سوار ہو رہے تھے اسی وقت میں نے تاڑ لیا تھا کہ تمہاری کمر میں پستول اڑسا ہوا ہے۔“ ڈرائیور نے مسکرا کر کہا۔

”بکواس بند کرو، صاف صاف بتاؤ تم کون ہو؟“ سید علی نے سخت لہجے میں کہا۔

”فی الحال تو تمہارا مددگار ہوں۔“ ڈرائیور نے اسٹیئرنگ گھما کر موڑ کاٹا پھر ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا کر رفتار تیز کر لی۔ وہ اتنے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا جیسے کسی بات کی پرواہ نہیں ہے۔

”سیدھی طرح بتا دو ورنہ میں فائر کر دوں گا۔“ سید علی کا لہجہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے تھے۔ عضلات تن گئے تھے۔

”سید علی! اتنی ٹریننگ کے بعد بھی تم ناکام ہو۔ میری طرف غور سے دیکھو۔ مونچھیں لگا کر پگڑی باندھ لینے سے چہرے پر تبدیلی ضرور آ جاتی ہے مگر بغور دیکھا جائے تو پہچانا جا سکتا ہے۔“

ڈرائیور نے جب یہ بات کہی تو سید علی کچھ اور آگے آ گیا۔ کچھ دیر تک دیکھنے کے بعد خوشی سے سرشار لہجے میں بولا۔ ”علی بھائی آپ! واقعی آپ نے خوب میک اپ کیا ہے۔ ایسا زبردست میک اپ...... میں تو پہچان ہی نہیں سکا۔ چہرے کی رنگت بدل گئی۔ سر کے بال سیاہ کی بجائے کھچڑی، اس حالت میں کون پہچان سکتا ہے۔ قسم سے آپ جادوگر ہیں۔“ پھر وہ پروفیسر کی طرف مڑ کر بولا۔ ”یہ میرے ہم نام ہیں۔ سید علی شاہ، لشکر طیبہ کے پلاٹون کمانڈر تھے، جموں میں بے شمار آپریشن کی کامیابی کے بعد انہیں لشکر طیبہ نے یہاں بھیج دیا ہے۔ اب ان کی رہبری میں حزب المومنین، کشمیر ٹائیگرز اور دیگر چھوٹی بڑی جہادی تنظیمیں کفر کے آگے سینہ سپر ہیں۔“

”اللہ آپ کو کامیابی عطا کرے۔“ پروفیسر عثمان نے صدقِ دل سے کہا۔

”مجھے دعا دینے کی بجائے یہ دعا کریں کہ ہمارے پیروں کی زنجیر کٹ جائے۔ ہم جلد سے جلد آزاد ہو کر اسلامی ملک پاکستان کے ساتھ الحاق کر لیں۔ امن و چین سے ارکان اسلامی ادا کر سکیں۔ ہمارے بچے اسلامی طرز زندگی میں ڈھل جائیں۔“ کمانڈر نے کہا پھر سید علی سے بولا۔ ”دراصل مجھے خبر ملی کہ تم کسی اہم شخصیت کو لانے کنٹرول لائن کی دوسری طرف گئے ہو۔ اتفاقاً اس وقت میرے پاس ایک بھی جوان نہیں تھا سب کے سب مشن پر گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں خود تم لوگوں کی نگرانی کے لیے چل پڑا۔ میں دور رہ کر تم لوگوں کی حفاظت کرنا چاہتا تھا جس وقت فوجیوں نے تمہیں روکا اس وقت بھی تم لوگ میری نظروں میں تھے۔ اگر وہ تمہیں گرفتار کرتے تو مجھے مقابلے میں آنا پڑتا لیکن جب انہوں نے تمہیں چھوڑ دیا اور تم پیدل ہی آگے بڑھنے لگے تو میں گاڑی آگے لے آیا تاکہ تم دونوں کو اس مشقت سے بچایا جا سکے۔“

”یہاں کے حالات کیا ہیں؟ فوجی جیپ ادھر کیوں آئی تھی؟“

”حرام کا کھانے کے لیے، مرنے سے پہلے مرغی کھانا چاہتے ہیں۔ انڈے اور مرغی کی تلاش میں آئے ہیں۔“

”شبانہ کا کچھ پتا چلا؟“ سید علی نے پوچھا۔

”ہاں! کل شام کو اس کی لاش جھاڑیوں میں پڑی ملی ہے۔“

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''یقیناً یہ کام فوجیوں کا ہوگا؟''

''نہیں، یہ کسی اور کا کام لگتا ہے کیونکہ اس کے جسم پر تشدد کے نشانات تو تھے مگر اور کوئی بات نہ تھی۔ یہ بات ہسپتال کی ڈاکٹر حمیدہ نے بھی بتائی ہے۔''

''کس کا کام ہوسکتا ہے کچھ اندازہ ہے؟''

''ابھی تک ہم اندازہ لگا رہے ہیں جبکہ پولیس نے اس کے قتل کا الزام ساجد پر لگایا ہے۔ وہ لوگ اسے پکڑ کر لے گئے ہیں۔''

''یہ شبانہ کون ہے؟'' پروفیسر عثمان نے پوچھا۔

''ایک شہید کی بہن! انور اس علاقے کا سرگرم مجاہد تھا۔ گزشتہ مہینے ایک مڈ بھیڑ میں وہ شہید ہوگیا۔ اس کے دو بھائی بھی مجاہد ہیں اور وہ ہمیشہ گھر سے باہر رہتے ہیں۔ گزشتہ پرسوں شبانہ گھر سے غائب ہوگئی۔ ہمیں شک تھا کہ اسے فوجیوں کے عقوبت خانے میں پہنچا دیا گیا ہے مگر جب وہاں ڈیوٹی دینے والے ہمدردوں سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ ایک ہفتے سے وہاں کسی عورت کو لایا نہیں گیا ہے۔ تب ہم نے اسے آس پاس کے گاؤں میں تلاش کرنا شروع کر دیا کہ ابھی ابھی اس کی لاش ملنے کی اطلاع ملی۔''

''یہ سب باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ یہ بتاؤ ان صاحب کو کس طرح عوام کے سامنے پیش کرو گے؟'' کمانڈر نے پوچھا۔

''کل جمعہ ہے۔ جمعے کی نماز کے فوراً بعد ہم انہیں عوام کے سامنے پیش کر دیں گے۔''

''خیال برا نہیں ہے۔'' سید علی کے جواب پر کمانڈر نے کہا۔ ''مگر یہ بھی سوچا ہے کہ مخبر کس طرح چمٹ جائیں گے، ان کی واپسی میں اڑچن آنا ضروری ہے۔''

''پھر آپ ہی کوئی راستہ بتائیں؟''

''صرف اہم شخصیات کی میٹنگ بلاؤ۔ اس میٹنگ میں انہیں پیش کرو تاکہ وہ اہم شخصیات باہر جا کر مشہور کریں۔ اس طرح مولانا صاحب کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا اور ان کے آنے کی خبر بھی مخفی رہے گی اور واپسی میں بھی دشواری نہیں ہوگی۔''

باتوں کے دوران میں راستہ طے ہوگیا اور وہ لوگ قصبے میں داخل ہو گئے۔ کمانڈر نے گاڑی کو مولانا کے گھر کے سامنے روکا اور وہ تینوں اتر کر اندر داخل ہو گئے۔

مولانا نے پروفیسر عثمان کو سینے سے لگا لیا۔ کچھ دیر تک وہ انہیں سینے سے لگائے رہے پھر انہوں نے الگ ہو کر پروفیسر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''پروفیسر صاحب! آپ دنیا کے مانے ہوئے سائنس دان ہیں۔ دنیا بھر میں آپ

کا نام ہے۔ آپ نے خلیے پر تجربات کیے اور ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن ہمیں آپ کے علم سے نہیں چہرے سے فائدہ اٹھانا ہے۔'' وہ بولتے بولتے سانس لینے کے لیے رکے پھر بولے۔ ''آپ کا چہرہ ایک ایسے شخص سے مشابہہ ہے جو تقریباً سو سال پہلے عرب سے یہاں آیا تھا اور اس نے یہاں والوں کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی پیدا کر دی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے آج بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ آج بھی لوگ منتظر ہیں کہ وہ پھر سے جنم لے گا، بار بار جنم لے گا۔ جب جب یہاں والوں پر ظلم ہو گا وہ انہیں بچانے کے لیے کسی نہ کسی روپ میں آئے گا اور یہ وقت ایسا ہی ہے جب اسے آنا چاہیے۔ یہاں کے مظلوم لوگ ظلم سے نجات چاہتے ہیں اور نجات کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اس شخصیت کے پھر سے جنم لینے کی دعا کر رہے ہیں۔''

''یعنی مجھے اسی شخصیت کا بہروپ بھرنا ہے۔'' پروفیسر عثمان نے پوچھا۔

''کبھی کبھی موت کو دور بھگانے کے لیے مرض کے خاتمے کے لیے کڑوی گولی بھی نگلنا پڑتی ہے۔ ہمارا مذہب کسی دوسرے جنم کو نہیں مانتا پھر بھی میں صرف یہاں والوں کے حوصلے بلند کرنے کے لیے اس بات کو مشہور کرنے والا ہوں۔ آپ کو اسد الکبیر کا دوسرا جنم کہہ کر متعارف کراؤں گا۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

مولانا نے خود اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی فوجی افسر کھڑا تھا جس نے پروفیسر عثمان اور سید علی کو راستے میں روکا تھا۔

''فرمایئے!'' مولانا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''مولانا! ہم تو آپ کے ساتھ چائے پینے آئے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ اس کا انداز اتنا جارحانہ تھا کہ مولانا اسے روک نہ سکے۔

''اچھا...... اچھا تو یہ صاحب آپ کے مہمان ہیں؟'' اس نے پروفیسر عثمان کو دیکھ کر کہا۔

''جی نہیں یہ میرے مہمان ہیں۔'' سید علی نے جلدی سے کہا۔

''اور آپ کس کے مہمان ہیں؟'' اس نے کمانڈر علی کی طرف چہرہ موڑ کر پوچھا۔

''میں یہیں کا ہوں۔'' کمانڈر نے برا ماننے کے انداز میں کہا۔

''ارے ارے آپ تو برا مان گئے شاید مجھے ہی دھوکا ہوا ہوگا۔ دراصل میرے ذہن میں ایک بھیانک آتنک وادی کی تصویر تھی اس کا نام علی ہے اور وہ بارہ مولا کا رہنے والا

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ خیر! ایک جیسی شکل کی وجہ سے دھوکا ہو جاتا ہے۔ آپ تو بارہ مولا کے نہیں ہیں نا؟"

"جی نہیں۔" کمانڈر علی نے کہا۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"ارے ارے آپ تو واقعی برا مان گئے۔ دراصل یہ داڑھی بری بلا ہے۔ کرتے ہیں مونچھ والے اور پکڑے جاتے ہیں داڑھی والے۔ اب دیکھئے عالمی پیمانے پر ظلم کرتے ہیں یہودی، فلسطینیوں کو دوڑا دوڑا کر مار رہے ہیں۔ گھروں کو جلا رہے ہیں، ہر وہ کام کر رہے ہیں جو انسانیت کی تذلیل کرا سکتی ہے مگر پکڑے جا رہے ہیں افغانی، ہے ناں تعجب کی بات۔"

"دیکھئے جناب! ہم نے کھانا کھانے کے لیے انہیں بلایا ہے، خدا کے لیے وقت برباد نہ کریں جو پوچھنا ہے پوچھیں اور ہمیں آرام سے کھانا کھانے دیں۔"

"ارے ہاں! کھانا تو ہم نے بھی نہیں کھایا ہے۔ چلئے آج آپ کے دسترخوان پر کھا لیتے ہیں۔"

"ہم مسلمان ہیں۔" مولانا نے نرم لہجے میں کہا۔

"تو ہم کب ہندو ہیں۔ ہم بھی تو مسلمان ہیں یہ اور بات ہے کہ بھارتی فوج میں ملازم ہیں۔"

"لیکن آپ کی آنکھیں، چہرہ، انداز تو یہی بتا رہا ہے آپ عام فوجی نہیں ملٹری انٹیلی جنس سروس کے افسر ہیں۔"

"جی ہاں جی ہاں سو تو ہے۔"

"یعنی آپ کو ہم پر شک ہے اور تحقیق کے لیے آئے ہیں۔"

"توبہ توبہ آپ پر شک کیسے ہوگا...... یقین ہے۔" اس نے داہنے ہاتھ سے اپنے دونوں گال کو تھپتھپا کر کہا۔

"یعنی آپ ہمیں غدار کہہ رہے ہیں۔" مولانا کی آواز میں برہمی تھی۔ "میں دہلی تک آواز پہنچا سکتا ہوں۔"

"جی ہاں! جی ہاں! میں آپ کی قوت سے واقف ہوں مگر کیا کروں ذرا مذاق کی عادت ہے۔" افسر نے مسکرا کر کہا پھر اس نے پروفیسر کو دیکھ کر کہا۔ "ہاں جناب! آپ پاکستان سے کب آئے؟"

"آپ کا دماغ تو درست ہے، ہم کنٹرول لائن کی طرف نہیں۔ اپنی زمین کی طرف گئے تھے میں نے اپنا باغ تو دکھایا تھا۔" علی بولا۔

"ہاں ہاں دکھایا تو تھا، میری یادداشت ہی کمزور ہے۔ کام کا لوڈ ہے ناں۔" علی کی بات کا جواب دے کر وہ پھر پروفیسر کی طرف مڑا اور بولا۔ "ہاں تو جناب آپ یہاں کب تک ٹھہریں گے۔"

"کیوں دماغ خراب کر رہے ہیں، میں نے تو بتایا تھا کہ ایک حادثے میں ان کی قوتِ گویائی چھن گئی ہے۔"

"ہاں...... ہاں بتایا تو تھا میں ہی بھول گیا۔ ویسے میری نیت بری نہیں تھی۔ بس یوں ہی پوچھ لیا۔"

"خدا کے لیے ہمیں پریشان نہ کریں۔" مولانا نے جز بز ہو کر کہا۔

"میں پریشان کب کر رہا ہوں۔ آخر کو مسلمان ہوں۔ مسلمانوں سے ہمدردی تو ہو گی ناں، کسی کو نقصان کیسے پہنچا سکتا ہوں۔"

"بالکل بالکل! آپ مسلمان ہیں، مسلمان ہو کر دوسرے مسلمان کو نقصان کیسے پہنچائیں گے۔ یوں بھی میر جعفر و میر صادق کی داستان تو تاریخ میں دفن ہو گئی۔ اب غدار کہاں پیدا ہوتے ہیں۔" مولانا نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"جی ہاں جی ہاں! اب تو کابل میں بھی گدھے نہیں ملتے۔" افسر نے معصوم صورت بنا کر کہا۔

"سنو میاں! تم ابھی بچے ہو، ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ سیدھے سیدھے مطلب پہ آؤ ورنہ میں وزارت داخلہ میں شکایت کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ تم انٹیلی جنس والے ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ کتنے مرکزی وزیروں سے میرے تعلقات ہیں۔" مولانا نے طیش میں آ کر کہا۔

"ارے جناب! آپ تو غصے میں آ گئے، بھئی میں مسلمان ہوں آپ کے خلاف ایسا قدم کیوں اٹھاؤں گا جس سے آپ کی عزت پر حرف آئے۔ آپ کی عزت، جامع مسجد کے تقدس سے مربوط ہے۔ اس لیے میں ایسا گناہ تو نہیں کر سکتا۔" افسر نے کہا۔

"بیٹے! لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ کلہاڑی کا دستہ اگر لکڑی کا نہ ہوتا تو پیڑ کبھی نہ کٹتا۔ اسی قول پر بھارتی حکمراں عمل پیرا ہیں۔ مسلمانوں سے ہی مسلمان کو مروا رہے ہیں۔ تمہارے ڈپارٹمنٹ کے لوگ نقاب لگا کر پہلے بھیڑ بھری سڑکوں، بازاروں میں فائرنگ کرتے ہیں پھر نقاب اتار کر معصوم لوگوں کو گرفتار کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح ان کا مقصدِ عین یعنی مسلمانوں کی تعداد گھٹانے کا کام پروگرام کے مطابق ہو جاتا ہے کیونکہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گولیاں کھا کر مرنے والے بھی مسلمان، ٹارچر سیل میں اذیت سہہ کر مرنے والے بھی مسلمان۔'' مولانا نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

افسر نے بھانپ لیا کہ مولانا کا پارا اوپر اور اوپر آتا جا رہا ہے۔ اس لیے اس نے نیا پینترا بدلا۔

☆======☆======☆

صبح کیا ہوئی غلام رسول کو ایسا لگا جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ وہ اپنے کمرے سے نکلا، اس کے چہرے پر شب بیداری کی جھلک تھی، تھکن تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا جیسے وہ ساری رات جاگتا رہا ہو۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر ہاتھ کو سر سے اوپر اٹھایا، جسم کو خفیف سا خم دیا اور زوردار انگڑائی لی۔

''صاحب جی! چائے لے آؤں؟'' باورچی نے کچن کے دروازے پر پہنچ کر پوچھا۔

''آں...... ہاں...... ہاں چائے لے آؤ۔'' اس نے جلدی سے کہا اور باتھ روم میں پہنچ کر برش کرنے لگا۔

وہ زور زور سے ہاتھ چلا رہا تھا لیکن اس کے ہاتھ سے بھی زیادہ تیز اس کا دماغ دوڑ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں رات اتنی دشوار کیوں تھی کہ گزارے نہیں گزر رہی تھی۔ وہ خوفناک چہرہ کس کا تھا؟ کون تھا وہ بھیانک چہرے والا جو چاندنی کی پٹی پر پنجے لہرا لہرا کر مجھے ڈرا رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سب کچھ خواب تھا؟ ہاں...... ہاں وہ خواب ہی ہوگا۔ ذہن کے کسی گوشے میں چھپا خوف، تحت الشعور میں مخفی ڈر جو مجھے خواب کی صورت میں نظر آیا۔

اس خیال کے آتے ہی وہ مطمئن ہو گیا۔ ایک اطمینان سا اترتا محسوس ہوا اور وہ مسکراتے ہوئے کھانے کی ٹیبل پر پہنچا۔ باورچی انور نے ناشتہ لگا دیا تھا۔ غلام رسول نے ٹوسٹ اٹھایا ہی تھا کہ کیتھی اندر آئی۔ ''گڈ مارننگ مسٹر غلام رسول!''

''مارننگ!'' غلام رسول نے مسکرا کر کہا۔ ''چائے پی لی؟''

''نہیں'' کہتے ہوئے اس نے پیالی میں چائے نکالی۔

''بچے کا ٹشو لے لیا؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''D.N.A ٹیسٹ کے لیے؟ نہیں! رات میں تو صرف پلاسٹر کیا تھا، آج لوں گی۔'' کیتھی نے چائے کا سپ لے کر جواب دیا۔

''D.N.A کا انالائیسز کر لو گی ناں؟ ایسا نہ ہو کہ کہیں غلطی کر جاؤ اور پوری کہانی

بدل جائے۔''

''مجھے کیا بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ Deoxyribo Nucleie Acid کا ایک ایک جز میرا جانا پہچانا ہے۔ اتنی بار تجربہ کر چکی ہوں کہ ایک ایک سالمے میں کتنی مقدار میں کون سا Acid ہے۔ زبانی یاد ہو چکا ہے، سمجھے مولانا!'' کیتھی نے ہنس کر کہا۔

''کسی چیز کے جز کی مقدار کتنی ہے اس کا یاد رہنا ثبوت نہیں ہے۔ میں سائنس دان نہیں ہوں پھر بھی مجھے معلوم ہے کہ انسانی جسم میں R.N.A اور D.N.A ہوتے ہیں۔ خلیوں کے یہ حکمران الگ الگ طرح سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ DNA کی شکل چوبی سیڑھیوں جیسی ہوتی ہے جس کے ڈنڈے ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں۔ یہ ڈنڈے جس ترتیب سے ہوتے ہیں وہی ترتیب جسمانی اعضاء اور ذہنی صلاحیتوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کیا میں نے غلط کہا؟''

''نہیں تو!'' کیتھی بولی۔

''DNA کو جسم میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ایک ہی جگہ شان سے قیام کیے رہتا ہے جبکہ RNA پورے جسم میں گردش کرتا ہے لیکن RNA جب DNA کے قریب سے گزرتا ہے تو DNA کے سالمے اسے احکامات کی طویل فہرست کیمیکل کی صورت میں تھما دیتے ہیں اور وہ احکام کی بجا آوری کے لیے دیگر سالموں کو کام پر لگا دیتا ہے۔ اسی کے مشورے پر Amino Acid کی بیس قسموں میں سے کس قسم کی Acid کی کتنی مقدار کس اعضاء کے لیے استعمال کر کے پروٹین تیار کی جائے، RNA عمل کرتا ہے۔''

''ارے واہ! تم تو ڈاکٹریٹ کے حامل ہو۔ اپلائی کر دو تو یونیورسٹی والے فوراً ڈگری دے دیں۔''

''ڈگری کی تمہیں ضرورت ہے مجھے نہیں۔ اچھا خدا حافظ!'' کہہ کر وہ اسٹڈی کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میری مذاق کی عادت ہے۔ اتنی پختہ عادت کہ اچھی بات بھی کروں تو مذاق لگے، میری باتوں کا برا نہ منائیں۔ بس عادت تو عادت ہوتی ہے۔''

''کبھی کبھی عادت مہنگی بھی پڑ جاتی ہے۔'' مولانا نے درشت لہجے میں کہا۔ ''آپ کو جو پوچھنا ہے پوچھیں اور ہمیں آرام سے کھانا کھانے دیں۔''

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ارے ارے جناب! آپ تو غصہ دکھانے لگے۔ میں نے کہا ناں میں تفتیش کے لیے نہیں آیا ہوں، چائے پینے آیا تھا، کھانے کا سن کر بھوک جاگ اٹھی اس لیے......''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' کہہ کر مولانا صاحب نے نوکر کو آواز دی۔ اسے کھانا لگانے کی ہدایت دینے کے بعد افسر سے بولے۔ ''بھوکوں کی ضیافت ہم کشمیریوں کی پہچان ہے، کھایئے...... بڑے شوق سے کھایئے مگر یاد رکھیے بارود پر چنگاری ڈالنے سے نتیجہ بہت اچھا نہیں نکلتا۔'' اس وقت مولانا کے ہاتھ کی تسبیح حد سے زیادہ تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ شاید وہ حد سے زیادہ جذباتی ہو گئے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد افسر چلا گیا مگر ان لوگوں کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے لوٹ سکتا ہے اس لیے وہ لوگ جلد سے جلد مطلب کی بات کر لینا چاہتے تھے۔

''تو علی میاں! تم نے کیا سوچا ہے؟'' مولانا نے پوچھا۔

''یہاں نہیں، ایسا کریں ہم تہہ خانے میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر وہ کمینہ آیا بھی تو آپ کا نوکر اسے یہ کہہ کر بھگا دے گا کہ مولانا صاحب نہیں ہیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' کہہ کر مولانا کھڑے ہو گئے۔ وہ تینوں اندر والے کمرے سے ہو کر تہہ خانے میں اتر گئے۔ لکڑی سے بنی اس عمارت کے نیچے اتنا بڑا تہہ خانہ ہوگا، باہر سے اس کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

تہہ خانے میں پہنچ کر وہ سب زمین پر بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گئے۔

''ہاں اب بتائیں ہمیں کیا کرنا ہے؟'' علی نے پوچھا۔

''کل رفیق کے گھر میں علاقے کی اہم شخصیات کو دعوت دی جائے۔ جب سب آ جائیں تو ان کے سامنے پروفیسر صاحب کو پیش کر دیا جائے۔ پروفیسر صاحب ان لوگوں سے استدعا کریں گے کہ وہ ہتھیار اٹھا لیں، جس کے ہاتھ میں جو آئے وہ اسی کو لے کر بھارتی درندوں پر ٹوٹ پڑے۔''

''انہیں دعوت دینا شروع کر دیں۔ پروفیسر صاحب ایسا ہی کریں گے۔''

''وہ کام تو شروع ہو چکا ہے۔ میرے تین جاں نثار ساتھی خفیہ طریقے سے دعوت نامے تقسیم کر رہے ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ پروفیسر صاحب کو کہاں ٹھہراؤ گے؟''

''مولانا صاحب! میرا گھر اس قابل تو نہیں ہے کہ یہ وہاں ٹھہر سکیں مگر میری خواہش ہے کہ وہ ہمارے ہاں ٹھہریں۔'' کمانڈر نے کہا۔

''ہاں یہ مناسب ہے۔ پروفیسر صاحب آپ کے ہاں زیادہ محفوظ رہیں گے کیونکہ

آپ کا گھر اپنے آپ میں قلعہ ہے۔ کئی خفیہ راستے ہیں پھر آپ کے ہاں عورتیں نہیں ہیں اس لیے انہیں آزادی رہے گی۔''

اس بات سے سب متفق ہو گئے اور پروفیسر صاحب کمانڈر علی کے ساتھ چل پڑے۔

پروفیسر عثمان، کمانڈر علی کے ساتھ باہر نکلے تو سید علی بھی ان کے ساتھ آ گیا۔

''تم یہیں رہو گے یا میرے ساتھ چلو گے؟'' کمانڈر علی نے سید علی سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ پروفیسر صاحب کا قصبے میں آپ کے ساتھ دیکھا جانا صحیح نہیں ہے، ہر طرف مخبروں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ آپ کی حقیقت سے بھی واقف ہوں گے اور وہ اس کی آڑ لے کر کوئی بھی کہانی گھڑ سکتے ہیں۔'' سید علی نے کہا۔

''بات تمہاری صحیح ہے۔ تم ایسا کرو انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ اور پہاڑی والے گھر سے ہو کر خفیہ راستے سے میرے گھر میں داخل ہو جانا۔ میں کچھ ہی دیر میں سیدھے راستے سے پہنچ رہا ہوں۔'' کہہ کر کمانڈر نے اپنی چال تیز کر دی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر عجیب سی پُراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے کنکھیوں سے ان دونوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ پروفیسر عثمان، سید علی کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ دونوں ہی خاموش تھے اور سر جھکائے آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ ایک گھر کی آڑ سے یکا یک ہی کسی جن کی طرح وہی ملٹری افسر نمودار ہوا اور ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ارے واہ! آپ ابھی تک سیر کر رہے ہیں۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ گھر میں آرام کر رہے ہوں گے، آپ نے یقیناً پورا قصبہ دیکھ لیا ہوگا۔ ہے ناں!'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا پھر خود ہی بولا۔ ''مگر ایک جگہ اب تک نہیں دیکھی ہوگی۔ چلیے آج میں آپ کو وہ جگہ دکھاتا ہوں۔''

''نہیں جناب! اب ہم تھک چکے ہیں۔'' علی نے کہا۔

''یہ نزدیک ہی وہ جگہ ہے، چلیں ناں!'' اس نے یہ جملہ اتنی لجاجت سے کہا کہ انہیں اس کی بات ماننا پڑی پھر وہ زبردستی بھی کر سکتا تھا اس وجہ سے بھی پروفیسر اور علی نرم پڑ گئے اور اس کے ساتھ چل پڑے۔ کچھ قدم کے بعد ایک بڑا سا احاطہ تھا۔ اس احاطے کے درمیان لکڑی سے بنا ہوا ایک بہت ہی خوبصورت سا مکان تھا۔ وہ انہیں لے کر اس مکان میں آیا۔ ''یہ میرا غریب خانہ ہے تشریف رکھیں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ دونوں بستر پر بیٹھ گئے۔ تب وہ افسر بولا۔ ''محترم! میں ایک ذمے دار افسر ہوں۔ مجھے اپنی ڈیوٹی دینا ضروری ہے اور وہ دے رہا ہوں۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''آپ ہمیں کچھ دکھانے والے تھے۔'' علی نے کہا۔

''وہی دکھا رہا ہوں۔'' کہہ کر اس نے وی سی آر میں ایک کیسٹ ڈالی پھر ٹی وی آن کرنے کے بعد بولا۔ ''بغور دیکھئے گا۔''

وہ دونوں اسکرین کی طرف دیکھ رہے تھے کہ پروفیسر عثمان بری طرح چونک اٹھے۔ اسکرین پر وہ غلام رسول کے ساتھ بیٹھے کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ اس منظر کے ساتھ کمنٹری بھی چل رہی تھی۔ کمنٹری کرنے والا پروفیسر عثمان کے بارے میں بتا رہا تھا۔

''اب تو آپ اچھی طرح سب کچھ جان چکے ہوں گے۔ یہ کیسٹ ہمارے ایجنٹ نے بھیجا ہے۔ آپ کو میں نے پہلی بار دیکھتے ہی پہچان لیا تھا مگر مسلمان ہوں ناں اس لیے چھوٹ دے رہا تھا۔''

''آپ...... آپ تو بہت خطرناک ہیں۔'' علی نے کہا اور پستول نکال لیا۔ ''ایسے خطرناک آدمی کا زندہ رہنا ہمارے حق میں بہتر نہیں ہے۔''

''یو باسٹرڈ!'' کہہ کر اس افسر نے لات چلا دی۔ پستول نکل کر دور جا گرا اور وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ کبھی علی نیچے آ جاتا اور کبھی وہ افسر۔ فری اسٹائل کا یہ مقابلہ جاری تھا کہ پروفیسر عثمان نے پستول اٹھا لیا۔

''پروفیسر! آپ غلط کر رہے ہیں۔'' افسر نے علی کی گردن دباتے ہوئے جواب دیا۔

''جی نہیں میں جو بھی کر رہا ہوں وہ صحیح ہے۔''

''پروفیسر! یہ مجاہد نہیں مخبر ہے۔ اصل مجاہد میں ہوں کہ میں اتنے اہم محکمے میں ہوتے ہوئے بھی مجاہدین کے لیے کام کر رہا ہوں۔'' افسر نے کہا۔

''پروفیسر گولی...... گولی چلاؤ...... یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' علی نے چیخ کر کہا۔

''پروفیسر! یقین کرو یہ غدار ہے۔ میں تمہیں ثبوت دکھاؤں گا۔ بہت جلد یہاں پر ایک خونی ڈراما کھیلا جائے گا اور اس ڈرامے میں تمہارا ملک بھی ملوث کر دیا جائے گا۔ یہ اسی بساط کو بچھانے کی کوشش میں ہے۔'' افسر بولا۔ اس کا چہرہ جوش و جذبات سے بھرا تھا۔

''فی الحال میں تم دونوں میں سے کسی کی بات سننے پر تیار نہیں ہوں اس لیے جا رہا ہوں۔'' کہہ کر پروفیسر عثمان نے جوانوں کی طرح کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور بھاگتے چلے گئے۔

پروفیسر عثمان بے تحاشا بھاگ رہے تھے ان کے لیے پورا علاقہ اجنبی تھا۔ راستے

گھاٹ کا کچھ علم نہ تھا پھر بھی وہ اندازے سے دوڑ رہے تھے۔ وہ جلد سے جلد مولانا کے گھر پہنچنا چاہتے تھے کیونکہ ایک وہی جگہ تھی جہاں انہیں شیلٹر مل سکتی تھی۔

ابھی وہ کچھ ہی دور گئے تھے کہ ایک کار آ کر ان کے نزدیک کھڑی ہو گئی۔ اس کار میں سید علی کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ ''پروفیسر صاحب! بیٹھ جائیں۔''

پروفیسر عثمان کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ کار پھر چل پڑی۔ پروفیسر کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''سید علی! تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ہمیں جانا کہاں ہے؟''

سید نے مسکراتے ہوئے پروفیسر کی طرف دیکھا۔ ''تم نے یہ بتانے کی زحمت بھی تو نہیں کی۔''

''مولانا صاحب کے گھر۔'' یہ کہہ کر پروفیسر نے سید علی کی طرف دیکھا۔ آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔

جب سید علی نے کار کا رخ سیدھے ہاتھ کی جانب موڑا تو پروفیسر کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے ان دونوں کی لڑائی کے دوران میں کہے گئے جملے یاد آ گئے۔ ''آج رات بھارتی سینا اپنے ایجنٹوں کو پاکستانی علاقے میں بھیجے گی۔ وہاں سے وہ لوگ فائرنگ کریں گے اور جواب میں ادھر سے توپ خانے کا کام شروع ہو جائے گا۔''

پروفیسر نے بے چینی سے پہلو بدلا اور سید علی کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ کار چلا رہا تھا۔

''سید! اگر اس وقت ہم پر بموں کی بارش ہونے لگے تو ہم کیا کریں گے؟''

سید علی نے سر گھما کر پروفیسر کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی پُراسرار مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کار بڑی تیزی سے قصبے کی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ پروفیسر نے اپنے اعصاب کو مضبوط بناتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہر طرف خاموشی تھی، سناٹے کا راج تھا۔

''کار روک لو۔'' انہوں نے اچانک کہا۔

''پروفیسر! تم ہی نے کہا تھا کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ تمہیں واپس بھی جانا ہے؟''

اس سے پہلے کہ پروفیسر کچھ کہتے، انہیں اپنی پسلیوں میں نال چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس لی اور اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان کے بدترین اندیشے درست ثابت ہو رہے تھے۔ افسر کی کہی بات سچ نکلی تھی۔ واقعی سید علی غدار تھا۔ تبھی کار جھٹکے سے مڑی پھر رک گئی تھی اور دروازہ کھلا تھا۔ سامنے ہی ایک درمیانی عمر کا انتہائی بدصورت شخص کلاشنکوف تھامے کھڑا تھا۔ ان کے جسم میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی تھی۔ وہ اپنی تمام قوتیں سمیٹتے ہوئے باہر نکلے تھے۔ قریب ہی ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔

چند لمحوں بعد سید علی کار سے باہر نکلا اور پروفیسر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''مجھے افسوس ہے پروفیسر کہ تمہارا استقبال کلاشنکوف سے کیا جا رہا ہے۔''

پروفیسر کے ہونٹوں پر ایک حقارت بھری مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ''علی! تم پر یہ نام سجتا نہیں ہے۔ نام کی بے حرمتی ہے۔ تمہارا نام تو میر جعفر ہونا چاہیے تھا۔''

''کوئی بات نہیں، یہ نام رکھ کر تم خوش ہونا چاہتے ہو تو اسی نام سے خوش ہو لو کیونکہ میں عقلمند ہوں، پیٹ خالی ہے اور آزادی آزادی کا نعرہ ہے۔ مجھے دولت چاہیے تاکہ یہ بے وقوف جب آزادی حاصل کر لیں تو میں اس کا صحیح لطف اٹھا سکوں۔ یہاں کی حکومت مجھے ہر ماہ موٹی رقم دیتی ہے، سمجھے!''

''یہاں والے فاقہ زدہ ہیں تو اس لیے کہ ان کی دولت دلی والے لوٹ رہے ہیں جبکہ اسی دولت کی زکوٰۃ تمہاری جھولی میں ڈال رہے ہیں۔ اس دولت پر تمہارا حق ہے بے وقوف!''

''بے وقوف کون ہے یہ ابھی پتا چل جائے گا۔'' پھر اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

''یہ دولت ہے۔ اس کے بدلے میں بہت بڑی رقم ملے گی۔ اسے اوپر لے جاؤ۔''

''تم بہت پچھتاؤ گے۔'' پروفیسر نے کہا۔

''میں دوسروں کی طرح ضعیف الاعتقاد نہیں ہوں کہ تمہیں اسد الکبیر مان لوں۔'' کہہ کر اس نے پروفیسر کو کھینچ کر لے جانے کا اشارہ کیا۔

☆======☆======☆

غلام رسول عجیب سی کیفیات کا شکار تھا۔ دن نہایت بے چینی کے عالم میں کٹا۔ وقت سرکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ شدت سے منتظر تھا کہ کب رات ہو اور وہ کل رات کا منظر پھر سے دیکھے لیکن گھڑی کی سوئیاں گویا جام ہو کر رہ گئی تھیں۔ بارہ بجے تو اسے یوں لگا جیسے بارہ برس بیت گئے ہوں۔ اسی وقت درختوں کے عقب سے چاند نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ باغ میں پھیلی ہوئی تاریکی کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ چاند کو دیکھ کر دفعتہً اسے

مکروہ چہرے کا خیال آ گیا جو کھڑکی کے راستے چاندنی کی پٹی پر متحرک نظر آیا تھا اور اسے خوفزدہ کر گیا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی تاکہ تازہ ہوا اندر آ سکے مگر لائٹ آن تھی اس لیے فرش پر چاندنی کی پٹی کے نمودار ہونے کا سوال نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ لائٹ آف کر کے دیکھے کہ آج بھی وہ خوفناک چہرہ نظر آتا ہے یا صرف وہ وہم کا کرشمہ تھا۔ پھر اس نے خود ہی اس خیال کو جھٹک دیا۔ جہنم میں جائے وہ خبیث چہرہ! میں تو اس ہیولے کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون تھی۔

وقت آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔ آخرکار ڈیڑھ بج گیا اور اسی وقت اچانک بجلی چلی گئی۔ اندھیرے میں کمرے کے فرش پر چاندنی کی پٹی نمایاں نظر آنے لگی لیکن وہ شیطانی شبیہ وہاں نہ تھی۔ غلام رسول نے اطمینان کی سانس لی اور وہ اس ہیولے کی تلاش میں دروازے کی سمت چل پڑا کیونکہ گزشتہ شب بھی تقریباً اسی وقت وہ نظر آئی تھی۔

دروازے پر پہنچنے کے لیے اسے چاندنی کی اس پٹی کو عبور کرنا تھا اور جونہی وہ اس جگہ پہنچا، یکلخت وہ مسخ شدہ چہرہ چاندنی کی پٹی پر نمودار ہو گیا۔ غلام رسول تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ مکروہ چہرہ اس کے پیروں سے چمٹ جائے گا اور فرش پر گرا کر اس پر سوار ہو جائے گا۔ اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دے گا۔

وہ ہیبت ناک چہرہ آگے پیچھے، دائیں بائیں مسلسل حرکت کر رہا تھا جیسے رقص کر رہا ہو اور اسے دہشت زدہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہو۔ تبھی اس نے خود کو تسلی دی کہ یہ صرف واہمہ ہے۔ اس سائے کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ ہے۔ کوئی طاغوتی قوت اسے اپنے دام میں لینا چاہتی ہے لیکن کیوں؟ کس لیے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

کسی کو ہم سے کیا نقصان ہے؟ ہم تو یہاں تجربات کرنے آئے ہیں۔ بنی نوع انسان کی بقا کے لیے نئے کلیے ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ ہم سے کسی کو کیا لینا دینا؟ تبھی اس کے ذہن میں علی مدد شاہ کا چہرہ آ گیا۔ اس کی پُراسراریت یاد آ گئی۔ پروفیسر کا خواب مسلسل یاد آ گیا کہ وہ کس طرح قسط وار خواب دیکھ رہا ہے۔ ضرور یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ اس نے سوچا اور بستر پر آ کر بیٹھ گیا تبھی دروازہ کھلا اور وہ حیرت سے اچھل پڑا۔

☆======☆======☆

پستول والے آدمی نے آگے بڑھ کر پروفیسر کی جامہ تلاشی لی۔ پروفیسر نے حقارت سے سید علی کی طرف دیکھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کسی بھوکے شیر کی طرح اس غدار پر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جھپٹ پڑے لیکن مشین گن اور پستولوں کی اٹھی ہوئی نالیوں نے اسے روک دیا۔

وہ انہیں تقریباً کھینچتا ہوا اوپر لے گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک کشادہ کمرے میں تھے۔ کمرے میں پرانے ڈیزائن کی ایک آرام کرسی تھی۔ پستول والے نے انہیں اس کرسی کی جانب دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ اس پر بیٹھ کر سید علی کے بارے میں سوچنے لگے۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور سید علی مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے کمانڈر علی تھا اور کمانڈر کے پیچھے دو ریوالور بردار۔ کمانڈر علی کے لمبے لمبے کاکل بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر اداسی تھی۔ دونوں کی آنکھیں ملیں اور کمانڈر نے اپنا منہ موڑ لیا۔

''مسٹر عثمان! کمانڈر علی کی خواہش ہے کہ تمہاری موت اس کے ہاتھوں واقع ہو۔''

''مرنے سے پہلے میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ غداری کی تمہیں کتنی بڑی قیمت ادا کی گئی ہے؟'' پروفیسر نے حقارت سے پوچھا۔

سید علی نے قہقہہ لگایا۔ ''ہر آدمی کی قیمت ہوتی ہے۔ اس کی قیمت ہے رہائی۔ اسے تبھی رہائی ملے گی۔ اس کا خیال ہے کہ یہاں کی آزادی کے لیے اس کی ضرورت ہے تمہاری نہیں اس لیے اس نے سودا کر لیا ہے۔''

عام حالات میں شاید کبھی بھی پروفیسر اس طرح موت سے کھیلنے کی جرأت نہ کرتے لیکن اس وقت انہیں اپنی زندگی کی فکر نہ تھی۔ وہ یہ بھی بھول چکے تھے کہ وہ کتنے بڑے سائنس دان ہیں۔ ان کی تحقیق نے پوری دنیا میں ہلچل مچا دی ہے۔ قرآن شریف کی آیات کو مدِ نظر رکھ کر انہوں نے کس طرح ثابت کر دیا تھا کہ انسان کے اندر بھی جانداروں کی ایک دنیا آباد ہے جو انہی کی طرح سانس لیتی ہے، پیدا ہوتی ہے، ترقی کرتی ہے اور پھر مر جاتی ہے۔ Cell پر ریسرچ تھیوری پیش کر کے طب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔

اس عظیم سائنس دان نے جب پوری قوت سے اپنے جسم کو اوپر اچھالا تو ان کے ذہن میں صرف ایک دعا تھی کہ خدایا! مجھے اپنا فرض مکمل کرنے کے لیے زندگی کے صرف چند لمحات اور عطا کر دے۔

وہ اس تیزی کے ساتھ اچھلے تھے کہ کلاشنکوف کا رخ ان کی طرف مڑ نہ سکا اور اس سے پہلے کہ وہ آدمی اس غیر متوقع صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے حواس پر قابو پاتا کہ پروفیسر عثمان کلاشنکوف کی زد سے نکل کر اپنے بدحواس حریف کو بازوؤں کے شکنجے میں کس چکے تھے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ سید علی ایک لمحے کے لیے بے یقینی

کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ پروفیسر عثمان کلاشنکوف کا رخ اس کی طرف گھمانے کی کوشش کر رہے ہیں تو وہ ایک دم پوری قوت سے چیخا۔ ''دیکھ کیا رہا ہے، گولی چلا، کمانڈر فائر کر۔''

پروفیسر نے کلاشنکوف چھیننے کے لیے پوری قوت لگا دی تھی مگر ان کا بوڑھا جسم ایک نوجوان لڑاکا سے ہارنے لگا تھا تبھی انہوں نے کمانڈر علی کی طرف دیکھا، وہ پستول بلند کر رہا تھا۔ پروفیسر سر بچانے کے لیے کچھ نیچے جھکے تبھی فائر ہوا۔ ایک چیخ گونجی اور ان کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ بس یہی وہ کمزور لمحہ تھا جب کلاشنکوف والے نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا اور وہ پروفیسر کے شکنجے سے نکلتا چلا گیا۔

''خبردار! گولی مت چلانا۔'' کمانڈر علی کی ترش آواز کمرے میں گونجی۔

کلاشنکوف کا رخ پروفیسر کی طرف مڑتے مڑتے رک گیا۔ انہوں نے بے یقینی کے عالم میں سید علی کی طرف دیکھا جو دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے نیچے فرش پر لڑھک گیا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں کمانڈر علی پر جمی ہوئی تھیں۔

کمانڈر کا ریوالور دوبارہ گونجا یکے بعد دیگرے پستول اور کلاشنکوف بردار اپنا اپنا سر پکڑ کر بیٹھتے چلے گئے۔

''پروفیسر باہر نکلو!'' کہہ کر کمانڈر چوکنا نظروں سے مقتولوں پر نظر ڈالتا ہوا باہر کی سمت بڑھا۔

وہ دونوں باہر نکلے تو ہر طرف وہی خاموشی تھی جو اس علاقے کا خاصہ تھا۔ یہ گھر قصبے سے کافی دور تھا۔ باہر کمانڈر کی گاڑی موجود تھی۔ اگنیشن میں چابی لٹک رہی تھی۔ کمانڈر نے دروازہ کھول کر کہا۔ ''میں نے اسی لیے چابی چھوڑ دی تھی کہ اگر زندہ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو چابی ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہیں ہوگا، آؤ بیٹھو۔''

پروفیسر عثمان اس کے برابر میں بیٹھ گئے۔ اس نے پک اپ اسٹارٹ کی اور ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ اس نے گاڑی کا رخ قصبے کی طرف کر لیا تھا۔ آہستہ آہستہ فاصلے ختم ہو رہے تھے۔ قصبہ نزدیک آتا جا رہا تھا۔

''کمانڈر علی! تم نے تعلیم وغیرہ حاصل کی ہے یا نہیں۔'' پروفیسر عثمان نے خاموشی کو توڑا۔

''تعلیم...... ہم کشمیریوں کے لیے تعلیم!'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''میرے بزرگ، تعلیم حاصل کرنے کا شوق مجھے بہت تھا۔ میری ماں خواب دیکھا کرتی تھی کہ میں انجینئر بنوں گا،

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈاکٹر یا پائلٹ بنوں گا لیکن اسی نے ایک دن مجھے قسم دے دی کہ میں تعلیم حاصل نہ کروں۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ کیوں روکا انہوں نے، کوئی حادثہ ہو گیا تھا کیا؟''

''ہاں وہ حادثہ ہی تھا۔ میری زندگی کا رخ موڑ دینے والا حادثہ، اس دن میری ماں، ایک حرف بھی پڑھ نہ پانے والی ماں نے فلاسفروں جیسی ایک بات کہی تھی۔''

''انہوں نے کیا کہا تھا؟'' پروفیسر عثمان کے لہجے میں تجسس تھا۔

''مجھے آج بھی یوں لگتا ہے جیسے وہ منظر میری آنکھوں میں تازہ ہے۔'' کمانڈر علی نے دور افق پر نظر ٹکا کر کہا لیکن فوراً ہی اس نے نظریں موڑ کر سڑک پر بگٹٹ بھاگتے ٹرک اور اس کے پیچھے ایک بارہ تیرہ سال کے بچے کو دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''ہر روز میری ماں میرے ابا سے ضد کرتی تھی کہ میرے علی کو سکول میں بھرتی کرا دے۔ وہ پڑھے گا۔ بہت سا پڑھے گا۔ ڈاکٹر بنے گا۔ روز روز کی چخ چخ سے تنگ آ کر ابا نے ادھر اُدھر سے ادھار مانگ کر اتنے پیسے جمع کر لیے کہ مجھے بڑے قصبہ کے سکول میں بھرتی کرا دیں۔ سکول میں داخلہ لے کر مجھے وہیں رہنا تھا۔ اتنا فاصلہ طے کر کے آنا جانا ممکن بھی نہیں تھا۔ اماں نے مجھے عید والے کپڑے پہنائے اور میں ابا کے ساتھ بڑے قصبہ کی طرف چل پڑا۔ ہم صبح کی نماز پڑھ کر چلے تھے اور اب ظہر کا وقت ہو چلا تھا۔ اس سکول میں ابا نے بھی پانچ جماعت تک پڑھا تھا اس لیے وہ راستے بھر مجھے سکول کے نظم ونسق کے بارے میں بتاتے آئے تھے لیکن جب ہم سکول میں داخل ہوئے تو سکول کی وسیع و عریض اور پُرشکوہ عمارت سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی آدم زاد نہ ہو۔ اس بے رونقی اور ویرانے نے ابا کو وسوسے میں ڈال دیا کہ کہیں وہ کسی غلط جگہ تو نہیں آ گئے۔ وہ اپنا وسوسہ دور کرنے کے لیے دوبارہ باہر نکلے۔ گورنمنٹ سیکنڈری سکول کا بورڈ دیکھ کر وہ پھر اندر آ گئے۔ ان کا وسوسہ ختم ہو گیا تھا لیکن حیرت میں اضافہ ہو گیا تھا جس کا اظہار انہوں نے دھیمی آواز میں کیا تھا۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ اس سکول کو کیا ہو گیا ہے۔

سامنے ہی بڑا سا پلے گراؤنڈ تھا۔ میدان میں اُگی ہوئی گھاس بے ترتیب تھی۔ کہیں بڑی کہیں چھوٹی۔ جھاڑ جھنکاڑ کی کثرت تھی۔ درختوں کے خشک اور زرد پتے ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں بھی ہر جانب پھیلی ہوئی تھیں۔ میدان کی رنگت بتا رہی تھی کہ عرصے سے وہاں چھڑکاؤ نہیں ہوا ہے تبھی یہ خشک سالی ہے۔

''کبھی یہ باغ تھا۔ اب جنگل ہو گیا ہے۔'' کہتے ہوئے ابا نے قدم آگے بڑھایا۔ ا

ہم برآمدے میں پہنچ گئے۔ سامنے لائبریری ہال تھا۔ اس میں جھانک کر دیکھا۔ کتابیں، میز، کرسیاں، اخبارات و رسائل سب کچھ موجود تھا مگر نہیں تھا تو کوئی ایک لڑکا۔ بعض الماریاں خالی تھیں۔ ''ہمارے وقت میں تو یہاں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی۔'' کہہ کر وہ لائبریری کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ نزدیک پہنچ کر انہوں نے لائبریرین سے پوچھا۔

''دینی کتابیں بہت کم نظر آ رہی ہیں؟''

''جلد بندی کے لیے گئی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

ابا واپس مڑ گئے۔ راہداری میں چلتے ہوئے انہوں نے کلاس رومز کا جائزہ لیا۔ طالب علم جماعت میں موجود تھے۔ جہاں چالیس طلباء بیٹھ سکتے تھے وہاں بمشکل دس گیارہ طلباء بیٹھے ہوئے تھے، خاموش سر جھکائے اپنی کتابیں اور کاپیاں دیکھ رہے تھے۔ چہرے حسرت زدہ تھے اور انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ خود کہیں اور ہیں اور ان کی توجہ کہیں اور۔ اساتذہ بھی کمروں میں موجود تھے اور بالکل مشینی انداز میں کام کر رہے تھے جیسے یہ ان کے لیے ناروا بوجھ ہو جسے اٹھا کر پھینکنا چاہتے ہوں۔

اب ہم سکول کے آفس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دفتر کے باہر کچھ فوجی بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں دلی سے نکلنے والا ہندی اخبار تھا۔ دفتر کے اندر ایک بوڑھا شخص رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔ ابا مجھے ساتھ لے کر اس بوڑھے کے قریب پہنچے پھر ازراہِ تذکرہ پوچھا۔

''یہ فوجی یہاں کیوں ہیں؟''

''یہ سکول کی نگرانی کر رہے ہیں؟''

''کیوں کیا سکول کہیں بھاگ رہا تھا؟''

''ہاں بھاگ رہا تھا، کہیں اور، بہت دور جا رہا تھا۔''

میرے ابا کے چہرے پر پریشانی چھا گئی کہ یہ سکول کہیں دور جا رہا تھا۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔ ''تو کیا اب داخلہ نہیں دیا جا رہا ہے۔''

''داخلہ یا خروج؟ T.C لینا ہے کیا؟''

''نہیں نہیں، یہ میرا بچہ ہے۔ اسے داخل کروانا ہے۔''

''واہ واہ! تمہیں میڈل ملے گا۔ اس سال کے تم پہلے شخص ہو۔ یہ پہلا لڑکا ہے جو سکول میں داخل ہو گا ورنہ یہاں تو T.C حاصل کرنے والوں کی قطار لگی ہے۔''

''میں ہیڈ ماسٹر سے مل سکتا ہوں؟''

''بسرو چشم، سو بار مل سکتے ہیں۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کہاں ہیں وہ؟"

"اپنے دفتر میں۔"

"کیا کر رہے ہوں گے؟"

"مکھیاں مار رہے ہوں گے۔ جلدی جائیے وہ بہت خوش ہوں گے۔"

میرے ابو مجھے وہیں ٹھہرا کر ہیڈ ماسٹر کے روم میں داخل ہو گئے۔ بمشکل دس منٹ کے بعد لوٹے تو ان کے ہاتھ میں فارم تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ راستے میں انہوں نے بتایا کہ اب اس سکول کا بہت سا قانون بدل گیا ہے۔ اب اس سکول کا ہیڈ ماسٹر تلک لگانے والا ایک پنڈت ہے۔ یہاں دینی تعلیم کی جگہ لامذہبیت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اشوک کی مہانتا، وشوامیتر کی چالاکی، بودھ کی شانتی اور دیگر ہندو راجاؤں کی دانائی کی تعلیم دی جا رہی ہے تاکہ دہلی جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں رکاوٹ نہ ہو۔

جب ہم اپنے گھر میں داخل ہوئے تو شام کا سایہ اترنے لگا تھا۔ ویسا ہی سایہ ابا کے چہرے پر بھی لرز رہا تھا۔ شاید ان کا ذہن پرت در پرت روشن ہو گیا تھا اور دل پر درد کی لہر محیط ہو گئی تھی۔ وہ جملے، وہ باتیں، وہ تمام ویرانیاں، وہ تمام سناٹے اور سوالات جو اندرون سکول انہیں پکڑ بیٹھے تھے اب وہ ان کی گرفت سے آزاد تھے۔ ابا مجھے سکول میں داخلے کے لیے لے گئے تھے مگر وہاں سے فارم لے کر لوٹے تو وہ حد سے زیادہ ٹوٹے بکھرے نظر آ رہے تھے۔ امی نے پوچھا۔ "کیا بات ہے آپ اس قدر تھکے ہوئے کیوں ہیں، چہرے پر غصہ ہے کیا کسی سے کوئی بات ہو گئی۔"

"نہیں! میں سکول کی حالت دیکھ کر مایوس ہو گیا ہوں۔ پرانے تمام ماسٹر سکول چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر بھی بدل گیا۔ اب جموں کا ایک پنڈت ہیڈ ماسٹر بن کر آیا ہے۔ سکول کی لائبریری سے اسلامیات کی تمام کتابیں ہٹا دی گئی ہیں۔ بقول ہیڈ ماسٹر اسلامی تاریخ خون خرابے سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا بچوں کے ذہنوں پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ بدلے کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس کی جگہ بدھ مذہب کے اقوال سکھائے جا رہے ہیں تاکہ امن و شانتی بڑھے۔ اسلامی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر لوگ بچوں کو سکول سے ہٹا رہے ہیں۔ پچھلے سال کی نسبت اس سال 90 فیصد بچے کم ہو گئے ہیں اس لیے داخلہ فوراً مل رہا ہے۔ نہ صرف داخلہ بلکہ وظیفہ بھی ملے گا۔ میں داخلہ فارم لے آیا ہوں۔ اب کیا کرنا ہے مجھے بتا دو۔" کہہ کر انہوں نے داخلہ فارم امی کی طرف بڑھایا تھا۔

امی کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ انہوں نے غضب ناک نگاہوں سے فارم کو دیکھا پھر غراہٹ بھری آواز میں بولیں۔ "ہنہ...... ! تو اب ہماری نئی پود کو مذہب سے بیگانہ کرنے کی مہم چلائی جا رہی ہے۔ اسلام تو امن و آشتی کا مذہب ہے۔ اس پر خون خرابے کی مہر لگائی جا رہی ہے۔ ہنہ...... ! وہ کسی ایک شخص کی غلطی تمام لوگوں پر تھوپ رہے ہیں۔ انفرادی غلطی کو اجتماعی قرار دے رہے ہیں۔"

امی حد سے زیادہ جذباتی ہو گئی تھیں۔ وہ چیخنے کی حد تک تیز آواز میں بول رہی تھیں۔

"اوہ...... وہ...... وہ اپنی تاریخ بھول رہے ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے ہی تو ماسٹر شجاعت ہندوؤں کی تاریخ بتا رہے تھے کہ اشوک نے تخت کی خاطر خون کی ندیاں بہائی تھیں۔ تخت حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے بھائیوں کو قتل کیا تھا۔ مہا بھارت کی جنگ کے وقت اپنے بھائیوں، رشتے داروں کو مخالف صف میں دیکھ کر حوصلہ ہارتے ہوئے، مہا راجا ارجون کو ان کے بھگوان شری کرشن نے یہ کہہ کر اکسایا تھا کہ جنگ کے وقت کوئی بھائی، چچا، ماموں نہیں رہتا، صفِ مخالف میں صرف دشمن ہوتے ہیں اور اس کے کہنے پر ارجون نے اپنے رشتے داروں کا بے دریغ قتل کیا تھا؟ کیا مہا راجا ویکرامادیہ نے تخت کے لیے اپنے باپ کو قتل نہیں کیا تھا؟ اس ماسٹر کے بچے سے یہ تو پوچھ لیتے کہ اس کی تاریخ کیا ہے؟ ویکرم شیلہ اور نالندہ وہار آج بھی گواہ ہیں۔" بولتے بولتے شدت جذبات سے امی کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔ انہوں نے غضبناک نگاہوں سے فارم کو دیکھا تھا۔ پھر اسے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے اور ان ٹکڑوں کو پیروں سے مسل کر بولی تھیں۔ "میرا بیٹا بھارتیوں کے پاؤں کی جوتی بننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کشمیری مائیں بھارتیوں کا غلام بننے کے لیے بیٹے نہیں جنتیں۔ یہ سکول کی نہیں، اب بندوق کی تعلیم حاصل کرے گا۔ مجاہد بنے گا، غلامی کی زنجیر توڑے گا۔" پھر وہ میری طرف مڑ کر بولی تھیں۔ "جا بیٹا! میں نے تجھ پر حقِ شیر معاف کیا۔ تجھے دودھ بخش دیا۔ جا مادرِ وطن کے گلے میں پڑے طوقِ غلامی کو توڑ دے۔"

"پروفیسر! وہ دن ہے اور آج کا دن، میں نے موت کے سکول میں داخلہ لے لیا ہے۔ کلاشنکوف میرا قلم ہے اور بھارتی درندوں کا سینہ کاغذ۔ میں ہر روز نیا سبق سیکھ رہا ہوں۔ نہ جانے کب تک لکھتا رہوں گا؟" آخری جملہ اس نے پروفیسر عثمان سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"اپنی امی سے ملنے جاتے ہو؟" پروفیسر نے پوچھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"عید، بقرعید پر چلا جاتا ہوں۔"

"آخری بار کب گئے تھے؟" پروفیسر نے یونہی پوچھ لیا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے سات آٹھ ماہ ہو گئے ہوں گے۔ مجھے بارہ مولا کی ایک چوکی اڑانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور اس کی ایک ہی وجہ تھی۔ وہ یہ کہ میں اس علاقے کا تھا۔ وہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ایک ایک پتھر سے آشنائی تھی۔ وہاں کے پیڑ مجھے پہچانتے تھے۔ اس چوکی سے کچھ ہی دور میرا گاؤں تھا۔ وہ گاؤں جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ جس کی گلیوں میں، اونچی نیچی پہاڑیوں میں مَیں کھیل کود کر جوانی کی منزل تک پہنچا تھا اسی لیے میں فوراً راضی ہو گیا تھا اور تب ایریا کمانڈر نے میرے اثبات پر آگے بڑھ کر مبارکباد دی تھی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ "علی! یاد رکھنا وہاں تمہارا گاؤں بھی ہے اور گاؤں میں تمہاری ماں بھی ہے۔ چھوٹے بھائی بہن بھی ہیں۔ مجھے پتا ہے تم اپنی ننھی بہن سکینہ سے بہت پیار کرتے ہو لیکن یاد رکھو، ہر رشتے سے بڑھ کر فرض ہے۔ تم فرض کے راستے سے بھٹک نہ جانا۔"

"نہیں، میں فرض کو بھول نہیں سکتا۔ میرا وطن غلامی کی زنجیروں میں جکڑا کراہ رہا ہے۔ ایسے وقت میں، میں کیسے اپنے بھائی بہنوں اور ماں سے ملنے جاؤں گا۔ نہیں، میں فرض پورا کر کے لوٹ آؤں گا۔"

"یہیں ہم غلطی کر رہے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہماری تاریخ کا ہر باب ہمارے لیے درس ہے یاد رکھو یہ کشمیر کربلا ہے، ظلم و جفا کربلا۔ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ظلم و جبر سے ٹکرانے کے لیے نکلے تھے تو کیا اپنے گھر کے بچوں کو مدینہ میں چھوڑ آئے تھے؟ نہیں ناں؟ تو پھر تم اپنے گھر والوں کو کیوں چھوڑنا چاہتے ہو۔ تم ان سے ملو گے۔ ان کے حوصلے بڑھاؤ گے۔ ان کی خیریت معلوم کرو گے مگر تب جب اپنا فرض پورا کر لو گے۔ چوکی کو اڑا دو گے۔"

"آپ جیسا کہیں۔" میں نے جواب دیا تھا اور کلاشنکوف کو اٹھا لیا تھا۔ کمر سے پانچ گرینیڈ کی جھالر باندھی تھی اور آپریشن پر روانہ ہو گیا تھا۔

کہتے کہتے کمانڈر علی رکا تھا اور گہری سانس لے کر بولا تھا۔ "میں جس وقت اس علاقے میں پہنچا تو رات گھر آئی تھی۔ تاریک رات، اکا دکا، دھندلا دھندلا ستارہ دور آسمان پر ٹمٹما رہا تھا۔ میں اچانک ہی زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے زمین مجھے پکار رہی ہے۔ ایک عجیب، مدھم مگر پُراسراری آواز میں۔ ہاں، ہاں وہ میری

دھرتی ماں کی آواز تھی۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی، میرے بیٹے، میرے جانباز مجاہد بیٹے، میرے غازی بیٹے، مجھے تم پر فخر ہے۔ میرے عزیز تم نے اپنی ماں کی عزت پر حرف نہیں آنے دیا۔ میری عزت کی حفاظت کی۔ میرے شیر جوان بیٹے، مجھے تم پر فخر ہے۔ جس ماں کے بیٹے اتنے غیرت مند، بہادر، دلیر اور شجاع ہوں وہ ماں کبھی کسی کی کنیز نہیں بن سکتی۔ غلامی کرنے پر اسے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔

پروفیسر! یقین کرو پروفیسر! اس وقت میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہونٹوں کو مٹی پر رکھ کر محبت کا اظہار کیا تھا پھر سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔ ماں! میری جان سے پیاری ماں! یقین کرو میں تجھے مایوس نہیں کروں گا۔ زندگی کے آخری لمحے تک، جسم کے آخری قطرہ خون تک میں تجھے آزاد کرانے کے لیے لڑتا رہوں گا۔ تیرے سینے کو روندنے والے کافروں سے چن چن کر بدلے لوں گا۔ ایک ایک ظلم کا حساب لوں گا۔ تُو آزاد ہو کر رہے گی۔

جانتے ہو پروفیسر! اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ زمین جو اندھیرے کی چادر میں شرمساری چھپانے کے لیے منہ لپیٹے ہوئے ہے، ایک سکون کی سانس لی تھی۔ وہ اطمینان بھری سانس خواہ میرے خیالوں میں گونجی ہو مگر میں پھر بھی مطمئن ہو گیا تھا اور کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر ایک نئے جذبے کے ساتھ کلاشنکوف تھامے آگے بڑھا تھا اور چوکی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ پھر کرولنگ کرتے ہوئے کافروں کے سر پر پہنچ گیا تھا دس قدم، ہاں صرف دس قدم کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔ میں نے کمر سے بندھی گرینیڈوں کی جھالر کو نکالا تھا اور پے در پے دانتوں سے پنوں کو کھینچ کھینچ کر چوکی پر اچھالتا چلا گیا تھا۔

دھماکہ، زوردار گڑگڑاہٹ، چیخیں، سسکیاں پھر خاموشی، گہری خاموشی، موت کا سناٹا اور لپلپاتی ہوئی آگ کی لپیٹیں۔

میں جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا۔ اطراف کا جائزہ لیا۔ چند منٹ قبل وہاں ایک بیرک نما کمرا تھا۔ اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ گری پڑی اینٹیں، ٹوٹی پھوٹی لکڑیاں، جھلستی ہوئی زمین اور مرغولوں میں اٹھتا ہوا دھواں، میرے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی تھی۔ اس وقت میں وہاں اکیلا تھا۔ خود مختار، بے خوف۔ میں نے غلامی کی زنجیر سے ایک کڑی توڑ دی تھی۔ زمین کا وہ ٹکڑا آزاد ہو چکا تھا۔ اس علاقے سے دلی فوج کی ایک اور چوکی نیست و نابود ہو چکی تھی۔ میں نے جھک کر تاریکی میں ملبے کو ٹٹولا۔ تھوڑی ہی دیر میں کئی رائفلیں ملبے کے نیچے سے نکل آئیں۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد میں مزید دو رائفلیں ڈھونڈ چکا تھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے تمام رائفلیں اٹھائیں اور پھر جھاڑیوں کی طرف چل پڑا۔ جھاڑیوں کے پیچھے ایک بڑا سا تھیلا پڑا تھا۔ بوری نما تھیلا، اس میں پہلے ہی سے کئی چیزیں بھری ہوئی تھیں، اسی میں رائفلیں ٹھونس لیں۔ پھر اسے اٹھا کر کندھے پر لادا اور آگے کی سمت بڑھتا چلا گیا۔

اب میں اپنے گاؤں جا سکتا تھا۔ ابھی پو پھٹنے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں یہاں سے تیز تیز چلتا رہوں تو ڈیڑھ گھنٹے میں اپنے گاؤں پہنچ سکتا ہوں۔ اپنے گھر میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرنے کے بعد میں پو پھٹنے سے پہلے گاؤں سے نکل سکتا ہوں۔ مجھے صبح ہونے تک بارہ مولا کے قریب اپنے خفیہ اڈے پر پہنچنا ضروری تھا۔ میں بار بار فاصلے اور وقت کو ذہن میں لا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا ٹھیک وقت پر اپنے کیمپ میں پہنچ جاؤں گا۔

میری چال خود بخود تیز ہوگئی۔ اب میں اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ذہن کی رفتار میرے قدموں کی رفتار سے بھی تیز تھی۔ بار بار کئی چہرے میری آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ صاحب جان، سکینہ اور اماں کے چہرے، ان پر رات کی تاریکی کا ذرا بھی اثر نہیں تھا۔ تمام چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ منظر اب بھی آنکھوں میں تیر رہا تھا جب میں گھر سے نکل رہا تھا۔ میری ماں نے میرے دونوں کندھوں کو پکڑ کر کہا تھا۔

''علی! میں کب سے اس موقع کی منتظر تھی۔ ایک عرصہ سے یہ خواب دیکھ رہی تھی مگر بیٹے جانے سے پہلے تجھے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''کیسا وعدہ؟'' میں نے ماں سے پوچھا تھا۔

''ایک ہی وعدہ! تم اپنے نام کی لاج رکھو گے کہ پیٹھ پر گولی نہیں کھاؤ گے۔ گولی آئے تو اپنا سینہ بڑھا دو گے۔'' اس وقت میری ماں کا سر تنا ہوا تھا۔ آنکھیں شرارے اگل رہی تھیں۔ چہرے پر ایک ملائمت آمیز استقامت تھی۔ شدت جذبات سے اس کے وجود میں لرزش پیدا ہو چکی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ''تم نے وہ گیت سنا ہوگا۔ میرے وطن، میرے وطن، ہم لوٹ آئیں گے ایک دن، تمہاری وہ بہنیں، وہ بھائی جو آزاد کشمیر کے مہاجر کیمپوں میں پڑے ہیں، یہ آواز ان کی ہے۔ یہ خواب ان کا ہے۔ اپنے گھر کو چھوڑ کر جانے والوں کے خوابوں کو تعبیر دینے کی ذمے داری اب تمہاری ہے۔'' اس وقت ماں کی آنکھوں میں شرارے دمکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ مجھے چوم رہی تھیں۔ اپنے سینے سے لگا رہی تھیں۔

میں اڑا چلا جا رہا تھا۔ فاصلے سمٹ رہے تھے۔ میں اس علاقے کے ایک ایک

درے، ایک ایک موڑ سے واقف تھا۔ آنکھیں بند کر کے اپنے گاؤں پہنچ سکتا تھا۔ وہ سارے لمحے جو آخری اور الوداعی ملاقات کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھے وہ سارے لمحے تصویروں اور آوازوں کی صورت میں میرے ذہن کے پردے پر کھنچے چلے آ رہے تھے۔ ان میں بعض لمحے بہت اذیت ناک تھے۔ بعض لمحے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے تھے۔ اپنی ننھی بہن کو دیکھ کر میں سوچا کرتا تھا کہ جب میں مقابلے کے لیے جاؤں گا تو یہ مجھے بہت یاد آئے گی اور اس کی یاد میرے دل کو بوجھل کر دے گی۔ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ اگر میں بھی مر گیا تو...... اس کے بعد میرا ذہن تاریک ہو جاتا۔ دل ڈوبنے لگتا۔ میں سوچتا میری پیاری بہن کا کیا ہوگا۔ یہ تو ابھی اتنی چھوٹی ہے کہ اسے تو ابا کی شکل بھی یاد نہ ہوگی۔ مجھے ہی سب کچھ سمجھتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں دانت پیسنے لگتا اور دل میں کہتا، میں بزدل ہو گیا ہوں۔ میں سب کچھ سننے کے لیے تیار تھا لیکن بزدل کہلوانا پسند نہ تھا۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ میں مر جاتا......

اس وقت جب میرے قدم تیزی سے اپنے گاؤں کی طرف اٹھ رہے تھے، اس وقت میری آنکھوں کے سامنے بہن کا چہرہ بار بار آ رہا تھا۔ سب سے روشن و منور چہرہ، پھولے پھولے سرخ رخسار، بال بھورے، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، توتلے لہجے میں گنے چنے الفاظ پر مشتمل کچھ مبہم اور کچھ غیر مبہم باتیں۔

ایک لمحے کے لیے میں رک سا گیا۔ میں راستہ نہیں بھولا تھا۔ ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ میرا ایک ایک قدم مجھے گاؤں کے قریب کر رہا تھا لیکن سکینہ کا جاں افزا تصور تھا جس نے ایک لمحے کے لیے میرے قدم روک دیے تھے۔

کچھ تیز تیز چلنے سے، کچھ یادوں کی حدت اور کچھ جذبات کی شدت سے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ میں اب گاؤں کے قریب آ چکا تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ میں ٹھیک راستے پر بڑھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں اب تب میں گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ میں نے سوچا۔ اماں اور سکینہ مجھے اچانک سامنے دیکھ کر کتنا خوش اور کتنا حیران ہوں گی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ سکینہ اب بھی سو رہی ہوگی لیکن میں اسے جگا دوں گا۔ ہاں اب میں اسے سونے نہیں دوں گا۔ اس سے خوب باتیں کروں گا، خوب پیار کروں گا۔

میں نے ایک لمبی سانس بھری۔ مجھے احساس تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔ میں زیادہ دیر گاؤں میں نہیں ٹھہر سکتا لیکن جتنی دیر ٹھہروں گا، اس میں، میں اپنی اماں کو یہ ضرور

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بتاؤں گا کہ اس کا بیٹا علی ایک بہادر مجاہد ہے۔ میں اپنے کچھ معرکوں کی کہانی اماں کو ضرور سناؤں گا کہ کس طرح میں نے کئی دفعہ دشمن کو جان پر کھیل کر ختم کیا۔ کس طرح کئی بار ایسا ہوا کہ میری جان خطرے میں پڑ گئی لیکن میں ہراساں نہ ہوا۔ میں اماں کو بتاؤں گا کہ ابھی ابھی ایک چوکی کو تباہ کر کے آ رہا ہوں۔ میں ایک سچا مجاہد ہوں۔ میں اماں کو بھارتی فوجیوں کے مظالم کی داستانیں سناؤں گا اور بتاؤں گا کہ مجاہدین نے کس طرح جان کی بازی لگا کر بھارتی فوجیوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ میں اپنی اماں کو یہ خوشخبری ضرور سناؤں گا کہ جلد بہت جلد میں ظالم فوجیوں کے تسلط سے اپنے ملک کو نجات دلا دوں گا۔ کشمیر کو آزاد کرا لوں گا۔

اب میں گاؤں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے مکان بڑے بڑے دھبوں کی صورت میں دکھائی دینے لگے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے سارا گاؤں ابھی جاگ جائے گا اور مجھ سے ملنے کے لیے دوڑا چلا آئے گا۔

پروفیسر! آپ نے کسی پیاسے کو دریا کنارے پہنچتے دیکھا ہے؟ اس وقت پیاسے کی جو کیفیت ہوتی ہے وہی کیفیت میری تھی۔ دل کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ قدموں میں بھی کچھ لڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی اور آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ میں نے فرغل کی آستین سے آنکھوں کو رگڑا اور پھر تیز تیز چلنے لگا۔ چند لمحوں بعد میں گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ میرا گاؤں تھا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ جہاں میں بڑا ہوا تھا۔ جہاں میرے باپ کی قبر تھی۔ اس گاؤں میں میری بہادر اور غیرت مند ماں رہتی تھی۔ اس گاؤں میں میرے دوست تھے، احباب تھے۔ سب لوگ اپنے تھے۔ اسی گاؤں میں میرے اپنے گھر میں میری ننھی بہن سکینہ سو رہی تھی۔ میں نے خود سے کہا میں جاتے ہی اسے پیار کروں گا۔ جتنی دیر گاؤں میں ٹھہروں گا، سکینہ کو اپنی گود میں لیے بیٹھا رہوں گا۔ بالآخر میں اس گلی میں داخل ہو گیا جس کے سرے پر میرا گھر تھا۔ پھر میں اپنے گھر کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے میں بند دروازے کو گھورتا رہا۔ ابھی یہ دروازہ کھلے گا اور پھر...... میں نے دروازے پر دستک دی۔ خاموشی، سناٹا، تاریکی، کوئی جواب نہ ملا۔ کسی کی چاپ سنائی نہ دی۔ میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ دھندلے ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر دستک دی۔

پروفیسر! کاش میں اس روز گاؤں نہ جاتا۔ کاش میں دستک نہ دیتا۔

☆======☆======☆

غلام رسول کی نظریں بار بار گھڑی کا طواف کر رہی تھیں۔ وقت بہت آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔ آخر کار ڈیڑھ بج گیا اور اسی وقت بجلی چلی گئی۔ اندھیرے میں کمرے کے فرش پر چاندنی کی پٹی نمایاں نظر آ رہی تھی لیکن وہ شیطانی شبیہہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور سفید سوٹ والی کی تلاش میں دروازے کی طرف چل دیا کیونکہ گزشتہ شب بھی وہ اسی وقت نظر آئی تھی۔ وہ اسے نزدیک سے دیکھنا چاہتا تھا۔ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس پوری عمارت میں کیتھی کے علاوہ کوئی دوسری عورت نہیں تھی اور کیتھی نے بتا دیا تھا کہ وہ ساری رات بے خبر سوتی رہی تھی۔ پھر کیتھی یورپین تھی وہ فرغل نما سوٹ پہننا نہیں جانتی تھی جس پر ساڑھی کا گمان ہو پھر وہ کون تھی۔ غلام رسول کے ذہن میں یہ بات چبھ کر رہ گئی تھی اسی لیے وہ اتنا بے چین تھا۔

دروازے تک پہنچنے کے لیے اسے چاندنی کی اس پٹی کو عبور کرنا تھا جس پر کل اسے ایک شیطانی شبیہہ نظر آئی تھی۔ جونہی وہ اس جگہ پہنچا، یکلخت وہ مکروہ چہرہ چاندنی کی پٹی پر نمودار ہو گیا۔ غلام رسول تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اسے ایسے لگا تھا گویا وہ اس کی ٹانگوں سے چمٹ جائے گا اور فرش پر گرا کر اس پر سوار ہو جائے گا۔ اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دے گا۔

وہ ہیبت ناک چہرہ آگے پیچھے، دائیں بائیں مسلسل حرکت کر رہا تھا جیسے رقص کر رہا ہو اور اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ بلا شبہ اس وقت اس پر خوف طاری ہو گیا تھا مگر خوف کی وہ کیفیت نہیں تھی جو گزشتہ رات تھی اور غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ غلام رسول اسے دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ غلام رسول اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ چہرہ مادی نہ تھا محض ایک سایہ تھا۔ اسے اب اس بات کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ اس کا وہم ہرگز نہیں ہے۔ کوئی طاغوتی قوت اسے پھانسنے کی کوشش میں ہے مگر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ کیوں کوئی اسے پھانسنا چاہتا ہے۔ اس کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا اور تبھی اس کے ذہن میں پروفیسر کا قسط وار خواب اور علی مدد شاہ کا انگلش بولنا ابھر آیا۔ وہ انہی باتوں پر غور کر رہا تھا کہ دروازہ دھڑ سے کھلا اور وہ بری طرح چونک گیا۔ دروازے کے بیچوں بیچ وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اسی سفید سوٹ میں، سنگِ مرمر کی مورت جیسی۔ غلام رسول کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی خوبصورت ہو گی۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگ چودھویں کے چاند کی طرح روشن اور شفاف۔ اس کا قد سرو کی مانند تھا۔ چشمِ آہو کی مانند سیاہ اور کشادہ آنکھیں، دانت سفید آبدار موتی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایسے اور بال گھٹنوں کو چومتے ہوئے جیسے ساون کی گھن گھور گھٹا، گردن لمبی، شانے بھرے بھرے اور کلائیاں میدے کی لوئی جیسی تھیں۔ وہ سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ حسن و شباب کا ایسا حسین امتزاج غلام رسول نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے جیسے اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی ہو۔ اس عالم میں وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔

غلام رسول اس فسوں ساز کرشمہ ساز حسن و جمال کے سحر کا اسیر بن گیا کر رہ گیا تھا۔ اس کے لب ہلنا اور آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھیں گویا وہ پتھر کی مورت میں بدل چکا تھا۔ تبھی ایک کھنکھناتی چوڑیوں کی جھنکار جیسی آواز سنائی دی۔ ''آپ...... آپ سے میں دو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''تم...... تم کون ہو؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''میں زونو ہوں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''کہ...... کیا...... تم...... تم زونو ہو؟'' غلام رسول کی آواز کانپ اٹھی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ پروفیسر جو قسط وار خواب دیکھ رہا ہے اس خواب کا مرکزی کردار زونو ہے۔

''جی ہاں! میں ہی زونو ہوں۔ چوکیدار کی اکلوتی بیٹی! کل ہی اپنے گاؤں سے یہاں آئی ہوں۔''

''اوہ اچھا!'' غلام رسول کی جان میں جان آئی۔

''ہمارے ہاں پردے کا سخت رواج ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی پر کسی غیر مرد کی نظر نہیں پڑنے دی جاتی ہے۔ آپ نے غور کیا ہو گا ابھی تک آپ کو اس پورے علاقے میں ایک بھی جوان لڑکی نظر نہیں آئی ہو گی۔''

''ہاں! یہ بات تو ہے۔''

''مجھے بھی باہر نکلنے سے منع کیا گیا ہے مگر میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے اس پرانی حویلی کو بھاری قیمت پر خریدا ہے۔''

غلام رسول کی زندگی بہت سادہ تھی۔ اس نے کبھی کسی غیر لڑکی کو میلی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی زندگی ستاروں پر ریسرچ کرنے کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ قرآن پاک کی روشنی میں اس وسیع کائنات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اسی وجہ سے اس کے لیے عورت کا وجود بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ زندگی کے میٹھے برس، وہ سنہرا دور جسے لوگ جوانی کہتے ہیں، وہ گنوا چکا تھا۔ اب تو بڑھاپے کی آمد آمد تھی۔ ایسے وقت میں کسی دوشیزہ

کا سحر کیسے طاری ہوتا مگر پتا نہیں کیوں وہ اس لڑکی کو دیکھ کر ڈگمگا اٹھا تھا۔ بجھتی ہوئی شمع آخری بار بھڑکتی ہے۔ جاتی ہوئی جوانی دم آخر منہ زوری پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی شاید یہی ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح ڈگمگا اٹھا تھا۔ وہ لڑکی اسے اچھی ہی نہیں بہت اچھی لگی تھی۔ اسے اپنا دل کھنچتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

''اے! اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟'' لڑکی نے اسے ٹوکا۔

''کچھ...... کچھ نہیں۔'' غلام رسول گھبرا اٹھا تھا اور اس نے جسم کے اندر انگڑائی لیتے شیطان کو مارنے کے لیے قرآن مجید کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن جیسے ہی اس نے ہاتھ بڑھایا تھا کہ لڑکی نے گھبرا کر کہا۔

''اے سنو!''

☆======☆======☆

''پروفیسر! کاش میں اس دن دستک نہ دیتا۔ چوتھی دستک کے بعد گھر کے اندر سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔

''کہیں اماں بیمار تو نہیں۔'' میں نے سوچا۔

''کون ہے؟'' اندر سے مدھم سی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں ہوں علی!'' میں نے قدرے بلند سرگوشی کے انداز میں جواب دیا۔

دروازہ کھلا، میں تیزی سے آگے بڑھا لیکن سامنے ایک سایہ کھڑا تھا۔ دروازہ روک کر راستہ بند کر کے وہ سایہ پوچھ رہا تھا۔ ''کون ہو تم؟''

میں نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ''اماں...... میں ہوں علی! تیرا بیٹا۔''

''علی!'' آواز میں درد پنہاں تھا۔ ''بیٹا تو آ گیا؟'' دوسرے لمحے ہم ماں بیٹے ایک دوسرے کے گلے لگے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں خود بخود دریائے جہلم بن گئی تھیں۔ اماں کا کمزور وجود میرے بازوؤں میں کانپ رہا تھا۔ وہ کمزور و نحیف آواز میں کہہ رہی تھیں۔ ''علی میرا بیٹا! میرا مجاہد بیٹا آ گیا تو آ گیا۔''

''ہاں اماں! میں آ گیا۔ چلو اب اندر چلو۔ وقت بہت کم ہے، مجھے واپس بھی جانا ہے۔''

میں اماں کو سہارا دے کر اندر کی طرف بڑھا۔ چھوٹے سے صحن کو پار کر کے ہم اندر پہنچے جہاں گھپ اندھیرا تھا۔ کوئی چراغ روشن نہیں تھا۔ اماں کی چارپائی سے میرا پیر ٹکرایا۔ میں نے اماں کو چارپائی پر بٹھا دیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''اماں! چراغ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا لیکن اماں نے جواب نہیں دیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھی ہانپ رہی تھیں۔ میں نے اپنا بوری نما تھیلا زمین پر رکھ دیا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکالی۔

اسی لمحے اماں کی آواز سنائی دی۔ ''علی! چراغ نہیں ہے۔''

''چراغ نہیں ہے۔ کیا سب لوگ اندھیرے میں سوتے ہیں؟''

اماں خاموش رہیں۔ یہ خاموشی مجھے گراں گزر رہی تھی۔ دماغ کی نسیں پھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس گھپ اندھیرے میں بھی میری نظریں تلاش کر رہی تھیں۔ سکینہ کہاں ہے۔ چھوٹا بھائی کہاں ہے۔ کیا وہ سب ایسی گہری نیند سوتے ہیں کہ کون آیا یہ پتا بھی نہیں چلتا مگر اماں کے علاوہ کسی کی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تبھی اماں نے کہا۔

''بیٹا! میں نے تجھے ایک فرض سونپا تھا۔ بتا میرے لعل تُو نے اس فرض کو کہاں تک پورا کیا؟ کتنے دشمن وطن کو واصل جہنم کیا؟ کتنے کافروں کا سر کاٹا۔ تجھے یاد ہے ناں کہ تیرے کچھ مجبور بھائی بہن کوسوں دور کیمپوں میں بیٹھے نغمہ گا رہے ہیں۔ ''میرے وطن ہم آئیں گے ایک دن!'' کیا تُو نے اس نغمے کو تعبیر دینے کے لیے کوئی ٹھوس قدم اٹھایا۔ بتا ناں میرے لعل، تُو نے پیٹھ پر زخم تو نہیں کھایا ناں۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا پھر بولا۔ ''ماں! میں تیرا بیٹا ہوں۔ تیرا دودھ پیا ہے میں نے۔ ایک نہیں بہت سارے کافروں کو جہنم رسید کیا ہے۔ بہت سی چوکیوں کو پاک کیا ہے۔ اماں...... میں اس وقت بھی ایک چوکی کا صفایا کر کے آ رہا ہوں۔''

''اللہ تیرا شکر ہے، میرا بیٹا کامیاب ٹھہرا۔'' ماں نے ہاتھ اٹھا کر کہا پھر ان کے بوڑھے وجود میں حرکت اور جنبش پیدا ہوئی اور انہوں نے یکدم چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''علی اٹھ! میرے ساتھ چل۔''

''کہاں چلوں اماں؟''

''تُو کچھ نہ بول، کچھ نہ پوچھ، تُو اٹھ میرے ساتھ چل۔ تُو نے کہا تھا کہ وقت کم ہے۔ تجھے واپس جانا ہے۔''

''ہاں اماں! میرے پاس وقت کم ہے۔ ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔ کمانڈر کو رپورٹ دینی ہے ناں۔''

''تو پھر چل، وقت ضائع مت کر، چل میرے لعل!''

سینکڑوں سوال میرے دل میں مچل رہے تھے مگر میں نے لب سی لیے اور ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح ماں کے ساتھ چل پڑا۔

''میرا ہاتھ پکڑ لے۔ مجھے گھر سے باہر لے چل۔'' اماں نے رندھے گلے سے کہا۔

''گھر کے باہر، سکینہ وغیرہ کہاں ہیں۔ انہیں بھی ساتھ لے لیں۔'' میرے منہ سے بے اختیار یہ بات نکل گئی۔

اماں کا لہجہ یکدم بہت نرم اور درد بھرا ہو گیا۔ وہ بولیں۔ ''انہی کے پاس لے کر چل رہی ہوں۔''

''اماں وہ کہاں ہیں۔ وہ تیرے پاس کیوں نہیں ہیں؟'' میں یہ سوال کرنے سے خود کو روک نہ سکا۔ انجانے خدشے سے میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔

''کچھ دیر کے لیے چپ نہیں رہ سکتا۔ چل میرے لعل!'' اماں کی آواز میں التجا تھی۔ میں نے انہیں سہارا دیا اور باہر کی سمت چل پڑا۔

باہر اندھیرا تھا گہرا اندھیرا۔ میں اندھیرے میں اماں کو سہارا دیے گاؤں کی گلیوں سے گزر رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اماں مجھے کہاں لے جا رہی ہیں۔ میں گویا حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ان کے ساتھ چلتا رہا۔

پروفیسر! میں گھنٹوں پیدل چل سکتا ہوں۔ میلوں کا سفر پیدل طے کر سکتا ہوں مگر اس رات مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے پیروں میں جان نہیں ہے۔ میں خود کو گھسیٹ رہا ہوں۔ شاید یہ احساس میری چھٹی حس نے پیدا کیا تھا۔

☆======☆======☆

غلام رسول نے لڑکی پر نظر ڈالی تھی پھر قرآن کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ لڑکی چیخی۔ ''نہیں...... اسے کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔ بعد میں تلاوت کر لینا۔ ابھی تو مجھ سے باتیں کرو۔'' اس کی آواز میں ایسا سحر تھا کہ وہ ہاتھ آگے بڑھاتے بڑھاتے رک گیا تھا۔

''دیکھو غلام! میں تم سے ملنے آئی ہوں اور تم ہو کہ مجھ سے دور ہو رہے ہو۔'' اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

غلام رسول پر اس کے لہجے نے جادو سا کر دیا۔ وہ مڑ کر بولا۔ ''تم...... تم مجھے پاگل کر دوگی۔ خیر چلو بیٹھو۔''

''یہاں نہیں، آؤ میرے ساتھ کیونکہ یہاں رہو گے تو کبھی اس کتاب کو چھیڑو گے تو کبھی اس کتاب کو۔ آدھی زندگی تو کتابوں میں دفن کر چکے ہو۔ باقی زندگی کا لطف تو اٹھا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لو۔ زندگی ریگستان نہیں، نخلستان ہے، اس چمن میں پھول کھلانے سے زندگی کا صحیح لطف آتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔'' کہہ کر اس نے اسٹڈی روم سے باہر قدم نکالا۔ غلام رسول کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل پڑا۔

وہ گلیارے میں آئی پھر اندر والے کمرے کی طرف چل پڑی۔ ایک کے بعد ایک کمرے کے سامنے سے گزرتی ہوئی وہ بڑے کمرے کے ہال میں پہنچی پھر اس نے دیوار پر ہاتھ مارا تو فرش دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ غلام رسول حیرت بھری نظروں سے اس راستے کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی نظر آیا تھا یہ راستہ فرش کے نیچے جا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا گہرائی تک سیڑھیاں تھیں۔

''آؤ...... آؤ میرے ساتھ۔'' لڑکی نے سیڑھی پر قدم رکھ کر کہا۔ غلام رسول پر گویا سحر طاری تھا۔ وہ کسی معمول کی طرح آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک بعد ایک سیڑھیاں طے کرتا ہوا وہ نیچے اترا۔

یہ ایک ہال نما کمرا تھا۔ اس کمرے میں ضروریات زندگی کی بہت ساری چیزیں تھیں۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ درمیان میں بڑا سا چھپر کھٹ جس پر نفیس مسہری لگی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی شاہزادے کی خوابگاہ ہو۔

''آؤ رک کیوں گئے۔ یہ خواب گاہ تمہیں آواز دے رہی ہے۔''

غلام رسول آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا۔

''بیٹھو، بیٹھو ناں!'' لڑکی دلفریب انداز میں مسکرائی پھر لہراتی ہوئی بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ ایک دعوت تھی، ایک پیغام تھا۔ اس کے پنکھڑی جیسے ہونٹ ہلے۔

''واقعی تمہیں مجھ سے بہت محبت ہے؟''

''ہاں، بلکہ اتنی کہ اسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔'' اس وقت غلام رسول کی حالت ایسی تھی جیسے وہ آپے میں نہ ہو۔ وہی شخص جو عورت کے نام سے بدکتا تھا اس وقت غلام بنا مسکین آواز میں بول رہا تھا۔ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے اس کے جسم میں مجنوں یا مہینوال کی روح حلول کر گئی ہو۔

لڑکی نے اس کی بات پر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کوئی تو حد ہو گی۔ کتنا پیار کرتے ہو اس کی حد بتا دو۔''

''اگر اس جہان کی وسعتوں کی حد کا کوئی تعین کر سکتا ہے تو میری محبت کی حد کا تعین کر لے۔'' غلام رسول نے مخمور لہجے میں جواب دیا۔ وہ مدہوش اور سحر زدہ سا اس پری وش کو دیکھے جا رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''تمہاری ذات میں اپنی دنیا دیکھ رہا ہوں۔'' غلام رسول نے بے باک لہجے میں جواب دیا۔ اس پر ایک عالم بے خودی طاری تھا۔ ''تمہاری محبت میری زندگی کی معراج ہے۔ تمہاری خاطر میں دنیا کو ٹھکرانے پر تیار ہوں۔ سر تک کٹا سکتا ہوں۔''

''سچ! تم میری خاطر اپنا سر بھی کٹا سکتے ہو۔ جان تک دے سکتے ہو؟'' لڑکی کی آواز جذبات سے کانپ اٹھی تھی۔ اس پر خود سپردگی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ رخسار تمتما رہے تھے اور سانس کا زیر و بم یہ احساس دلا رہا تھا جیسے تیز اور ہلچل لہروں پر کوئی کشتی بغیر چپو کے ڈول رہی ہو اور جسے ساحل کی تلاش ہو۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ بند کر دی۔ تہہ خانے میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ وہ تہہ خانہ جس کا پتا غلام رسول کو بھی نہ تھا۔ اس میں جنریٹر کی لائن کیسے آئی اس بات پر اس نے غور بھی نہیں کیا تھا۔ لائٹ بجھنے کا سبب بھی اس نے دریافت نہ کیا۔ وہ تو گویا بستر پر ڈھے گیا تھا۔ اس کے چوڑے سینے پر پھیلے بالوں میں لڑکی کی انگلیاں سرسرا رہی تھیں۔ آگے ہی آگے پھسلتی ہوئی انگلیاں غلام رسول کے گلے میں پہنے حمائل شریف سے ٹکرائیں اور اس کی چیخ تہہ خانے میں گونج اٹھی مگر چیخ کی آواز غلام رسول کی سماعت تک پہنچ نہ پائی۔ وہ ہوش کی حد سے گزر چکا تھا۔ تمام حسیں خوابیدہ ہو چکی تھیں۔ وہ بے ہوشی کی کیفیت میں پڑا ہوا تھا۔

☆======☆======☆

پروفیسر! میں اس رات خود کو گھسیٹتے ہوئے اماں کے ساتھ چل رہا تھا۔

''اماں! بتاتی کیوں نہیں، تُو کہاں جا رہی ہے۔'' بالآخر میں نے پوچھ لیا۔

''تُو یہاں گاؤں میں کس سے ملنے آیا ہے؟'' ماں نے سوال کیا۔

''تجھ سے بھائی سے اور سکینہ سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''مجھ سے مل لیا۔ اب کیا بھائی اور اپنی پیاری بہن سکینہ سے نہیں ملے گا؟'' ماں نے تیز سرگوشی میں کہا اور قدم تیز کر دیے۔ میرا دماغ چکرا اٹھا۔ سکینہ کو ماں کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ وہ کہیں اور کیوں گئی۔ بھائی کو بھی ذرا عقل نہیں۔ بوڑھی ماں کو بھی اکیلا چھوڑنا چاہیے۔ ملاقات ہو لے میں اسے خوب ڈانٹوں گا۔ سکینہ کو بھی ڈانٹوں گا۔ اس نے یہ حرکت کیوں کی۔ یہی کچھ سوچتا ہوا میں ماں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا پھر ماں ایک جگہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رک گئی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ ہم گاؤں سے باہر آ چکے تھے۔ سامنے قبرستان تھا۔ وسیع قبرستان جس میں گاؤں کے بہت سارے افراد سوئے ہوئے ہیں۔ یہیں میرا بھی سو رہا ہے۔

''یہیں ہے سکینہ اور تیرا بھائی۔'' ماں نے گویا میرے دماغ پر ہتھوڑا مارا میں چکرا اٹھا۔ مجھے زمین آسمان گردش کرتے ہوئے محسوس ہوئے۔

''ماں! یہ تُو کیا کہہ رہی ہے۔'' میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''شش! آہستہ بول، میری بیٹی اور بیٹا دونوں آرام کر رہے ہیں۔ جب تُو جا رہا تھا اس دن بھی سکینہ سو رہی تھی ناں! لے دیکھ لے وہ آج بھی سو رہی ہے۔''

''اماں...... اماں!'' میری چیخ سسکیوں میں بدل گئی تھی۔

''چل جلدی چل وہ بھی بے چین ہو گی۔'' کہہ کر اماں قبرستان میں داخل ہو گئیں۔ پھر دو قبروں کے بیچ میں بیٹھ کر بولیں۔ ''یہ...... یہ میری سکینہ ہے۔ پیاری سی ننھی سی نٹ کھٹ سی بیٹی اور یہ...... یہ میرے بیٹے کی قبر ہے جس نے جوانی نہ دیکھی۔''

میں نے قبروں کو دیکھا۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں کے سامنے دو قبریں تھیں۔ ایک چھوٹی اور ایک بڑی۔ میں چھوٹی قبر سے لپٹ گیا۔

اماں بھائی کی قبر کو سہلا رہی تھیں۔ تھپکیاں دے رہی تھیں جیسے وہ لوری دے رہی ہو۔ پھر خود ہی بولنے لگیں۔ ''آج سے ٹھیک 24 دن پہلے وہ لوگ گاؤں میں گھس آئے۔ ایک ایک گھر کی تلاشی لی۔ سب کو ہانک کر باہر نکالا پھر عورتوں اور مردوں کی ایک ایک لائن بنائی پھر تفتیش شروع ہو گئی۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ اس گاؤں میں کون کون مجاہد ہے؟ کس کس کا رابطہ مجاہدوں سے ہے مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ کسی میں حوصلہ ہی نہیں تھا۔ سب خاموش تھے۔ یوں بھی گاؤں میں جواب دینے والا کون باقی تھا۔ تمام جوان تو گاؤں سے باہر ہیں۔ بوڑھے یا بچے کیا جواب دیتے۔ سب کو خاموش دیکھ کر ان کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ ہماری عزتوں کو اپنے لیے منتخب کرنے لگے۔ لڑکیوں پر قیامت آئی ہوئی تھی۔ سکینہ خوف زدہ ہو کر میری ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی اور تب اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ میرے ننھے شیر کو جلال آ گیا۔ اس نے قریب کھڑے شخص کی رائفل چھینی اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سارے فوجی لاشوں میں بدل گئے لیکن وہ خود بھی زخمی ہو گیا۔ گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ پھر جب اس نے سپاہیوں کو سکینہ کی طرف بڑھتے دیکھا تو مرتے مرتے اس میں اتنی طاقت آ گئی کہ اس نے رائفل سنبھالی اور سکینہ کو اپنی پیاری بہن کو نشانہ بنا کر گولی

چلا دی۔ علی! میرے چھوٹے شیر نے بھارتیوں کا ہاتھ لگنے نہ دیا۔ جب وہ مر رہا تھا تو سکینہ کا سر اس کی گود میں تھا اور اس نے دم توڑتے ہوئے کہا تھا۔ ''اماں! بھیا آئے تو اسے کہہ دینا کہ میں نے گھر کی عزت کی حفاظت کی۔ میں نے سکینہ کو کسی کافر کا ہاتھ نہیں لگنے دیا۔ اماں ان سے کہہ دینا جب وہ گئے تھے تو سکینہ سو رہی تھی۔ میں بھی سو رہا تھا۔ جب وہ آئیں گے تو بھی سکینہ سو ہی رہی ہو گی۔ میں بھی سو رہا ہوں گا۔''

میری آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ مجھے ایک عجیب طرح کا قرار آ گیا تھا۔ میری نگاہیں دونوں قبروں کا طواف کر رہی تھیں۔ ماں جائے اور ماں جائی کی قبریں۔ ایک بڑی قبر، ایک چھوٹی قبر۔ چھوٹی قبر گویا بڑی قبر کی آغوش میں تھی جیسے بھائی کو بہن کے ڈر جانے کا خوف ہو۔ اماں بولے جا رہی تھیں۔ ''اس روز بہت عورتیں بچے مارے گئے۔ بہت سے گھر جلے لیکن کوئی کافر کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جا سکا۔ علی! میرے شیر! اب گاؤں میں چند بوڑھے اور چند بوڑھی عورتیں رہ گئی ہیں۔ ہمی نے سب کو غسلِ آخر دیا۔ ہمی نے سب کو دفنایا۔'' اماں کی آواز میں عجیب سی گونج تھی۔ وہ فخریہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔ ''دیکھ علی! اس قبرستان میں تیرا باپ بھی سو رہا ہے۔ اس قبرستان میں ہمارے گاؤں کی تمام جوان عورتیں اور سارے بچے ہمیشہ کی نیند سو رہے ہیں۔ علی...... علی بیٹا! میں بھی یہیں سوؤں گی، یہیں دفنانا۔''

میں جو تاریکی میں ابھرے ہوئے قبروں کے ڈھیر کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان ہلکا سپید ہو رہا تھا۔ میں گاؤں میں لوٹ آیا تھا۔ مجھے اپنے جن پیاروں سے ملنا تھا ان سے ملاقات کر لی تھی۔ مجھے جو آوازیں سننی تھیں سن لی تھیں۔ جن چہروں کو دیکھنا تھا دیکھ لیا تھا۔

''تیرا وقت ہو گیا ہے بیٹا!'' ماں کی آواز میں نمی تھی مگر لہجے میں استقلال تھا۔ ''جا بیٹا! تجھے فرض پکار رہا ہے مگر دیکھ پیٹھ پر گولی نہ کھانا۔ سکینہ سو رہی ہے، تیرا بھائی بھی سو رہا ہے۔ گاؤں کے دوسری عورتیں بچے بھی خوش ہیں۔ سب آرام سے سو رہے ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں ہم بھی یہیں سو جائیں گے۔ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس تُو اپنا فرض پورا کر، ان دراندازوں کو، ہماری پاک مٹی کو اپنے ناپاک قدموں سے روندنے والے کافروں کو پیچھے دھکیل دے۔ دہلی تک دھکیل دے، یہ سرزمین ہماری ہے۔ راجا رنجیت سنگھ نے جو چالبازی سے ہمیں غلام بنایا ہے، اس زنجیر کو تجھے توڑنا ہے۔ ایک تُو ہی نہیں۔ اس سرزمین کے ایک ایک نوجوان تک یہ پیغام پہنچا دینا کہ عزت کی موت غلامی کی زندگی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے اچھی ہے۔''

میں نے ماں کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ ماں کے نحیف بدن میں نئی قوت آ گئی۔ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔ ''اللہ تیرا حافظ و ناصر ہے، جا تجھے میں نے مادرِ وطن کو سونپا۔ اب وہ ہی تیری مالک و مختار ہے۔ اس کی آبرو کی حفاظت اب تیری ذمے داری ہے۔ جا بیٹا، جا مگر پیٹھ پر گولی نہ کھانا، جا بیٹا جا۔''

ماں نے مجھے تقریباً دھکیل دیا تھا۔ تب سے میں آگے ہی آگے بڑھ رہا ہوں۔ ایک کے بعد ایک چوکی اڑا رہا ہوں۔ مجھے پتا نہیں میری ماں کس حال میں ہے کیونکہ آتے وقت انہوں نے قسم دی تھی کہ اب مجھے اپنا چہرہ تبھی دکھانا جب غلامی کی زنجیر ٹوٹ جائے۔

پروفیسر! تب سے میں لگاتار اس مشن میں مصروف ہوں کہ میرا وطن جلد سے جلد آزاد ہو جائے۔'' کمانڈر علی نے اپنی کہانی سنا کر آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔

پروفیسر نے زندگی کے اس رخ کو نہیں دیکھا تھا۔ وطن کی خاطر قربانی کا ایسا جذبہ، وہ خود بھی اس کی باتوں میں کھو گئے تھے۔ اس کی کہانی ختم ہوتے ہی بری طرح چونک پڑے تھے اور آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو پونچھ کر بولے تھے۔ ''علی! میں نے وطن کو صرف زمین کا ایک ٹکڑا سمجھا تھا مگر آج مجھے احساس ہوا کہ زمین کا ایک ٹکڑا وطن نہیں ہوتا۔ اس ٹکڑے میں دل کی دھڑکن، جذبات و احساسات بھی ہوتے ہیں۔ یقین کرو میرے دوست! کشمیر تمہارا وطن ہے اور تم لوگ اسے پاک وطن سے الحاق کرنا چاہتے ہو۔ میں صرف اس لیے تمہارا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ تم میرے ہم مذہب ہو اور کفار تم پر مظالم ڈھا رہے ہیں۔ اس لیے بھی ساتھ نہیں دے رہا تھا بلکہ اب میں اس لیے ساتھ دوں گا کہ تمہاری ماں جیسی ہزاروں ماؤں نے جس جذبے کے تحت اپنے اپنے لختِ جگر کو موت کی آندھی میں چلے جانے کی اجازت دی ہے، اس آندھی کا رخ موڑنے کے لیے ساتھ دوں گا۔ میرا علم میرا تجربہ تمہارے بازوؤں کی قوت کے ساتھ مل کر ان بھارتی درندوں کے دانت کھٹے کرے گا۔''

باتوں کے دوران کب فاصلہ سمٹا، کب راستہ طے ہوا، کب وہ مولانا باقر کے دروازے پر پہنچے انہیں خود بھی پتا نہ چلا۔

وہ دونوں گاڑی سے اتر کر دھیرے دھیرے مولانا کے دروازے میں داخل ہونے لگے۔ تبھی پیچھے سے آواز آئی۔ ''اے رکو۔''

ان دونوں نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا اور سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے۔

☆======☆======☆

غلام رسول کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر پر تھا جبکہ اسے یاد تھا کہ وہ کسی تہہ خانے میں ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔ وہ اس کے سینے پر ہاتھ پھیر رہی تھی کہ چیخ گونجی تھی۔ اس کی چیخ نے غلام رسول کے حواس چھینے تھے۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور یہ بے ہوشی اب سورج نکلنے کے بعد ٹوٹی تھی۔

''تو کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟ کیا مجھے بھی پروفیسر کی طرح خواب دیکھنے کی بیماری ہو گئی ہے؟'' وہ خود سے سوال کر رہا تھا لیکن اس کے پاس جواب نہ تھا۔

وہ خود سے الجھتا ہوا واش روم میں آیا اور برش کر کے ناشتے کی ٹیبل پر پہنچا۔

کیتھی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس نے مسکرا کر صبح بخیر کہا پھر بولی۔ ''یہ تم اتنے تھکے تھکے سے کیوں نظر آ رہے ہو۔ کیا رات میں سوئے نہیں تھے؟''

''سویا ضرور تھا مگر ایک پریشانی نے ذہن کو مفلوج کر رکھا ہے۔''

''کیسی پریشانی؟ کیا پروفیسر کے نہ لوٹنے کی وجہ سے پریشان ہو؟''

''پروفیسر اپنے مالک و مختار ہیں۔ میں ان کے کسی کام میں دخل نہیں دیتا۔''

''تم ان کے دوست ہو۔ وہ تمہیں بھائی کہتے ہیں۔''

''انسان اکیلا آتا ہے۔ اکیلے جانا پڑتا ہے۔ مٹی کا پتلا ہے، مٹی میں مل جانا ہے اس لیے میں فکر فردا میں وقت برباد نہیں کرتا۔''

''تم ایک جینیٹنگ اسکالر کے معاون ہو کر جاہلوں جیسی باتیں کرتے ہو کہ انسان مٹی سے بنا ہے۔'' کیتھی نے پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

''جب قرآن کہتا ہے کہ انسان مٹی سے بنا ہے تو ہمیں یقین کامل ہے کہ انسان مٹی کا پتلا ہے۔'' غلام رسول ٹوسٹ پر مکھن کی چھری پھیرتے ہوئے بولا۔ ''سورۃ الروم کی آیت 20 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، اس قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے بنایا ہے۔''

''ہر بات میں قرآن، تم نے تو اپنے ذہن پر قرآن طاری کر لیا ہے۔ سائنس کہہ رہی ہے کہ انسان کا جسم خلیہ (Cell) سے بنا اور تم کہہ رہے ہو مٹی سے بنا۔'' کیتھی نے چائے کا سپ لے کر بحث کا آغاز کر دیا۔

''پرسوں میں نے بتایا ناں تھا کہ سائنس نے اب جا کر خلیہ (Cell) کو دریافت کیا ہے جبکہ قرآن نے ساڑھے چودہ سو سال قبل بتا دیا تھا۔ میں نے سیدنا امام جعفر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صادقؑ کی تقریر کا اقتباس بھی سنایا تھا جو انہوں نے اس موضوع پر ابو شاکر کے سامنے کی تھی۔ جس قرآن نے خلیہ کے بارے میں بتایا ہے اسی قرآن کا کہنا ہے کہ انسان مٹی سے بنا ہے۔''

''ثابت کرو کہ انسان مٹی سے بنا ہے۔'' کیتھی نے چیلنج کیا۔

''قرآن اشارے کنائے میں کہتا ہے تا کہ انسان غور وفکر کرے۔ غور وفکر سے ذہن کے دریچے کھلتے ہیں۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی Key استعمال کرنا پڑتی ہے۔ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ وہ اشیاء جو مٹی میں پائی جاتی ہیں، انسانی جسم میں مختلف مقدار میں موجود ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی تشریح ''بہار الانوار'' جلد 9 صفحہ 72 میں بہ زبان سیدنا امام جعفر صادقؑ یوں ہے کہ جو کچھ زمین میں ہے وہ انسانی جسم میں بھی ہے لیکن ان کا تناسب اس طرح ہے کہ چار حصے زیادہ مقدار میں اور آٹھ حصے ان سے کم اور پھر دوسرے آٹھ حصے پہلے آٹھ حصوں کی نسبت نہایت ہی کم مقدار میں موجود ہیں۔ بیلجیم کی یونیورسٹی آف برسلز اینڈ گان کے پروفیسر آرمان بل اپنی مشہور زمانہ کتاب ''سپر مین ان اسلام'' میں امام جعفر صادقؑ کے قول کی سائنسی تشریح یوں کرتا ہے۔ ''وہ آٹھ حصے جو انسانی جسم میں بہت کم مقدار میں ہیں، وہ یہ عناصر ہیں۔ مولبڈن، سیلیو نیم، فلورین، کوبالٹ، میگانز، تانبا، آیوڈین اور زنک وہ آٹھ عناصر جو انسانی بدن میں پہلے آٹھ عناصر کی نسبت زیادہ پائے جاتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔ میگنیشیم، سوڈیم، پوٹاشیم، کیلشیم، فاسفورس، کلورین، سلفر اور لوہا۔ وہ چار عناصر جو انسانی بدن میں زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں وہ آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن اور نائٹروجن ہیں اور اسی تناسب سے یہ تمام عناصر مٹی میں موجود ہیں تو انسان مٹی کا ہوا یا نہیں۔'' غلام رسول نے پوری تقریر کر ڈالی۔

''تم ایسے ایسے نکتے بیان کرتے ہو کہ میری دلچسپی بھی قرآن میں بڑھتی جارہی ہے۔ لگتا ہے مجھے بھی قرآن کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔'' کیتھی نے ہنس کر کہا۔

''قرآن پاک صرف مطالعہ کے لیے نہیں ہے، غور وفکر کرنے کے لیے ہے۔ اس کے ہر نقطہ کے اندر ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ جتنا غور کرو گی، اتنا ذہن کھلے گا اس لیے...''

وہ ابھی کچھ اور کہتا کہ دروازے پر انور نمودار ہوا۔

''صاحب جی! وہ اس بچے کا دادا آیا ہے آپ سے ملنے۔''

کیتھی اور غلام رسول کی باتوں میں رخنہ پڑ چکا تھا اس لیے غلام رسول نے اٹھ کر

مناسب سمجھا اور انور سے بولا۔ ''انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں آ رہا ہوں۔''

''لگتا ہے کوئی خاص بات ہے تبھی تو وہ معذور شخص آیا ہے۔'' غلام رسول نے کیتھی سے کہا۔

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ چلو میں بھی چلتی ہوں۔'' وہ بولی اور اس کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگی۔

علی مدد شاہ کا دادا کسی پیڑ کی ڈال سے بنی بیساکھی کے سہارے یہاں تک آیا تھا۔ وہ عجوبہ روزگار بیساکھی صوفے سے ٹکی کھڑی تھی۔ غلام رسول نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر بولا۔ ''آپ نے کیوں تکلیف کی، خبر بھجوا دیتے میں خود حاضر ہو جاتا۔''

''گھر پر آپ سے کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا اسی لیے یہاں آیا ہوں۔'' کہہ کر اس نے ان دونوں کے چہرے پر نظر ڈالی پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''بڑے صاحب نہیں آئے؟''

''ہاں!'' غلام رسول ان کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آج انہیں آ جانا چاہیے۔ اگر آج نہیں آئے تو پرسوں ہی آئیں گے جمعہ کی نماز پڑھ کر۔''

''چائے پیجیے!'' انور کو چائے کی ٹرالی لاتے دیکھ کر غلام رسول نے کہا۔

بڑے میاں نے چائے کا کپ لے کر پوچھا۔ ''میرا پوتا اب کیسا ہے؟''

''اللہ کا فضل ہے۔ انسے بروقت طبی امداد مل گئی ورنہ وہ بھی اپاہج ہو جاتا۔ ہڈی درمیان سے ٹوٹ گئی تھی۔ پلاسٹر کر دیا گیا ہے، جلد جڑ جائے گی۔ یوں بھی بچے کی ہڈی جڑنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔''

''اللہ کا شکر ہے۔'' بڑے میاں نے کہا۔ ''یہ بھی آپ کا احسان ہے۔''

''اچھا یہ بتائیں کیا وہ نیند میں بڑبڑاتا بھی ہے۔''

''جی ہاں، اکثر کچھ عجیب وغریب باتیں کرتا ہے۔ اس روز میں نے جھوٹ بولا تھا کہ اسے انگلش نہیں آتی۔ دیکھیں ناں! ہم لوگ ایک پچھڑے ہوئے علاقے کے رہنے والے ہیں۔ ایسے لوگ ہیں جو تعلیم سے کوسوں دور ہیں۔ ان حالات میں کسی بچے کا خواب کی حالت میں انگلش بولنا عجوبہ نہیں ہے؟ ہم اس بات کو چھپائے رکھنا چاہتے ہیں ورنہ لوگ اسے آسیب زدہ سمجھیں گے۔''

''نہیں یہ آسیب واسیب نہیں ہے۔ یہ بھی ایک بیماری ہے اس قسم کے مریض کم کم ہوتے ہیں اس لیے لوگ زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ اس پر تحقیق بھی نہیں ہو رہی ہے مگر اب

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم اس پر تحقیق کریں گے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اس راز سے جلد پردہ اٹھائیں گے۔" کیتھی نے انگلش میں کہا اور غلام رسول نے اردو میں ترجمہ کر دیا۔

"کب...... آپ کب تحقیق شروع کریں گی؟"

"بہت جلد مگر آپ اس بچے کے بارے میں اور کچھ بتائیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی تاکہ ہمیں تجزیہ کرنے میں آسانی رہے۔" کیتھی بولی۔ غلام رسول ہنوز مترجم کی ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔

"کبھی کبھی خود کو دیوان کہتا ہے اور اپنا نام اللہ مدد شاہ بتاتا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ اس وادی کا دیوان ہے۔ اسے راجا کو حساب دینے جانا ہے۔ لوگ مال گزاری نہیں دیتے اسی قسم کی باتیں کرتا ہے۔"

"اچھا یہ بتائیں آپ کے خاندان میں کوئی دیوان کے منصب پر رہا ہے؟"

"جی ہاں! میرے پردادا دیوان تھے، راجا کے دیوان!"

"ان کا نام کیا تھا؟"

"یہی تو حیرت کی بات ہے۔ ان کا نام اللہ مدد شاہ تھا اسی لیے تو ہم علی مدد شاہ کو اللہ مدد شاہ کا دوسرا جنم سمجھ رہے ہیں۔"

"اللہ مدد شاہ آپ کے پردادا تھے یعنی وہ آج سے تقریباً سوا سو ڈیڑھ سو سال پہلے پیدا ہوئے ہوں گے؟"

"جی ہاں!"

"اس دور میں لوگ انگلش نہیں بولتے تھے پھر وہ انگلش کیسے بولنے لگا؟" کیتھی کی آواز میں فکر کا عنصر تھا۔

"میرے دادا حسن مدد شاہ بہت اچھی انگلش بولتے تھے۔ وہ گاؤں میں نہیں رہتے تھے۔ پشاور چلے گئے تھے اور کسی فرنگی کے ہاں ملازمت کر لی تھی۔"

"یعنی وہ آپ کے دادا اور پردادا دونوں کی باتیں دہرا رہا ہے؟" کیتھی پُرسوچ انداز میں بولی۔ "پروفیسر صاحب! آجائیں تب میں کچھ بتا سکوں گی۔ ویسے مجھے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا ہے۔"

"یعنی واقعی علی مدد شاہ کا یہ دوسرا جنم ہے؟" علی مدد کے دادا نے کہا۔

"یہ میں پروفیسر کے آنے کے بعد ہی بتاؤں گی۔"

"بی بی! یاد رکھیں ہم مسلمان ہیں اور قرآن کی اس آیت پر یقین رکھتے ہیں کہ "ہم

نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا اور (مرنے کے بعد) اسی میں لوٹا کر لے جائیں گے اور اسی سے دوسری بار (قیامت کے دن) تم کو نکال کر کھڑا کریں گے۔" (سورۃ طٰہٰ آیت 55) اس لیے ہم دوسرے جنم کو فقط من گھڑت قصہ سمجھتے ہیں۔" بڑے میاں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ثابت کر دوں گی۔"

"یعنی تم ثابت کر دو گی کہ یہ علی مدد شاہ کا دوسرا جنم ہے؟" غلام رسول نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "تم قرآن کی بات کو غلط ٹھہراؤ گی؟"

"مسٹر غلام رسول! تم مذہب پرست ہو مگر میں نہیں۔ پھر میں ایک یہودی کے گھر میں پیدا ہونے والی لڑکی ہوں۔ سائنس کی طالب علم ہوں۔ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہوں۔ ثبوت کے ساتھ بات کرتی ہوں۔ دوسرے جنم کی حقیقت کیا ہے یہ میں جلد بتا دوں گی۔" کیتھی نے کہا۔

"مگر یاد رکھنا اگر مجھے ذرا بھی شک ہوا کہ تم غلط ثبوت پیش کر رہی ہو تو سمجھ لینا میں اس معاملے میں بہت سنجیدہ ہوں۔ کچھ کر بیٹھوں گا۔" غلام رسول تیز لہجے میں بولا۔

"ہاں ہاں میری بات غلط نکلے تو تمہیں حق ہوگا کہ تم مجھے جو چاہے سزا دے لو۔" کیتھی بھی جذباتی ہوگئی۔

ان دونوں کے انداز اور لہجے کی تیزی سے بڑے میاں نے اندازہ لگا لیا کہ دونوں آپس میں لڑ رہے ہیں اس لیے انہوں نے مداخلت کی۔ "اور جانتی ہیں بی بی! وہ کئی بار عجیب و غریب باتیں کر چکا ہے جو سچ ثابت ہوئیں۔ تقریباً تین سال پہلے ایک دن صبح سویرے بولا کہ تمہیں پیسے چاہئیں نا، چلو میں دے دیتا ہوں۔"

وہ سانس لینے کے لیے رک گیا۔ غلام رسول اور کیتھی پوری طرح متوجہ ہو گئے تھے۔

بڑے میاں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ان دنوں مجھے پیسوں کی بہت ضرورت تھی۔ زمین رہن رکھی ہوئی تھی۔ میری چھوٹی بہن سخت بیمار تھی۔ اس کے بچنے کی امید بالکل نہیں تھی۔ اسے گلگت کے ہسپتال میں داخل کروایا تھا۔ میں ایک ایک روپے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ جب علی مدد شاہ نے کہا کہ تمہیں پیسے چاہئیں، میں دے دیتا ہوں تو میں ہنس پڑا تب وہ بولا۔ مجھے معلوم ہے ایک جگہ بیس اشرفیاں رکھی ہیں۔ چلو میں دکھاتا ہوں اور وہ مجھے کھینچتا ہوا لے چلا۔ میں صرف اس کا دل رکھنے کے لیے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ مجھے ایک ایسی جگہ لے کر پہنچا جہاں ہر طرف کھڈ ہی کھڈ تھے۔ ادھر بہت کم لوگ جاتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں کیونکہ بعض کھڈ خطرناک ہیں کہ دور سے دکھائی بھی نہیں دیتے۔ ایسے ہی ایک کھڈ کے پاس مجھے لے کر پہنچا اور خود نیچے اتر گیا۔ میں اسے روکتا رہا مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کی ایک ہنڈیا تھی جس کا ڈھکن ہٹاتے ہی میں چونک گیا اندر اشرفیاں تھیں۔ پوری بیس اشرفیاں۔''

''ہو سکتا ہے وہ کھیلنے کے لیے کبھی اس کھڈ میں چلا گیا اور اسے اشرفیاں مل گئی ہوں۔'' غلام رسول نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں جناب! اس نے کہا تھا کہ یہ اشرفیاں اس کی ہیں۔ وہ ان اشرفیوں کا مالک ہے۔''

''اور کوئی بات؟''

''اسی طرح ایک بار اس نے کہا کہ یہ سامنے والی زمین بھی اسی کی ہے۔ اسے یہ زمین دادا نے دی تھی۔ بعد میں رجسٹری آفس سے پتا کیا تو معلوم ہوا کہ واقعی وہ زمین میرے دادا کی تھی۔''

''اور کوئی بات؟ ایسی کوئی بات جس سے یہ پتا چلے کہ اس کا کوئی رشتہ پہلے جنم سے ہے؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''ہاں کیوں نہیں، گزشتہ شب برات کی بات ہے۔ ہمارے ہاں مُردوں پر نام بہ نام فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس روز کوئی مرحوم چھوٹنے نہ پائے۔ فاتحہ ختم ہونے والی تھی کہ وہ بولا۔ ''اے...... تو کیسا بیٹا ہے اپنے دادا کے دو چچا اور پانچ پھوپھیوں کو بھول گیا۔ اگر تجھے یاد نہیں ہے تو سن لے تیرے دونوں چچاؤں کے یہ نام تھے۔'' کہہ کر اس نے صحیح صحیح نام بتا دیے، مجھے یاد آ گیا کہ واقعی میں انہیں بھول رہا تھا۔''

وہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ انور بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ ''صاحب جی! وہ...... وہ لڑکا......''

☆======☆======☆

پروفیسر عثمان اور کمانڈر علی، مولانا کے گھر میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔ ''اے رکو!'' اس آواز پر دونوں نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا اور اس طرح اچھل پڑے جیسے انہوں نے بھوت دیکھ لیا ہو۔ ان دونوں پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ دروازے کے سامنے ان کی جیپ کے پیچھے ایک اور جیپ آ کر رکی تھی اور اس سے وہی ملٹری آفیسر اتر رہا تھا جسے پروفیسر اس غدار شخص سید علی کے ساتھ لڑتا ہوا چھوڑ آیا تھا۔

''پروفیسر! یہ زخمی ہے اور زخمی سانپ زیادہ خطرناک ہوتا ہے میں اسے الجھا رہا ہوں آپ بھاگ جائیں۔'' کمانڈر علی نے سرگوشی میں کہا۔ ''یوں بھی یہ انٹیلی جنس افسر ہے اور آپ کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے۔''

''یہ صحیح ہے کہ یہ انٹیلی جنس آفیسر ہے مگر یہ غدار نہیں۔ بھارتی فوج کا افسر ہوتے ہوئے بھی مجاہدین کی مدد کر رہا ہے۔''

''مگر میرے پاس ایسی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں اس علاقے کا کمانڈر ہوں۔ ایسی بات ہوتی تو میرے علم میں یہ بات ضرور ہوتی۔'' کمانڈر علی نے کہا۔

''پروفیسر میرے پاس آ جاؤ!'' آفیسر نے کہا پھر تقریباً درشت لہجے میں بولا۔ ''نہیں کمانڈر، ایسی غلطی نہ کرنا، ہاتھ ہٹاؤ۔ مجھے معلوم ہے تمہاری کمر میں پستول ہے۔ میری انگلی جیب میں رکھے پستول پر ہے۔ اب تم بھی میری جیپ میں آؤ گے۔''

عین اسی وقت چھت پر سے آواز آئی۔ ''نہیں آفیسر تم ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ اس وقت دو طرف سے کلاشنکوف کے نشانے پر ہو۔''

آفیسر نے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا اور بے بسی سے ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔

''کمانڈر علی! تم اس بدذات کی تلاشی لو۔ ہتھیار لے کر اسے اندر لے آؤ۔''

کمانڈر علی چیتے کی سی پھرتی سے آگے بڑھا اور اس نے آفیسر کی تلاشی لے کر ریوالور نکال لیا پھر اسے دھکیلتا ہوا گھر کے اندر لے آیا۔ مولانا کئی مسلح آدمیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ انہوں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''خوش آمدید آفیسر! بالآخر تم نے مجھے بے نقاب کر ہی لیا کہ میں مجاہدین کا ساتھی ہوں لیکن افسوس کی بات ہے کہ تم یہ خبر اپنے افسران تک پہنچانے کے قابل نہ رہو گے۔''

''نہیں جناب! آپ کا یہ خیال غلط ہے۔ جس طرح میں اپنے پیروں پر چل کر آیا ہوں اسی طرح جاؤں گا بھی۔ آپ بے فکر رہیں۔'' آفیسر کے لہجے میں حد درجے کی خود اعتمادی تھی۔

''اس کی آنکھ پر پٹی باندھ کر بند گاڑی میں بٹھا دو۔'' مولانا نے کہا۔

مولانا کے دو ساتھیوں نے آگے بڑھ کر آفیسر کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی اور اسے تقریباً دھکیلتے ہوئے گیراج میں لے کر آئے۔ کمانڈر علی اور پروفیسر عثمان بھی ان کے ساتھ تھے۔ گیراج میں ایک واکس ویگن کھڑی تھی۔ انہوں نے اس میں آفیسر کو دھکیلا پھر خود بھی اسے کور کر کے بیٹھ گئے۔ کمانڈر علی اور پروفیسر عثمان بھی ان کے برابر میں بیٹھے اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گاڑی چل پڑی۔

ویگن میں خاموشی تھی۔ صرف انجن کی آواز گونج رہی تھی۔ کافی دیر تک سڑکوں پر چکرانے کے بعد وہ لوگ واپس مولانا کے گھر میں لوٹ آئے پھر آفیسر کو اتارا گیا اور اسے سہارا دے کر تہہ خانے میں لے جایا گیا۔ پروفیسر عثمان کو اس عجیب و غریب بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ خواہ مخواہ وقت کیوں ضائع کیا گیا۔ ان کے چہرے پر پھیلتی حیرت کو کمانڈر علی نے پڑھ لیا اور وہ نسبتاً نرم لہجے میں بولا۔ ''شاید آپ اس بات پر حیران ہیں کہ یہ خواہ مخواہ کا سفر کیوں طے کیا گیا؟''

''جی ہاں!'' پروفیسر عثمان بولے۔

''اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ آفیسر یہی سمجھ رہا ہو گا کہ اسے کسی اور جگہ لے جایا گیا ہے جبکہ اس سے گفتگو کرنے کے لیے اور اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے سب سے بہتر جگہ یہی ہے۔ یہاں ہم بہ آسانی اس سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں۔''

''تو چلو میں بھی دیکھو کہ تم لوگ کس طرح سے تفتیش کرتے ہو۔'' کہہ کر پروفیسر عثمان بھی تہہ خانے میں اتر گئے۔

نیچے ہال نما کمرے میں آفیسر کو ایک کرسی سے باندھ کر بٹھا دیا گیا تھا۔ وہیں ایک طرف مولانا بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے پروفیسر کو دیکھ کر کہا۔ ''ہاں جناب! آپ بھی دیکھ لیں ہم کس طرح دشمنوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔ اپنے ہی لوگ ہمیں کس طرح نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ صاحب یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر ہمارے پاس پوری رپورٹ ہے کہ ان کے خاندان میں کتنے افراد ہیں۔ کس کا کیا نام ہے۔ یہ کہاں کہاں ڈیوٹی دیتے رہے ہیں۔''

''اگر آپ کے پاس رپورٹ ہے تو میرے بارے میں یہ بھی علم ہو گا کہ میں مجاہدین کا دشمن نہیں دوست ہوں۔''

''یہ بھی صحیح ہے کہ تم نے کئی بار مجاہدین کی مدد کی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ تم نے کئی مجاہدین کو گرفتار اور ان کے گھر والوں کو خوار کیا ہے۔''

''یہ صحیح ہے مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ مجھے اپنی نوکری بچانی تھی۔ نوکری بچانے کے لیے کوٹا پورا کرنا پڑتا ہے اور میں نے کوٹا پورا کرنے کے لیے تیسری قطار کے مجاہدین کو گرفتار کرایا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں نے رشوت دے کر یہاں تبادلہ کرایا ہے صرف اس لیے کہ میں ان جاں فروشوں کی مدد کر سکوں۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم جڑوں تک پہنچنا چاہتے ہو اس لیے چھوٹے چھوٹے مہروں کو نظر انداز کر رہے ہو۔''

''یہ صحیح ہے کہ شطرنج کی بساط پر شاہ کو الٹنے کے لیے پیادہ کو نظر انداز کیا جاتا ہے مگر اس وقت تو میرے نشانے پر شاہ ہے۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ اس علاقے میں آپ کا گھر مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ 5901 نمبر کا موبائل فون جو بمبئی سے رجسٹرڈ ہے وہ اور 9081 نمبر کا دہلی رجسٹریشن آپ کے پاس ہے۔ ان دونوں موبائل فونز کا علم صرف مجاہدین کے اعلیٰ عہدیداروں کو ہے جس کے بارے میں ہمارا ڈیپارٹمنٹ پریشان ہے کہ آخر یہ فون ہے کہاں اور کس کے پاس ہے۔ اگر میں چاہتا تو اب تک آپ سلاخوں کے پیچھے ہوتے۔'' آفیسر بولا۔

''ہو سکتا ہے تم اس کے بھی آگے کچھ جاننا چاہتے ہو گے۔'' مولانا نے جواب میں کہا۔

''مولانا! سب سے اہم بات یہ ہے کہ پروفیسر کی اصلیت صرف میں جانتا ہوں کیونکہ پاکستانی علاقے سے ہمارے ایجنٹ نے ان کی پوری رپورٹ بھیجی ہے جسے میں نے اب تک اپنے ڈیپارٹمنٹ سے بھی چھپا رکھا ہے۔ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ آج آپ کو ایک خفیہ پیغام ملا ہو گا کہ تمام اہم کارکن رات تک علاقے سے نکل جائیں کیونکہ کل صبح کریک ڈاؤن ہو گا۔ وہ پیغام میں نے سطوت بھائی کو بھیجا ہے جسے انہوں نے ریلیز کیا ہے۔ جب میں سطوت بھائی کو جانتا ہوں تو آپ خود سوچیں میں کتنی دور تک خبر رکھتا ہوں۔''

''اچھا تمہاری بات مان لی کہ تم غدار نہیں ہو تو یہ بتاؤ کہ کل کریک ڈاؤن کیوں ہو گا؟'' مولانا نے پوچھا۔

''آج رات ہمارے ایجنٹ جو پاکستانی علاقے میں گھس گئے ہیں، وہ وہاں سے فائرنگ کریں گے ہماری فوج پر، جواب میں یہاں سے ملٹری ایکشن ہو گا تاکہ دنیا والوں کو بتایا جا سکے کہ فائرنگ پاکستانی کر رہے ہیں۔ بھارت کا کوئی بھی شہری مجاہد نہیں ہے یہ سب پاکستانی ہیں۔ کل 22 ایجنٹ وہاں گئے ہیں۔ ان میں سے آدھے کو ہماری فوج مار دے گی اور ان کی لاشوں کو یہ کہہ کر پریس والوں کو دکھائے گی کہ یہ سب پاکستانی تھے۔''

''اپنے ہی ایجنٹوں کو مارے گی؟ بات سمجھ میں نہیں آئی۔''

''ارے مولانا! یہ برہمنی ذہن ہے۔ مرنے والے سب مسلمان ہوں گے۔ اس طرح بھارتی تسلط والے علاقے کے مسلمانوں کی تعداد کم ہو گی۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اب تم کیا کہنا چاہتے ہو، مطلب کی بات کرو۔"

"پروفیسر کا جو پروگرام ہے اسے آج کینسل کر دیں اور انہیں واپس بھیج دیں۔ یہ نہیں یہاں کے تمام اہم ارکان علاقہ خالی کر دیں۔ پندرہ بیس دن بعد پروفیسر کو بھی بلا لیجیے گا۔"

"تمہاری بات دل کو لگ رہی ہے کیونکہ ہمارے پاس بھی یہ اطلاع پہنچی ہے کہ کچھ لوگ جو اس علاقے کے نہیں ہیں، گزشتہ پرسوں یہاں سے پاکستانی علاقے میں گھسے ہیں۔ پھر سطوت کا پیغام بھی ملا ہے۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر ہم تمہاری باتوں کو چ مان لیتے ہیں اور اپنا پروگرام کینسل کر دیتے ہیں۔"

"پروفیسر صاحب کو بھی پاکستان لوٹ جانے کو کہیں۔"

"چلو یہ کام بھی کر دیتا ہوں۔ کمانڈر علی انہیں پاکستانی علاقے میں پہنچا آئیں گے۔"

"پھر دیر کس بات کی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے ابھی انہیں بھجوا دیں۔"

"کیوں پروفیسر صاحب! آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں؟"

"جی نہیں۔" پروفیسر عثمان نے جواب دیا۔

"تو آپ ابھی چل دیں۔" آفیسر بولا۔

"چلیے میں پہنچا دوں گا۔" کہہ کر کمانڈر علی کھڑا ہو گیا۔

"آپ انہیں پہنچا کر فوراً لوٹیں گے نہیں۔ دو تین دن کے لیے وہیں رہ جائیں گے۔" آفیسر نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں یہی کروں گا۔" کہہ کر کمانڈر علی نے پروفیسر کو چلنے کا اشارہ دیا۔ دونوں آگے پیچھے باہر نکلے۔ مولانا نے پروفیسر عثمان کو سینے سے لگا کر الوداعی کلمات کہے اور نہایت ادب سے انہیں لے کر گاڑی تک پہنچے۔

پروفیسر عثمان اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کمانڈر علی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کنٹرول لائن کی طرف چل پڑے۔

گاڑی میں خاموشی طاری تھی۔ دونوں کی نظریں ونڈ اسکرین کے پار اس کچی سڑک پر جمی ہوئی تھی جس کا اگلا سرا پاکستان میں تھا۔

یوں تو یہ پورا علاقہ پاکستان کی ملکیت تھا۔ تقسیم ہند کے وقت اس بات کو مدِنظر رکھا گیا تھا کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی وہ علاقہ پاکستان کو دیا جائے گا اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو گی وہ ہندوستان کو۔ عین تقسیم ہند کے وقت فسادات کی آگ بھڑکا

کر مسلم لیڈران کو بوکھلا دیا گیا اور وہ مسلمانوں کے یکطرفہ قتلِ عام پر گھبرا کر جو مل رہا ہے اسے غنیمت سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ نتیجتاً آسام، ناگالینڈ، سکم کو بھارت میں شامل رکھنے کے لیے مشرق میں مرشد آباد، مالدہ، دیناج پور، نیلفاماری، پورنیہ، کنیبار، بونگائی گاؤں جیسے مسلم اکثریتی علاقوں کو بھارت کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ اسی طرح مغرب میں پنجاب کے گرداس پور وغیرہ کو بھارت میں شامل کر دیا گیا۔ کشمیر جو سو فیصد پاکستانی علاقہ تھا اسے یہ کہہ کر چھین لیا گیا تھا کہ یہاں کا راجا اسے بھارت میں شامل کرنا چاہتا ہے لیکن مسلمان نواب نے جوناگڑھ کو پاکستان میں شامل کرنے کی بات کی تو انہیں بزور طاقت وہاں سے بھگا کر ریاست پر قبضہ کر لیا گیا۔ اسی مکروفریب کا شکار یہ علاقہ بھی ہوا لیکن گلگت و بلتستان کے مجاہدین کی حوصلہ مندی اور قبائلی لشکریوں کی بہادری نے اس علاقے کا آدھا حصہ آزاد کر لیا۔

آزاد علاقہ اب زیادہ دور نہ تھا۔ کنٹرول لائن پر لگے دونوں طرف کے پرچم صاف نظر آ رہے تھے۔ کمانڈر علی کو اطمینان تھا کہ وہ ہر بار کی طرح بہ آسانی کنٹرول لائن پار کر جائیں گے۔ یوں بھی اس طرف فوجیوں کی نفری نہ ہونے کے برابر تھی مگر جیسے ہی ان کی جیپ نے موڑ کاٹا، کمانڈر علی کا دل دھڑک اٹھا۔ اس کچے راستے پر آڑے ترچھے دو فوجی ٹرک کھڑے تھے جس کی وجہ سے سڑک بلاک ہو گئی تھی۔ ان دو ٹرکوں کے سپاہی مورچہ لگائے بیٹھے تھے۔ کمانڈر علی نے چاہا کہ وہ یوٹرن لے لے مگر اسی وقت انٹیلی جنس کا وہی افسر ریوالور تھامے سامنے آ گیا۔ اس نے دور ہی سے چیخ کر کہا۔ "کمانڈر علی! کھیل ختم ہو گیا ہے۔"

☆======☆======☆

غلام رسول اپنے کمرے میں لیٹا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا لیکن اس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ آج بھی اس پُراسرار لڑکی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ لڑکی ضرور آئے گی۔ وہ رہ رہ کر کمرے میں بنی چاندنی کی لکیر کو بھی دیکھ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر یاد آ رہا تھا کہ اسی لکیر پر وہ مکروہ چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کہیں وہ پھر نمودار نہ ہو جائے ابھی وہ اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رات کے اس پہر انور یا کسی دوسرے کے آنے کا امکان نہ تھا اس لیے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اسی حسینہ کی آمد ہے۔ اس کی نظریں گویا دروازے پر چپک کر رہ گئی تھیں۔ تبھی دروازہ کھلا اور اس سراپا قیامت نے اندر جھانکا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس نے ہنس کر ایک انداز سے سر کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جھٹکا دیا پھر بولی۔ ''تم منتظر تھے؟''

''ہاں میں انتظار کر رہا تھا۔''

''کیوں؟ کیا میں بہت پسند آ گئی ہوں؟''

''ہاں، بات ہی کچھ ایسی ہے۔ دراصل میں ہر بات کی گہرائی تک پہنچنا ضروری سمجھتا ہوں۔ تمہارے اندر بھی جھانکنا ضروری سمجھتا ہوں۔''

''اچھا تو تم مجھ سے پیار نہیں کرتے، آزمانا چاہتے ہو۔''

''پیار کے لیے دل کا ملنا ضروری ہے اور دل ملنے کے لیے دل کے قریب ہونا ضروری ہے۔ ابھی تو قریب کرنے کی کوشش ہی کر رہا ہوں۔''

''بڑے صاف گو ہو، آزما لو۔''

''برا نہ مانو۔ بات یہ ہے کہ تم مجھے بڑے پُراسرار حالات میں ملی ہو۔ مجھے صرف تمہارا نام معلوم ہوا ہے۔ تم کون ہو۔ کہاں سے آئی ہو کچھ بھی نہیں پتا۔''

''میں اس حویلی میں رہتی ہوں۔''

''حویلی میں؟''

''جی ہاں، آپ کے چوکیدار کی بیٹی ہوں مگر کبھی ان سے ذکر نہ کریں کیونکہ ہماری برادری میں اگر لڑکی کسی غیر مرد سے بات کر لے تو اس کی جان لے لی جاتی ہے۔''

''تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟''

''زونو...... مقامی زبان میں زونو چاند کو کہتے ہیں۔''

''تو پھر چاند صاحبہ بلکہ مہتاب صاحبہ آپ نے مجھ غریب کو کیوں پسند کر لیا؟''

''کس بے وقوف نے کہا ہے کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔''

''پھر یہاں تشریف لانے کا مقصد؟''

''صاف سیدھی بات ہے۔ میں تمہیں نہیں پروفیسر کو پسند کرتی ہوں۔ ان تک پہنچنے کے لیے میں نے تمہارے ساتھ دوستی کی ہے۔''

''اوہ! تو بات یہ ہے۔ چلو یہی سہی، اب یہ بھی بتاؤ کہ ایک بوڑھے کو پسند کرنے کا مقصد کیا ہے؟''

''کیونکہ وہ میرے ہیں۔ میں ان کا کب سے انتظار کر رہی ہوں تمہیں کیا پتا۔''

''یعنی تمہیں پتا تھا کہ وہ یہاں اس دور افتادہ علاقے میں آئیں گے؟'' غلام رسول نے کہا۔

''بالکل! مجھے یقین تھا کہ وہ آئیں گے۔ انہیں یہاں آنا ہی ہوگا۔''

''اس یقین کی وجہ؟''

''یہ دنیا ایک نظام کے تحت چل رہی ہے۔ اس نظام میں ذرا بھی پھیر بدل نہیں ہوتا۔ انہیں آنا ہی تھا اور وہ آ گئے۔ میرا انتظار ختم ہوا۔ اب مجھے ان کے قریب پہنچنا ہے اور ان کے قریب پہنچاؤ گے تم۔''

''مجھے کتنی رکعت کا ثواب ملے گا۔''

''یہی تو سمجھ کا پھیر ہے مسٹر غلام رسول! اگر تم میری حقیقت کو جان لو گے تو تمہارے اچھے بھی مجھے ان کے پاس پہنچائیں گے۔''

''اگر میں تمہیں ان کے قریب نہ لے جاؤں تو؟''

''چاندنی کی پٹی پر ایک عکس دیکھا تھا ناں! اسے یاد رکھنا۔ وہ بہت ظالم ہے۔'' کہہ کر وہ لڑکی کھڑی ہو گئی۔

''میری سمجھ میں کچھ کچھ بات آ رہی ہے۔''

''کیا؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''یہی کہ تم...... خیر جانے دو مگر بی بی یاد رکھنا میں قرآن کا علم رکھتا ہوں۔ تم نے اگر زیادہ اڑنے کی کوشش کی تو میں پر کتر کر رکھ دوں گا۔''

''اچھا ناراضگی چھوڑو۔ میرے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ بتاؤ تم میری مدد کرو گے یا نہیں۔''

''جب تک تم اپنی حقیقت نہیں بتاؤ گی میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔''

''تم بہت پچھتاؤ گے۔'' لڑکی کے لہجے میں بلا کی سختی آ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسے کچا چبا جائے گی۔

''کیوں، کیوں...... میں کیوں پچھتاؤں گا؟'' غلام رسول نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''اس لیے پچھتاؤ گے کہ تم ایک ایسے گرداب میں پھنس چکے ہو جہاں سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ پھر اب تمہارا ٹکراؤ مجھ سے ہے، مجھ سے۔''

لڑکی کا چہرہ جوش و جذبات سے سرخ پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سخت غصے میں ہو۔ وہ چیخنے کی حد تک تیز آواز میں بول رہی تھی۔

''میں وہ قوت ہوں جس سے ٹکرانے والے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ میں تمہیں برباد کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوں گی۔"

"اچھا! تم مجھے برباد کر دو گی مگر کیسے؟" غلام رسول نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"تم نے ابھی حویلی صرف اوپر سے دیکھی ہے۔ اسے خریدنے سے پہلے اس کے متعلق مشہور قصوں کو سن لیتے تو تمہیں بھی معلوم ہو جاتا کہ اس میں کیسے کیسے اسرار ہیں۔ میں تمہیں یہاں کے اسرار میں دفن کر دوں گی۔"

"سنو بی بی! میں مسلمان ہوں اور مسلمان کسی بھی قوت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ اگر ڈرتا ہے تو اپنے پالنے والے، اس دنیا کے مالک سے ڈرتا ہے۔ رہا سوال تمہاری پُراسرار قوت کا، تو اسے بھی تم آزما لو۔ میں اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہوں جسے گنڈوں پھونک مارنے والیوں کے شر سے بچانے کی، شام وسحر کے شر سے بچائے رکھنے کی نوید دی گئی ہے۔ تم اگر باطل پرست ہو تو میں حق پرست ہوں۔ تم اپنی بساط بھر کوشش کر لو مگر میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکو گی کیونکہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ قرآن الحکیم جو تمام عالم میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ جس میں حاسدوں کے حسد سے، برائی کی تمام قوتوں سے بچنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ تم جیسی قوتوں کو سیدھا کرنے کا حل سمجھایا گیا ہے۔"

غلام رسول کی آواز بھی کافی بلند ہو گئی تھی۔ وہ کرخت لہجے میں بول رہا تھا۔ "رہا سوال مجھے اس حویلی کے اسرار میں دفن کرنے کا تو کان کھول کر سن لو، ہر اسرار کا توڑ ہوتا ہے، ہر فرعون کے لیے موسیٰ ضروری ہے۔ میں بھی اس مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالوں گا۔"

"اچھی بات ہے، تم حل ڈھونڈتے رہو۔ آج کے لیے، صرف آج دن بھر کا موقع دے رہی ہوں۔ اگر تم نے میرا کام نہیں کیا تو زندگی بھر پچھتاتے رہو گے۔ میں جا رہی ہوں۔" کہہ کر وہ جس پُراسرار انداز میں آئی تھی، اسی پُراسرار انداز میں چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد بھی غلام رسول اسی کے بارے میں سوچتا رہا کہ آخر یہ کون؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ایک دیہاتی بچے کا فر فر انگلش بولنا، پروفیسر کا قسط وار خواب دیکھنا اور اس لڑکی کا پُراسرار انداز میں آ کر دھمکی دینا، یہ سب کیا ہے؟ غلام رسول کافی دیر تک اسی بات پر غور کرتا رہا مگر اسے اس الجھی ہوئی ڈور کا کوئی سرا نظر نہ آیا۔ تنگ آ کر وہ اس کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر آتے ہی اس کی نظر سردرد پر پڑی۔ وہ پروفیسر عثمان کی شاگردہ کیتھی کو سردرد تو کہا کرتا تھا۔

کیتھی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور اب وہ تیر کی طرح اس کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی پرتیں جمی ہوئی تھیں۔ بقول غلام رسول، یہودی مسکراتے نہیں ہیں، چاپلوس مسکراہٹ کی پرتیں اپنے ہونٹوں پر جما جما کر دنیا والوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

کیتھی نے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔ "مسٹر غلام رسول! تم کہاں تھے، میں کب سے تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔"

"کیا بحث کرنے کا ارادہ ہے؟" غلام رسول نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"بحث کا تو نہیں مگر یہ ضرور پوچھنا ہے کہ پروفیسر صاحب کی کچھ خبر ہے؟ وہ کب تک واپس آئیں گے؟" کیتھی نے مسکرا کر کہا۔

"وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں، کہہ کر تو یہی گئے تھے کہ میں ایک دو دن میں آ جاؤں گا مگر آج تیسرا دن ہے۔ اب تک تو انہیں آ جانا چاہیے تھا۔"

"کسی کو بھیج کر پتا تو کرائیے۔ انہیں سفر کی عادت نہیں ہے۔ پھر یہ علاقہ بھی برف پوش ہے۔ ہر وقت برف باری ہوتی رہتی ہے۔ جگہ جگہ تودے بھی گرتے ہیں، کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔"

"تم لاکھ کوشش کر لو، اپنی قوم کی موروثی عادت سے باز نہیں آؤ گی۔ جب بھی بولو گی، کالی زبان بولو گی، بدشگونی کی باتیں کرو گی۔ کبھی تو اچھی باتیں کر لیا کرو۔"

"پھر تم نے میری قوم کو گالی دی۔" کیتھی نے غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "مسٹر غلام رسول! میں تمہاری جلی کٹی باتوں کو نظر انداز کر دیتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم میرے مذہب، میری قوم کا مذاق اڑاؤ۔ میں اکیلی ہوں تو اس کا فائدہ اٹھا کر تم زبردستی مجھ پر اپنا مذہب تھوپنے کی کوشش نہ کرو۔ یاد کرو، تم ہی نے سنایا تھا کہ قرآن مجید کی سورۃ بقرہ میں آیا ہے کہ لا اکراہ فی الدین یعنی دین میں جبر نہیں ہے۔ زبردستی نہیں ہے۔ اگر زبردستی ہوتی تو اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو زبردستی اپنے پسندیدہ دین میں داخل کر دیتا کہ وہ بہت بڑا قدرت والا ہے۔"

"ارے ارے تم تو برا مان گئیں۔ میں نے کب زبردستی کی ہے؟" غلام رسول نے معاملے کی نزاکت کو بھانپ کر کہا۔

"تم جب چاہتے ہو، میرے مذہب کی برائی شروع کر دیتے ہو جب کہ میرا مذہب سب سے اعلیٰ ہے۔ میرے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جتنے معجزے یعنی کھلی ہوئی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نشانیاں ملیں، اتنے کیا، ایک بھی معجزہ تمہارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں ملا۔''

''تم نے بات چھیڑ ہی دی ہے۔ تو سن لو، معجزہ ہر رسول کی پہچان ہے۔ رہا سوال میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو محترمہ! حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ہمارے رسول نہیں ہیں، وہ تمام عالم کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور عالم میں صرف زمین نہیں، سورج، چاند، زحل، عطارد، مریخ وغیرہ وغیرہ سب آتے ہیں۔ یعنی پوری کائنات کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رہا سوال معجزے کا تو جس دور میں جس چیز کا بول بالا تھا، اسی میں سے معجزہ دیا گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے وقت میں کاریگری کا زور تھا اس لیے حضرت داؤد علیہ السلام کو لوہا گلا لینے کا معجزہ عطا ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں معالجین کو عروج حاصل تھا اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیحائی عطا ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادو سحر کو معراج سمجھا جاتا تھا اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور عصا عطا ہوا جو اپنے آپ میں بہت قوی سحر تھا۔'' غلام رسول جذباتی ہو گیا تھا۔ اس نے گویا تقریر کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ بولا۔ ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور علم بدیع وعروض کا تھا۔ ہر طرف شعروشاعری، ادب وفن کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ایک سے ایک شاعر موجود تھے اس لیے خداوند کریم نے ایک ایسے بندے کو جس نے حرف کو پہچاننے کی بھی تعلیم کسی بندے سے حاصل نہ کی تھی، اس سے ایسے علم وفن کی باتیں پہنچائیں جن پر جتنا غور کرو، عقل ناکافی ثابت ہو۔ قرآن پاک بذات خود معجزہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر کنکر حمد وثنا کریں، شجر وحجر رسالت کی گواہی دیں، سورج غروب ہو کر پھر لوٹ آئے، ایسے لاتعداد معجزوں کو تو چھوڑو، اتنا ہی کافی ہے کہ نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود معجزہ ہے۔ یہ لفظ عربی لغت یعنی زبان میں موجود تھا مگر اس سے پہلے کسی نے اپنے بچے کا یہ نام نہ رکھا۔ کسی کے ذہن میں آیا ہی نہیں۔ یہ لفظ اس دور میں بھی معتبر رہا جب نام کو بگاڑنے کا رواج تھا کہ ہر نام کا ایک لفظ گرا کر بولتے تھے جس سے معنی کچھ سے کچھ ہو جاتا تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا میم ہٹا دیں تو حمد بنا۔ حمد میں الف لگا دیں معنی پر فرق نہ پڑا۔ درمیان کا ''م'' ہٹا دیں تو کوئی فرق نہ آئے محمد سے آخر کا ''د'' ہٹا دیں کوئی تبدیلی نظر نہ آئے۔ جس کا نام بھی معجزہ ہو، وہ تو سرتاپا معجزہ ہے۔ بولو، جواب ہے تمہارے پاس؟ میں تمہارے مذہب پر تنقید نہیں کر رہا۔ میں تو فقط تاریخی حوالہ دے رہا ہوں۔ History of The English Bible صفحہ 23 پر دیکھو، لکھا ہے۔ ''971 ق م میں رحعام شاہ یہود کی سلطنت کے پانچویں سال سیق شاہ مصر نے جب یروشلم پر

چڑھائی کی تو ہیکل اور یہودی بادشاہ کے گھر کو لوٹا، اس وقت توریت ضائع ہوئی اور تین سو سال تک ناپید رہی، کیونکہ تم یہودیوں میں یہ رسم ہے کہ ہیکل میں ہی توریت رکھتے ہو اور اسے وہیں جا کر سنتے ہو اور وہ بھی سات سال میں ایک بار، ایک نسخہ ہو تو ضائع ہونے کا احتمال رہے گا ہی۔ کیا غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں!'' کیتھی نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔

''کتب سماوی پر ایک نظر کے صفحہ 9 تا 12 کے مطابق تقریباً چھ سو برس قبل مسیح بخت نصر تاجدار بابل نے سلطنت یہود پر حملہ کیا تو توریت کا وہ نسخہ جسے دوبارہ ترتیب دیا گیا تھا، ضائع ہو گیا۔ یونان کے بادشاہ انطاکیہ نے حملہ کیا تو توریت کا مکرر ترتیب شدہ نسخہ جل گیا۔ یعنی کہ بار بار نسخہ ترتیب دیا جاتا اور وہ برباد ہو جاتا۔ فرانسیسی اسکالر مورلیس بوکائیے اپنی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' میں لکھتا ہے کہ ''عہد نامہ قدیم (توریت) کے مصدقہ ہونے میں شک ہے۔'' تم خود غور کرو۔ دنیا کی تخلیق کے بارے میں توریت کا کہنا ہے۔ ''سب سے پہلے خدا نے زمین وآسمان کو پیدا کیا اور اس میں پانی پیدا کیا۔ اس کے بعد روشنی کو پیدا کیا اور اسے تاریکی سے جدا کیا۔ روشنی کو دن اور تاریکی کو رات قرار دیا۔ اب دن اور رات کا چکر شروع ہوا۔ دوسرے دن پانیوں کے درمیان فضا بنائی اور فضا کو آسمان کہا۔ فضا بنانے کا مقصد یہ تھا کہ پانی سے پانی کو جدا کرے۔ (آیت 1 تا 8) چوتھے دن خدا نے چاند اور سورج بنائے تا کہ دن اور رات کو الگ کر سکے۔ ان آیات کو بغور پڑھو۔ لاتعداد تضادات سامنے آتے ہیں۔ نمبر 1 ابتدا تخلیق میں پانی کا وجود سائنس کی رو سے غلط ہے کیونکہ کائنات کی تشکیل کی ابتداء میں گیس موجود تھی۔ اس کی جگہ پانی کو قائم کرنا غلط ہے۔ پہلے دن روشنی پیدا کی گئی اور تاریکی سے جدا کی گئی جب کہ روشنی کا منبع چاند سورج چوتھے دن بنے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ روشنی پہلے پیدا ہو اور چاند سورج بعد میں۔ کیا یہ صحیح ہے؟''

''نہیں!'' کیتھی نے جواب دیا۔

''اب قرآن پاک اور توریت کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں۔ توریت کے باب دوم کی تین آیات میں بیان ہے کہ ساتویں دن اللہ نے اپنے کام سے فارغ ہو کر آرام کیا اور اس دن کو مقدس ٹھہرایا۔ اسی لیے یہودی سبت کے دن کو مقدس جانتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔'' غلام رسول نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جب کہ قرآن پاک کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی تھکتا نہیں۔ نہ اسے آرام کی ضرورت ہے نہ اسے نیند آتی ہے۔ اسی طرح توریت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہتا ہے۔''فضا بنانے کا مقصد یہ تھا کہ پانی سے پانی کو جدا کرے۔'' (آیت ح) جب کہ قرآن پاک کی تفسیر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیان کرتے ہیں۔''یقیناً خداوند پاک نے (ان سیاروں اور ستاروں کو) فلک میں رواں دواں کر دیا ہے اور فلک میں یعنی زمین و آسمان کے درمیان طویل (گیس کا) سمندر بنا دیا۔'' (تفسیر قرات، جلد اول، صفحہ 81) اب تم بتاؤ، سائنس کیا کہتی ہے فضا میں پانی ہے یا گیس؟''

''سائنس نے تجربات کے بعد یہ کہا ہے کہ فضا میں لاتعداد گیس ہے۔'' کیتھی نے مرے مرے لہجے میں جواب دیا۔

''تم D.N.A پر ری سرچ کر رہی ہو۔ D.N.A کیا ہے؟ ایک ایسی ڈسک جس میں اس آدمی کی تمام باتیں ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں، D.N.A میں انسان کیسی زندگی گزارے گا، یہی لکھا ہوتا ہے کہ اس کی نسل کیا ہے، کیسی کیسی بیماریاں اس میں ہیں، کون کون سے جراثیم سے خطرہ ہے وغیرہ وغیرہ ایسی لاکھوں باتیں درج ہوتی ہیں۔'' کیتھی بولی۔

''سورۃ بنی اسرائیل کی آیت 13 میں شاید D.N.A کے ہی بارے میں کہا گیا ہے کہ ''ہم نے ہر آدمی کا نامہ اعمال اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے اور قیامت کے روز ہم اسے نکال کر رکھ دیں گے۔'' وہ نامہ اعمال D.N.A بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہاں! ہاں! سب کچھ تمہارے قرآن پاک میں لکھا ہے۔'' کیتھی نے جل کر کہا۔

''بی بی! قرآن صرف ہمارا نہیں، سب کے لیے ہے کیونکہ یہ ایک الہامی کتاب ہے۔ توریت بھی الہامی کتاب تھی جسے برباد کر دیا گیا۔ قرآن کی پہلی آیت میں جو کچھ ہے، وہی آخری آیت میں بھی ملے گا۔ وہی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی۔ کوئی فرق نہیں ملے گا کیونکہ یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ مگر توریت میں تضاد در تضاد ملتا ہے جو شکوک پیدا کرتا ہے۔ پھر اس میں ایسی ایسی باتیں شامل کر دی گئی ہیں جو توریت کو مشکوک بنا رہی ہیں۔ پیدائش باب 19 میں توریت کا ارشاد ہے۔''حضرت لوط علیہ السلام کے سلسلے میں بڑی (بیٹی) نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور دنیا میں کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ، ہم اپنے باپ کو شراب پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں تا کہ ہمارے باپ سے نسل باقی رہے۔'' یہ پورا قصہ تم خود پڑھ لینا کیونکہ دونوں بیٹیوں کا جو قصہ بیان ہوا ہے اور جو مناظر بتائے گئے ہیں، ایسا کسی الہامی کتاب میں ہونا ناممکن ہے۔ مجھے بتاتے ہوئے بھی شرم آئے گی۔ سب سے

اہم بات یہ ہے کہ کوئی پیغمبر کبھی شراب جیسی نجس چیز کو ہاتھ لگا ہی نہیں سکتا کیونکہ شراب عقل سے بیگانہ کرتی ہے پھر یہ بھی دیکھو، کیا کوئی معمولی انسان بھی کبھی اپنی بیٹی کے ساتھ رات گزار سکتا ہے؟ اگر مان لیا جائے کہ اسے شراب نے عقل سے بیگانہ بنا دیا تھا تو کیا فرشتے بھی اسے روک نہ سکے اور ''موآب و بن عمی'' نامی دو بیٹے بھی پیدا ہو گئے۔ ننھی بچی! مذہب کھیل نہیں ہے۔ مذہب تو معاشرے کی صحیح شکل واضح کرتا ہے۔ اگر کسی مذہبی کتاب میں بگاڑ کی باتیں ہوں گی تو یقیناً وہ جعلی کتاب ہو گی اور جس کے مذہب کی بنیادی غلطیاں بے شمار ہوں، ان پر تنقید تو کی ہی جا سکتی ہے۔''

''میں تم سے یہ سننے نہیں آئی ہوں کہ کس مذہب کی کتاب جعلی ہے اور کس کی اصلی!'' کیتھی نے چڑ کر کہا۔

''یہ بات تو از راہ تذکرہ آ گئی۔ اصل میں میں یہ بتانے بلکہ تم سے ڈسکس کرنے تمہارے پاس آنے والا تھا کہ میرے پاس ایک ایسی لڑکی آ رہی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ یہ اس کا دوسرا جنم ہے۔''

☆======☆======☆

مولانا باقر کو انٹیلی جنس افسر کی بات سچ لگی اور انہوں نے اپنا پروگرام کینسل کر دیا۔ افسر نے ہی مشورہ دیا تھا کہ وہ پروفیسر عثمان کو پاکستان بھجوا دیں۔ پروفیسر کو کنٹرول لائن پار کرانے کی ڈیوٹی کمانڈر علی کے ذمے لگائی گئی۔ کمانڈر علی تجربے کار تھا۔ اسے علم تھا کہ راستے میں بھارتی فوجیوں سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے اس لیے اس نے اچھا خاصا ایمونیشن بھی لے لیا تھا اور اب وہ انہیں ساتھ لے کر کنٹرول لائن کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ صرف ایک پہاڑی اور پار کرنا تھی پھر وہ پاکستان کی حدود میں پہنچ جاتے لیکن ابھی وہ پہلا موڑ مڑے ہی تھے کہ اس کچے رستے پر آڑے ترچھے دو فوجی ٹرک کھڑے نظر آ گئے تھے۔ کمانڈر علی ٹرکوں کو دیکھ کر مڑنا ہی چاہتا تھا کہ انٹیلی جنس کا وہی افسر ریوالور لہراتے ہوئے سامنے آ کھڑا ہوا جس نے خود کو مجاہدین کا ہمدرد بتایا تھا مگر اب وہ لوگ اسے اس حالت میں دیکھ کر سمجھ گئے کہ وہ سب کچھ اس کی چال تھی۔ وہ چیخ کر بولا تھا۔''کمانڈر علی! کھیل ختم ہو چکا ہے۔''

کمانڈر کے پاس فرار ہونے کا ایک بھی راستہ نہ تھا۔

''سر! اب ہم کیا کریں۔ مقابلے کا مطلب ہے موت! ہم چاروں طرف سے گھر چکے ہیں۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''زندگی میں کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی اس طرح کے حالات کا بھی سامنا ہوگا۔ تم لوگ تو ان حالات کے عادی ہو، کوئی راستہ نکالو۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''میں اگر پکڑا گیا تو کوئی خاص بات نہیں ہوگی مگر آپ...... یہ کمینے زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ سفارتی مہم کے ذریعے حکومتِ پاکستان کا ناک میں دم کر دیں گے بلکہ یہ مشہور کر دیں گے کہ آپ کو حکومت پاکستان نے بھیجا ہے۔''

''لیکن حکومتِ پاکستان مجھے کیوں بھیجنے لگی؟'' پروفیسر عثمان نے حیرت سے کہا۔

''اسے تو یہ بھی علم نہیں ہے کہ میں پاکستان میں رہ رہا ہوں۔''

''میرے بزرگ! یہاں یہ تک ہوتا ہے کہ برسات میں کسی گھر کی دیوار گر جائے یا کوئی آوارہ کتا بھی مر جائے تو اسے آئی ایس آئی کی سازش کہہ دیتے ہیں اس لیے میرا تو خیال ہے کہ ہم اپنا نام شہداء میں لکھوالیں۔''

''اگر مجھ جیسے گناہگار کی قسمت میں شہید ہونے کی سعادت لکھی ہے تو اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔ اپنا ریوالور مجھے دے دو، میں مقابلہ کروں گا۔'' پروفیسر نے پُرجوش آواز میں کہا۔

''نہیں جناب! ہم آپ کو اس طرح بے سبب نہیں مرنے دیں گے۔'' کمانڈر نے کہا۔ ''ہم دو ہیں اور وہ پانچ! زیادہ فرق بھی نہیں ہے اس لیے......''

''اس لیے لڑ کر مریں گے۔'' کہہ کر پروفیسر نے خود ہی ریوالور اٹھا لیا۔ اس سے پہلے پروفیسر عثمان نے ایک چڑیا بھی نہیں ماری تھی لیکن اب وہ آدمی مارنے پر تیار تھے کیونکہ اب نہ وہ مشہور سائنٹسٹ تھے اور نہ بوڑھے! اس وقت وہ ایک مجاہد کی طرح سینہ سپر ہو چکے تھے کیونکہ ان کی نظروں کے سامنے مسلمانوں کی بے کسی اور بے بسی کی تصویریں رقصاں تھیں پھر انہیں پکڑ کر یقیناً تشدد کا نشانہ بنایا جاتا اور عیش و آرام میں زندگی گزارنے والا شخص تشدد کے آگے بہ آسانی جھک سکتا تھا اور ان کے لکھائے ہوئے بیان کو ٹی وی کے سامنے دہرا سکتا تھا جس کا سیدھا اثر پاکستان پر پڑتا۔ جو لوگ اپنے ہاں کتا مرنے پر کہتے ہیں کہ یہ آئی ایس آئی کی سازش ہے، وہ تو پروفیسر کو بھی آئی ایس آئی کا نمائندہ کہلوا سکتے تھے اسی لیے پروفیسر نے پستول اٹھا لیا تھا۔ تبھی دھائیں دھائیں کی آواز سے پورا علاقہ کانپ اٹھا تھا۔ فوجیوں نے بغیر کسی اشتعال کے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ونڈ اسکرین ٹوٹ چکا تھا۔ وہ دونوں اگر سیٹوں کے درمیان دبک نہ جاتے تو شاید اب تک زخمی ہو چکے ہوتے۔ وہ دونوں نہایت ہوشیاری سے پچھلی طرف اتر گئے تھے۔ پروفیسر کا

اس معاملے میں تجربہ صفر تھا مگر کمانڈر علی ایسے نہ جانے کتنے معرکے سر کر چکا تھا۔ اس نے اپنا جرمن ساخت کا ریوالور لوگر ہولیسٹر سے نکالا اور نشانہ لے کر فائر کیا۔

اس کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولیاں نشانے پر پڑیں اور دو فوجی اچھل کر گر پڑے۔

وہ فوجی ٹرک سے اترے جن میں سے ایک ٹرک کے انجن کی آڑ میں ہوگیا اور فائر کرنے لگا۔ ٹرک کی دوسری طرف سے جھک کر دوڑتے ہوئے ایک دوسرا فوجی آگے آیا تھا۔ پروفیسر نے آنکھیں بند کر کے زندگی کی پہلی گولی چلائی۔ یکے بعد دیگر دو فائر کیے پھر آنکھیں کھول کر دیکھا۔ گولیاں اس کی پیشانی پر لگی تھیں۔ اندازے پر چلائی گئی گولیاں اپنا کام کر گئی تھیں۔

جھک کر دوڑنے والے فوجی کی پیشانی پر گولی لگتے ہی وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر خون پھیل گیا تھا۔

فوراً ہی کمانڈر علی نے بھی دو فائر کیے۔ ایک اور فوجی لڑھک گیا جب کہ دوسرا اچھل کر ٹرک کے نیچے برساتی نالے میں جا گرا اور وہ جتنی دیر تڑپتا رہا، پانی میں تلاطم رہا۔ اس کے بعد بتدریج پانی پُرسکون ہوگیا۔ علی نے اتنی دیر میں اپنی لائٹ مشین گن نکال لی تھی۔ اس نے نال سیدھی کر کے لیور کھینچ دیا تھا۔ گن کی نال سے متعدد گولیاں نکل کر شیشے سے ٹکرائیں تو شیشہ چکنا چور ہوگیا اور اس کے ٹکڑے ان پر برس پڑے۔ اس نے جسے نشانہ بنایا تھا، وہ چند ثانیوں تک تڑپا پھر خاموش ہوگیا۔ اس کے پیٹ اور سینے میں بہت سی گولیاں لگی تھیں اس لیے خون ابل رہا تھا۔

معاً ٹرک کے اوپر سے ہولناک تڑتڑاہٹ کے ساتھ فائرنگ شروع ہوگئی۔ علی نے پیچھے کی جانب چھلانگ لگائی اور پروفیسر کو لیے ہوئے نیچے جا پڑا۔ وہ ان پر جھکا ہوا تھا تاکہ کوئی گولی انہیں نقصان نہ پہنچا دے۔

اس کار کو وہ تینوں فوجی تین طرف سے نشانہ بنائے ہوئے تھے اور ان پر گولیاں برسا رہے تھے۔ علی نے سوچا کہ اگر وہ کار سے دور نہ ہٹا تو چوہے کی موت مارا جائے گا اس لیے وہ پروفیسر کا ہاتھ تھامے زمین پر لڑھکتا ہوا ڈھلان کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ ابھی وہ ٹرک کے کنارے پہنچا ہی تھا کہ اس کی نظر ٹرک کی جانب اٹھ گئی۔ ایک فوجی گرینیڈ کا پن دانتوں سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یقیناً اب وہ اسے کار پر پھینکے گا، یہ سوچ کر وہ پروفیسر کو کھینچتے ہوئے نیچے لڑھکتا چلا گیا۔

''دھائیں! دھائیں!'' دو لرزہ خیز دھماکے ہوئے۔ شعلوں کی کوند دکھائی دی۔ ٹھیک

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسی وقت کمانڈر علی نے اس پر فائرنگ کی تو وہ کراہ کر الٹ گیا۔

دوسری طرف سے ایک اور فوجی آ رہا تھا۔ علی نے اس پر بھی فائر کیا تو وہ بھی گھومتا ہوا آگے آیا اور پھر پہلے والے مردہ فوجی سے الجھ کر گر پڑا۔

''میں ان لوگوں کو فائرنگ کر کے الجھاتا ہوں۔ آپ کسی طرح فوجی ٹرک کو یہاں لے آئیں۔'' کمانڈر علی نے پروفیسر سے کہا۔

پروفیسر اپنی اور کمانڈر علی کی جان بچانے کے لیے مختلف چیزوں کی آڑ لیتے ہوئے ٹرک کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے ٹرک کے نزدیک پہنچ کر اطراف کا جائزہ لیا۔ بچ جانے والے فوجی دور دور تھے۔ موقع مناسب تھا۔ وہ ٹرک پر چڑھے اور اسے ڈرائیو کرتے ہوئے کمانڈر علی کے پاس لے آئے۔

آفیسر ایک طرف کھڑا اپنے آدمیوں کو ختم ہوتے دیکھ رہا تھا مگر اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ تو کمانڈر علی کے جسم سے لہو ابلتا دیکھنا چاہتا تھا۔

کمانڈر علی نے ٹرک کو اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ درخت کی آڑ سے نکلا۔ ٹھیک اسی وقت آفیسر نے اپنی ٹیلی اسکوپ رائفل سیدھی کی اور اس کی دوربین کو اپنی آنکھ سے لگا کر علی کا نشانہ لینے لگا۔

کمانڈر علی جب اس کی زد میں آ گیا تو اس نے ٹریگر پر انگلی رکھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا، علی نے چھلانگ لگائی اور ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار ہو گیا۔

ٹرک میں گرتے ہی وہ لیٹ گیا اس لیے آفیسر کی گولی سے بچ گیا۔

کمانڈر علی نے چیخ کر پروفیسر کو ہدایت دی کہ وہ آگے کی طرف بڑھتے رہیں۔ پروفیسر نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

علی حیران تھا کہ وہ تو فقط پانچ فوجی تھے اور اس نے پانچ سے زیادہ کو واصل جہنم کر دیا تھا پھر بھی ان کی تعداد اتنی ہی تھی، پھر پتا نہیں کہاں سے چار پانچ موٹر سائیکل سوار فوجی نکل آئے جو ان کے تعاقب میں چلے آ رہے تھے۔ علی مسلسل ان پر فائر کر رہا تھا۔ اس کی نظریں ادھر تھیں اس لیے وہ ان دو فوجیوں کو دیکھ نہ پایا جو موٹر سائیکل پر سوار بائیں طرف سے ٹرک کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ وہ ان لوگوں کو نشانے پر رکھے ہوئے تھا اس لیے وہ اس بائیک والے کو بھی دیکھ نہ سکا جو دائیں طرف سے طوفانی رفتار سے ٹرک کے قریب آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے ٹرک کی باڈی کو مضبوطی سے پکڑ لیا پھر موٹر بائیک کو چھوڑ دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے کمال پھرتی سے اسے لات مار کر دور دھکیل دیا

تھا اور خود چھلانگ لگا کر ٹرک پر چڑھ گیا تھا۔

علی چونکہ دوسری طرف متوجہ تھا اس لیے وہ اسے دیکھ نہ سکا یا پھر اسے مہلت نہ ملی تھی۔ وہ فوجی جس کا چہرہ چوڑا تھا اور جسم کسرتی، وہ اس سے لپٹ گیا تھا۔

وہ بے حد طاقتور تھا، کسی ارنے بھینسے کی طرح مضبوط! چند لمحوں کے لیے تو علی کو اپنی ہڈیاں کڑکڑاتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کی سانس بھی رکنے لگی تھی۔

علی نے جھٹکا دے کر اپنی کہنی چھڑائی پھر وہی کہنی اس نے فوجی کی پسلیوں پر ماری تو وہ اوغ کی آواز کے ساتھ دوہرا ہو گیا۔

علی کے لیے اتنی مہلت بہت تھی۔ اس نے اس فوجی کو دونوں بازوؤں سے پکڑا اور اسے اٹھا کر انجن کی طرف اچھال دیا۔ وہ بونٹ پر گرا تھا پھر وہاں سے پھسل کر نیچے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ ٹرک کے درمیان میں گرا تھا اور ٹرک اس پر سے گزر گیا تھا۔ دونوں پہیے اس کے دائیں اور بائیں سے گزر گئے تھے۔ وہ صحیح سلامت تھا کہ اس کے دو ساتھی جو موٹر سائیکلوں پر ٹرک کا پیچھا کرتے ہوئے اڑتے چلے آ رہے تھے، اسے کچلتے ہوئے گزر گئے۔

علی نے ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد اپنی گن پھر سے سیدھی کر لی اور تعاقب کرنے والوں پر گولیاں برسانے لگا۔

اب پیچھا کرنے والے گھٹ کر صرف دو رہ گئے تھے کہ پروفیسر نے چیخ کر کہا۔

''علی دیکھنا۔''

کمانڈر علی نے گردن باہر نکال کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ سامنے سڑک کے بیچوں بیچ ایک اور ٹرک کھڑا تھا۔ پروفیسر نے اس فوجی ٹرک سے بچنے کے لیے بریک پر دباؤ بڑھا دیا تھا مگر وہ ٹکراؤ سے بچ نہ سکا۔

ٹکر ہوتے ہی علی اچھل کر نیچے جا پڑا تھا۔ اب وہ جھاڑیوں کے عقب میں تھا کہ پروفیسر بھی ٹرک کا دروازہ کھول کر سانپ کی طرح پھسلتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ تبھی ان پر کھڑے ہوئے ٹرک کے عقب سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ اس انٹیلی جنس آفیسر نے انہیں پھانسنے کے لیے ہر طرف پھندے پھیلا دیے تھے اسی لیے ان دونوں کو محسوس ہوا جیسے وہ چوہے دان میں پھنس چکے ہیں۔

☆======☆======☆

''کیا؟ تمہارے پاس ایک ایسی لڑکی آ رہی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ یہ اس کا دوسرا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جنم ہے؟'' کیتھی نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''اس نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے مگر باتوں سے یہی سمجھا رہی ہے لیکن میں ایک مسلمان ہوں اور مسلمان ہونے کے ناطے مجھے یقین کامل ہے کہ دوسرا جنم ایک گھڑی ہوئی کہانی ہے جسے ہندوؤں کے رفی فارمرز نے لوگوں کو برائی سے بچانے کے لیے دل میں خوف بٹھانے کے لیے گھڑا ہے۔ اگر دوسرا جنم ہوتا تو قرآن پاک میں اس کا ذکر ضرور آتا۔ کیونکہ قرآن پاک خود کہتا ہے کہ ''اس میں کائنات کی ہر شے کا بیان ہے۔'' پھر دوسرے جنم کا کیوں نہیں ہے؟'' غلام رسول بولا۔

''پھر وہ لڑکی کون ہے؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''اگر وہ فراڈ نہیں کر رہی ہے تو وہ شیاطین میں سے ہے۔ شیاطین اور جن کا ذکر قرآن میں ہے۔ اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ علامہ ابن جوزی نے 597 ہجری میں ''کام المرجان فی احکام الجان'' لکھی۔ علامہ ابن قیم نے 751ھ میں ''اغاثہ الملتبان من مصائد الشیطان'' لکھی۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے 91ھ میں ''لقط المرجان فی احکام الجان'' لکھی۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے 505ھ میں ''احیام العلوم'' لکھی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''الاصابہ'' شیخ علی متقی نے ''کنزل العمال'' ابن مصلح مقدسی نے ''مصائب الانسان'' امام ابن کثیر نے بھی شیطان و جن پر روشنی ڈالی اس لیے جنات کے وجود سے میں تو انکار نہیں کرسکتا۔'' غلام رسول نے کہا۔

''یعنی کہ وہ لڑکی جنات میں سے ہے؟''

''ابھی میں کہہ نہیں سکتا مگر اس کی حرکات و سکنات پُراسرار ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے، میں اس کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ دراصل میں اسٹڈی کرنا چاہتا تھا۔ میری یہ کوشش تھی کہ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ اس ڈر سے میں نے کمرے کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ میں بری طرح چونک پڑا۔ وہ میرے پیچھے بیڈ کے نزدیک کھڑی تھی۔''

''کیا وہ یکایک نمودار ہوگئی تھی؟''

''اس کا تو پتا نہیں کیونکہ میں کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ آہٹ پر پلٹا تو وہ بیڈ کے نزدیک کھڑی ہوئی نظر آئی۔''

''ہوسکتا ہو، کمرے کا دروازہ کھلا رہ گیا ہو۔'' کیتھی بولی۔

''میں نے اس پہلو پر بھی غور کیا تھا مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دروازہ میں نے

خود بند کیا تھا اور بعد میں بھی بند نظر آیا۔''

''کوئی خفیہ دروازہ؟''

''اس پر بھی غور کیا ہے۔ ایک ایک انچ زمین کو ٹھونک بجا کر دیکھا ہے کیونکہ ایک بار وہ مجھے ایک تہہ خانے میں بھی لے گئی تھی مگر حیرت کی بات ہے کہ وہ تہہ خانہ بعد میں ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔''

''واقعی یہ تو عجیب بات ہے۔''

''اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ اپنا ایک ایسا نام بتا رہی ہے جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔''

''کیا نام بتا رہی ہے؟''

''تقریباً دو سو سال قبل یہاں یعنی اس علاقے پر گوہر امان نامی سردار حکومت کرتا تھا۔ یہ علاقہ ان دنوں سب سے مظلوم علاقہ تھا۔ کبھی تبتی تو کبھی ازبک اور کبھی قازق حملہ کر کے خوب لوٹ مار کرتے۔ لوگوں کی زندگی اجیرن تھی کہ کہیں سے بھٹکتا ہوا ایک عرب سیاح آ گیا۔ وہ حکمت و دانائی میں یکتا تھا۔ علم کیمیا پر بھی اسے دسترس حاصل تھی اور عقل میں بھی اس کا ثانی نہ تھا۔ اسے ان مظلوموں پر رحم آ گیا اور اس نے اپنی عقل سے، علم کیمیا کی مدد سے ایسے ہتھیار بنا کر ان لوگوں کو دیے جن کے استعمال سے ان کی شکست فتح میں بدلنے لگی۔ حملہ آور ادھر کا رخ کرنے سے کترانے لگے اور اس عرب کو نجات دہندہ کہا جانے لگا۔'' غلام رسول نے اس علاقے کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا۔ ''اس عرب نوجوان کی عقل و دانائی، علم و حکمت سے یہاں کے سردار کی بیٹی زونو متاثر ہوگئی۔ وہ اپنا دل ہار بیٹھی جب کہ زونو کا منگیتر بھی کم بہادر نہ تھا۔ وہ یہاں کا سپاہ سالار تھا۔ میرے پاس جو لڑکی آئی تھی، اس نے بھی اپنا نام زونو بتایا ہے۔''

''زونو اس علاقے کا کامن نیم ہے۔ ہر تیسری لڑکی کا یہ نام ہوتا ہے، اس رخ پر کیوں نہیں سوچتے۔''

''اس لڑکی سے ملاقات سے پہلے مجھے اپنے کمرے میں چاندنی کی ایک پٹی نظر آئی تھی اور اس پٹی پر ایک عجیب و غریب بھیانک شکل والی شبیہہ دکھائی دی تھی۔ اسے کس خانے میں فٹ کرو گی؟''

''بھئی دیکھو، میں ٹھہری ڈی این اے ریسرچ اسکالر! میں خیالوں، مفروضوں پر یقین نہیں رکھتی۔ اگر میرا خیال سننا چاہتے ہو تو سنو! تم ہی نے تو بتایا تھا کہ تمہارے قرآن

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاک میں......''

''غلط! قرآن پاک صرف ہمارا نہیں ہے۔ یہ تمام عالم کے لیے ہے جس میں زمین، چاند، مریخ، زہرہ، مشتری، عطارد وغیرہ بھی شامل ہیں یعنی تمام کائنات کے لیے ہے۔ یہ کیونکہ یہ کلام اس کا ہے جو رب المشرق و رب المغربین ہے۔ اگر وہ خود کو رب المشرق والمغرب کہتا تو ہم سمجھتے کہ یہ کلام جمع کا صیغہ استعمال کر کے بتا رہا ہے کہ یہ کلام مغربوں اور مشرقوں کے رب کا ہے۔''

''اچھا اچھا! میں کہہ رہی تھی کہ تم ہی نے بتایا تھا کہ قرآن پاک میں D.N.A کا ذکر ہے۔ ہوسکتا ہے وہ لڑکی D.N.A کے زیر اثر، تحت الشعور کے حکم پر کھنچ آئی ہو؟''

''تم نے تو میری پوری سوچ کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب مجھے اس پہلو پر بھی غور کرنا ہوگا کہ وہ لڑکی انجانے میں D.N.A کے حکم پر ایسا کر رہی ہو، یہ انسانی جسم کا پُراسرار حاکم D.N.A اسے ورغلا رہا ہو۔''

☆======☆======☆

کمانڈر علی نے اپنی جیب ٹٹولی تو انگلیاں گرینیڈ سے ٹکرائیں۔ اس نے پھرتی سے وہ گرینیڈ نکالا اور اپنے دانتوں سے پن کو کھینچ کر فوجیوں پر اچھال دیا۔ زبردست دھماکہ ہوا اور ان کے پیروں تلے کی زمین کانپ اٹھی۔ فوجیوں کے پرخچے اڑ گئے۔ ان میں سے ایک فوجی دھماکہ ہوتے ہی فضا میں اچھلا اور پھر جلتے ہوئے گولے کی صورت میں نیچے گرا تھا۔ پروفیسر عثمان نے سہم کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ بڑی دیر سے قتل و خون کا یہ کھیل دیکھ رہے تھے۔ بیس سے زائد فوجیوں کی موت دیکھ چکے تھے لیکن یہ موت سب سے بھیانک تھی، کربناک تھی۔

''ٹرک اسٹارٹ کریں۔'' کمانڈر علی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''ورنہ مزید فوجی آ جائیں گے۔ یہ آوازیں دور دور تک سنی گئی ہوں گی۔''

پروفیسر نے گیئر بدلا، ٹرن لیا اور ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔

فوجی ٹرک اوبڑ کھابڑ، اونچے نیچے راستے پر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ پروفیسر کے اندر نہ جانے کہاں سے اتنی قوت آ گئی تھی کہ وہ ذرا بھی تھکن محسوس نہیں کر رہے تھے۔ ڈرائیو کیے جا رہے تھے۔ انہیں یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ کنٹرول لائن کی طرف جانے کی بجائے مخالف سمت میں بڑھتے جا رہے ہیں۔ کچھ دور جانے کے بعد پروفیسر نے اونچی آواز میں پکارا۔ ''علی!''

''جی! کیا میں ادھر آ جاؤں؟ مگر پچھلی طرف گارڈ کون کرے گا؟'' ٹرک کے عقب سے علی کی آواز سنائی دی۔

''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہمیں تو کنٹرول لائن کی طرف جانا تھا۔''

''کنٹرول لائن کو بھول جائیں۔ اب ادھر خطرہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ زبردست ناکہ بندی کی گئی ہوگی۔ خدانخواستہ ہم ادھر گئے تو موت ہی ملے گی۔'' علی نے جواب میں کہا۔

''پھر ہم کہاں جائیں گے؟''

''کچھ آگے جا کر ٹرک چھوڑ دیں گے۔ آگے مرکزی شاہراہ ہے۔ وہاں سے ہمیں بہ آسانی سرینگر کی بسیں مل جائیں گی۔ کچھ دن ہم سرینگر میں رہ لیں گے۔ جب حالات معمول پر آ جائیں گے تو کنٹرول لائن کراس کر لیں گے۔''

پروفیسر نے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد انہوں نے خود ہی ٹرک کو روک دیا کیونکہ اب وہ پختہ سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ کمانڈر علی نے بھی کوئی اور سوال نہیں کیا اور نیچے اتر پڑا پھر دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے سیدھے سیدھے بڑھنے لگے۔ کافی دور چلنے کے بعد انہیں پختہ مکانات نظر آنے لگے گو کہ وہ کافی دور تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی چھوٹا موٹا بازار ہے۔ وہ دونوں ادھر ہی بڑھتے جا رہے تھے۔

اس بازار میں پہنچ کر کمانڈر علی نے پروفیسر سے کہا۔ ''آپ کسی سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ آپ کا لہجہ چغلی کھا لے گا کہ آپ اس علاقے کے نہیں ہیں۔ یہاں سے ہم بس کے ذریعے سرینگر جائیں گے۔''

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کی بس آ کر رکی۔ وہ دونوں ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو گئے۔

سرینگر اب زیادہ دور نہیں تھا۔ پروفیسر کے دل میں جو ڈر تھا، وہ اب ختم ہو چکا تھا کیونکہ سرینگر میں داخل ہوتے ہی وہ کلی طور پر محفوظ ہو جاتے۔ وہ اتنا بڑا شہر تھا کہ کسی ایک کو ڈھونڈنا اتنا آسان نہیں تھا پھر کمانڈر علی کی کئی پناہ گاہیں بھی تھیں۔ اس کی تنظیم کے دفاتر تھے جو زیر زمین کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر جہادی تنظیموں کے لوگ بھی تھے جو وقت ضرورت کام آ سکتے تھے۔ یہ بات اس نے پروفیسر کو بھی بتا دی تھی اسی لیے پروفیسر عثمان مطمئن تھے لیکن یہ اطمینان کا دورانیہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ بس ابھی سرینگر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے مضافات میں پہنچی ہی تھی کہ وہ چونک پڑے۔ سڑک پر بیریئر لگا کر گاڑیوں کو روک
گیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف رائفلز سیدھی کیے فوجی مستعد کھڑے ہوئے تھے۔
میں سے کچھ فوجی آنے جانے والی گاڑیوں کی تلاشی لے رہے تھے۔

''پروفیسر صاحب! اگر آپ کے پاس کوئی اسلحہ رہ گیا ہے تو اسے سیٹ کے
ڈال دیں۔'' کمانڈر علی نے سرگوشی میں کہا۔

''نہیں، میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔'' پروفیسر نے بس میں چڑھتے ہو
فوجیوں کی طرف دیکھ کر نیچی آواز میں جواب دیا۔

''یہاں کی یہ عام بات ہے کہ تلاشی کے وقت مارا پیٹا جاتا ہے۔ اگر میرے یا آپ
کے ساتھ ایسی کوئی بات ہو تو بھی مزاحمت نہیں کریں گے۔ یوں بھی یہ جگہ ایسی ہے نہیں
ماحول و حالات کا بھی یہی تقاضہ ہے۔'' علی بولا۔

اتنی دیر میں وہ دونوں فوجی مختلف لوگوں کی تلاشی لیتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گے
ان میں سے ایک نے پروفیسر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''اے بڈھے کہاں سے آرہا ہے؟''

''جی، میں ستھگام سے آرہا ہوں۔'' پروفیسر نے راستے میں آنے والے ایک قص
کا نام بتا دیا۔

''لیکن تم ادھر کے تو لگتے نہیں ہو، کیا نام ہے؟'' فوجی نے پوچھا۔

''میرا نام ڈاکٹر احسن ہے۔ میں دلی سے آرہا ہوں۔'' راستے میں علی نے پوا
طرح فیڈ کر دیا تھا اسی لیے انہوں نے وہی بات بتائی جو انہیں سمجھایا گیا تھا۔

''آپ نیچے اتر آئیں۔'' پروفیسر سے کہہ کر اس نے علی کی طرف دیکھا۔

''یہ میرے چاچا کو آپ کہاں لے جا رہے ہیں؟'' علی نے کہا۔

''آپ بھی نیچے آ جائیں۔'' اس نے علی سے کچھ نہ پوچھا، سیدھے لے جا کر ا
بند گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی چل پڑی۔

کچھ دیر بعد جب گاڑی رکی اور دروازہ کھلا تو انہوں نے خود کو ایک بند گیراج میں پا
''ہمیں انویسٹی گیشن سینٹر میں لایا گیا ہے۔ ہمت سے کام لیں گے۔ کتنا بھی
کریں، آپ اپنا صحیح تعارف نہیں کرائیں گے ورنہ معاملہ اور بھی گمبھیر ہو جائے گا۔ یہ لو
ہر روز دس بارہ لوگوں کو پکڑ لاتے ہیں تاکہ رہائی کے نام پر موٹی رقم اینٹھ سکیں۔ میری
کال پر رقم آ جائے گی۔ آپ فکر نہ کریں۔''

☆======☆======☆

رات کا آخری پہر تھا۔ غلام رسول کچھ ہی دیر پہلے سویا تھا۔ اسے ستارا شناسی پر ایک کافی پرانی کتاب مل گئی تھی۔ گو کہ یہ کتاب تبتی زبان میں تھی مگر اس کے حاشیہ پر فارسی میں کسی نے نوٹ لکھا تھا۔ تبتی زبان اس کی سمجھ سے باہر تھی مگر وہ فارسی لکھ پڑھ اور بول لیتا تھا اس لیے وہ نوٹس کی مدد سے بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔ یہ کتاب اسے اسی گاؤں کے ایک شخص نے دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ کتاب کئی پشتوں پہلے ایک بزرگ کے ہاتھ لگی تھی تبھی سے یہ ان کے پاس محفوظ چلی آ رہی ہے۔

کتاب کے حاشیہ پر جو نوٹس تھے، اسے ہی پڑھتے پڑھتے وہ سو گیا تھا۔ اسے سوئے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے شانے کو پکڑ کر ہلایا ہو۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ پروفیسر عثمان نے حویلی خریدنے کے بعد تہہ خانہ میں جنریٹر لگوا دیا تھا جس کی وجہ سے یہ حویلی رات کے وقت بقعۂ نور بنی رہتی تھی۔ غلام رسول کی عادت تھی کہ وہ سونے سے پہلے ٹیوب لائٹ آف کر دیتا اور زیرو پاور کا نیلا بلب جلا لیتا مگر اس وقت وہ بھی بجھا ہوا تھا اور اس کی وجہ سے کمرے میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

غلام رسول بستر پر بیٹھا اس اندھیرے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جنریٹر فیل ہو گیا ہے۔ اس میں کیا خرابی ہے یہ دیکھنے کے لیے وہ بستر سے اترا اور ٹٹولتا ہوا الماری کی طرف بڑھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ انتہائی ضروری چیزوں کو الماری کے اوپر رکھتا تھا۔ ٹارچ بھی وہیں ہونا چاہیے، یہ سوچ کر وہ الماری کے اوپر ہاتھ چلانے لگا۔ کافی دیر ٹٹولنے کے بعد بھی جب اسے ٹارچ نہیں ملی تو وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا کیتھی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کا کمرا بھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازہ اندر سے مقفل تھا مگر کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی سے اندر جھانکا۔ بستر پر سفید چادر تھی اور وہ خود سیاہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نائٹ گاؤن پہنے ہوئے تھی اس لیے نظر آ گئی۔ غلام رسول نے اسے کئی آوازیں دیں لیکن اسے نہ اٹھنا تھا نہ اٹھی۔ شاید بہت گہری نیند میں تھی۔ وہ ادھر سے مایوس ہو کر نوکروں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ کچن کے ساتھ چوکیدار اور باورچی کا کمرا تھا۔ وہ دونوں بھی اپنے کمرے میں بے خبر سو رہے تھے۔ انہوں نے بھی کمرے بند کر رکھے تھے اس لیے غلام رسول پر جھلاہٹ سوار ہو گئی۔ وہ پیر پٹختا ہوا تہہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ کے گلیارے اور کمروں میں کھڑکی دروازوں سے ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ تہہ خانے کی سیڑھیاں اس طرح سے اندھیری تھیں جیسے سیاہی کی چادر پھیلی ہو۔ وہ اندازے سے نیچے اترنے لگا۔ ابھی اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ بری طرح چونک گیا۔ آخری سیڑھی پر ایک سیاہ ہیولا کھڑا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا چہرہ اس طرح چمک رہا تھا جیسے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی ہوں۔

"اے! کون ہے وہاں؟" غلام رسول نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

"تمہارا دوست اور اگر بات نہ مانی تو تمہاری موت!" نیچے سے کھرکھراتی آواز سنائی دی۔

"کیا کہا میری موت! بھیا میرے! میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ کل نفس ذائقۃ الموت ہر شے کو فنا ہونا ہے۔ مجھے بھی موت آئے گی تو پھر کیوں نہ میں آج ہی اس سے ملاقات کر لوں۔" کہہ کر وہ ایک سیڑھی نیچے اترا۔ کہنے کو تو اس نے اتنا کچھ کہہ دیا تھا، حقیقت میں وہ دل ہی دل میں کسی حد تک سہم گیا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو خوفزدہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے حواس پر قابو رکھا اور نسبتاً مضبوط لہجے میں بولا۔ "تم نے تعارف تو کرایا مگر ادھورا۔ اب ذرا صحیح تعارف کراؤ تاکہ میں جان سکوں کہ تمہارے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے۔"

"میرے آنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ تمہیں ہوشیار کر دوں۔ ابھی بھی وقت ہے۔ تم زونو سے پروفیسر کی ملاقات کرا دو۔"

"پروفیسر تو یہاں ہیں ہی نہیں پھر کیا ان کے فرشتوں سے ملاقات کراؤں؟" غلام رسول نے ہنس کر کہا۔

"جیسے ہی آئیں، ان سے ملاقات کا بندوبست کراؤ اور ان کے نوٹس جو انہوں نے یہاں آنے کے بعد تیار کیے ہیں، اسے زونو کو دے دو۔"

"اور اگر میں نہ دوں تو؟" غلام رسول بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دو سیڑھی

نیچے اترا۔

"وہیں رک جاؤ!"

"کیوں؟" کہہ کر اس نے دو سیڑھیاں اور طے کر لیں۔

"تم ایسے نہیں مانو گے۔" اس ہیولے نے کہا اور اپنے داہنے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ غلام رسول کو ایسا لگا جیسے اس کے چہرے سے کچھ ٹکرایا ہو پھر اسے ہوش نہ رہا۔

☆======☆======☆

غلام رسول کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ جتنا غور کرتا، وہ اتنا ہی الجھتا جاتا۔ رہ رہ کر اس کی نظروں کے سامنے رات کا منظر آ جاتا۔ ہوش کھونے سے پہلے تک وہ اس چمکدار چہرے والے ہیولے کی طرف بڑھتا رہا تھا۔ اندھیری سیڑھیوں پر چمکتا ہوا چہرہ اور چہرے سے پھوٹتی ہلکی ہلکی روشنی اور اس روشنی میں ہلتے ہوئے ہونٹوں پر یہ حکم کہ غلام رسول! اگر تم نے اس لڑکی کو پروفیسر عثمان سے نہ ملوایا تو نقصان میں رہو گے۔ پہلے روز چاندنی کی چمکدار پٹی پر بھیانک شکل نظر آئی اور اب یہ عجیب الخلقت چہرہ!

وہ بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ دماغ کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے ہی وہ گھر سے نکلا تھا۔ اس نے سوچا تھا، باہر کی کھلی ہوا اچھا اثر دکھائے گی۔ ذہن کا بوجھ خود بخود کم ہو جائے گا۔ آج جمعے کا دن تھا۔ تمام دنوں میں سب سے مبارک دن! اس دن پڑوس کے گاؤں کی ہمہ ہمی میں وہ ذہنی ٹینشن سے آزاد ہو جائے گا اسی لیے وہ بازار کی طرف مڑ گیا تھا۔

پڑوس کا وہ گاؤں تقریباً پانچ کلومیٹر دور تھا۔ اس فاصلے کو پیدل طے کرنا آسان نہ تھا اس لیے اس نے پروفیسر کی فیاٹ نکال لی تھی اور اب اسی فیاٹ میں سوار وہ گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گاؤں کے عقبی حصے میں بازار تھا۔ اس بازار میں غذائی اجناس، کپڑے اور ضرورتِ زندگی کی معمولی چیزیں بکتی تھیں۔ اسے کچھ خریدنا تو تھا نہیں، صرف تفریح کے لیے جا رہا تھا تاکہ دماغی دباؤ کم ہو جائے۔

دماغ پر دباؤ ہو تو راستے کا پہاڑ بھی نظر نہیں آتا۔ یہی ہوا تھا۔ یکایک ہی اس کی نظر راستے کے درمیان کھڑے بیل پر پڑی تھی۔ اسے بچانے کے لیے اس نے اسٹیئرنگ کو پھرتی سے موڑا اور یہی حرکت اس کے لیے گلے کی ہڈی بن گئی۔ گاڑی ایک تودے سے ٹکرا گئی۔

انسان خواہ شہر کا ہو یا گاؤں کا، اس کی فطرت میں تماش بینی ہوتی ہے۔ آتے جاتے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لوگ رک گئے۔ اس کے گرد مجمع سا لگ گیا۔ یہ بات اس کے لیے خطرناک ثابت ہو گئی تھی پھر وہ شرمندگی بھی محسوس کر رہا تھا اس لیے اس نے گاڑی موڑ لی تھی۔ اس نے بازار جانے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ وہ واپسی کے راستے پر چل رہا تھا کہ گاڑی نے جھٹکے لینے شروع کر دیے۔ انجن سے عجیب طرح کی آوازیں آنے لگیں پھر وہ رک گئی۔ غلام رسول نیچے اترا۔ اس نے بونٹ اٹھایا تو گرم بھاپ کا بھبکا سا اٹھا۔ ریڈی ایٹر کا پانی خشک ہو چکا تھا۔ وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ پانی کہاں سے لائے، وہ اسی بات پر غور کر رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے سے آتی ہوئی ایک لڑکی پر پڑی۔ سترہ اٹھارہ سال کی وہ لڑکی کمر پر پانی کا مٹکا اٹھائے اسی کی طرف چلی آ رہی تھی۔ یہ امریکہ کا مین ہٹن بازار نہیں تھا کہ کوئی بھی لڑکی کسی بھی لڑکے کے پاس بے جھجک چلی آئے۔ یہ بلتستان کا ایک پسماندہ گاؤں تھا۔ یہاں لڑکیاں بے شرمی کا مظاہرہ نہیں کرتیں۔ حجاب کی چادر سے خود کو ڈھکے رکھتی ہیں۔ جو آلودہ کر مشرقی حسن کو دوبالا کرتی ہیں مگر وہ دوشیزہ تیر کی طرح اس کی طرف کھنچی چلی آ رہی تھی۔

نزدیک پہنچ کر اس نے کہا۔ ''لو پانی چاہیے ناں! میں لے آئی ہوں۔''

غلام رسول نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی میں ایسی کوئی بات ضرور تھی کہ جو اسے عام لڑکیوں سے منفرد کر رہی تھی۔ لڑکی کے منہ سے پانی کا ذکر سن کر ایک اطمینان اس کے حوصلے کی دیواروں کو مضبوط کر گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر پانی کا مٹکا لیا اور ریڈی ایٹر کا ڈھکن کھول کر اس میں مٹکے سے پانی کی دھار گرانے لگا۔ مٹکا خالی ہو گیا۔ غلام رسول نے خالی مٹکا تشکر سے لڑکی کی طرف بڑھایا۔

''انجن ٹھنڈا ہونے میں ابھی دیر ہے۔ وہ سامنے میرا گھر ہے۔ آؤ، کچھ دیر وہاں بیٹھ جاؤ۔ پھر چلے جانا۔'' لڑکی نے کھلے الفاظ میں دعوت دی۔

غلام رسول خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ جواب نہ ملنے پر وہ بولی۔

''کیوں، میرے ساتھ جانے سے ڈر رہے ہو؟ مت ڈرو، اپنا قد، جسم اور مردذات، انہیں میری نگاہوں سے نہ گراؤ۔ بلا خوف و تردد چلے چلو۔''

لڑکی نے جب اس کے اندر مردانہ حوصلے اور غیرت کو بیدار کیا تو وہ تیار ہو گیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

وہ سامنے ہی اونچائی پر بنے ایک جھونپڑے میں رہتی تھی۔ اس جھونپڑے کا دروازہ کچی سڑک کی طرف نکلتا تھا۔ شاید اس نے وہیں سے اسے دیکھا تھا اور بھانپ لیا تھا کہ

اسے پانی کی ضرورت ہے اور پانی لے آئی تھی۔

غلام رسول اس کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہوا۔ وہ جھونپڑی اندر سے کافی کشادہ اور صاف ستھری تھی۔ ایک طرف نواڑ کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس نے غلام رسول کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک بڑے سے کٹورے میں دودھ لے آئی۔ ''لو پی لو۔''

غلام رسول نے کٹورا تھام لیا۔ اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس لڑکی کو پہچانتا ہو۔ وہ اس کی جانی پہچانی ہے مگر اسے کہاں دیکھا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ذہن پر زور دینے کے بعد بھی اسے یاد نہ آ سکا اور تھک ہار کر اس نے دودھ کے کٹورے سے منہ لگا لیا۔ کئی گھونٹ لینے کے بعد اس نے کٹورا رکھ دیا پھر بولا۔ ''مہمان نوازی کا شکریہ! میں چلتا ہوں۔''

''اچھی بات ہے، پھر کبھی ادھر آنا ہو تو بلا جھجک آیئے گا۔''

''جی اچھا!'' کہہ کر وہ باہر نکل آیا۔ اپنی گاڑی کے پاس پہنچا۔ بونٹ کو گرا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ ابھی اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی تھی کہ بری طرح چونک پڑا۔ اچانک ہی اس کی نظر اٹھ گئی تھی۔ ونڈ اسکرین سے سامنے والی پہاڑی صاف نظر آ رہی تھی مگر اس پہاڑی پر وہ جھونپڑا نہیں تھا جہاں بیٹھ کر اس نے دودھ بھرا کٹورا خالی کیا تھا۔

''یا مظہر العجائب! یہ کیا ماجرا ہے؟'' وہ بڑبڑایا اور گاڑی سے اتر کر سامنے سڑک کنارے چاول کی دکان لگائے بیٹھے شخص کی طرف بڑھا۔

وہ دکاندار پستہ قد، گندمی رنگت اور چپٹے چہرے والا بوڑھا بلتستانی تھا۔ وہ بھی بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ نزدیک پہنچ کر غلام رسول نے اس سے پوچھا۔ ''بھائی صاحب! سامنے والی اس پہاڑی پر ایک جھونپڑا ہوا کرتا تھا۔''

''ہاں، ماضی میں یہاں ایک جھونپڑا تھا لیکن یہ تب کی بات ہے جب میں گیارہ بارہ سال کا بچہ تھا پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ گھر خالی ہو گیا۔ سنتے ہیں کہ اس گھر کے مکین کسی حادثے میں مارے گئے تھے مگر یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟'' بوڑھے کے لہجے میں حیرت تھی۔

غلام رسول کا ذہن چکرا اٹھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو وہ اس جھونپڑے میں گیا تھا پھر اب وہ کہاں گیا؟ وہ لڑکی کون تھی؟ اسے پہچانی پہچانی سی کیوں لگ رہی تھی؟ وہ کھڑا یہی سوچ رہا تھا۔

☆======☆======☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انویسٹی گیشن سینٹر میں کل چھ افراد تھے۔ ان میں ایک کرنل کے رینک کا تھا۔ اس نے علی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''تم کیا کرتے ہو؟''

''پہلے بجرے چلاتا تھا۔ جب سیاحوں کی آمد کم ہوگئی تو مزدوری کرنے لگا مگر اب وہ بھی نہیں ملتی اس لیے بیکار ہوں۔''

''پاکستان کبھی گئے ہو؟''

''جی نہیں سرکار! مجھے دلی تک جانے کا موقع نہیں ملا تو پاکستان کیسے جاؤں گا؟''

''ہم نے سنا ہے بلکہ ہمارے پاس پکے ثبوت ہیں کہ تمہارا رابطہ پاکستانی گھس بیٹھیوں سے ہے۔ تم ان آتنک وادیوں کے لیے مخبری کرتے ہو۔''

''جی نہیں سرکار! ہم تو دیش بھگت ہیں۔ اکھنڈتا پر ہمارا وشواس ہے۔'' علی نے خالص ہندی لفظوں کا استعمال کیا۔

''جھوٹ مت بولو۔ تم کون کون سا اسلحہ چلا سکتے ہو؟''

''بولا ناں صاحب جی! میں ایک غریب آدمی ہوں۔ مجھے آتنک وادیوں سے کیا لینا دینا انہی لوگوں کی وجہ سے تو ہماری روزی روٹی ختم ہوئی ہے۔ مجھے اگر ایک بھی آتنک وادی مل گیا تو میں اسے کچا چبا جاؤں گا۔''

''تم ایسے نہیں بتاؤ گے۔'' کہہ کر آفیسر نے کسی کو پکارا۔ ''رمیش! اسے لے جاؤ ''خاطر داری'' کرو۔''

ایک بڑی بڑی مونچھوں والا قد آور فوجی آگے بڑھا اور علی کو کھینچ کر لے جانے لگا۔

''اسے...... اسے کہاں لے جا رہے ہو؟ میرے بھتیجے کو چھوڑ دو۔'' پروفیسر نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''کیسے چھوڑ دوں۔ یہاں خیرات خانہ کھلا ہے کیا؟ اگر اسے چھڑانا چاہتے ہو تو پورے دس ہزار روپے دینے ہوں گے۔ بولو منظور ہے؟'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک فوجی اسٹین گن لٹکائے آ گیا۔

''صاحب جی! دسوں چھوروں کو رہا کر دیں۔ سب دس دس ہجار روپیہ لائے ہیں۔''

''اچھا اچھا!'' اس نے کہا۔ ''جاؤ، ان چھوکروں کو بلا لاؤ بلکہ انہیں لے جا کر باہر چھوڑ آؤ۔ روپے گن لیے ہیں ناں؟''

''جی سردار!'' کہہ کر وہ فوجی اندر والے کمرے سے دس لڑکوں کو لے آیا۔ سب کے کپڑے جھول رہے تھے۔ جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔

''ہاں! کچھ اور لڑکوں کو لائے ہو؟'' اس نے فوجی سے پوچھا۔

''شام تک اتنے ہی لڑکے اور آ جائیں گے۔'' کہہ کر وہ لڑکوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

''ان کی حالت دیکھی، یہی حالت تم لوگوں کی ہوگی اس لیے میرا کہا مانو اور فٹافٹ رقم کا انتظام کرو ورنہ کسی کھائی میں یا سڑک کنارے ''پولیس مقابلے'' میں مارے جاؤ گے۔ اگر ایسا ہو گیا ناں تو جانتے ہو کیا ہوگا؟'' وہ افسر کچھ دیر کے لیے رکا پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''پھر تمہاری تصویر اخبارات میں آئے گی۔ ٹی وی پر دکھایا جائے گا۔ خوب شہرت ملے گی اور اس شہرت کا آسیب تمہاری آنے والی نسلوں پر، پورے خاندان پر چھایا رہے گا۔ ہر کوئی تمہارے خاندان کو آتنک وادیوں کا خاندان کہے گا۔ اس مسئلے کا حل صرف رقم ہے۔''

علی جانتا تھا، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ کہانی وادی کے ہر مسلمان گھر کی ہے۔ یہ لوگ نوجوانوں کو پکڑتے ہیں اور بھاری تاوان وصول کرتے ہیں۔ بالکل وہی سلوک کرتے ہیں جو ایک مفتوح قوم کے ساتھ فاتح کرتے آئے ہیں۔

''ہمیں کچھ وقت دیا جائے کیونکہ سرینگر میں ہمارا کوئی نہیں ہے۔ ہمیں رقم بارہ مولا سے منگوانا ہوگی۔'' علی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''مگر ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تم بجرا چلاتے تھے، وہ کس کا بجرا تھا؟''

''جس کا بھی خالی مل جاتا، چلا لیتا۔''

''انہی میں سے کسی سے دس ہزار روپے لے آؤ۔''

''موقع تو دیں، ایک فون کا موقع دیں میں کوشش کرتا ہوں۔''

''آؤ اس کمرے میں فون ہے۔'' کہہ کر وہ علی کو دوسرے کمرے میں لے آیا پھر بولا۔ ''ینگ مین! ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ ہم لوگ اتنی دور سے بال بچوں کو چھوڑ کر جان ہتھیلی پر لے کر آئے ہیں تو کیا ہمیں ''کمائی'' کرنے کا حق نہیں ہے؟'' افسر کی آواز میں یاسیت تھی اور لالچ بھی۔

علی نے فون اٹھایا اور اسی افسر کی طرف دیکھا پھر اس کی طرف پیٹھ کر کے ڈائل گھمانے لگا۔ کرر کرر کی مکروہ آواز کمرے میں گونجتی رہی۔ دوسری گھنٹی پر رابطہ ہو گیا۔

''السلام علیکم! میں شاہ جی بڑے بھائی کے ہاں سے بول رہا ہوں۔ مجھے دس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔'' پھر وہ دوسری طرف سے آنے والی آواز کو سننے لگا۔ ادھر کی بات

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ختم ہوتے ہی بولا۔ ''ہاں، ہاں، دو گڈی لے آؤ، پانچ پانچ ہزار کی۔ انشاء اللہ خوشی کی خبر سنو گے۔''

لائن ڈسکنکٹ ہوتے ہی وہ بولا۔ ''صاحب جی! میری ایک صاحب سے بات ہوئی ہے۔ پہلے میں انہی کا بجرا چلاتا تھا۔ میرے ہی گاؤں کے ہیں۔ انشاء اللہ وہ رقم کا انتظام کر دیں گے۔''

''مگر وہ آئے گا کب؟''

''ایک گھنٹے میں آ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم جا کر اپنے چچا کے پاس بیٹھو۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنا رخ موڑ لیا۔

علی واپس آ کر پروفیسر کے پاس بیٹھ گیا۔ پروفیسر عثمان دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھے تھے۔ اس حالت میں انہیں دیکھ کر کوئی بھی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ اتنے بڑے سائنس دان ہیں جنہوں نے پوری دنیا میں ہلچل مچا دی ہے۔ صحیح کہا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے تو ارب پتی بھی عیش و آرام چھوڑ کر مجاہدین کی زرہ بکتر پہن لیتا ہے اور کھردری زمین کے بستر پر بھوک کے دسترخوان سے قناعت کا نوالہ لینے لگتا ہے۔ تپتے ریگستان سے آ کر برف پوش پہاڑوں کو مرکز بنا لیتا ہے۔ پروفیسر کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ امریکہ اور سوئٹزر لینڈ کے مختلف بینکوں میں ان کی کروڑوں کی دولت پڑی تھی مگر وہ آج ایمان کی دولت حاصل کرنے کے لیے کفار کے مرکز تشدد کی کھردری زمین پر بیٹھے تھے۔ ان کے برابر میں آ کر علی نے سرگوشی میں کہا۔ ''تیار رہیں، کچھ ہی دیر میں یہاں حملہ ہو گا۔''

''کون کرے گا؟''

''میں نے آتے ہی دیکھ لیا تھا۔ یہاں کل پانچ افراد ہیں۔ ان میں سے ایک مجھے پہچانتا ہے۔ جب ہمیں لایا جا رہا تھا تو وہ فائل لے کر نکل رہا تھا اس لیے اس نے غور نہیں کیا مگر جب تفتیش شروع ہو گی تو وہ مجھے پہچان لے گا کیونکہ ایک بار اس نے مجھے بٹ گرام میں گرفتار کیا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔''

''مگر یہ بھی تو دیکھو کہ یہ عمارت کسی قلعے سے کم نہیں ہے۔ ڈبل چار دیواری ہے، پھر اتنے کمروں کے بعد ہمارا کمرا ہے۔ ہم تک پہنچنے کے لیے مددگاروں کا یہاں تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔'' پروفیسر نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ناممکن کو ممکن بنانا ہی ہم مجاہدین کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال رہی تو

ہمارے ساتھی ضرور کامیاب رہیں گے۔''

''تم نے انہیں خبر کیسے کی؟''

''کوڈ ورڈز میں، میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ میں پھنس گیا ہوں اور انویسٹی گیشن سینٹر میں قید ہوں۔ یہاں صرف پانچ افراد ہیں۔ جلد سے جلد حملہ کرو۔''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ، زخمیوں کی چیخ پکار، محافظوں کی گالیاں اور جئے ہند کی پکار۔ جواب میں مجاہدین کی للکار، جوابی نعرے۔ عجب سا خون آشام ماحول بن چکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بج کر رہے گی۔ کمانڈر علی اور پروفیسر عثمان انویسٹی گیشن سینٹر کے اس کمرے میں اکیلے رہ گئے تھے BSF کے تمام سپاہی مجاہدین کا حملہ روکنے میں مصروف تھے۔ اس موقع کا فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی تھی۔ علی نے آگے بڑھ کر پروفیسر عثمان کا ہاتھ تھاما اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے کچھ دیر تک رک کر باہر کی سن گن لی پھر گلیارے میں نکل آیا۔

گلیارا ویران پڑا تھا۔ اس نے مزید کچھ دیر رک کر ماحول کا جائزہ لیا۔ جو کچھ بھی کرنا تھا بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ وہ گربہ پا آگے بڑھتا چلا گیا۔ گلیارے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے پھر رک کر آہٹ لی۔ اس طرف خاموشی تھی۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، صدر دروازے پر ہو رہا تھا۔ یہ ان کے حق میں بہتر تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔

وہ حویلی کا عقبی حصہ تھا۔ ادھر وسیع و عریض دالان پھیلا ہوا تھا جس میں کئی بوسیدہ ستون تھے۔ یہ سرخ پتھروں سے بنی کوئی انتہائی قدیم حویلی تھی جو اس طرف سے باہر اجاڑ نظر آ رہی تھی۔ دالان کے آگے ایک وسیع و عریض صحن پھیلا ہوا تھا۔ آگے جا کر وہ گولائی کی شکل اختیار کر لیا گیا اور اس گولائی کے انتہائی سرے پر اونچی اونچی دیواریں بنی ہوئی تھیں۔ ان دیواروں کو پھلانگنا آسان نہ تھا پھر بھی کمانڈر علی پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا، آہستہ آہستہ نہایت ہوشیاری سے اسی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

گیٹ پر اب بھی بھاگ دوڑ، چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ وہاں کی آوازیں یہاں تک پہنچ رہی تھیں۔ انہیں یہ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے حویلی کے محافظوں کی نظروں میں آ سکتے ہیں کیونکہ مجاہدین کا حملہ روکنے کے لیے ایک دو محافظ چھت پر بھی ہوں گے۔ یہ سب بھی ایس ایف کے سپاہی تھے۔ ان میں کمانڈوز جیسی پھرتی کا ہونا ناممکن سی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بات تھی پھر بھی وہ دونوں ہر جانب سے ہوشیار تھے۔

اب وہ دیوار کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ ایک تو دیوار کی اونچائی اس پر دیوار پر اوپر شیشے کے ٹکڑے اور کیلیں لگی تھیں۔ اس لیے پھلانگنا آسان نہ تھا۔

''بس اب ایک راستہ ہے۔'' کمانڈر علی نے سرگوشی میں کہا۔ ''اس پیڑ پر چڑھنا ہو گا۔''

پروفیسر عثمان نے پیڑ کی طرف دیکھا۔ اس کی ایک موٹی ڈال دیوار کے اوپر سے ہوتی ہوئی باہر تک چلی گئی تھی۔ کمانڈر علی کسی بندر کی سی پھرتی سے پیڑ پر چڑھتا چلا گیا۔ اوپر پہنچ کر اس نے پروفیسر کو بھی چڑھ آنے کا اشارہ کیا۔

پروفیسر عثمان کی زندگی تجربے گاہ کی ٹیبل پر گزری تھی۔ وہ اس قسم کی مشقت کے عادی نہ تھے لیکن یہاں زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ دل میں خدا کا نام لے کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ تھوڑی سی محنت کے بعد وہ اوپر پہنچ گئے پھر کمانڈر علی کی طرح آہستہ آہستہ آگے کی طرف کھسکنے لگے۔

دیوار کی دوسری طرف پہنچ کر کمانڈر علی ڈال پکڑ کر جھول گیا۔ گو کہ زمین اب بھی پیروں سے تین چار ہاتھ کی دوری پر تھی پھر بھی اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ اس قسم کے کاموں میں مشاق تھا۔ گرتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پروفیسر بھی اس کی نقل میں اسی طرح جھول گئے۔ جیسے ہی انہوں نے ہاتھ چھوڑا، کمانڈر علی نے پھرتی سے انہیں اپنے ہاتھوں پر سنبھال لیا۔

ادھر ویرانی کا راج تھا۔ یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ یہ عمارت کہاں ہے۔ یوں بھی یہ اندازہ لگانے کا وقت بھی نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔

نیچے اترتے ہی دونوں نے دوڑ لگا دی تھی۔ سامنے والے حصے سے فائرنگ کی آواز اب تک آ رہی تھی۔ خطرہ سر پر تھا اس لیے وہ دونوں برق رفتاری سے دوڑنے لگے تھے۔ جدھر منہ اٹھا تھا وہ دونوں ادھر ہی دوڑ رہے تھے۔ کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ بس اس وقت انہیں اپنی جان کی فکر تھی۔ یہ عمارت آبادی سے الگ تھلگ مضافاتی علاقے میں واقع تھی۔ جگہ جگہ سرو کے درخت شان سے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ وہ ان درختوں کی آڑ لیتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔

اب وہ لوگ کافی دور آ چکے تھے۔ پیچھے اب آوازیں ہلکی ہو گئی تھیں لیکن انہیں یقین تھا کہ مجاہدین کا زور کم ہوتے ہی وہ لوگ ان کے تعاقب کی کوشش کریں گے چنانچہ وہ

جان لگا کر دوڑ رہے تھے۔ پروفیسر عثمان کی سانس پھول رہی تھی۔ ان کا سینہ لوہار کی دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا مگر وہ رکنے پر آمادہ نہ تھے۔ بس دوڑے چلے جا رہے تھے پھر انہیں پانی کا شور سنائی دیا۔ غالباً ڈل جھیل آ چکی تھی جس میں تیرتے بجروں کے چپوؤں کی یہ آوازیں تھیں۔ ان دونوں نے پوری قوت یکجا کی اور اپنی رفتار دوگنا کر دی۔

تھوڑی سی دیر کے بعد وہ ڈل جھیل کے کنارے کھڑے تھے۔ ڈل میں بجرے آ جا رہے تھے۔ کبھی یہ جھیل سیاحوں کا مرکز تھی مگر اب اس کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔ یہاں کی رونقوں کو غاصبوں نے اپنے بھاری بوٹوں تلے روند ڈالا تھا۔ جھیل تو اب بھی تھی۔ بجرے بھی چل رہے تھے مگر ان میں قہقہے ناپید تھے۔ ملاحوں کے چہروں پر اداسی اور پیٹ میں بھوک کا عفریت اتر گیا تھا۔

کمانڈر علی نے کنارے پر کھڑے ہو کر ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ کسی خالی بجرے کو آواز دینا چاہتا تھا کہ اس کی نظر ایک درخت سے بندھی ہوئی کشتی پر پڑی اور وہ ادھر بڑھتا چلا گیا لیکن جیسے ہی اس نے درخت سے رسا کھولنے کی کوشش کی تھی کہ ایک نوجوان دھم سے کودا۔ اس کی کمر سے اسلحہ لٹکا ہوا تھا۔

☆======☆======☆

غلام رسول بازار کے باہر کھڑا اس پہاڑی کو دیکھ رہا تھا جس پر کچھ ہی دیر پہلے اس نے ایک جھونپڑی دیکھی تھی۔ اس جھونپڑی والی سے ملا تھا۔ وہاں بیٹھ کر دودھ پیا تھا مگر اب نہ وہ جھونپڑی تھی اور نہ جھونپڑی والی۔

''کیا یہ نظر کا دھوکا ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ ''نہیں یہ دھوکا نہیں ہو سکتا۔ ابھی میں نے جس دکاندار سے بات کی تھی وہ اس وقت بھی موجود تھا جب میری کار یہاں آ کر رکی تھی۔'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں بول رہا تھا۔ ''میری کار رکی تھی تو اس نے چونک کر دیکھا تھا۔ میں نیچے اترا تھا وہ تب بھی دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے بونٹ کھولا تھا اور بھاپ اڑاتے ریڈی ایٹر کا جائزہ لیا تھا اس وقت بھی یہ دکاندار مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر جب وہ لڑکی جھونپڑی سے نکلی تھی اور اس نے گاگر لا کر مجھے دی تھی تو اسے کیوں نظر نہیں آئی؟''

غلام رسول کا ذہن سوالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ کیسا معما ہے؟

''لڑکی نے گاگر دی تھی تو پانی انڈیل کر میں نے گاگر کو اس طرف رکھا تھا'' وہ

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑبڑاتے ہوئے کار کی دوسری طرف پہنچا تو اس کے ذہن کو پھر ایک بار جھٹکا لگا۔ وہاں گاگر موجود تھی۔ ''جب گاگر موجود ہے تو یقیناً وہ لڑکی آئی تھی پھر یہ دکاندار جھوٹ کیوں بول رہا ہے؟ وہ جھونپڑی اب کیوں نظر نہیں آ رہی ہے؟''

وہ متلاشی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اس دکاندار نے پھر کہا۔ ''بھائی صاحب! کیوں میری دکانداری خراب کر رہے ہیں، کار آگے لے جائیں ناں!''

''میں...... میں جھونپڑی کو دیکھ رہا ہوں۔'' غلام رسول نے کہا۔

''کہا ناں کہ ادھر کوئی جھونپڑی نہیں ہے۔ چالیس بیالیس سال پہلے یہاں جھونپڑی تھی مگر اب نہیں ہے۔ اس اجاڑ بیابان میں کون آ کر رہے گا۔ یہ تو ہفتہ میں ایک دن کی رونق ہے۔ بازار ختم رونق ختم۔''

''ہوں، اچھا!'' غلام رسول نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا پھر اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور کار کو آگے بڑھا لے گیا۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں سوالات کی آندھیاں اسی زور و شور سے چل رہی تھیں۔ یہ کیسا سحر ہے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ایک پل میں پورا منظر کیسے بدل گیا۔ پھر وہ لڑکی اسے جانی پہچانی سی کیوں لگی تھی۔ کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں ہے جو رات میں اس سے ملنے آتی ہے۔

رات والی لڑکی کا خیال آیا تو ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ''یقیناً یہ وہی لڑکی تھی۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''آخر وہ لڑکی چاہتی کیا ہے؟ کیوں اتنے پُراسرار انداز میں وہ بار بار سامنے آتی ہے؟ پروفیسر سے قریب ہونا کیوں چاہتی ہے؟'' غلام رسول کے ذہن میں سوالات کا میلہ سا لگا تھا۔ وہ ڈرائیو کے دوران بھی اسی بات پر غور کر رہا تھا اس کی نظریں ونڈ اسکرین پر تھیں اور دماغ کہیں اور تھا تبھی تو حادثہ ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اس پر یکایک ہی نظر پڑی تھی اور اس نے بریک پر دباؤ بڑھا دیا تھا۔ گاڑی جھٹکے سے رک گئی کیونکہ وہ عورت سڑک کے درمیان میں کھڑی تھی اور ہاتھ ہلا ہلا کر رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اس نے برقع اوڑھ رکھا تھا۔ چہرہ پوری طرح سے نقاب میں ڈھکا ہوا تھا۔ غلام رسول نے سر باہر نکال کر جھلاہٹ بھری آواز میں کہا۔ ''کیا بات ہے؟ کیوں مرنا چاہتی ہو؟''

''کیا آپ نگار کی طرف جا رہے ہیں؟'' اس کی آواز میں غضب کا لوچ تھا۔

''جی ہاں!'' غلام رسول کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

''کیا آپ مجھے لے چلیں گے؟'' عورت نے پوچھا۔

''بیٹھ جائیں۔'' کہہ کر اس نے پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔

عورت اندر بیٹھ گئی۔ کار میں خاموشی تھی۔ صرف انجن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ غلام رسول نے گویا اس عورت کو نظرانداز کر دیا تھا۔ بالآخر اس عورت نے ہی خاموشی کا پردہ چاک کیا۔

''مسٹر غلام رسول!''

عورت کے منہ سے اپنا نام سن کر وہ اس طرح سے اچھل پڑا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اس نے چہرہ موڑ کر عورت کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟''

''میں صرف نام ہی نہیں، تمہاری پوری زندگی سے واقف ہوں، تم امریکہ سے کب چلے، یہاں کب آئے، پروفیسر عثمان سے تمہارا کیا رشتہ ہے وغیرہ وغیرہ۔'' عورت نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تم...... تم کون ہو؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''میں نے اگر اپنا صحیح تعارف کرا دیا تو تم بے ہوش ہو جاؤ گے۔ فی الحال اتنا سن لو کہ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ دوست بن کر تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔''

''جب تک تمہارا تعارف حاصل نہ کر لوں میں کیسے سمجھوں گا کہ تم میری دوست ہو کہ دشمن؟ پہلے اپنے بارے میں کھل کر بتاؤ۔'' غلام رسول نے آہستہ آہستہ کھل کر اپنے دل کا خدشہ ظاہر کیا۔

''مٹھی جب تک بند ہے وہ لاکھ کی اور کھل گئی تو سمجھو خاک کی۔'' عورت نے مسکرا کر کہا۔

''اچھا یہی بتا دو کہ تم ہماری مدد کس طرح کرنا چاہتی ہو؟''

''سب سے پہلے تو یہ سنو کہ تم اس وقت خطروں کے درمیان گھرے ہوئے ہو۔ تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔ رہا پروفیسر عثمان کا سوال تو انہوں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی بھول کی ہے۔ انہیں امریکہ سے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''تم کیسی پاکستانی ہو جو اس طرح کی باتیں کر رہی ہو۔ بے وقوف عورت! پاکستانی مائیں تو اپنے گود کے بچوں کو بھی اسلام کی آن پر فدا کر دیتی ہیں۔ گھر جلتے ہیں فلسطین میں اور تڑپ اٹھتی ہیں یہاں کی مائیں۔ بوسنیا ہو یا چیچنیا انڈونیشیا، کہیں بھی مسلمانوں کا خون بہتا ہے تو یہاں کی مائیں کہتی ہیں، کاش میرے بچے اس کا بدلہ لے سکتے۔''

''اسے حب المذہب نہیں بے وقوفی کہا جاتا ہے۔ مذہب کے نام پر خون بہانا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب سے بڑا گناہ ہے۔"

"بالکل صحیح! اسلام نے بھی اس بات سے منع کیا ہے۔ ایک سچا مسلمان، سچا پاکباز کبھی متعصب نہیں ہوتا۔ میں نے جو مثالیں دیں وہ تعصب پرستی نہیں انسان دوستی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اشرف المخلوقات میں سب سے اعلیٰ مسلمان ہے۔ انسان کی معراج طہارت ہے اور مسلمان اندر سے بھی طاہر ہوتا ہے۔" غلام رسول نے اسٹیرنگ کو داہنی جانب تیزی سے موڑتے ہوئے کہا، موڑ کاٹتے ہی اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر بولا۔ "طہارت جسمانی صحت کو برقرار رکھتی ہے۔ روح کی طہارت کے لیے اسلامی احکام بجا لانا ضروری ہے۔ جب وہ اسلام کے عین مطابق زندگی گزارے گا تو روح کی طہارت خود بخود ہو جائے گی۔ سورہ بقرہ میں کہا گیا ہے۔ "دین میں جبر نہیں ہے۔" جو سچا مسلمان ہو گا وہ متعصب ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اسلام نام ہے امن و سلامتی کے پیغام کا۔"

"ابھی تمہی نے تو کہا کہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں مسلمانوں پر ظلم ہو، ہم فوراً اس کے لیے شور مچا دیتے ہیں۔"

"ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہوتا ہے اس لیے دوسرے مسلمان کے دل میں درد تو اٹھے گا اسی لیے تو استعماری قوتیں کوشش میں لگی ہیں کہ مسلمان فروعی مسائل کو اچھال کر ایک دوسرے کو کافر کہیں اور گلا کٹنا شروع ہو جائے تاکہ قوت مسلم منتشر ہو جائے۔"

"ناک اِدھر سے پکڑو یا اُدھر سے بات ایک ہی ہوئی، خود کو برتر سمجھنے کا مطلب ہی دوسرے کو کمتر سمجھنا ہے اور یہی تعصب کی بنیاد ہے۔"

"باپ اپنے بیٹوں سے جتنا پیار کرے گا، اتنا دوسرے کے بیٹے سے نہیں، یہ انسانی فطرت ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اپنے بیٹے سے پیار کرنے والا دوسروں کے بیٹوں کو قتل کر دیتا ہے۔ تعصب ہم نہیں، یورپ والے کرتے ہیں۔ مثال ہے اسرائیل جو یورپی قوت کی آڑ لے کر ظلم ڈھا رہا ہے۔ خود ہمارے پروفیسر عثمان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ کیا ہے؟ ان کی برسوں کی محنت تعصب کی بنا پر ہی تو ایک امریکی سائنس دان کی جھولی میں ڈال دی گئی۔"

"ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی تو وہ اسے عدالت میں چیلنج کرتے۔ یورپ کے کسی ملک میں رہتے، یہاں کیوں آ گئے؟ اسی لیے ناں کہ وہ تخریب کار پیدا کر کے بدلہ

لیں گے۔"

"غیر مسلموں کے پاس یہی تو ایک ہتھکنڈہ رہ گیا ہے۔ BCCI نے بینکنگ میں ترقی کی تو اس پر فلسطینیوں کی امداد کا الزام لگا کر سازش کے ذریعے ختم کرا دیا۔ ایک عرب پتی شخص نے غرباء کی امداد کے لیے تنظیم بنائی تو اسے اور اس تنظیم کے کارکنوں کو تخریب کار کہہ کر بدنام کیا جانے لگا۔ کسی مسلم ملک نے ذرا سی بھی قوت حاصل کر لی تو اس پر کئی ممالک مل کر ٹوٹ پڑے، یہی انصاف ہے ناں؟"

"میں عالمی سیاست کی نہیں، پروفیسر کی بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں پروفیسر سے کیا دلچسپی ہے اور انہیں تم کیسے جانتی ہو۔" غلام رسول سنبھل گیا۔ اسے خیال آ گیا کہ یہ لڑکی یا عورت تو اسے راستے میں ملی ہے۔ اس سے لفٹ لے کر بیٹھی ہے۔ تو کیا اس نے دانستہ مجھے روکا؟ اس کے دماغ میں یہ بات کھٹک گئی کیونکہ اس علاقے کی عورتیں اتنی آزاد خیال تو ہوتی نہیں ہیں کہ ایک اجنبی مرد کے ساتھ اکیلی گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ آخر یہ ہے کون؟

☆======☆======☆

کمانڈر علی نے جیسے ہی کشتی کی رسی کھولی تھی، پیڑ سے کوئی کودا تھا۔ علی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ایک نوجوان تھا۔ اس کی کمر میں کلاشنکوف بندھی تھی۔ اس نے کلاشنکوف سیدھی کر کے کہا۔ "تم کون ہو؟"

"پہلے تم اپنا تعارف کراؤ؟"

"ہم تو سیدھے سادے اللہ کے بندے ہیں۔" نوجوان نے مسکرا کر مگر کرخت لہجے میں کہا۔

"ہم سب ایک مشن، ایک اللہ کے بندے ہیں۔" علی نے پُر جوش لہجے میں جواب دیا۔

"خوش آمدید، نئی زندگی مبارک۔" کہہ کر وہ علی سے لپٹ گیا۔ معانقہ کے بعد اس نے کہا۔ "مجھے ہمارے کمانڈر نے ڈیوٹی سونپی تھی کہ میں کشتی میں آنے والے کی مدد کروں۔ پہچان کے لیے یہ دو سال پرانا کوڈ ورڈ دیا گیا تھا جس کا آپ نے صحیح جواب دیا۔"

"مگر مجاہدین تو ابھی بھی وہیں ہیں۔" علی نے کہا۔

"کمانڈر کا کہنا ہے کہ آپ تر نوالہ نہیں ہیں۔ حملہ ہونے کے بعد باہر کی مدد کا انتظار

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں کریں گے اور عقبی حصے سے بھاگ نکلیں گے۔ اسی لیے مجھے کشتی دے کر بھیجا ہے۔ اب میں موبائل پر اشارہ دوں گا تو حملہ کرنے والے مجاہدین تتر بتر ہو جائیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ!" علی نے سہارا دے کر پروفیسر کو سوار کرایا۔ مجاہد چپوؤں کی مدد سے کشتی کو آگے بڑھانے لگا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" علی نے پوچھا۔

"حسان بٹ!" مجاہد نے جواب دیا۔

کافی دور آنے کے بعد حسان نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اسے کون سی سمت اختیار کرنا چاہیے۔

"ہمارے خیال سے کشتی کو چھوڑ دینا بہتر ہے۔ زمینی راستہ زیادہ محفوظ ہے۔" پروفیسر عثمان نے مشورہ دیا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے مگر میں کسی ایسی جگہ اترنا چاہتا ہوں جہاں سے ہمیں گاڑی مل سکے۔" حسان بولا۔

"ادھر دیکھو، شاید وہ سڑک ہے کیونکہ ابھی ابھی میں نے کسی ٹرک کا ہڈ دیکھا تھا۔" پروفیسر نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے سمت بتائی۔

"جی ہاں، آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں کشتی کو کنارے لے جا رہا ہوں۔" کہہ کر حسان نے کشتی کا رخ موڑ دیا۔

کنارے پر اتر کر اس نے کشتی کو ایک پیڑ سے باندھا پھر پروفیسر عثمان اور علی کے ساتھ اوپر کی طرف بڑھنے لگا۔

دھیرے دھیرے چلتے ہوئے وہ تینوں سڑک پر پہنچ گئے۔ تبھی انہوں نے اپنی طرف آتی ہوئی بس کو دیکھا اور اسے روکنے کے لیے ہاتھ کھڑا کر دیا۔

بس نزدیک آ کر رک گئی۔ اس بس پر سرینگر سے بارہ مولا لکھا تھا۔

"یہ بھی اچھا ہوا۔ میں خود بھی بارہ مولا ہی پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ علاقہ میرا جانا پہچانا ہے۔" علی نے کہا اور بس کی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔ اندر کئی سیٹیں خالی تھیں۔ وہ تینوں الگ الگ نشستوں پر بیٹھ گئے۔ پروفیسر نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں تبھی کنڈیکٹر کی وسل بجی۔ نیچے کھڑے مسافر جلدی جلدی اوپر چڑھنے لگے۔

سیاہ کول تار کی سانپ جیسی بل کھاتی سڑک پر بس دوڑ رہی تھی اور اس سے زیادہ تیز رفتاری سے پروفیسر کا دماغ، وہ سوچ رہے تھے کہ اب کس طرح پاکستان تک پہنچ پائیں گے۔

کیپٹن اور غلام رسول پریشان ہوں گے۔ وہ جس مقصد کے لیے یہاں آئے تھے وہ پس پشت رہ گیا تھا۔ اس کمینے انٹیلی جنس افسر نے ایسی چالاکی دکھائی تھی کہ مولانا باقر کی پوری پلاننگ مٹی میں مل گئی تھی۔ اب تو وہ واپس اس علاقے میں جا بھی نہیں سکتے تھے۔ پورے آٹھ گھنٹے ہو چکے تھے لیکن ان کا سفر ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ مسلسل بھاگ رہے تھے۔ ان آٹھ گھنٹے میں انہوں نے مقبوضہ کشمیر کا بہت بڑا حصہ دیکھ لیا تھا اور کئی خونی تجربوں سے گزر چکے تھے۔ اس وقت بھی انہیں اس انٹیلی جنس افسر کی یاد آ رہی تھی۔ اس نے یہی تو کہا تھا کہ آج ہمارے کچھ ایجنٹ کنٹرول لائن کی دوسری طرف جائیں گے اور وہاں سے بھارتی مورچوں پر فائرنگ کریں گے۔ اس فائرنگ پر بھارتی حکومت جم کر واویلا مچائے گی۔ ان کا میڈیا اسے خوب خوب اچھالے گا تا کہ عالمی سطح پر پاکستان کا امیج خراب ہو سکے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کنٹرول لائن کی حالت مزید خراب ہو جائے۔ اس سے پہلے اسے پار کر لینا چاہیے۔

کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتے ہوئے پروفیسر عثمان یہی کچھ سوچ رہے تھے کہ اگر فائرنگ کی واردات بڑے حملے میں بدل گئی۔ گولہ باری شروع ہو گئی تو پریشانیاں حد سے زیادہ بڑھ جائیں گی۔

وہ اپنے خیالوں میں اس طرح ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ آدھے سے زیادہ راستہ کٹ چکا تھا۔ اب بارہ مولا زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں سے حسان اور علی، مدد حاصل کرتے اور انہیں بہ حفاظت کنٹرول لائن کے پار پہنچا دیتے۔ وہ خیالوں کے گرداب میں گم تھے کہ بری طرح چونک پڑے اس لیے کہ وہ منظر ہی ایسا تھا۔ کھڑکی سے بل کھاتی سڑک دور تک نظر آ رہی تھی۔ اس سیاہ چکنی سڑک کے کنارے فوجی کانوائے کھڑا تھا۔ ٹرک کے اردگرد مسلح فوجی ہتھیار سنبھالے کھڑے تھے تقریباً سب کی نظریں اس بس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

☆======☆======☆

"تم..... تم کون ہو؟" غلام رسول نے لڑکی سے پوچھا۔

"میں کون ہوں، لو دیکھو پہچانو!" کہہ کر اس نے نقاب الٹ دیا۔ سیاہ نقاب کے ہالے میں گورا چہرہ گویا سیاہ رات کے سینے کو شق کر کے ابھرتا ہوا ماہتاب۔

اس ماہتابی چہرے پر نظر پڑتے ہی غلام رسول نے اسے پہچان لیا اور نسبتاً نرم لہجے میں بولا۔ "تم کیا چاہتی ہو، کیوں ہمارے پیچھے پڑی ہو؟"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں بس پروفیسر کا قرب چاہتی ہوں۔ پہلے میں نے اسے قریب کرنے کی کوشش کی تو اسے تم نے کہیں دور بھیج دیا۔"

"وہ اپنے نجی کام سے کہیں گئے ہیں۔"

"بات کچھ بھی ہو۔ اب میں نے سوچ لیا ہے کہ میں تمہارا سہارا لوں گی۔ تم مجھے پروفیسر سے قریب کرو گے۔"

"مگر کیوں؟ تمہیں پروفیسر سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

"وہ میرا محبوب ہے۔ میں اس سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہوں۔"

"کیوں مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے؟ تم جوان ہو اور وہ عمر کے اس حصے میں ہے جہاں تمام امنگیں دم توڑ دیتی ہیں۔ اس نے تو جوانی میں بھی کسی لڑکی کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔"

"تمہاری معلومات ناقص ہیں۔ وہ میرا محبوب ہے اس لیے میں اسے تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی یورپ کے رومیو اور جیولٹ، عرب کے لیلیٰ اور مجنوں، شام کے وامق و عذرا، عدن کے قیس اور لبنیٰ، ایران کے شیریں و فرہاد، پنجاب کے سوہنی اور مہینوال سندھ کے سسی اور پنوں وغیرہ ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ وہ مجھے بانہوں میں بھر لیتا تھا تو میں دنیا کے ہر غم سے آزاد ہو جاتی تھی۔"

"اچھی کہانی بنا لیتی ہو۔" غلام رسول نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔ "نگار اب نزدیک ہے۔ بولو تمہیں کہاں اتاروں؟"

"میں اب بھی اس حویلی میں رہتی ہوں جہاں تم ٹھہرے ہوئے ہو۔ وہ حویلی ہمارے پیار کی امین ہے۔ صدیوں سے ہمارے پیار کی داستان کو اپنے سینے میں چھپائے کھڑی ہے۔"

"تم اگر وہاں رہتی ہو تو پہلے نظر کیوں نہیں آئیں؟"

"اس لیے کہ میں پہلے دن سے پروفیسر کے ساتھ تھی پھر میں ہر ایک کو نظر بھی نہیں آنا چاہتی۔ صرف اسے نظر آتی ہوں جسے میں اپنا آپ دکھانا چاہوں۔ اس کی تازہ مثال ابھی کچھ دیر پہلے کا واقعہ ہے۔ تم نے جھونپڑی دیکھی، مجھے دیکھا، میری جھونپڑی میں آئے، میرے ہاتھوں سے پانی پیا مگر جب میں نے چاہا کہ میں تمہیں نظر نہ آؤں تو کیا میں تمہیں نظر آئی؟ میری جھونپڑی دکھائی دی؟ اس دکاندار تک کو نظر نہیں آئی تھی۔"

نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یعنی تم نظر بندی جانتی ہو؟"

"اسے نظر بندی نہیں قوتِ ارادی کہتے ہیں۔ میں نے اپنی قوتِ ارادی کو تمہارے کمزور ذہن پر حاوی کر دیا۔"

"تو تم اب اپنی قوتِ ارادی سے حویلی پہنچ جاؤ۔ میں نہیں لے جانے کا۔ چلو اترو میری کار سے نکلو۔" غلام رسول نے بریک دبا کر باہر کی طرف اشارہ کیا۔

"سوچ لو، بہت برا ہوگا۔ تم میری قوت نہیں جانتے۔ میں تمہیں تباہ و برباد کر دوں گی کیونکہ صدیوں سے میں یہی کرتی آئی ہوں۔ جس چیز کو میں حاصل نہیں کر سکتی اسے برباد کر دیتی ہوں۔"

"واہ! تو یہی کچھ تم میرے اور پروفیسر کے ساتھ کرنے والی ہو۔ بقول تمہارے یہ پروفیسر کا دوسرا جنم ہے اور تم اس سے پہلے جنم میں بھی پیار کرتی تھی یعنی تم نے ہی اس جنم میں اسے ختم کیا ہوگا، ہے ناں؟" غلام رسول نے طنزیہ انداز میں کہا۔

☆======☆======☆

فوجی کارواں کو دیکھ کر پروفیسر کے دل میں خوف نے سر ابھارا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ قسمت نے ایک بار پھر دھوکا دے دیا ہے۔ وہ منتظر تھے کہ اب انہیں پھر سے اذیت سہنی پڑے گی۔ ان کے فرار کی خبر عام ہو چکی ہوگی اس لیے اس بار تشدد زیادہ ہوگا۔ ان سے اگلوایا جائے گا کہ وہ کون ہیں۔ کس مقصد سے ہندوستان آئے ہیں۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے اور بس دوڑتی جا رہی تھی۔ اب فوجی کانوائے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ ڈرائیور نے اسپیڈ کم نہ کی تھی۔ پروفیسر ایک ٹک فوجیوں کو دیکھ رہے تھے مگر ابھی تک انہوں نے بس کو رکنے کا اشارہ نہیں دیا تھا۔ اب بس ان کے برابر میں پہنچ گئی تھی۔ پہلے ٹرک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے ٹرک کے برابر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پروفیسر نے تقریباً سانس روک لی تھی۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کا دل سینے سے اچھل کر کنپٹی میں پہنچ گیا ہے اور وہ وہاں دھڑک رہا ہے۔ اس کی ٹک ٹک کی آواز انہیں ساعت شکن لگ رہی تھی۔ اعصاب تن گئے تھے۔ شاید چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا کہ وہ قیامت خیز لمحہ گزر گیا۔

فوجی کانوائے پر حملہ روز کا معمول تھا۔ شاید اسی لیے فوجیوں نے اس بس کو نشانے پر لے لیا تھا مگر جب وہ بس اپنے معمول کے مطابق روٹ پر بڑھتی چلی گئی تو انہوں نے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی راحت کی سانس لی ہوگی۔

پروفیسر نے سینے میں جمع سانس کو باہر نکالا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ بس دوڑتی رہی۔

ذہن پر سکون کا غلبہ ہو تو اعصاب خود بخود ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور نیند آنکھوں پر بہ آسانی اتر آتی ہے۔ وہ بھی نیند کی وادیوں میں کھو گئے تھے۔

وقت گزرتا رہا مگر پروفیسر کو احساس تک نہ ہوا کہ کب راستہ طے ہوا اور کب وہ بارہ مولا پہنچے۔ ان کی آنکھ جھنجھوڑنے پر کھلی۔

''اٹھیے سر! ہمیں یہیں اترنا ہے۔'' علی نے اٹھایا تو وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے اٹھ گئے۔

''بس سے نیچے آیئے۔''

''یہیں قریب افضال بھٹ کا مکان ہے۔ ہم وہیں چلتے ہیں۔'' حسان نے کہا اور تینوں پیدل ہی چل پڑے۔

افضال بھٹ کا مکان دو ڈھائی فرلانگ کی دوری پر تھا۔ وہ لوگ فوراً ہی پہنچ گئے۔

افضال ایک قد آور کھلتی ہوئی رنگت کا نوجوان تھا۔ اس نے بھی علی کو پہچان لیا تھا اور خندہ پیشانی سے اپنے ہاں آنے کا شکریہ ادا کیا تھا۔

چاروں ایک کمرے میں بیٹھے آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دے رہے تھے۔

''اس وقت کنٹرول لائن کی حالت بہت خراب ہے۔ بی ایس ایف کے علاوہ فوجی بھی جمع ہیں۔ صبح سے فوجیوں کا قافلہ ادھر جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں ادھر جانا موت کے منہ میں چھلانگ لگانا ہے۔'' افضال نے بتایا۔

''مگر ان صاحب کا پاکستان پہنچنا بہت ضروری ہے کیونکہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ جتنی جلد ممکن ہو انہیں یہاں سے نکالنا ضروری ہے۔'' کمانڈر علی نے کہا۔

''تب تو پھر ایک ہی راستہ ہے۔ یہاں سے لیہ (LEH) اور لیہ سے تبتی علاقے سے متصل علاقے کو پار کرتے ہوئے ہم بلتستان میں داخل ہو سکتے ہیں۔''

''کسی بھی علاقے سے ہو، ہمیں پاکستان میں داخل ہونا ہے۔'' علی نے کہا۔

''مگر وہ برفانی علاقہ ہے۔ انتہائی دشوار گزار، کیا یہ صاحب اسے پار کرلیں گے؟'' افضال بھٹ نے پوچھا۔

''جب بات زندگی اور موت کی ہو تو ہر دشواری آسان لگتی ہے۔'' علی بولا۔ ''سب

ے اہم بات یہ ہے کہ اگر یہ صاحب ان حرامزادوں کے قبضے میں آ گئے تو یہ لوگ پاکستان کو خواہ مخواہ بدنام کرنا شروع کر دیں گے۔''

''تو ایسا کریں کہ آپ آج ہی نکل پڑیں۔'' افضل نے مشورہ دیا۔ ''گیارہ بجے والی بس میں سوار ہو جائیں۔ شام تک لیہ پہنچ جائیں گے، سو پر ایکسپریس بس ہے، صرف دو اسٹاپ پر رکتی ہے۔''

''ہم تیار ہیں۔'' علی نے کہا۔

''کچھ گرم کپڑے اور دیگر ضروری چیزیں رکھ لیں۔''

''چلو راستے سے لے لیں گے۔'' کہہ کر وہ لوگ باہر آ گئے۔ بازار سے دو سفری بیگ خرید کر اس میں گرم کپڑے اور دیگر ضروری چیزیں رکھیں اور بس اسٹینڈ پر آ گئے۔ انٹر اسٹیٹ سروس کی بس تیار کھڑی تھی۔ انہوں نے ٹکٹ لیا اور سوار ہو گئے۔ افضال اور حسان نے گلے لگ کر الوداع کہا اور مڑ گئے۔

بس کافی آرام دہ تھی۔ جھکولے ذرا بھی نہیں لگ رہے تھے۔ گزشتہ رات سے وہ مسلسل سفر میں تھے اس لیے تھوڑی ہی دیر میں انہیں نیند نے آ لیا۔ علی اور پروفیسر دونوں ہی سو گئے۔ راستہ طے ہوتا رہا اور لیہ نزدیک آتا رہا۔ راستے میں بس دو جگہ رکی مگر انہیں خبر نہ ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں ہاتھی گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں۔

''صاحب جی اٹھ جائیں، لیہ آ گیا۔'' کنڈیکٹر نے انہیں اٹھایا تبھی وہ لوگ اٹھے تھے۔

بس سے نیچے اتر کر انہوں نے ناشتہ کیا۔ اب یہاں سے انہیں دوسری بس پکڑنی تھی۔ سردی کی تیز لہر ہڈیوں میں چبھ رہی تھی۔ ان دونوں نے اوور کوٹ پہنے اور چائے کی کئی پیالیاں حلق میں اتار لیں۔ اتنی دیر میں لاکوٹ کی بس آ گئی۔ اسی بس میں انہیں سوار ہونا تھا۔

جب ان کی بس لاکوٹ پہنچی تو شام کا دھندلکا اتر آیا تھا۔ وہ دونوں بس سے نیچے اترے اب یہاں سے انہیں کس طرف جانا تھا یہ بات انہیں حفیظ الرحمٰن سے پتا کرنا تھی اور حفیظ الرحمٰن کا ہوٹل لاکوٹ بازار میں تھا۔ بس اسٹینڈ سے کچھ فاصلے پر خاصی روشنی تھی، پیٹرومیکس کی روشنی۔

''شاید وہی بازار ہے۔'' کہہ کر علی نے ادھر ہی قدم بڑھا دیے۔ پروفیسر کو سردی اتنی زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی جتنی اس عمر کا تقاضا تھا کیونکہ برفباری ان کے لیے نئی

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بات نہ تھی۔ وہ الاسکا میں بھی کچھ وقت گزار چکے تھے۔

دونوں آگے پیچھے اس بازار میں پہنچے۔ وہاں عام زندگی میں کام آنے والی اشیاء کی چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ انہیں ہوٹل حفیظ الرحمٰن کی تلاش تھی۔ زیادہ تر دکانوں پر کوئی بورڈ نہیں تھا۔ ایک جگہ انہیں تھمس اپ کا بورڈ نظر آیا تو وہ اسی طرف بڑھنے لگے۔ ان کا اندازہ درست نکلا۔ وہ ہوٹل ہی تھا۔ اس ہوٹل کے کاؤنٹر پہنچ کر علی نے مقامی زبان میں پوچھ "حفیظ الرحمٰن سے کہاں ملاقات ہو جائے گی؟"

"وہ اوپر اپنے کمرے میں ہیں۔" جواب ملا۔

لکڑیوں کی سیڑھی کو طے کرتے ہوئے وہ اوپر پہنچے۔ وہ عمارت دو منزلہ تھی مگر لکڑیوں کی۔ لکڑی کے بند دروازے پر دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ گورے چہرے پر سیاہ چھوٹی سی داڑھی اور سنہرے فریم کا چشمہ، اس کی آنکھوں میں سوال تھا جیسے وہ پوچھنا چاہتا ہو کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

"حفیظ الرحمٰن آپ ہی ہیں؟" علی نے مقامی زبان میں سوال کیا۔

"جی ہاں!" اس نے جواب دیا۔

"مجھے علی کہتے ہیں، بارہ مولا سے آیا ہوں۔"

"اچھا! اندر آجائیں۔" کہہ کر وہ دروازے سے ہٹ گیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

"آپ کے نام پر افضل بھٹ نے یہ خط دیا ہے۔" علی نے تہہ کیا ہوا کاغذ بڑھا دیا۔

حفیظ الرحمٰن نے خط پڑھا پھر بولا۔ "رات کا وقت ہے۔ یہیں آرام کریں۔ انشاء اللہ صبح میں اپنی جیپ پر آپ کو آخری چوکی تک پہنچا آؤں گا۔"

لیہ سے لاکوٹ تک وہ سو کر آئے تھے۔ بھرپور نیند لے چکے تھے اس لیے اس وقت ان کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ بستر پر لیٹ کر انہوں نے باتیں شروع کر دی تھیں۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ علی نے اٹھ کر کنڈی کھول دی۔ باہر حفیظ الرحمٰن کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ اس نے کہا۔ "فوراً...... فوراً نیچے چلیں، سامان بھی لے لیں۔"

علی نے بجلی کی سی تیزی سے سامان سمیٹا۔ انہیں بیگ میں ٹھونسا۔ وہ سب عقبی زینے سے نیچے اترے۔ نیچے جیپ کھڑی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک شخص موجود تھا۔ حفیظ الرحمٰن نے کہا۔ "مخبری ہو گئی ہے۔ تھانے میں الرٹ میسج آیا ہے کہ دو خطرناک آتنک وادی سری نگر سے بارہ مولا اور وہاں سے آنے والی بس میں سوار ہوئے تھے۔ ان دونوں

نے بی ایس ایف کے انویسٹی گیشن سینٹر پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا ہے۔ بی ایس ایف کے کئی سپاہی بھی مارے گئے ہیں۔ آپ کو یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا تھا۔ اس نے تھانے میں خبر کر دی ہے۔ وہاں مجاہدین کا ایک ہمدرد سپاہی ہے۔ اسی نے مجھے خبر بھجوائی ہے کہ آپ دونوں کو فرار کرا دیا جائے۔" پھر اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ "یہ بھی مجاہد ہے۔ تمام راستے جانتا ہے۔ آپ کو "شانوتے" کی پہاڑیوں تک پہنچا دے گا۔ وہاں کی مسجد کے امام آپ کی مدد کریں گے۔ اپنے دستے کا نام بتا کر آپ ان کی مدد لے سکتے ہیں، خدا حافظ!" حفیظ الرحمٰن نے طوفانی رفتار سے اپنی بات مکمل کی اور مڑ گیا۔

"جلدی آئیں۔" ڈرائیور نے کہا تو وہ دونوں جیپ میں بیٹھ گئے۔ جیپ بغیر ہیڈ لائٹ جلائے بے نام منزل کی طرف دوڑنے لگی۔

رات کا وقت، برفیلی ہوائیں اور دشمنوں کی سرزمین جہاں ہر طرف خطرے ہی خطرے تھے۔ جیپ میں خاموشی تھی۔ ڈرائیور مشاقی سے جیپ کو اڑائے لیے جا رہا تھا۔

تقریباً تین گھنٹے کے بعد اس نے جیپ روک دی۔ اندھیرا اب بھی اتنا ہی گہرا تھا کیونکہ آسمان پر ستارے تک نہیں تھے۔ شاید اسی لیے اندھیرے کی چادر کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔ جیپ روکنے کے بعد ڈرائیور نے کہا۔ "برادر! میں اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ آپ لوگ سیدھے سیدھے بڑھتے رہیں۔ صبح تک سرحد پر پہنچ جائیں گے۔ یاد رکھیں داہنے جانب بڑھیں گے تو سیدھے تبت پہنچ جائیں گے اور سامنے بڑھیں گے تو پاکستان۔ اسی راستے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ملے گا شانوتے جس کی مسجد کے امام آپ کی پوری مدد کریں گے۔ اللہ کا نام لے کر بڑھتے رہیں۔ میں اگر وقت پر نہیں پہنچا تو حفیظ صاحب پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے۔"

ڈرائیور کے مڑتے ہی وہ دونوں سیدھے سیدھے بڑھنے لگے۔ انجان راستے، ہر طرف ویرانی، نہ کسی انسان اور نہ جانور کا پتا تھا۔ ایسی ہولناک خاموشی کہ روح تک کانپنے لگے مگر وہ دونوں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جوتوں تلے آ کر برف کی پرتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ کہیں کہیں تو پیر برف میں دھنس رہے تھے۔

"پتا نہیں کب وہ گاؤں آئے گا۔" پروفیسر عثمان نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"فکر مت کریں۔ خدا ہمارا نگہبان ہے۔ اگر اسے ہماری زندگی بچانا مقصود ہے تو ضرور کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔" علی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہ چاروں طرف بھٹک رہی تھی۔ تھوڑے فاصلے پر چٹانوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ وہ ادھر ہی بڑھتے جا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے تھے۔ پروفیسر عثمان کو ایسا لگ رہا تھا جیسے موت کے سرد ہاتھ انہیں چھو چھو کر گز رہے ہیں۔ نہ جانے کتنی دیر کی مشقت اور کمر توڑ جدوجہد کے بعد وہ دونوں چٹانی سلسلہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ تھکن کے مارے وہ حالت تھی کہ جان کنی کی کیفیت احساس ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ایک چھجے کی طرح آگے کو نکلی ہوئی چٹان کے نیچے بیٹھ ستانے لگے۔ اندھیرا اب بھی اسی طرح چھایا ہوا تھا اور برف باری بھی جاری تھی لیکن برف باری زیادہ دیر تک جاری نہ رہی اور آسمان دھیرے دھیرے صاف ہونے لگا۔

تھکان اور ٹھنڈ نے ان کے جسموں کو ساکت کر دیا تھا۔ چٹان کے نیچے لیٹے لیٹے آنکھوں میں غنودگی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی اور پھر جب آنکھ کھلی تو سورج پوری آب تاب سے چمک رہا تھا۔

انہوں نے اردگرد کے ماحول کو تعجب سے دیکھا۔ دور دور تک برف سے اٹا میدا اور میدان میں جا بجا درخت۔

''میں نے کہا تھا نا کہ خدا ہمارا نگہبان ہے۔ اگر اسے ہماری زندگی بچانی ہے تو ہر طرح کے حالات سے نکل آئیں گے۔''

پروفیسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتے رہے پھر انہوں نے آنکھیں جھکا لیں جیسے وہ اس کی بات سے مطمئن ہیں۔

''سر! اس علاقے میں ایک قسم کا خوش ذائقہ پھل ہوتا ہے۔ پہاڑی کے درے میں چھوٹے چھوٹے پودوں پر پھلتا ہے۔ ممکن ہے تھوڑی سی تلاش سے مل جائے۔'' علی نے کہا اور پروفیسر اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ایک حیرت ناک بات جو علی نے محسوس کی تھی وہ یہ کہ اب نہ تو پروفیسر کے چہرے پر مردنی اور تھکن پائی جاتی تھی اور نہ ہی پژمردگی جواب تک دیکھی جاتی رہی تھی بلکہ ان کی چال میں بھی تھوڑی سی تیزی تھی۔ طور اس نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا اور وہ آگے بڑھنے لگے۔ آہستہ آہستہ پیڑوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ تقریباً دو میل کے بعد برفیلا میدان شروع ہو گیا۔

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے اور پھر درختوں کے درمیان سے نکل آئے۔ ابھی بھی ان کے قدموں میں تھکن پیدا نہیں ہوئی تھی اور یوں بھی دن کی روشنی اچھی خاصی تھی اور پھر سفر کرنے کے علاوہ انہیں کوئی کام بھی نہیں تھا۔

ابھی وہ لوگ کچھ ہی دور پہنچے تھے کہ دفعتاً ایک آواز کانوں سے ٹکرائی اور وہ دونوں ہی اچھل پڑے۔ پروفیسر نے جلدی سے علی کا بازو پکڑ لیا تھا پھر وہ آہستہ سے بولے

''ہیلی کاپٹر!''

''ہاں، میں نے بھی اس کی آواز سن لی ہے۔'' علی نے آسمان کی طرف نگاہیں جما کر کہا۔

مشرقی افق کی پہاڑیوں سے ہیلی کاپٹر آگے بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ اس کا رخ اسی جانب تھا۔

''بھاگیں واپس بھاگیں۔'' علی نے کہا اور پروفیسر نے فوراً ہی ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ میدان میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ پناہ لے سکتے اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ درختوں کی آڑ میں چلے جائیں اور وہاں سے اس بات کا جائزہ لیں کہ یہ ہیلی کاپٹر پاکستان کا ہے یا بھارتی۔

سب سے آگے جو درخت تھا وہ اسی کے پاس رک گئے۔ بیٹھنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ درخت کا تنا اتنا چوڑا تھا کہ وہ اس کی آڑ میں پناہ لے سکتے تھے۔

یہاں رک کر وہ ہیلی کاپٹر پر نظریں دوڑانے لگے۔

ہیلی کاپٹر زیادہ بلندی پر نہیں تھا بلکہ کسی خاص مقصد کے تحت نیچی پرواز کر رہا تھا۔ ان کی نگاہیں بغور جائزہ لیتی رہیں۔ ہیلی کاپٹر ان کے سروں پر سے گزر گیا۔ اس پر بنا گول تین رنگوں کا نشان انہوں نے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھارتی فوج کا ہیلی کاپٹر تھا۔

''سر! یوں لگتا ہے ہماری تلاش جاری ہے۔''

''ممکن ہے۔'' پروفیسر آہستہ سے بولے۔

''بہر طور حالات کچھ بھی ہوں، ہم مایوس نہیں ہوں گے۔'' علی نے کہا تو پروفیسر نے گردن ہلا دی۔ ان کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ چاق و چوبند تھے۔

''اب کیا کیا جائے۔ آگے بڑھیں یا درختوں میں ہی رک کر جائزہ لیا جائے۔'' علی نے جملہ ختم ہی کیا تھا کہ اچانک ایک بار پھر ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ فضا میں گونجی اور اس بار بھی وہ درختوں کی تھوڑی بلندی سے گزر گیا۔ اس کے بعد پھر واپس نہیں آیا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس علاقے میں چند خانہ بدوش قبیلے آباد ہیں۔ یہ خانہ بدوش کشتی میں سفر کرتے ہیں۔ دریائے سندھ کے کنارے کنارے آباد یہ قبیلے مجاہدین کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں۔ ہم انہیں کچھ دے دلا کر راضی کر لیں گے کہ وہ ہمیں کشتی کے ذریعے دریائے سندھ عبور کرا دیں۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پروفیسر نے پُرخیال انداز میں گردن ہلا دی اور پھر دونوں درختوں کی آڑ میں اس سمت سفر کرنے لگے جدھر ان قبائل کا ہونا متوقع تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وہ بے خوف و خطر سفر کرتے رہے۔ کوئی مشکل پیش نہیں آئی لیکن دوسرے گھنٹے کا آغاز پھر ان کے لیے سنسنی خیز ثابت ہوا۔

انہوں نے اپنے عقب میں کچھ گاڑیوں کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ ایک دم رک گئے۔ ایک درخت کی آڑ سے تھوڑا سا نکل کر انہوں نے عقب میں دیکھا تو ان کا ذہن جھنجھنا اٹھا۔ فوجی گاڑیوں کی ایک قطار چیونٹیوں کی مانند رینگتی ہوئی برف کے میدان کو پار کرتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی۔ خاموش پہاڑیوں میں گاڑیوں کے انجن کی آوازیں اچھا خاصا شور پیدا کر رہی تھیں حالانکہ وہ دور تھیں لیکن ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

☆======☆======☆

''ہاں یہ پروفیسر کا دوسرا جنم ہے مگر میرا نہیں، میں نے تو ابھی جنم ہی نہیں لیا۔'' لڑکی نے اپنی آواز میں پُراسراریت گھولتے ہوئے کہا۔

اس کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی جس نے غلام رسول کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے لڑکی کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اگر جنم نہیں لیا ہے تو کیا یہ تمہارا بھوت ہے جو مجھ سے محوِ گفتگو ہے؟''

''تم تو ستاروں کی چال کے ماہر ہو، ہے نا! کس ستارے کا رخ کدھر ہے، کس دوسرے ستارے کی شعاعوں سے اس کی شعاع ٹکرا رہی ہے اور اس ٹکراؤ کا نتیجہ کیا نکلے گا، یہ سب کچھ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ جب ستاروں کی باتیں صرف اندازے سے سمجھ سکتے ہو تو کیا میری گفتگو سے ابھی تک اندازہ نہیں لگا پائے ہو کہ میں کون ہوں؟''

''کچھ کچھ اندازہ تو ہو چکا ہے پھر بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کیا کرنا چاہتی ہو اور کیوں ہمارے پیچھے پڑی ہو۔'' غلام رسول نے کہا۔

''پہلے میری پوری کہانی سن لو۔ تمہیں یہاں تک تو معلوم ہی ہو گا کہ اس علاقے کے راجا تاشی کی اکلوتی بیٹی کا نام زونو تھا جس کی نسبت ایک بہادر نوجوان سے طے ہو چکی تھی۔ وہ راجا تاشی کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اسی دوران میں اسد الکبیر ادھر آ نکلا۔ وہ عربی نوجوان زونو کے دل میں گھر کر گیا۔ پہلے پہل اسد الکبیر نے پہلو بچانے کی کوشش کی مگر جب حسن اپنی ضو پوری طرح پھیلا دے تو عشق کو جھکنا ہی پڑتا ہے، وہ بھی حسن کے آگے جھک گیا۔ راجا تاشی اس کا احسان مند تھا مگر جب اس نے محسوس کیا کہ اسد الکبیر کا ہاتھ

اس کی عزت تک پہنچنے میں کوشاں ہے تو اس کے دل میں میل آ گیا۔ وہ اسد الکبیر کے علم سے مرعوب تھا بلکہ خوفزدہ تھا۔ جانتا تھا کہ اسد الکبیر اکیلا پوری فوج پر بھاری ہے اس لیے اس نے عیاری سے اسے ملک بدر کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ کسی بھی بات کا سوچنا آسان ہے مگر اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا خاصا مشکل ہے۔ یہی بات تاشی پر صادق آ رہی تھی۔ راجا تاشی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بالآخر اس نے طے کیا کہ اسد الکبیر کو دعوت دے کر بلائے گا اور اس کے کھانے میں زہر دے دے گا لیکن اسے کس بہانے اپنے ہاں بلائے۔ وہ یہی کچھ سوچتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔ ہاں! یہ بتا دوں کہ اسد الکبیر ہی اس جنم کا پروفیسر عثمان ہے اور زونو میں خود ہوں۔'' اس لڑکی نے اتنا کہا اور خاموش ہو کر اپنی بات کا ردعمل غلام رسول کے چہرے پر تلاش کرنے لگی۔

غلام رسول اسٹیئرنگ پر داہنا ہاتھ رکھے بالکل خاموش ہمہ تن گوش تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے اس کی کہانی کو سن رہا تھا۔ لڑکی نے پھر سے سلسلہ کلام کو جوڑا۔ ''اسد الکبیر کو زہر دیا جائے گا یہ خبر کسی طرح زونو تک پہنچ گئی۔ اسے یہ خبر اس کی ہم راز سہیلی ربابہ نے دی تھی اور ربابہ کو یہ بات اس کے باپ سے معلوم ہوئی تھی۔ ربابہ کا باپ حکیم تھا۔ اسد الکبیر کے یہاں آنے سے پہلے ربابہ کے باپ کی شہرت ہر سو پھیلی ہوئی تھی مگر جب اسد الکبیر آیا اور اس نے لاعلاج قرار دے دیے گئے مریضوں کو بھی شفا دے دی تو لوگ اس کے ہاں آنے سے کترانے لگے۔ یوں بھی وہ مریضوں کا علاج اناج کے بدلے کرتا تھا جبکہ اسد الکبیر بغیر کچھ لیے علاج کر دیتا تھا اس لیے ربابہ کے باپ کے دل میں اسد الکبیر کے لیے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ راجا تاشی نے جب اس سے کہا کہ وہ کوئی ایسا سریع الاثر زہر بنا دے جسے کھاتے ہی اسد الکبیر مر جائے تو وہ خوش ہو اٹھا۔ جب وہ دونوں باتیں کر رہے تھے اس وقت ربابہ برابر والے کمرے میں بیٹھی جڑی بوٹیاں صاف کر رہی تھی۔ اس نے یہ بات سن لی اور زونو تک پہنچا دی۔ اب زونو اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح یہ بات اسد الکبیر تک پہنچ جائے مگر مشکل یہ تھی کہ وہ اس تک پہنچے کیسے کیونکہ باپ نے اس پر پابندی لگا دی تھی۔ وہ گھر سے نکل نہیں سکتی تھی۔ اسی دوران میں ایک دن راجا نے اسد الکبیر کو اپنے ہاں محفلِ میلاد کے نام پر بلا لیا۔

☆======☆======☆

میدان برف سے اٹا ہوا تھا پھر بھی ٹرک اچھی خاصی رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ان کے قریب پہنچ گئے پھر وہاں سے گزر کے آگے بڑھ گئے۔ وہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دونوں سنسنی خیز نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اب اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ اس برف پوش علاقے میں کوئی فوجی کارروائی نہیں تھی بلکہ کسی کو تلاش کیا جا رہا تھا اور وہ یہ لوگ بھی ہو سکتے تھے۔ اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ انہیں اب تمام تفصیل معلوم ہو چکی ہے اور اب وہ سری نگر کے انویسٹی گیشن سینٹر پر حملہ کرنے والوں کو تلاش کر رہے ہیں۔

ٹرک جس رفتار سے جا رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہ دور نکل جائیں گے لیکن سوال یہ تھا کہ اس کے بعد اگر وہ دونوں رخ بدلیں تو کس طرف جائیں۔ تقریباً تمام راستے بند تھے۔ پروفیسر سوچنے لگے کہ علی نے کہا تھا، جنگلوں کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ہم ندی تک پہنچ جائیں گے اور وہاں کے خانہ بدوشوں کی مدد مل گئی تو دریا پار کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر کارگل کے جنوب مشرق میں بہ آسانی پہنچ جائیں گے اور وہاں پہنچ کر مجاہدین کی کسی بھی ٹولی سے رابطہ قائم ہو سکتا ہے جو ہمیں کنٹرول لائن کے پار پہنچا دیں گے۔

لیکن تقدیر کو یہ منظور نہ تھا۔ ابھی کچھ اور سختیاں ان کی قسمت میں لکھی تھیں۔ وہ اپنی جگہ رک کر دور جاتے ہوئے ٹرکوں کو دیکھ رہے تھے کہ دفعتہً انہوں نے ان ٹرکوں کو رکتے ہوئے دیکھا۔ تبھی پروفیسر کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

’’وہ تو یہیں رک گئے۔ اب تو ہمارے تمام راستے بند ہو گئے۔‘‘ علی نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دونوں خاموشی سے دیکھتے رہے۔

ٹرکوں سے مسلح فوجی کودنے لگے اور پھر وہ اسٹین گن سیدھی کیے اردگرد پھیل گئے۔

’’یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔ آئیں پہاڑیوں کے درمیان چلے چلتے ہیں۔ ممکن ہے وہ ہمیں تلاش کرتے ہوئے اس طرف آ جائیں۔‘‘

پروفیسر نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی کے ساتھ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔

وہ دونوں بندروں کی طرح ہاتھ پاؤں کے بل چلتے ہوئے جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ لوگ اندازاً ان سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر تھے۔ ان کے بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دھڑکتے دلوں سے یہ آوازیں سنتے رہے اور آگے بڑھتے رہے پھر درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں رکے اور خرگوشوں کی طرح ایک درخت کے تنے کے نیچے دبک گئے۔ ابھی دن کا بڑا حصہ باقی تھا۔

طے یہ پایا کہ رات کو سفر کر کے اس برفیلے میدان میں دور تک نکلنے کی کوشش کریں گے اور دن کو کہیں چھپ جائیں گے۔ اس وقت تک ان کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ مایوس ہو کر یہاں سے چلے نہ جائیں۔

وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر چھپے رہے۔ ان کے کان قدموں کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ کئی بار دائیں بائیں پُراسرار سی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی دبے قدموں ان کی طرف آ رہا ہو۔ ایسے موقعوں پر وہ سانس روک لیتے اور اپنی جگہ پر جنبش بھی نہیں کرتے۔

سورج ڈھل گیا اور شام کا سایہ زمین پر اتر آیا۔ وہ خدا کو یاد کر کے اندازے سے سامنے کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی کہا نہیں جا سکتا تھا کہ بھارتی فوجی کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ کئی بار ایسے آثار نظر آئے جن سے پتا چلتا تھا کہ کچھ دیر پہلے یہاں سے فوجی گزرے ہیں۔ جب جب ایسے آثار نظر آئے وہ آس پاس کے کسی اونچے پیڑ پر چڑھ کر اطراف کا جائزہ ضرور لے لیتے کیونکہ رات کے وقت بھی یہ علاقہ دن کی طرح خطرناک ہو چکا تھا۔ برفیلے میدان میں جہاں ہر طرف برف کی سفید چادر سی بچھی ہوا اس پر ہلکا سا دھبہ بھی دور سے نظر آ سکتا تھا۔ اس وجہ سے وہ بہت زیادہ ہوشیار تھے۔ ان دونوں نے نہ جانے کتنی کھائیوں، وادیوں کو عبور کیا اور پھر ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ہر طرف ویرانی بھی تھی اور اونچی نیچی پہاڑیوں کے سلسلے کی وجہ سے بہت محفوظ بھی۔ وہاں سانپ، بچھو جیسے کیڑوں کا بہت زیادہ خطرہ تھا مگر بھارتیوں کی قید سے بہتر تھا کہ ان کا شکار ہو جائیں۔

آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ جسم تھکن سے چور ہو چکا تھا اس لیے وہاں کچھ دیر کے لیے بیٹھے تو نیند نے دبوچ لیا۔

وہ دونوں اس طرح سوئے کہ صبح سورج نکلنے کے بعد ہی اٹھے۔ علی کی آنکھ پہلے کھلی تھی۔ اس نے انگڑائی لیتے ہوئے اطراف کا جائزہ لیا تھا اور بری طرح گھبرا اٹھا تھا۔ اس نے پروفیسر کا شانہ ہلا کر انہیں بیدار کیا تھا۔

’’پروفیسر! یہ جگہ کچھ عجیب سی نہیں ہے؟‘‘ علی نے پوچھا۔

پروفیسر کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ واقعی وہ دونوں نادانستگی میں کہاں آ گئے تھے۔ ’’شکر کرو علی! واقعی خدا نے ہمیں نئی زندگی دی ہے۔‘‘

’’ہاں ماننا پڑے گا۔‘‘ علی نے تشکر بھرے انداز میں کہا۔ ’’کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جو لوگ جہاد کے لیے نکلتے ہیں انہیں خطرناک جانور، زہریلے کیڑے بھی نقصان نہیں پہنچاتے۔‘‘ کہہ کر اس نے زمین پر پھیلی لمبی لمبی لکیروں پر نظریں دوڑائیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

☆======☆======☆

''ہاں تو میں بتا رہی تھی۔'' لڑکی نے کہنا شروع کیا۔''راجا تاشی نے اپنی حویلی
یعنی اس حویلی میں جس میں تم رہ رہے ہو، اسد الکبیر کو محفل میلاد کے بہانے سے بلوا
مسلمان ہر قسم کی محفل میں جانے سے انکار کر سکتا ہے مگر محفل میلاد یا قرآن خوانی کی محفل
ہو تو اس میں انکار نہیں کرتا۔ وہ بھی وہاں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

جب وہ تیار ہو کر نکل رہا تھا اس وقت چھپتی چھپاتی زونو وہاں پہنچ گئی۔ اس کے
چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ سخت مخمصے میں تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیسے
اسے روکے کیونکہ اصل بات وہ بتانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس سازش کا سرغنہ اس کا باپ
تھا۔ اسد الکبیر کو اگر معلوم ہو جاتا کہ راجا تاشی اس کی جان کا دشمن بن چکا ہے تو وہ بدلے
میں راجا کی جان لے لیتا اور زونو یہ بھی پسند نہیں کرتی کہ کوئی اس کے باپ کو نقصان
پہنچائے۔ ایک طرف اس کا باپ تھا اور دوسری طرف اس کا محبوب اسی لیے وہ الجھن میں
گرفتار تھی۔ اسے یوں پریشان حال دیکھ کر اسد الکبیر نے پوچھا۔

''کیا بات ہے زونو! تم اتنی پریشان کیوں ہو؟''

''بات ہی کچھ ایسی ہے۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کچھ لوگ آپ کے
خلاف سازش کر رہے ہیں اور اس سازش میں وہ میرے ابا کو پھنسانا چاہتے ہیں۔ کہیں
ایسا نہ ہو کہ وہ کامیاب ہو جائیں اس لیے آپ کوئی ایسا راستہ تلاش کریں جس سے آپ پر
بھی آنچ نہ آئے اور میرے ابا بھی ہر طرح سے محفوظ رہیں۔ ان کے لیے آپ کے دل
میں میل نہ آئے۔''

''ہوں!'' اسد الکبیر نے ہنکارا بھرا۔

''آپ کچھ کریں ورنہ وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو جائیں گے اور آپ کے دل
میں ابا کے لیے کدورت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے آپ کوئی ایسا طریقہ ڈھونڈیں جس
سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''خطرہ کس قسم کا ہے، کچھ بتاؤ تو سہی؟'' اسد الکبیر نے پوچھا۔

''شاید کھانے میں کچھ ملائیں گے۔'' زونو نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

''فکر نہ کرو، میں زہر کا توڑ لے کر وہاں جاؤں گا۔'' اسد الکبیر بولا۔

اپنی بات اس نے سچ کر دکھائی۔ محفل میلاد کے بعد جب دسترخوان بچھا اور خوان
سجائے گئے تو رسم کے مطابق ایک ایک سینی میں چار چار شخص کھانے کے لیے بڑھے۔

ایسا صرف اس لیے کیا جاتا تھا کہ ایک برتن میں کھانے سے محبت بڑھتی ہے۔ گاؤں کے
لوگ ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہیں، اسی خیال سے دعوتوں میں ایک پرات میں کئی
آدمیوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا مگر یہاں معاملہ الٹ تھا۔ محفل کے شرکاء تو رسم کے مطابق
کھانا کھا رہے تھے لیکن اسد الکبیر کو الگ برتن میں کھانا دیا گیا۔ اس بات پر اسد الکبیر کے
دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں اور اس نے فوراً اپنی جھولی سے زہر مہرا کا پیالہ نکالا
اور اس میں کھانا لے کر بیٹھ گیا۔ زہر مہرے کی خاصیت یہ ہے کہ جیسے ہی اس میں زہر جاتا
ہے وہ اپنی شکل بدل دیتا ہے۔ اسی وجہ سے عالم و عاقل کہتے ہیں کہ داہنے ہاتھ میں
فیروزے کی انگوٹھی ضرور پہنو تاکہ اگر کھانے میں زہر ہو تو وہ اپنی رنگت بدل دے۔

اسد الکبیر نے پیالے کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھی تو وہ غصے میں تن کر کھڑا ہو گیا۔

☆======☆======☆

''زمین پر یہ لکیریں سانپوں کے چلنے کی وجہ سے بنی ہیں۔ کتنے قریب سے گزرے
ہیں یہ ہمارے لیکن ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچائی۔'' علی نے کہا۔''کیا اس کے بعد بھی آپ
خوف کا اظہار کریں گے؟''

''واقعی ہمیں اللہ تعالیٰ نے بچایا۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ تو آپ بتائیں گے۔''

''آؤ ہم یہاں سے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ اس طرف ہمیں ضرور پناہ ملے گی۔'' وہ
دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ دور دور تک کسی انسان کا وجود نہیں تھا۔ وہ ہر جانب نظر رکھتے
ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ان کی رفتار سست تھی مگر وہ پوری طرح ہوشیار تھے۔ بھارتی
فوجیوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم تھا کہ کمبخت کتنے فاصلے پر ہیں۔ ہیں بھی یا چلے
گئے۔ کیا وہ ساری رات انہیں تلاش کرتے رہیں گے؟ ان کے بارے میں فوجیوں کے
پاس کیسی اطلاعات ہیں؟ وہ خود سے انہی سوالات کے جواب پوچھتے رہے۔ وقت گزرتا
رہا وہ بڑھتے رہے۔

اگر علی تنہا ہوتا تو شاید اسے اتنی زیادہ پرواہ نہ ہوتی مگر اس کے ساتھ پروفیسر تھے۔
اس کے علاوہ وہ نہتا بھی تھا اگر حفیظ الرحمٰن جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرتا تو اس وقت کم از کم
ایک پستول ضرور ہوتا مگر اس کی جلد بازی نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا
تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسم
میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ ہر چند کہ دھوپ اتنی تیز نہ تھی مگر برف کی وجہ سے چمک آنکھوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو خیرہ کر رہی تھی۔

پروفیسر عثمان بڑے اعتماد سے اس کا سہارا لیے ہوئے تھے اور تھکے ہونے کے باوجود آگے بڑھ رہے تھے۔ برف کے ذرات ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی وجہ سے چٹانوں پر قدم جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ کھائیاں اور گڑھے تھے اور بعض جگہ یہ گڑھے انہیں پھلانگنا بھی پڑتے تھے۔ چٹانیں اتنی چکنی تھیں کہ اگر کوئی گڑھا پھلانگتے ہوئے اندازے کی ذرا سی بھی غلطی ہو جاتی تو وہ گڑھے میں پڑے نظر آتے۔

صبح سے دوپہر اور دوپہر نے شام کا چولہ پہن لیا۔ اب رات کی آمد سے پہلے انہیں کسی محفوظ جگہ کی تلاش تھی جہاں کوئی بہتر پناہ گاہ مل سکے۔ ان کی نگاہیں ادھر اُدھر بھٹک رہی تھیں پھر دفعتہً ایک جگہ علی کو نظر آ گئی۔ اس نے پروفیسر کو متوجہ کیا اور وہ چونک کر اُدھر دیکھنے لگے۔

"میرے خیال میں وہ بہتر جگہ ہے اگر رات ہو گئی تو ہمیں پناہ مل سکے گی۔ نہ... محفوظ جگہ ہوگی۔"

"آں...... ہاں......" پروفیسر نے جواب دیا اور انہوں نے رخ بدل لیا۔ وہاں انہیں چٹانوں کی ایک چھتری سی نظر آئی تھی۔ نیچے خاصا گہرا خلا تھا وہ اس خلا میں اترنے لگے۔ راستہ ایسا تھا کہ انہیں اس جگہ پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی لیکن یہ دراڑ بہت دور تک چلی گئی تھی اور دھند چھا جانے کے باوجود انہیں دوسری طرف کی روشنی صاف نظر آ رہی تھی۔ دراڑ اتنی سیدھی تھی کہ کافی لمبی ہونے کے باوجود دراڑ کے باہر کا منظر بھی صاف دیکھا جا سکتا تھا اور اس منظر میں انہیں دوسری طرف کا آسمان بھی نظر آ رہا تھا۔ گویا چٹانوں کا اختتام تھا۔ علی کے دل میں آیا کہ وہ دوڑ کر دوسری طرف نکل جائے مگر علاقہ شناسا نہ... اس لیے وہ لوگ وہیں بیٹھ گئے۔

"میرے خیال میں یہ جگہ ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ہے۔ ہم یہاں محفوظ طر... سے رات گزار سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" پروفیسر نے کہا اور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ انہیں اپنے حال... ہنسی آ رہی تھی۔ ایک ایسی شخصیت جس کا شمار ماہرین خلیہ میں ہوتا ہو، جس کا لیکچر... کے لیے دنیا کے کونے کونے سے لوگ کھنچ آتے ہیں۔ خلیہ کے بارے میں جس کا کہا حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔ جس نے اپنی تحقیق سے دنیا بھر میں ہلچل مچا دی ہے، وہ... سائنس دان پیادہ پا زندگی بچانے کے لیے بھاگ رہا ہے، اس سے بڑی مضحکہ خیز صور...

حال کیا ہوگی۔

ایسا صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ وہ مسلمان ہے، مسلمان ہونے کی اتنی بڑی سزا کہ دنیا کے ہر گوشے میں دشمنوں کا اژدحام ہے۔ یکایک پروفیسر کی ذہنی رو بہک گئی اور مسلمانانِ عالم کی زبوں حالی یاد آنے لگی۔ افریقہ کے مختلف ممالک میں مسلمانوں پر ظلم، بوسنیا ہرزی گووینیا، عراق، افغانستان، چیچنیا میں مسلمانوں کا شکار، بی سی سی آئی کو تباہ کرنے کی سازش، ایسی ہی بے شمار باتیں یاد آنے لگیں۔

کچھ دیر کے آرام نے جسم میں نئی توانائی بھر دی تھی۔ پھر پروفیسر خود کو ذہن پر چھائی ہوئی قنوطیت سے بچانا چاہتے تھے۔ ان افکارِ پریشاں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے وہ کھڑے ہو گئے اور بولے۔ "ینگ مین! تیار ہو جاؤ، ہمیں پھر سے سفر شروع کر دینا چاہیے کیونکہ دشمن کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔"

کمانڈر علی کی تھکن بھی اتر چکی تھی پھر وہ ایسی مشکلات کا عادی تھا اس لیے وہ فوراً سفر کے لیے تیار ہو گیا۔

رات بے حد تاریک تھی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ دونوں اندھوں کی طرح چلنے لگے۔ اس پُر ہول سناٹے میں ان کے حواس کچھ زیادہ ہی بیدار ہو گئے تھے۔ شاید اسی لیے بار بار انہیں کچھ ایسی آوازیں سنائی دیتیں جن سے شبہ ہوتا کہ بھارتی فوجی ان کے تعاقب میں ہیں۔

رفتہ رفتہ ان کی آنکھیں اس اندھیرے سے مانوس ہو گئیں اور اب وہ ٹھوکریں کھانے کی بجائے دیکھ بھال کر آگے بڑھنے لگے۔ کچھ دور جانے کے بعد دفعتہً علی کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی اور وہ شش کہتا ہوا پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا۔

"لیٹ جاؤ...... زمین پر لیٹ جاؤ۔" اس نے سرگوشی کی اور پروفیسر نے اس کی تقلید کر لی۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو تھوڑے فاصلے پر دھندلے دھندلے سے سائے نظر آ رہے تھے۔

"بھارتی فوجی ہمارے سروں پر پہنچ چکے ہیں۔" کمانڈر علی نے سرگوشی کی۔ پھر وہ زمین پر کسی چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ کھڑا ہوا پھر لوٹ کر آنے لگا۔ نزدیک پہنچ کر اس نے ہنسنا شروع کر دیا پھر اس نے ہنسی روک کر کہا۔ "نہیں بھئی، حماقت ہو گئی۔ وہ بھارتی فوجی نہیں بلکہ انسانی قد و قامت کے برابر جنگلی جھاڑیاں ہیں۔"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پروفیسر بھی ہنسنے لگے۔ پھر وہ بھی کھڑے ہو گئے اور یہ دونفری قافلہ پھر سے چل پڑا۔ اس کے بعد کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔

اس وقت رات کا آخری پہر تھا جب انہیں ایک چھوٹی سی بستی کے ہیولے نظر آئے۔ بستی پہاڑوں کے دامن میں آباد تھی۔ جس جگہ وہ کھڑے تھے، وہاں سے ایک پکی سڑک نظر آ رہی تھی۔ جس کا فاصلہ دو ڈھائی سو گز سے زیادہ نہ ہوگا۔ قریب ترین مکان پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا۔ بستی کے باہر ایک نشیبی میدان نظر آ رہا تھا جس میں خشک گھاس کے دو بڑے بڑے اونچے ڈھیر لگے ہوئے تھے جن پر ٹین کی چھت تھی۔

''کیوں نہ اس گھاس کے ڈھیر میں چھپنے کی جگہ بنا لی جائے۔'' علی نے خیال پیش کیا۔

وہ دونوں گھاس کے قریب پہنچ گئے اور جلدی جلدی گھاس کے ڈھیر کو کھود کر جگہ بنائی اور اس میں گھس گئے۔ اچھا خاصا سفر طے کر چکے تھے اس لیے تھکن پھر ہو گئی تھی چنانچہ انہوں نے گھاس میں لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ برفیلی ہواؤں میں یہ سوکھی گھاس نعمت نظر آئی۔ گرمی کا احساس جاگ اٹھا۔ ابھی بمشکل تھوڑا وقت گزرا ہوگا کہ ایک زناٹے دار آواز سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ یہ آواز کبھی مدھم ہو جاتی اور کبھی تیز، کبھی دور سے تو کبھی قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتی۔

ان کے دل دھڑکنے لگے۔ علی نے گھاس کے ڈھیر سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ آواز ایک ہیلی کاپٹر کی تھی جس کی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں اور جس کی پرواز بہت نیچی تھی۔

یہ بھارتی ہیلی کاپٹر تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بھارتی فوجی انہیں بستی کے نواح میں تلاش کر رہے تھے۔ وہ دونوں دم سادھے گھاس کے ڈھیر پر لیٹے ہیلی کاپٹر کو دیکھتے رہے۔ ہیلی کاپٹر نے کئی چکر لگائے اور اس کے بعد وہ واپس چلا گیا اور انہوں نے سکون کی سانس لی۔

''تقدیر ساتھ دے رہی ہے۔'' علی نے آہستہ سے کہا پھر وہ بولا۔ ''میرے خیال میں اب آرام کرنا بے کار ہے۔ کیوں نہ گھوم پھر کر اس بستی کے بارے میں اندازہ لگایا جائے کہ یہ ہندوؤں کی بستی ہے یا مسلمانوں کی۔ کیونکہ اگر یہ مسلمانوں کی بستی ہوئی تو ہمیں امداد مل جائے گی۔''

''مگر اس وقت؟ اتنی رات گئے کون جاگ رہا ہوگا۔ پوری بستی خواب میں ڈوبی ہوئی ہو گی۔'' پروفیسر نے کہا۔

''سوئی ہوئی بستی ہمارے لیے زیادہ سودمند ہے۔ میں یوں کرتا ہوں کہ خود جا کر اندازہ لگاتا ہوں، لیکن آپ سونے کی کوشش نہیں کریں گے کیونکہ دشمن چپے چپے پر کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ بستی سے کوئی ایسا ذریعہ تلاش کروں جس سے ہمیں راستے کے بارے میں معلومات ہو جائے یا پھر اس بستی میں ہمیں پناہ مل جائے۔'' کہہ کر وہ رینگتے ہوئے بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔

بمشکل آدھے گھنٹے میں وہ لوٹ آیا۔ اس کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ اس نے خوشی سے سرشار لہجے میں بتایا کہ یہ بستی مسلمانوں کی ہے اور یہاں کی مسجد کے پیش امام تقی جوادی سے میری ملاقات ہوئی ہے وہ نہ صرف ہمیں پناہ دینے پر راضی ہو گئے ہیں بلکہ راستہ بتانے کے لیے ایک آدمی بھی دیں گے۔''

''کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دشمن کا ایجنٹ ہو اور ہمیں فریب میں لے کر دشمن کے حوالے کر دے؟'' پروفیسر نے خدشہ ظاہر کیا۔

''NO, NEVER وہ مسجد کے امام ہیں۔ کم از کم کسی مولوی سے یہ امید نہیں ہے کہ وہ غداری کرے، ایک جہادی کو کافروں کے حوالے کر دے۔'' علی کے لہجے میں جوش تھا۔

پروفیسر کو علی کا مشورہ ماننا پڑا۔ وہ اس کے ساتھ امام کے حجرے میں آ گئے۔ مولوی صاحب کے چہرے سے تقدس عیاں تھا۔ انہوں نے خود ہی دودھ گرم کیا اور انگور کی روٹیوں کی پرات بڑھا کر بولے۔ ''فی الحال اسی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔''

روٹی کی خوشبو نے بھوک کی آگ کو تیز کر دیا۔ یہ نعمت غیر متوقع تھی۔ صبح سے ایک دانہ منہ میں نہیں گیا تھا اس لیے پروفیسر روٹی پر گویا ٹوٹ پڑے۔ بھوک چیز ہی ایسی ہے کہ سب کو ایک قطار میں لا کھڑا کرتی ہے۔

پیٹ بھرنے کے بعد وہ دونوں مولوی صاحب کے ساتھ ان کی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ گرم کمبلوں میں جسم لپٹا تو گرمی کے احساس نے راحت بخشی۔

مولوی صاحب نے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میرے بچے، اللہ تمہیں کامیابی نصیب کرے اور ہم جلد سے جلد آزادی کا سورج طلوع ہوتے دیکھ لیں۔ بیٹے! یہ علاقہ پاکستانی مملکت ہے۔ اگر 1947ء میں تھوڑی سی کوشش اور ہوتی تو یہ علاقہ بھی پاکستان کا حصہ ہوتا۔ ادھر چین ہے اور ادھر پاکستان، بیچ میں ہم لوگ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے تڑپ رہے ہیں۔ تم لوگ اپنی کوشش تیز سے تیز کر دو تاکہ جلد سے جلد غلامی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی زنجیر ٹوٹ جائے۔"

ابھی باتیں جاری تھیں کہ کسی نے باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ آواز خاصی بلند ایسا لگتا تھا جیسے اگر دروازہ کھولا نہ گیا تو اسے توڑ دیا جائے گا۔

☆======☆======☆

پیالے کا بدلتا رنگ بتا رہا تھا کہ کھانے میں زہر ہے۔ اس انکشاف نے اسد الکبیر پیشانی پر سلوٹیں پیدا کر دیں۔ چہرے پر غصے کی جھلک صاف دکھائی دینے لگی تھی۔ نے راجا کی طرف نفرت سے دیکھا پھر اٹھ کر باہر نکل آیا۔ راجا تاشی نے اپنے شکار کو صاف بچ نکلتے دیکھا تو پیچ و تاب کھانے لگا مگر اس کے پاس کوئی ایسا راستہ بھی نہیں تھا وہ اسد الکبیر کو چت کر دیتا۔ راجا تاشی میں بردباری تھی مگر زونو کا منگیتر جوان تھا۔ اس اندر جوش و ولولہ تھا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کمر سے لٹکتی تلوار کو کھینچ کر نکال لیا تھا۔

لڑکی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ وہ گھبرا اٹھی۔ اس نے علی مدد شاہ کی دادی کو آ دیکھ لیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ بولی تھی۔ "باقی کی کہانی کل سناؤں گی۔ فی الحال تم ان با پر غور کرو۔" اور وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں چلی گئی تھی۔

غلام رسول کی کار کو بڑی بی نے دیکھ لیا تھا اور اب وہ تیز تیز قدموں سے اس طرف بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔

نزدیک پہنچ کر انہوں نے کہا۔ "صاحب! آپ نے میرے پوتے کو ابھی تک نہیں بھیجا۔ اب اس کی حالت کیسی ہے؟"

"اللہ نے کرم کیا ہے۔ بہت جلد آپ خوش خبری سنیں گی۔ اس کی ہڈی جڑ گئی ہے وہ پھر سے بھاگنے دوڑنے کے قابل ہو جائے گا۔" انہوں نے تسلی دی پھر بولے "آیئے، میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں۔"

"نہیں صاحب! میں اس کاہل بنا دینے والی سواری سے نفرت کرتی ہوں جو کے عضلات کو کام کا نہیں رہنے دیتی۔ اللہ نے پیر دیے ہیں چلنے کے لیے جب ان چلے گا تو عضلات متحرک رہیں گے اور انسان چاق و چوبند رہے گا۔"

گاؤں کی ایک اجڈ گنوار عورت کے منہ سے اتنی گہری بات سن کر غلام رسول حیر زدہ رہ گیا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا، واقعی ہم اسی لیے تو کاہل جا رہے ہیں۔ کبھی انسان کی اوسط عمر سو سال ہوا کرتی تھی اور اب ساٹھ بھی نہیں

یہی تو ہماری تباہی کے آثار ہیں جب کہ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا۔ جس کا ذکر مسند احمد بن حنبل جلد 5 میں ہے کہ "آخری دور میں میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے کہ جو کجاووں کی مانند زینوں کی سواری کریں گے اور مساجد کے دروازوں پر اترا کریں گے۔ ان کی عورتیں (کپڑے) پہن کر بھی برہنہ معلوم ہوں گی۔ ان کی عورتوں کے سروں پر اونٹ کے کوہان کی مانند کچھ ہو گا۔ ان کو لعنت کرو کیونکہ وہ سب لعنتی ہیں۔"

واقعی ہم زینوں کی سواری یعنی کئی زین کی سواری کے دور میں تو سانس لے رہے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم نے تیز سے تیز سواری بنا لی ہے۔ جب کہ سورۃ النحل کی آٹھویں آیت ہے۔ "اور گھوڑے و خچر اور گدھے کہ جن پر تم سواری کرو اور (یہ) زینت کے لیے ہے اور وہ (ایسی سواریاں) پیدا کرے گا کہ جن کو تم (ابھی) جانتے بھی نہیں ہو۔"

واقعی اس دور میں کس کو خیال آیا ہو گا کہ ایسی تیز رفتار سواری بھی ایجاد ہو گی جس کے لیے نہ گھوڑے کی ضرورت ہو گی اور نہ خچروں کی بلکہ بغیر کسی باہری سہارے کے وہ دوڑے گی۔

اپنے خیالوں میں ڈوبتے ہوئے وہ حویلی تک پہنچ گیا۔ کار کو پورچ میں کھڑی کر کے جب وہ برآمدے میں پہنچا تو وہاں کیتھی پہلے سے موجود تھی۔ اس نے غلام رسول کو فکر میں ڈوبے دیکھا تو ہنس کر بولی۔ "مسٹر غلام رسول! کیا راہ چلتے بھی تم فکر میں ڈوبے ہوتے ہو؟ کیا ستاروں کے بارے میں سوچ رہے تھے؟"

"میں کیا کروں، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لڑکی سے کیسے پیچھا چھڑاؤں۔"

"میں نے کہا ناں کہ وہ لڑکی آسیب وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ راجے مہاراجے حویلیوں میں چور دروازے ضرور بناتے تھے۔ اس لڑکی کو ایسے خفیہ راستوں کا علم ہو گا۔ وہ انہی راستوں سے تمہارے کمرے میں آ جاتی ہو گی۔"

"لیکن ابھی تو وہ مجھے بازار کے باہر ملی تھی اور اسی بات پر اڑی ہوئی تھی کہ یہ پروفیسر کا دوسرا جنم ہے۔"

"یہاں آنے سے پہلے میں خود بھی عقیدہ آواگون پر یقین رکھتی تھی۔ یہی سمجھتی تھی کہ ہندوازم کا یہ عقیدہ سو فیصد صحیح ہے کہ انسان کے سات جنم ہوتے ہیں مگر جب میں یہاں آئی اور تم سے بحث شروع ہوئی تو ذہنی رخ بدل گیا اور میں نے اس کفرانہ عقیدے پر لعنت بھیج دی کیونکہ توریت اور انجیل میں بھی ایسا کوئی ذکر نہیں ہے۔" کیتھی نے ہنس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر کہا۔

"اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ مجھ سے بحث کرتی رہو۔" غلام رسول نے قدرے کر کالر کھڑے کرتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ میں تم سے زیادہ عقلمند ہوں۔"

"ضرب المثل ہے، ادب سیکھا بے ادبوں سے اور عقل بے وقوف سے۔ میں یہی کرتی ہوں۔" کیتھی نے چوٹ کر دی۔

"یعنی میں بے وقوف ہوں۔ تم نے صرف ایک سبجیکٹ پڑھا ہے، سائنس اور نے تم سے کئی گنا زیادہ ازبر کر لیے ہیں۔" غلام رسول نے برا مان کر جھلاہٹ بھری میں کہا۔

"بہت خوب! تم ہی نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول سنایا تھا خود ہی ثابت کر دیا کہ انسان کی پہچان غصے کے عالم میں ہوتی ہے۔ تمہارے اندر کتنا ہے، یہ کھل کر سامنے آ گیا۔"

"تو کیا تم نے مجھے جاہل سمجھ رکھا ہے۔ میرے پاس بھلے ہی بڑی بڑی ڈگریاں ہوں مگر علم ہے۔ سب سے بڑی کتاب کا عطا کردہ صدقہ!"

"اچھا! کتنا علم ہے؟" کیتھی اسے چھیڑنے پر اتر آئی تھی۔

"اتنا وسیع علم کہ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔"

"اچھا! حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہی کہا ہے ناں کہ علم وہ وسیع سمندر ہے جس کی گہرائی اور کنارا نہیں، پھر میں کیسے اندازہ لگا لوں؟"

کیتھی نے کہا تو غلام رسول کے ذہن میں جھماکا سا ہوا کہ واقعی یہ لڑکی بہت کام کی ہے۔ مجھ ہی سے یہ تمام اقوال سیکھے اور اب مجھ ہی پر اسے الٹ رہی ہے مگر اس نے کہا نہیں۔

اسے خاموش دیکھ کر کیتھی نے ہی خاموشی کو توڑا۔ "میں بتا رہی تھی کہ مجھے آواگون پر یقین تھا کہ ایک انسان سات بار جنم لیتا ہے۔ پہلی بار برہمن کے گھر جب گناہ کرتا ہے تو شودر (اچھوت) کے گھر، اس سے زیادہ گناہ کرتا ہے تو جانور بن کر پیدا ہوتا ہے لیکن تم سے بحث کرنے کے بعد میں نے اپنی سوچ کا محور بدل دیا اور ایک لائن پر سوچنے لگی۔ اس فکر کو مدنظر رکھ کر Cell Test کیا تو ایک ایسی بات کا پتا چلا کہ......"

"تو کیا تم نے علی مددشاہ کا Cell analyse کر لیا؟"

"رپورٹ تیار کرنے کے لیے نوٹس بنا لیے ہیں۔ پروفیسر صاحب D.N.A کے analyse پر اپنی رائے دیں گے تب فائنل رپورٹ بنے گی۔"

باتیں جاری تھیں کہ اختر باورچی نے آ کر خبر دی کہ علی مددشاہ کے دادا رسول مددشاہ آئے ہیں۔

"میں انہیں بلوا لوں؟ شاید وہ بچے کو لینے آئے ہیں۔"

"ہاں بلا لو کیونکہ پندرہ دن بعد ہی پلاسٹر اترے گا۔"

کیتھی کا جواب سن کر غلام رسول باہر چلا گیا اور کیتھی اس کمرے کی طرف چل پڑی جہاں علی مددشاہ کو رکھا گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا پیروں کی چاپ سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" کیتھی نے پوچھا۔

علی مددشاہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ شاید وہ انگلش سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر کیتھی نے پھر وہی سوال کیا مگر اس بار بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیتھی سمجھ گئی کہ ابھی وہ خلیے متحرک نہیں ہوئے ہیں جن کی وجہ سے وہ انگلش بولنے اور سمجھنے لگتا ہے۔ وہ بیڈ کے پاس کھڑی یہی سوچ رہی تھی کہ اس کا نظریہ صحیح ثابت ہو رہا ہے، خلیہ ہی اس بچے کے میموری بکس (Memory Box) کو کھولتا اور بند کرتا ہے۔ اگر اس نظریہ کی تائید پروفیسر عثمان نے بھی کر دی تو دنیائے سائنس میں وہ نامور بن جائے گی۔ نوبل پرائز بھی مل سکتا ہے کیونکہ اس نظریہ کے تحت انسان کلی طور پر کھلی کتاب بن جائے گا کہ جہاں سے مرضی اس کی زندگی کی حرکات و سکنات کو پڑھ لیا جائے۔

وہ سوچ میں گم تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ کیتھی نے مڑ کر دیکھا۔ غلام رسول بڑے میاں کو سہارا دیے اندر آ رہا تھا۔ بچے نے دادا کو دیکھا تو شینے زبان میں کچھ کہا جس کے جواب میں بڑے میاں نے پوتے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسی زبان میں کچھ کہا پھر مڑ کر غلام رسول سے پوچھا۔ "اسے ہوا کیا تھا، کچھ پتا چلا؟"

"بیٹھیے، میں سمجھاتا ہوں۔" غلام رسول بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود بھی سامنے پڑی سیٹی پر بیٹھ گیا پھر بولا۔ "سورۃ الانعام کی آیت 38 میں خداوند کریم فرماتا ہے "اور زمین میں جو چلنے پھرنے والے جاندار ہیں یا اپنے دونوں پروں سے اڑنے والے پرندے، ان کی بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ ہم نے کتاب میں کوئی بات فروگزاشت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں کی ہے۔" اس آیت سے صاف پتا چلتا ہے کہ ہر جاندار کو عقل دی ہے، جذبہ ہے، اپنے پرائے کی تمیز دی ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے لیے "بہار الانوار" کی اس حدیث مبارکہ کو پیش کیا جاتا ہے کہ امام زین العابدین نے اپنے بابا حسین رضی اللہ عنہ سے، حسین نے اپنے بابا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس دنیا میں جانداروں کی دس لاکھ اقسام موجود ہیں جن کی الگ الگ شکل وصورت اور خصوصیات ہیں۔ تمام جاندار چار باتیں جانتے ہیں، اپنے رب کو، موت کو، مذکر مونث کو اور اپنی خوراک کو پہچانتے ہیں۔" کہہ کر غلام رسول سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا۔ "صرف انسان ہی نہیں، شجر وحجر بھی شعور و احساس کے حامل ہیں، جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل آیت 44 میں یوں آیا ہے۔ "سات آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں ہیں، (سب) اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو۔" اس آیت کی تشریح میں "معجزات رسول صلی اللہ علیہ وسلم" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔"

"کن معجزات کو پیش کرو گے، کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح انہیں ید بیضا یا عصا ملا تھا؟" کیتھی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

رسول مددشاہ کے چہرے پر ناپسندیدگی کے جذبات ابھر آئے اسی لیے غلام رسول نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"ید بیضا یا عصا صرف وقتی معجزہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ختم ہوگیا کیونکہ وہ ایک مخصوص دور کے پیغمبر تھے۔ ان کی ہدایت کے لیے وقت محدود تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وقت مقرر نہیں ہے۔ وہ قیامت تک کے لیے پیغمبر بن کر آئے ہیں اس لیے ان کے پاس پیغام کا معجزہ ہے، اللہ تعالیٰ کے پیغام کا یعنی قرآن پاک جس کی ہر آیت معجزہ ہے لیکن یہاں بات ہو رہی ہے شجر وحجر کی، کنکر پتھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں آ کر حمد وثناء کرتے تھے جس کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے۔"

"کتابوں کا کیا کہنا، اکثر لوگ جوشِ عقیدت میں بھی بہت کچھ لکھ جاتے ہیں۔" کیتھی نے پھر ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔

"تمہاری بات صحیح ہے۔" غلام رسول نے کہا۔ "تم نے پولی گراف دیکھا ہے؟"

"وہی آلہ جسے امریکن سائنٹسٹ ڈاکٹر کلیو بیکنر نے ایجاد کیا ہے؟ شاید وہ پیڑ پودوں پر ریسرچ کے لیے کام میں آتا ہے؟"

"ہاں! ڈاکٹر کلیو بیکنر نے گزشتہ دنوں ایک تجربہ کیا جسے انٹرنیشنل ماہنامہ جیوگرافیکل سوسائٹی نے مع تصویر کے چھاپا ہے۔ اس نے تجربہ اس طرح کیا کہ ایک کمرے میں دو گملوں میں پودے لگا کر رکھ دیے پھر اس کمرے سے چالیس آدمیوں کو گزارا گیا۔ ان میں سے ایک کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ایک پودے کو مسل کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ اس نے وہی کیا۔ پھر بچ جانے والے پودے سے پولی گراف کا تار منسلک کیا گیا اور انہی چالیس آدمیوں کو یکے بعد دیگرے گزارا گیا۔ لوگ گزرتے رہے مگر پولی گراف پر کوئی اشارہ نظر نہ آیا مگر جیسے ہی وہ شخص جس نے دوسرے پودے کو مسلا تھا، اس کے قریب پہنچا، پولی گراف کی سوئیاں حرکت کرنے لگیں یعنی اس پودے نے پہچان لیا کہ اسی شخص نے میرے ساتھی کو مسلا تھا۔ جانتی ہو ایسا کیوں ہوا؟"

"نہیں۔" کیتھی نے نفی میں سر ہلایا۔

"ایسا اس لیے ہوا کہ پودے میں بھی جان ہوتی ہے کیونکہ اس کی تخلیق میں بھی وہی عناصر ہیں جسے تم سیل (Cell) کہتی ہو، جو انسانی جسم میں بھی ہے صرف اوزان اور ترتیب میں فرق ہے۔ اس کی زندگی کا انحصار بھی ہوا، پانی اور غذا پر ہے۔ جڑیں پانی کی تلاش میں زمین کے اندر بڑھتی ہیں، تنا سورج کی روشنی جذب کر کے کاربن ڈائی آکسائیڈ سے غذا تیار کرتا ہے۔" غلام رسول نے رسول مددشاہ کی طرف سے نظریں ہٹا کر کیتھی کی طرف دیکھا پھر بولا۔ "دراصل یہ تمام کام خلیے کا ہے۔ خلیہ یعنی سیل جو ہر جاندار کا اصل ہے، یہی زندہ جسم کی اکائی ہے لیکن خود میں مکمل کائنات ہے۔ اگر اسے خوردبین کے ذریعے دیکھا جائے تو اس میں ایک مائع سا بہتا نظر آئے گا۔ یہی زندگی کا اصل جز ہے۔ اس میں ڈنڈے نما کچھ شکلیں نظر آئیں گی جسے انگریزی میں مائٹو کانڈریا (Mitochondria) کہتے ہیں۔ یہی کلوروفل (Chlorophyll) کلورو پلاسٹ (CHlorophlast) اور پلاسٹیڈ (Plastid) ہے۔ یہی شے پتے، ٹہنی، پھول، ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، دل وغیرہ بناتی ہے۔" غلام رسول بولتے بولتے رکا پھر سانس لے کر بولا۔ "اس مائع میں ایک چیز اور ہوتی ہے جو مرغولے کی شکل میں نظر آتی ہے جسے کروموسوم (Chromosome) کہتے ہیں۔ یہ دراصل وہ تختہ ہے جس پر ہزاروں ڈی این اے سیڑھی کی شکل میں رہتے ہیں۔ ڈی این اے لوحِ محفوظ کی ادنیٰ سی شبیہہ ہے جس میں جاندار کے موروثی خصوصیات اور خلیہ کے افعال کی تکمیل کے لیے ہدایات درج ہوتی ہیں۔ جو چار قسم کے ہوتے ہیں۔ ایڈی نین (Adenine)، گوانین

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

(Guanine)، تھایامن (Thiamin) اور سائٹوسین (Cytocin) کہلاتی ہیں۔‘‘

’’لگتا ہے ان کے نام رکھنے والے کو نون کا قافیہ زیادہ پسند تھا۔‘‘ رسول مدد شاہ ہنس کر بولا۔

’’سنجیدہ باتوں پر مذاق وہی کرتے ہیں جو عقل سے پیدل ہوتے ہیں۔‘‘ کیتھی نے عمر کا لحاظ کیے بغیر جھڑکا۔

’’اچھا! اب میں مذاق نہیں کروں گا بولو۔‘‘

’’میں بتا رہا تھا کہ ان ہی میں کوڈ ورڈ میں تمام باتیں لکھی ہیں۔ ڈی این اے کا ایک سالمہ پانچ کاربن کے چھلوں والے شکر کے سالمہ جو ڈی آکسی رائبوز کہلاتے ہیں، فاسفیٹ اور ان چار نائٹروجنی اساس سے مل کر تیار ہوتے ہیں۔ اس کی شکل سیڑھی نما اس لیے نظر آتی ہے کہ ڈی این اے کے کئی سالمے مل کر ایک لمبی پٹی بناتے ہیں۔ پھر ہر سالمہ اپنی ایک نقل تیار کر لیتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے اس طرح مل جاتے ہیں کہ ایڈی نین کی جوڑی تھایامن سے اور سائٹوسین کی جوڑی گوانین سے چپک جاتی ہے۔ یعنی ایک ایسی سیڑھی بن جاتی ہے جس کے قد مچے نائٹروجنی اور دستے شکر و فاسفیٹ کے ہوتے ہیں۔ موروثی خصوصیات اور خلیہ کے افعال کے واسطے احکامات تین نائٹروجنی اساس کے پہلے حروف تہجی کے ذریعے ڈی این اے کے سالمے پہ محفوظ ہوتے ہیں جسے خفیہ اشارہ کوڈ کہا جاتا ہے۔ علی مدد شاہ بھی ڈی این اے کے زیر اثر ہے۔‘‘ غلام رسول نے پوری تقریر کر ڈالی۔

رسول مدد شاہ سمجھا یا نہیں مگر سر ہلاتا رہا پھر اس نے کہا۔ ’’جناب اگر آپ اجازت دیں تو میں علی مدد کو ساتھ لے جاؤں کیونکہ کل ہمارا خصوصی تہوار ہے۔‘‘

’’ضرور ضرور۔‘‘ غلام رسول نے جواب دیا۔ ’’کون سا تہوار؟‘‘

’’اس علاقے میں نویں کا تہوار بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا ہے۔ علی مدد بھی دوسرے بچوں کے ساتھ انڈے پھوڑنے کا مقابلہ کرتا ہے۔‘‘

’’آں...... یہ انڈا پھوڑنے کا مقابلہ؟ میں سمجھا نہیں۔‘‘ غلام رسول کے لہجے میں حیرت تھی۔

’’دراصل یہ خوشی منانے کا ایک انداز ہے۔ بچے اپنے اپنے گھروں سے مرغی کے انڈے لے آتے ہیں اور ایک دوسرے کے انڈوں پر مار کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ میرے انڈے نے تمہارے انڈے کو توڑ دیا۔ ویسے اس کی شرعی حیثیت کچھ نہیں ہے، بس

ایک رسم بنا لی ہے۔ تبتیوں کی ایک رسم سے متاثر ہو کر، بالکل اسی طرح جیسا میں نے کراچی میں دیکھا۔ شادی کی تقریباً ساری رسموں میں ہندوانہ جھلک تھی۔‘‘

’’معاشرے کا اثر تو پڑنا ضروری ہے۔ غم کا اظہار خالص ہوتا ہے مگر خوشی کے اظہار کا طریقہ لوگ دوسروں سے لیتے ہیں۔‘‘

وہ سب باتیں کر ہی رہے تھے کہ علی مدد شاہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور انتہائی فصیح و بلیغ انگریزی میں کیتھی سے باتیں کرنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بلتستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں نہیں، انگلینڈ کے کسی گاؤں میں بیٹھے ہوں اور وہ کسی بہت پڑھے لکھے گھرانے کا بچہ ہو۔ اس نے کیتھی سے کہا۔ ’’تم دوسرے جنم کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہو تو سنو یہ میرا دوسرا جنم ہے۔‘‘

’’کیسے؟‘‘ کیتھی نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

☆======☆======☆

ایسا لگ رہا تھا جیسے دروازہ ٹوٹ کر گر جائے گا۔ علی اور پروفیسر دونوں ہی گھبرا اٹھے تھے۔ مولوی صاحب کے چہرے پر بھی فکر مندی کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ تیسری بار دروازہ دھڑ دھڑایا گیا تو مولوی صاحب نے دونوں کو پلنگ کے نیچے چلے جانے کا اشارہ کیا اور بلند آواز میں پوچھا۔ ’’کون؟‘‘

’’میں ہوں زوار...... فوراً دروازہ کھولیں۔‘‘

مولوی صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے تیز تیز آواز میں کہا۔ ’’مولوی صاحب! ہوشیار رہیں۔ پچھلے گاؤں سے اطلاع آئی ہے کہ بھارتی فوجی ادھر آ رہے ہیں۔ وہ ٹرکوں پر سوار اسی گاؤں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اطلاع دینے والا کھائی سے ہو کر آیا ہے اس لیے جلدی پہنچ گیا۔‘‘

’’ٹھیک ہے، میں ہوشیار رہوں گا۔ تم گاؤں کے جوانوں کو مستعد رہنے کا اشارہ دے دو۔‘‘ مولوی صاحب نے کہا تو وہ نوجوان لوٹ آیا۔

’’میرے خیال سے وہ فوجی ہماری تلاش میں آ رہے ہیں۔‘‘ علی نے کہا۔

’’آپ فکر نہ کریں ہمارے پاس جگہ ہے، میں آپ کو اپنے مریدوں کے گھر میں چھپا دوں گا۔‘‘ مولوی صاحب بولے۔

’’میرا خیال ہے کہ ہمیں چل دینا چاہیے ورنہ ہماری وجہ سے آپ لوگ بھی عتاب میں آ جائیں گے۔‘‘

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''عتاب میں آنا ہماری قسمت بن چکا ہے۔ آئے دن یہ غاصب فوج ہم پ
ڈھاتے رہتے ہیں۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہاں اگر آگے جانے کی ٹھان لی ہے تو
روکوں گا نہیں۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

''بزرگو بات یہ ہے کہ ہمیں جلد سے جلد پاکستانی حدود میں پہنچ جانا ہے۔'' علی
کہا۔

''آپ فکر نہ کریں، میں آپ کے ساتھ کسی کو کر دیتا ہوں۔''

''جی نہیں، ہم پھر سے تازہ دم ہو چکے ہیں صرف راستوں کے بارے میں بتا د
ہم خود کنٹرول لائن پار کر لیں گے۔''

''تو سنیں! یہاں سے سیدھے داہنے ہاتھ کی طرف بڑھتے رہیں۔ آسمان پر خ
رکھیں، سات ستاروں کا جو جھرمٹ ہے، اس کا نچلا ستارا آپ کے داہنے ہاتھ کی طر
ہونا چاہیے۔ آگے جا کر ''ساکوٹ'' آئے گا پھر ''چھیلا'' اس سے آگے بڑھیں گے ت
گاؤں مزید آئیں گے انہیں پار کرتے ہی آپ کنٹرول لائن پر پہنچ جائیں گے مگر یاد ر
راستہ بھٹک گئے تو آپ تبت پہنچ جائیں گے۔''

''بہت بہت شکریہ، ہم چلتے ہیں۔'' کہہ کر وہ دونوں باہر نکل پڑے۔ اب ایک
پھر ان کے سامنے برفیلا میدان تھا۔ چنگھاڑتی ہوئی ہوائیں تھیں اور دشمن کا خطرہ تھا۔
دونوں گاؤں کی حدود سے باہر نکل گئے۔ رات کے اس پہر جب تمام علاقہ نیند میں
ہوا تھا وہ دونوں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ برفیلی ہوا واٹر پ
جیکٹ کو چیرتی ہوئی ہڈیوں میں اترتی جا رہی تھی۔ رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہ
تھا۔ اب انہیں احساس ہو رہا تھا کہ رات کے اس پہر میں گھر کی گرمی کو ٹھکرا کر انہوں
غلطی کی ہے مگر وہ خود کو تسلی دے رہے تھے کہ چپ چاپ جان گنوانے سے بہتر ہے
کوشش کر لی جائے۔

وہ دونوں سرد موسم سے لڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ آسمان پر ستارے
ان ستاروں کی چمک سے برفیلا میدان چمک رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد اس میدان کو پا
کے اس پہاڑی سلسلے تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن حوصلے ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے۔
من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ دونوں کبھی گرتے اور کبھی اٹھتے۔ صرف زندہ رہنے کی چا
جو انہیں کھینچ رہی تھی۔ خاموش رہنے کی وجہ سے ذہن ایک نقطہ پر منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔
اثر کو کم کرنے کے لیے پروفیسر نے توجہ بٹانے کے لیے پوچھا۔ ''ہم اس برفیلے م

میں کدھر جائیں گے؟''

''زندگی کے پُرخطر تجربات میں ایک تجربے کا اضافہ اور ہو جائے گا۔'' علی نے مسکرا کر کہا۔

''بشرطیکہ یہ اضافی تجربہ زندگی کا آخری تجربہ نہ ثابت ہو۔'' پروفیسر نے بھی ہنسی میں جواب دیا۔

''اگر آپ نے ہمت نہ ہاری تو مجھے یقین ہے کہ ہم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

''میں اور ہمت ہاروں؟'' پروفیسر عثمان نے ہنس کر کہا پھر اس کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''اس رات کے اندھیرے میں جہاں دور دور تک آبادی کا نام ونشان نہیں، ہر طرف موت ہی موت نظر آ رہی ہے اور تم اتنے یقین سے ایسی بات کیسے کہہ رہے ہو؟''

''آپ اسے میری چھٹی حس کہہ سکتے ہیں۔'' علی نے جواب دیا۔

''چھٹی حس تو وہ لوگ کہا کرتے ہیں جنہیں ہیومن اناٹومی کا صحیح پتا نہیں ہے۔ انسانی جسم میں ایک خاص قسم کا خلیہ ہوتا ہے جسے ایکس ٹو فیکٹر کہتے ہیں۔ اس خلیہ کی کلکولیشن بہت تیز ہے اور اسی کے اندازے کو لوگ چھٹی حس کہتے ہیں۔''

''میں آپ جتنی سائنس نہیں جانتا، فقط اتنا جانتا ہوں کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ابھی ہم جس صورت حال سے نکل کر آئے ہیں، اس میں ہمیں یقینی موت کا سامنا تھا لیکن شاید ابھی ہماری زندگیوں کے دن پورے نہیں ہوئے ہیں ورنہ اس وقت ہم زندہ نہ ہوتے۔'' علی کہتے کہتے رکا۔

اس کی بات کاٹ کر پروفیسر عثمان نے کہا۔ ''جب ہم بے بس تھے تو قدرت نے ہمیں بچا لیا تھا لیکن اب چونکہ ہم بے بس نہیں ہیں لہٰذا ہمیں اپنے لیے خود ہی کچھ کرنا ہے۔ جب تک ہم کوشش نہیں کریں گے ہمیں منزل نہیں ملے گی۔ یہاں سے نکلنا آسان نہیں ہے سخت حالات سے دو چار ہونا پڑے گا۔''

''میں تو خیر خاصے طویل عرصے تک ایسے حالات کا مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن مجھے آپ کی طرف سے خطرہ ہے۔ جسمانی طور پر بھی آپ اتنے توانا نہیں ہیں۔'' کمانڈر علی بولا۔

پروفیسر نے رک کر کہا۔ ''تم نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں کسی بھی میدان میں تم سے پیچھے نہیں رہوں گا۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''خدا کرے ایسا ہی ہو کیونکہ اب ہماری زندگیوں کا انحصار اسی بات پر ہوگا کہ ہم کتنی جدوجہد کر سکتے ہیں۔''

''جان ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے اور جان بچانے کے لیے ہر شخص آخری حد تک کوشش کرتا ہے۔'' کہہ کر انہوں نے رفتار تیز کر دی۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برف سے بھرے میدان میں چلنا آسان نہیں۔ رات، حرارت کو کھا رہی تھی خاموشی، خوف بڑھا رہی تھی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہڈیوں کو برما رہے تھے۔ کمانڈر علی کو اپنا حوصلہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ احساسِ شکستگی کو عیاں کرتے ہوئے وہ بولا۔ ''اس آزادی سے تو قید ہی بہتر تھی۔ کم از کم لوگوں کے درمیان تو تھے۔ ذرا دیکھیں تو یہاں کیسا خوفناک سناٹا مسلط ہے۔''

''چلتے رہو علی!'' پروفیسر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے کہا۔ حالانکہ خود ان کی حالت خاصی خراب تھی۔ وہ جسمانی محنت کے ذرا بھی عادی نہیں تھے یہی وجہ تھی کہ اس برفیلے میدان میں پیدل چلتے ہوئے خود انہیں اپنا جسم قابو میں محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ ''خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرو ورنہ ہم اس برفیلے میدان سے باہر نکل نہیں پائیں گے۔ سوچو ہم عام آدمی نہیں ہیں۔ ہم تو بہت خاص قسم کے لوگ ہیں۔ لہٰذا ہمیں حالات بھی خاص قسم کے ہی درپیش آتے ہیں۔'' خاص آدمیوں والی بات کمانڈر علی پر اثر کر گئی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پروفیسر!'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''جس قسم کے حالات ہمیں پیش آئے ہیں، ایسے حالات سے کسی عام آدمی کو شاید ہی واسطہ پڑا ہو۔ اگر پڑے تو ان کے اعصاب جواب دے جائیں۔''

''اعصاب جواب نہیں دے جائیں گے بلکہ چیخ جائیں گے۔'' پروفیسر نے حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ ''جسمانی قوت اور مضبوطی سے سخت حالات کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اس کے لیے آہنی اعصاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم بھی آہنی اعصاب کے مالک ہو مگر تم نے خود پر جو احساس طاری کر لیا ہے وہ تمہاری اعصابی قوتوں میں دراڑیں ڈال رہا ہے۔''

''کون سا احساس؟'' کمانڈر علی نے چونک کر کہا۔

''تم نے خود پر یہ احساس مسلط کر رکھا ہے کہ تمہاری قوتِ مدافعت کم ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی تمہارے قویٰ جواب دیتے جا رہے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

اگر یہی بات ہوتی تو تم کبھی برف کے اس جہنم میں اتنی آسانی سے چل نہ سکتے تھے۔''

''میں نے خود پر کوئی احساس مسلط نہیں کیا۔ پھر بھی آپ کی باتوں نے میرے اندر توانائیوں کی نئی لہریں دوڑا دی ہیں۔'' کمانڈر علی نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

اندھیری رات میں برفیلے میدان کو پار کرنے کے لیے وہ بڑھتے رہے۔ کمانڈر علی کے اعتماد میں اب خاصہ اضافہ ہو چکا تھا لیکن اس کی چال بتا رہی تھی کہ وہ تھک کر چور ہے اور خود کو گھسیٹ رہا ہے۔ یہی حالت پروفیسر عثمان کی بھی تھی مگر وہ ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ جلد سے جلد اس پہاڑی تک پہنچنا چاہتے تھے۔ پہاڑیوں میں غار نما چھوٹے بڑے گڑھے مل جاتے ہیں لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے کمانڈر علی گر گیا۔ اس کے پیروں نے جواب دے دیا تھا جب کہ وہ پہاڑی اب چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ مجبوراً پروفیسر نے اپنے بوڑھے کندھے پر کمانڈر علی کے جوان جسم کو اٹھایا اور آگے بڑھنے لگا مگر پہاڑی کے پاس پہنچ کر وہ بھی گر گئے۔

☆======☆======☆

''ہاں، یہ میرا دوسرا جنم ہے۔'' علی مدد شاہ بڑبڑایا۔ ''پہلے جنم میں، میں اللہ مدد شاہ تھا۔ اس وقت میں دیوان تھا۔ یہ پورا علاقہ میرا باج گزار تھا۔''

''مگر تم تو مسلمان ہو اور اسلام میں کہیں بھی دوسرے جنم کی بات نہیں ہے۔''

''یہی تو کمال ہے۔'' علی مدد شاہ نے کہا۔

''تم کیسے ثابت کرو گے کہ یہ تمہارا دوسرا جنم ہے؟''

''اس طرح سے کہ میں اپنے اس جنم کی ایک ایک بات یاد رکھے ہوئے ہوں۔ میرا نام کیا تھا۔ میں کہاں رہتا تھا۔ میرے کتنے بچے تھے، یہ تمام باتیں مجھے ازبر ہیں۔'' علی مدد شاہ نے کہا۔

''یہ ثبوت نہیں ہے۔ کوئی ایسی بات بتاؤ جو ٹھوس ثبوت ثابت ہو۔'' غلام رسول نے کہا۔

''تو سنو!'' کہہ کر وہ بستر پر گر گیا۔ ایسا لگا تھا جیسے وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ کیتھی اور غلام رسول اس پر جھک گئے۔ کیتھی نے پھرتی سے الماری کھولی، ایک انجکشن نکالا اور ڈسٹلڈ واٹر ملا کر علی مدد کے بازو میں انجکٹ کرنے لگی۔ اس بچے کے دادا اور غلام رسول کی آنکھیں اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کمرے میں سب کچھ ساکت ہو گیا ہے۔ وقت بھی تھم گیا ہے اور سب پتھر کے ہو گئے ہیں۔ ان کی سانسیں بھی گونج پیدا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر رہی تھیں۔

انجکشن بازو میں لگتا ہے، خون میں ملتا ہے اور رگوں میں دوڑتے ہوئے بیماری جراثیموں کا گلا گھونٹنے لگتا ہے۔ اس کی بے ہوشی کا بھی سدباب ہو گیا۔ اس نے آنکھ کھول دیں۔ چند لمحوں تک وہ آنکھیں پٹپٹاتا رہا پھر وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے رسول، کیتھی اور اپنے دادا کو باری باری دیکھا پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ ''میں میں یہاں...... آپ لوگ...... آپ سب مجھے اس طرح کیوں گھیرے کھڑے ہیں؟''

''تم کچھ بتا رہے تھے۔'' غلام رسول نے پوچھا۔

''میں کیا بتا رہا تھا؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''کچھ نہیں تم آرام کرو۔'' کیتھی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا اور مڑ کر غلام رسول سے بولی۔ ''آؤ اس کمرے میں آؤ۔''

کیتھی کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر غلام رسول بھی ادھر ہی بڑھتا چلا گیا۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر کیتھی نے کہا۔ ''مجھے شک نہیں، یقین ہے۔ علی مددشاہ کے ڈی این اے میں ایسی کچھ باتیں ہیں جو وقتاً فوقتاً انزائم ہو کر اشارے دیتی ہیں اس کے ذہن میں ایسی باتیں جاگ اٹھتی ہیں جو اس نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ میرے خیال سے ڈی این اے کے سالمے میں کوئی خرابی ہے۔ عام طور سے ایڈی نین (Adenine) کی جوڑی تھایامن سے اور سائٹوسین کی جوڑی گوانین سے مل جاتی لیکن اس کے سالمے میں یہ الٹ ہے۔ الٹ جوڑی کی وجہ سے نئی پرانی باتیں ابھرتی ہیں۔''

''آپ لوگوں کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ مجھے تو یقین ہے اس میرے دادا کی سواری آتی ہے۔ دادا کی روح آ کر اسے یہ سب کچھ بتاتی ہے۔''

اعتقاد ایک ایسا معاملہ ہے جس میں دخل اندازی خطرناک ہوتی ہے اسی لیے رسول نے انہیں حقیقت بتانے کی کوشش نہیں کی۔ صرف اتنا کہا۔ ''آپ کو قرآن کی با پر یقین ہے؟''

''الحمد للہ، ہم مسلمان ہیں۔ قرآن پاک کی باتوں پر کیوں نہ یقین ہو گا؟''

''تو ایسا کریں کہ آج گھر جا کر اس آیت کی تشریح دیکھ لیں گے۔'' اس کی قد کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک آدمی بن کر چلنے پھرنے لگے۔'' (الروم 20) یعنی انسان کے اندر وہ تمام عناصر

ہیں جو مٹی میں ہیں اور یہ مٹی کس طرح، کن کن اجزاء کو یکجا کرتی ہے۔''

''صاحب جی! ہم ٹھہرے سیدھے سادے پہاڑ کے رہنے والے، یہ سب کام تو مولوی صاحبان کا ہے کہ وہ قرآن پاک پر غور کریں۔ اچھا ہم چلتے ہیں۔''

''قرآن پاک پر غور کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ قرآن صرف مولوی صاحبان کے لیے نہیں ہے، ہر مسلمان کے لیے ہے کہ وہ اپنی زندگی اس کی تعلیم کردہ خطوط پر چلائے بلکہ تمام بنی نوع کے لیے ہے۔ تمام عالم کے لیے ہے۔'' غلام رسول نے کہا پھر وہ اختر سے بولا۔ ''انہیں گھر تک پہنچا آؤ۔''

علی مددشاہ کے پیروں پر پلاسٹر تھا اور اس کے دادا کی ایک ٹانگ میں نقص تھا۔ اختر نے اپنی مدد کے لیے چوکیدار کو بلا لیا۔ اس نے علی مددشاہ کو وہیل چیئر پر بٹھایا اور اسے دھکیلتے ہوئے گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔ اختر نے اس کے دادا کو سہارا دے رکھا تھا۔

کیتھی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''میرے خیال سے پروفیسر صاحب کو اب آ جانا چاہیے کیونکہ یہ مسئلہ تقریباً سلجھ چکا ہے۔''

''کون سا مسئلہ؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''یہی کہ اس بچے کا بار بار یہ کہنا کہ یہ میرا دوسرا جنم ہے، پہلے جنم میں میں دیوان اللہ مدد تھا۔''

''یعنی تم نے وجہ دریافت کر لی۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔'' غلام رسول طنزیہ انداز میں بولا۔

☆======☆======☆

پروفیسر کو ہوش آیا تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ انہوں نے کمانڈر علی کو ہلا کر دیکھا تنفس کی رفتار دیکھ کر انہیں اطمینان ہوا اور وہ اطراف کا جائزہ لینے لگے۔ دور دور تک برفیلا میدان پھیلا تھا۔ کھائیاں اور پہاڑیاں بھی تھیں انہیں دیکھ کر پروفیسر کو اطمینان ہو گیا کہ اس جگہ فوجیوں کے ٹرک نہیں آ سکتے ہیں اور نہ جیپیں۔ ہر طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد انہوں نے کمانڈر علی کو اٹھایا اور آگے کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ بہت آگے نہ بڑھے تھے کہ دفعتاً انہیں رکنا پڑا۔ علی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسے کچھ شبہ ہوا تھا۔ اس کے بعد پروفیسر بھی صورتِ حال سے آگاہ ہو گئے۔ ہوا کے دوش پر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں اور ان آوازوں میں قدموں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ان کا یہ اندازہ غلط ثابت

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو گیا تھا کہ فوجی ادھر نہیں آ سکتے ہیں۔

وہ برق رفتاری سے آگے کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ آسمان جو کچھ دیر پہلے بر... تھا پھر سے گیلا ہو گیا تھا۔ برف باری کے قوی امکانات تھے۔ وہ تیز رفتار سے دوڑ ر... تھے۔

نہ جانے کتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ کچھ دیر ستانے کے لیے رکے۔ کت... کے بھونکنے کی آوازیں اب معدوم ہو گئی تھیں شاید ان لوگوں کو ان کی سمت کا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ وہ مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ ابھی انہوں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا برف باری شروع ہو گئی اور اس انداز میں شروع ہوئی کہ خدا کی پناہ! برف کے ذر... برچھیوں کی مانند ان کے چہروں پر پڑنے لگے لیکن اب رکنے کا وقت نہیں تھا۔ چنانچہ مسلسل آگے بڑھتے رہے لیکن پہاڑی سلسلے کو پار کرتے ہی دونوں ٹھٹک گئے۔ ترائی م... ایک وسیع و عریض فوجی کیمپ تھا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کیمپ میں بھارتی فوجی خا... تعداد میں موجود ہوں گے۔ ایک بلند ٹاور سے وقفے وقفے کے بعد فلیش لائٹ چارو... طرف پھینکی جا رہی تھی۔ قریب ہی ایک دریائی نالہ تھا جس کی چوڑائی پچیس تیس فٹ سے کم نہ تھی۔ اسے پار کرنے کے لیے کشتی کی ضرورت پڑتی۔

''اگر اس وقت ہم دریا نہ پار کر سکے تو سمجھو ہماری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہ... کیونکہ ہم دشمن کے سینے پر بیٹھے ہیں چنانچہ ہمیں کشتی کی تلاش شروع کر دینا چاہیے... کمانڈر علی نے کہا تو پروفیسر نے سر ہلا کر تائید کی پھر وہ ہاتھ پیروں کے بل چلتے ہو... آگے بڑھنے لگا۔

اس دریائی نالے کے ساتھ ساتھ وہ آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک چھو... سی پہاڑی کے ساتھ ہی نالہ مڑا تھا۔ وہ بھی اسی انداز میں مڑ گئے تھے لیکن مڑتے ہی بُر... طرح چونکے تھے۔ یکا یک علی کے سامنے دو پیر آ گئے تھے۔ وہ پیر کس کے ہیں، یہ دیکھ... کے لیے اس نے سر اٹھایا تھا۔ اس شخصیت کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ تھی جس نے کشمیریوں کا روایتی لباس پہن رکھا تھا۔ اسے ان... دیکھ کر وہ خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹی اور آنکھیں پٹ پٹا کر اسے دیکھنے لگی پھر اس کے لب کھلے اور خوفزدہ سی آواز برآمد ہوئی۔ ''تت...... تم کون ہو؟''

اس کی آواز میں ایسی نغمگی تھی کہ لمحے بھر کو تو وہ کھو کر رہ گیا تھا۔ پھر اچانک اسے جیسے ہوش آ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ ورنہ اس لق و دق ویر...

برفیلے میدان میں کسی حسین و جمیل دوشیزہ کا کیا کام ہو سکتا تھا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ہر سمت برف ہی برف پھیلی تھی۔ اس کے برابر پروفیسر تھے اور سامنے وہ شعلہ جوالہ موجود تھی۔ اس نے سوچا یقیناً میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا ہوں۔ ہر چیز اپنی پوری تفصیل سمیت میری نگاہوں کے سامنے ہے اور...... خوابوں میں جزئیات بہر حال واضح نہیں ہوا کرتیں۔

پھر سوال یہ تھا کہ وہ خوب رو دوشیزہ کون ہے۔ ظاہر ہے وہ آسمان سے تو اتری نہیں ہو گی۔ یقیناً کہیں نہ کہیں سے آئی ہو گی۔ اس کا ناک نقشہ بتا رہا تھا کہ اس کا تعلق اسی علاقے سے ہے لیکن جن حالات سے وہ دوچار تھا، اس کے پیش نظر وہ ہر چیز کو شک و شبے کی نظر سے دیکھنے کے لیے مجبور تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا تعلق انہیں تلاش کرنے والی کسی پارٹی سے رہا ہو۔ وہ لوگ دھوکے سے گرفتار کرنا چاہتے ہوں۔ انہوں نے کسی ایسے ذریعے سے ان کا سراغ لگا لیا ہو جس کے بارے میں وہ کوئی اندازہ نہ لگا سکتا ہو اور اس کے بعد انہوں نے حسین و جمیل دوشیزہ بھیج دی ہو جس کا مقصد یہ ہو کہ ہمیں دھوکے سے کسی مخصوص مقام تک لے جائے اور گرفتار کرا دے۔

''ہم مسافر ہیں۔'' علی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''راستہ بھٹک گئے ہیں۔''

اس نے حیرت سے ان دونوں کو دیکھا۔ ''مسافر ہو؟ کیا مسافر چاروں ہاتھ پاؤں سے چلتے ہیں؟'' وہ مقامی زبان بول رہی تھی مگر یہ زبان عام کشمیری زبان سے تھوڑی مختلف تھی۔

''ہماری بدقسمتی کی داستان بہت طویل ہے خاتون اور اسے سنانے کے لیے بڑا وقت درکار ہے۔'' علی نے کہا۔ ''تم اپنے بارے میں بتاؤ تم کون ہو اور یہاں اس ویرانے میں کیا کر رہی ہو؟''

''میرا نام گل افروز ہے اور میرا تعلق شاہا قبیلے سے ہے۔''

''شاہا قبیلے کا نام میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا؟'' علی نے ذہن پر زور دینے کی اداکاری کی۔

''ہمارا قبیلہ کوئی مشہور قبیلہ نہیں ہے۔'' گل افروز نے کہا۔ ''اور ہم قریب ہی آباد ہیں۔''

''کدھر؟''

''ادھر!'' گل افروز نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہاں سے زیادہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دور نہیں ہے۔"

"تم ہمیں اپنے علاقے میں لے چلو گی؟" علی نے گل افروز سے کہا۔

"تمہارے خیال میں، میں یہاں رکی کیوں ہوں؟" گل افروز نے تعجب سے کہا "اس بے سروسامانی کی حالت میں تم دونوں کہیں جا بھی نہیں سکتے۔ بغیر کانگڑی کے تو دونوں مر جاؤ گے۔ جسم کا خون تک جم جاتا ہے، کیا یہ بات تم نہیں جانتے؟"

"بالکل جانتا ہوں محترم خاتون!" علی نے کہا۔ "مگر اس وقت ہم بہت مجبور ہیں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ہمیں اپنے ہاں لے چلیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو اجنبی!" گل افروز نے ناگوار لہجے میں کہا۔ "میرا باپ قبیلے کا سردار ہے اور تم ہمارے مہمان ہو۔ کیا تم نے اس علاقے کی مہمان نوازی کے بارے میں نہیں سنا ہے؟"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"تم دونوں بہت تھکے ہوئے ہو گے۔ تمہارے حلیے سے بھی یہی ظاہر ہو رہا ہے کیا تمہیں تھکن محسوس نہیں ہو رہی؟"

"معمولی سی تھکن ہے۔" اس نے جھوٹ کا سہارا لیا جب کہ حقیقت تو یہ تھی برفیلے میدان میں کئی میل پیدل چلنے کے بعد اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کا جوڑ جوڑ ہل کر رہ گیا ہو۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا اجنبی مسافر؟" گل افروز نے پوچھا۔

"مجھے علی کہتے ہیں۔"

گل افروز نے اسے بڑے غور سے دیکھا اور مسکرا کر رہ گئی۔ علی نے اس کا جائزہ لے کر کہا۔ "چلیں؟"

"ہاں چلو۔" گل افروز نے کہا اور وہ اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

چلتے چلتے علی نے گل افروز سے کہا۔ "اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ سے ایک ذرا سا سوال کر لوں؟"

"اجازت ہے، میں برا نہیں مانوں گی۔" گل افروز نے باوقار انداز میں کہا۔

"آپ اپنے قبیلے سے اتنی دور کیوں اور کیا کرنے آئی تھیں؟"

"کیا اس سوال کا جواب ضروری ہے؟" گل افروز نے جواب دیا۔ علی نے محسوس کر لیا کہ اس کے لہجے میں ہلکی سی اداسی تھی۔

"اگر کوئی بہت ہی ذاتی بات ہے تو میں جواب پر اصرار نہیں کروں گا۔"

"تم ہمارے مہمان ہو علی اور ہم لوگ مہمان کو اپنی پریشانیوں سے دور رکھتے ہیں۔"

"اگر ایسی بات ہے تو میں جواب پر اصرار کروں گا۔" علی نے کہا۔

"تم ضد کر رہے ہو تو میں بتائے دیتی ہوں۔ دراصل کچھ دنوں سے ہماری بستی ایک مشکل کا شکار ہے، بی ایس ایف نے ہمارا سکون درہم برہم کر دیا ہے۔ حکومت نے اس نیم فوجی دستے کی تشکیل اس لیے کی ہے کہ یہ بارڈر کی نگرانی کرے۔ شاید بنگلہ دیش، نیپال، برما، چین وغیرہ کے بارڈر پر یہی کام کرتی ہو مگر یہاں تو قزاقی کرتی ہے اور خود کو بارڈر سیکیورٹی فورس نہیں بلکہ بابو صاحب فنڈ کہتی ہے۔ ببانگ دہل کہتی ہے ہمارے فنڈ میں پیسا ڈالو اور عیش کرو ورنہ ہم سب کو آتنک وادی کہہ کر گولیوں سے اڑا دیں گے۔ تم لوگ کشمیری ہو، مسلمان ہو، اس لیے لوگ فوراً یقین کر لیں گے۔"

"ہاں، یہ اندھیر تو پورے مقبوضہ کشمیر میں مچی ہوئی ہے۔" علی نے نمناک لہجے میں کہ "کیا انہوں نے تمہاری بستی والوں پر بھی کوئی الزام لگایا ہے کہ یہ لوگ مقامی نہیں پاکستانی ہیں؟"

"اس علاقے میں بی ایس ایف سے زیادہ اس کے ایجنٹ سرگرم ہیں۔ ان کی جانب سے بدستور دھمکیاں مل رہی ہیں۔ انہوں نے ہم سے ایک خطیر رقم کا مطالبہ کیا تھا جس کا بندوبست کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے رقم کی فراہمی کے لیے ہمیں دوبارہ مہلت دی تھی مگر ہم مطلوبہ رقم کا بندوبست نہیں کر سکے۔ انہوں نے آخری بار تین روز کی مہلت دی تھی جو آج شام ختم ہو رہی ہے۔ اگر آج شام تک مطلوبہ رقم فراہم نہ کی گئی تو وہ بی ایس ایف کے ذریعے ہماری بستی کو تاخت و تاراج کرا دیں گے۔"

"مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ کے یہاں آنے میں کیا نسبت ہے؟ کیا آپ یہاں رقم کا بندوبست کرنے آئی تھیں؟"

"یہی سمجھ لیں۔" گل افروز پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ "دراصل ہماری بستی کے عامل نے ایک عمل بتایا تھا جو دفع مصائب کے لیے بہت مجرب ہے مگر اس عمل کے لیے دو کڑی شرائط ہیں۔ ایک تو یہ کہ عمل ایسے مقام پر کیا جائے جہاں ویرانہ ہو اور آبادی سے دور ہو، بہتے ہوئے پانی کے کنارے بیٹھ کر یہ عمل کرنا تھا چنانچہ میں نے عمل کرنے کے لیے یہ مقام پسند کر لیا۔"

علی اور پروفیسر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ بڑی ناقابل یقین باتیں کر رہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھی۔ اس قسم کی بچکانہ باتوں سے تو عام آدمیوں کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ اسے تو جھوٹ بولنے کا بھی سلیقہ نہیں تھا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ وہ ان ہی لوگوں کی ایجنٹ ہے۔ علی کو ان لوگوں پر حیرت ہوئی کہ انہیں چاہیے تھا کہ پھانسنے کے لیے کسی ذہین ایجنٹ کو بھیجتے۔ یہ لڑکی تو حد درجہ کی بے وقوف تھی لیکن پھر اس نے سوچا کہ وہ اپنی اس ویرانے میں موجودگی کا اس کے علاوہ یا اس سے ملتے جلتے کسی جواز کے علاوہ کوئی جواز پیش بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔

''مجھے اس طرح نہ دیکھو۔'' گل افروز نے قدرے جھینپے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں ضعیف الاعتقاد نہیں ہوں۔ میں نے کبھی کوئی وظیفہ یا عمل نہیں کیا لیکن اس بار معاملہ ایسا آ پڑا کہ میں مجبور ہو گئی۔ عمل کے لیے باکردار دوشیزہ ہونے کی شرط ایسی تھی کہ سردار کی بیٹی ہونے کے ناطے میں نے اس عمل کو کرنے کی ذمے داری خود پر محسوس کی۔''

علی نے ایک طویل سانس لی۔ ''بڑے عجیب لوگ ہیں انہیں تو قتل عام کر کے چلے جانا چاہیے تھا۔ دھمکیاں کیوں دے رہے ہیں؟''

''شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم بستی والوں کے پاس زیادہ مال و متاع نہیں ہے۔ ہمارے ذرائع بے حد محدود ہیں وہ ہمیں اسی لیے دھمکیاں دے رہے ہیں کہ ہم اپنے سارے ذرائع استعمال کر کے کہیں نہ کہیں سے ان کی مطلوبہ رقم کا بندوبست کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ مطلوبہ رقم ملنے کے بعد بھی وہ بستی میں لوٹ مار ضرور کریں گے۔''

''جب بستی والوں کے ذرائع ہی محدود ہیں تو وہ رقم کا بندوبست کہاں سے کریں گے؟''

''ہماری بستی کے زیادہ تر نوجوان چھوٹے بڑے شہروں میں جا کر مزدوری کرتے ہیں۔ سال میں ایک آدھ بار جب وہ یہاں آتے ہیں تو اپنے ساتھ ضروریات زندگی کی چیزیں لے آتے ہیں۔ ظاہر ہے اس برفستان میں رقم تو ہمارے کسی کام نہیں آ سکتی۔ بستی والوں کا خیال ہے کہ دشمن اس بات سے واقف ہے کہ ہمارے نوجوان شہروں میں مزدوری کرتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے ہمیں لوٹنے کی بجائے دھمکیاں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ تاکہ ہم لوگ شہر میں مزدوری کرنے والے نوجوانوں کے ذریعے رقم کا بندوبست کر دیں اگر وہ لوگ ایسے ہی لوٹ مار کریں گے تو انہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

علی و پروفیسر حیران رہ گئے تھے۔ گل افروز نے اچانک ہی منطقی انداز میں بدل گفتگو کرنا شروع کر دی تھی۔ اس کی باتوں میں وزن تھا اور انہیں رد کرنا آسان نہیں تھا

کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے یا سچ۔ علی سوچنے لگا کہ اس کے انداز میں تو اتنی معصومیت اور بے ساختگی ہے کہ اس پر یقین کر لینے کو جی چاہنے لگا ہے۔ اس کے جھوٹے یا سچے ہونے کی بہت زیادہ اہمیت ہے بھی نہیں۔ وہ جو کچھ بھی ہے، ہمارے لیے فرشتہ رحمت ہی بن کر نازل ہوئی ہے۔ وہ ہماری گرفتاری کے خواہاں لوگوں کی ایجنٹ ثابت ہوتی ہے یا سچ مچ کسی قبیلے کے سردار کی بیٹی نکلتی ہے، ہمیں اس سے کوئی غرض رکھنی بھی نہیں چاہیے۔ کچھ ہی دیر بعد حقیقت سامنے آنے والی ہے اور اس ذرا سی دیر کے لیے اس لایعنی مسئلے میں دماغ سوزی کرنا عبث ہے۔ علی نے ذہن سے سارے خیالات جھٹک دیے۔

''صبح جب میں ندی کنارے سے عمل پورا کر کے میں واپس ہو رہی تھی تو معاً میری نگاہ تم دونوں پر پڑی اور میں اس موڑ پر کھڑی ہو کر حیرت سے تم دونوں کی بچکانہ حرکتیں دیکھنے لگی۔'' گل افروز کہہ رہی تھی۔

''تو آپ کے قبیلے کے لوگ رقم کا بندوبست نہیں کر سکے؟'' علی نے پوچھا۔

''نہیں۔'' گل افروز بولی۔ ''ہم نے رقم کا بندوبست کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔''

''کیوں، کیا مال و متاع کی پرواہ نہیں ہے؟''

''جب ان کی طرف سے پہلی دھمکی آئی تھی اسی وقت قبیلے کے بزرگوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں دینا ہے کیونکہ یہ لوگ سب کچھ لے کر بھی حملہ کرنے والوں میں سے تھے۔''

''تم جو عمل کر رہی تھی، اس کا نتیجہ کیا نکلتا؟ کیا وہ سب تباہ ہو جاتے؟''

''میرا مذاق نہ اڑاؤ، عملیات پر میرا کبھی یقین نہیں تھا۔ میں تو سیدھی بات جانتی ہوں کہ جو کچھ ہوگا، منجانب اللہ ہوگا۔''

علی نے غور سے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ یا تو بہت معصوم تھی یا پھر بے حد چالاک اس کی سنائی ہوئی داستان علی کے حلق سے نہیں اتری تھی مگر لڑکی کے انداز میں جو بے ساختگی تھی کہ اسے کسی بھی طرح بناوٹ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ تبھی اس کی نظر مکانات کی قطار پر پڑی اور وہ اس طرح اچھل پڑا جیسے جنت نظر آ گئی ہو۔

''یہی ہماری بستی ہے۔'' لڑکی نے بتایا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ اس بستی کے نزدیک پہنچ گئے۔ بستی کے باہر ایک مضبوط ہاتھ پیروں والا شخص مضطربانہ انداز میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی نظریں انہی تینوں پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کی عمر پچاس سے زیادہ ہی رہی ہو گی مگر اس کے سر اور داڑھی کے بال سیاہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھے۔

''یہ میرے والد ہیں۔'' گل افروز نے بتایا۔ ''ان کا نام بابا شیر ہے یہ قبیلے کے سردار ہیں۔''

''تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی گل افروز! تمہیں معلوم ہے ناں ادھر ہی دشمنوں کا کیمپ ہے۔'' اس شخص نے بلند آواز میں کہا۔ ''اور یہ تمہارے ساتھ کون لوگ ہیں؟''

گل افروز دوڑتی ہوئی بابا شیر کے پاس پہنچی۔ ''یہ مسافر ہیں بابا! راستہ بھٹک گئے ہیں۔ میں انہیں ساتھ لے آئی۔''

''الحمدللہ! مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں مگر مسلمان ہیں ناں۔''

''مسلمان ہیں بابا!'' گل افروز نے کہا۔

''شکر ہے کہ اتنے دنوں بعد کوئی مہمان ملا اور وہ بھی مسلمان!'' بابا شیر نے کہا۔ ''بڑے صاحب کو جھونپڑی میں لے جاؤ۔'' پھر وہ علی کی طرف مڑ کر بولا۔ ''اور تم میرے ساتھ آؤ۔''

سردار کے اشارے پر علی اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر سیدھا پانی کے چشمے پر پہنچا اور ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھنے کے بعد علی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر بولا۔ ''تم عقل مند آدمی ہو۔ تمہاری روشن آنکھیں تمہاری ذہانت کی غماز ہیں۔ تمہاری گھنی بھنوؤں سے پتا چلتا ہے کہ تم مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔ جبڑوں کی بناوٹ ظاہر کرتی ہے کہ تم سخت گیر ہو جبکہ پتلے ہونٹ بتا رہے ہیں کہ تم رحم دل بھی ہو۔ تمہاری کشادہ پیشانی تمہارے بلند اقبال ہونے پر دلالت کرتی ہے تم یقیناً کوئی بہت بڑے آدمی ہو، کیا تم اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گے؟''

بڑے میاں کے تجزیے نے علی کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اب تک اس نے صرف سنا تھا کہ ان پہاڑوں کے باشندے سینہ بہ سینہ چلنے والے حیرت انگیز علوم کے حامل ہوتے ہیں آج پہلی بار اس کا تجربہ بھی ہو گیا۔ اس طرح صرف چہرہ دیکھ کر صحیح صحیح تجزیہ معمولی بات نہ تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس شخص کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکے گا۔ اگر کچھ بولا تو وہ فوراً پکڑ لے گا۔ پھر بھی اس نے امتحان لینے کی خاطر کہا۔ ''آپ کی صلاحیت حیرت انگیز ہے۔ صرف چہرہ دیکھ کر کسی کے بارے میں بتا دینا بڑی مشکل بات ہے۔''

''یہ ہمارا خاندانی علم ہے اور سینہ بہ سینہ چل رہا ہے۔'' بڑے میاں بولے۔ ''لیکن میں تمہارے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوں۔ میں نے اتنی متضاد خصوصیات کا حامل چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

علی کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بات قرین قیاس تھی کہ اس شخص کا حکومت سے کوئی رابطہ ہو اور اسے ہمارے بارے مطلع کر دیا گیا ہو۔ اس کے پاس ٹرانسمیٹر کی موجودگی خارج از امکان نہ تھی۔ ممکن ہے اسے ہمارے بارے میں کچھ باتیں بتائی گئی ہوں جن کی روشنی میں اس نے مجھے میرے بارے میں بتا کر رعب ڈالنے کی کوشش کی ہو۔

''کیا سوچنے لگے؟''

''آں کچھ نہیں۔'' اس نے چونک کر جواب دیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے اپنے بارے میں حقائق سے آگاہ نہیں کرے گا۔

''تم نے اپنے بارے میں بتایا نہیں؟''

''میں ایک تاجر ہوں سردار محترم! میرا دوست امریکہ سے آیا ہے اس نے برفیلا میدان دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ اس کی اسی خواہش سے مجبور ہو کر میں یہاں آیا تھا کہ راستہ بھٹک گیا۔''

بڑے میاں کی آنکھوں سے بے اعتباری مترشح تھی۔ ''تم نے جو داستان سنائی ہے، یہ غلط بیانی ہے۔ یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ میں چہرہ پڑھنے کا ماہر ہوں اور اسی لیے میں تمہاری بات کو اتنے یقین سے غلط قرار دے رہا ہوں۔ مجھے نہیں پتا کہ تم نے کس مصلحت کے تحت غلط بیانی کی ہے کیونکہ تم جھوٹ بولنے کے عادی نہیں ہو اور جھوٹوں سے نفرت بھی کرتے ہو۔''

''اس کا اندازہ آپ نے کیسے لگایا؟ کیا میری باتوں میں کہیں کوئی جھول تھا؟''

''تمہاری داستان ایسی ہے کہ ہر شخص یقین کر لے گا۔ میں بھی اگر چہرہ پڑھنے کا ماہر نہ ہوتا تو یقین کر لیتا۔ میں چہرہ دیکھ کر آدمی کے کردار کے بارے میں بتا دیتا ہوں۔ تمہارے چہرے کی بناوٹ بتا رہی ہے کہ تم جھوٹ سے نفرت کرتے ہو پھر بھی تم نے جھوٹ بولا، اس کا مطلب ہے کہ اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری بستی ساری دنیا سے کٹی ہوئی ہے اگر چاہو تو اپنے بارے میں بتا دو تمہاری کوئی بات یہاں سے باہر نہیں جائے گی۔''

''ہو سکتا ہے کہ میں حکومت کی نظروں میں مجرم ہوں۔''

''غلط بات ہے۔ اگر حکومت ایسا سمجھتی ہے تو وہ خود غلط ہے، یہ میرا علم کہتا ہے۔ تم

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہ خود کوئی جرم کر سکتے ہو اور نہ کسی مجرم کا ساتھ دے سکتے ہو۔ تم شدید ذہنی انتشار کا شکار ہو۔ تم پر تھکن بھی مسلط ہے اور تم ٹھیک طرح سے سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری قوتِ فیصلہ متاثر ہوئی ہے ورنہ علم کی رو سے تم بہترین قوت تجزیہ کے حامل ہو۔''

علی متاثر نظر آنے لگا پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں شرمندہ ہوں سردار محترم مجھے آپ کی طرف سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''میں بہت بے ضرر آدمی ہوں علی! جس سے کسی کو بھی خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے اور جیسے آدمی کو تو بالکل ہی خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔''

''کہیں آپ جادوگر تو نہیں ہیں؟''

''نہیں، ایک عام آدمی ہوں اور دوسروں پر میری برتری صرف اس حد تک ہے کہ مجھے علم قیافہ میں کمال حاصل ہے۔ میں علم قیافہ کی رو سے یہ تو بتا سکتا ہوں کہ تم کوئی بہت بڑے آدمی ہو یہ نہیں بتا سکتا کہ تم کون ہو؟''

''میرا نام علی بخت ہے اور میں ایک محب وطن سپاہی ہوں۔''

''یہی کچھ میرا اندازہ تھا کہ تم ایک مجاہد ہو۔ ہمارے وسائل بہت محدود ہیں پھر بھی جہاں تک ہوگا ہم تمہاری مدد کریں گے۔''

''ہم صرف اس علاقے سے نکلنا چاہتے ہیں۔''

''تم بہت عظیم کام کر رہے ہو۔ جہاد فی سبیل اللہ ہر کسی کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ مجھ سے جہاں تک بن پڑا، میں تمہاری مدد کروں گا۔ بستی کے وہ نوجوان جو اس علاقے سے باہر جاتے رہتے ہیں، انہیں تمہاری رہبری کے لیے ساتھ دوں گا۔''

''مگر اس وقت تو آپ لوگ خود پریشانی میں مبتلا ہیں۔''

''اچھا تو گل نے یہ بات تمہیں بتا دی ہے۔ یہ اس نے اچھا نہیں کیا ہے۔ دراصل ہم اپنی پریشانی میں مہمان کو شریک نہیں کرتے ہیں۔''

''اب تو میں شریک ہو ہی گیا ہوں۔'' علی نے ہنس کر کہا۔ ''اب تو یہ بھی بتا دیں کہ آپ لوگوں نے بھارتی ایجنٹوں کے سلسلے میں کیا طے کیا ہے۔ ان کا مطالبہ تو آپ لوگ پورا کریں گے نہیں۔''

''ہم نے کچھ بھی طے نہیں کیا ہے۔ بس تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ ہم کچھ کر بھی تو نہیں سکتے ہیں۔ ہماری تعداد بھی کم ہے اور ہمارے پاس اسلحے کے نام پر بندوقوں کے سوا کچھ نہیں ہے ورنہ ہم ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے۔''

''جہادی تنظیموں سے رابطہ کیوں نہیں کرتے۔ حرکت المجاہدین، حرکت الانصار، حزب اللہ، حزب المومنین، حزب المسلمین، البراق وغیرہ۔ بہت ساری تنظیمیں اس کونے سے اس کونے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کسی سے بھی رابطہ کر لیتے۔ وہ یقیناً آپ کی مدد کرتیں۔''

''جتنی بھی تنظیمیں ہیں، وہ سب وادی کے اس طرف برسرِ پیکار ہیں۔ ادھر کوئی آنا ہی نہیں چاہتا۔''

''اس کی وجہ؟''

''وجہ یہ ہے کہ ادھر بھارتی فوجی ابھی اتنا ظلم نہیں کر رہے ہیں کیونکہ برفیلے میدانوں کی وجہ سے ادھر فوجیوں کی تعیناتی کم کم ہے۔ ٹھنڈ کی وجہ سے وہ لوگ زیادہ تر کیمپ اور مورچوں میں ہی وقت گزارتے ہیں۔ ان کے لیے لوٹ مار کرنے کی ذمے داری ان کے ایجنٹ کرتے ہیں اور یہ ایجنٹ بدقسمتی سے کشمیری ہیں، ہندو کشمیری اور ان کی تعداد بھی کم ہے پھر یہ لوگ بھی سال چھ مہینے میں ایک بار رقم یا مویشی کے ریوڑ مانگتے ہیں۔ پہلی بار انہوں نے رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ رقم بھی اتنی کہ ہم کبھی بھی دے نہیں سکتے۔''

''اب وہ لوگ کب رابطہ کریں گے؟''

''آج شام پانچ بجے ان کی دی ہوئی مہلت کا وقت ختم ہو جائے گا۔''

''یعنی وہ لوگ حملہ بھی کر سکتے ہیں؟''

''ہاں! وہ لوگ حملہ کریں گے۔''

''وہ بستی پر حملہ کریں گے اور آپ ان کا مقابلہ بھی نہیں کریں گے؟'' علی نے حیرت سے کہا۔ ''حالانکہ بستی کا سردار ہونے کے ناطے بستی کے تمام لوگوں کے جان و مال کی ذمے داری آپ پر ہے۔''

''اسی لیے تو ان کا مقابلہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔'' بڑے میاں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ''ان کی یہ روایت ہے کہ اگر ان کا مقابلہ نہ کیا جائے تو وہ کسی کو جانی نقصان نہیں پہنچاتے، صرف لوٹ مار پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ کرنے کے اہل نہیں ہیں لہٰذا مجھ پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے لیے وہ فیصلہ کروں جو ان کے لیے زیادہ بہتر ہو۔ مقابلہ نہ کرنے سے کم از کم ان لوگوں کی جانیں تو محفوظ رہیں گی۔''

''یہ بزدلی ہے۔ ایک مسلمان سے اس طرح کی بزدلی کی امید نہیں تھی اس لیے میں نے سوچا ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ شانہ بشانہ لڑوں گا۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ضد نہ کرو علی!'' بڑے میاں بولے۔ ''تمہاری جان بہت قیمتی ہے۔ تم ایک بڑے مقصد کے لیے لڑ رہے ہو۔''

''میرے ایجنڈے میں ایسے ایجنٹوں کی سرکوبی بھی شامل ہے۔''

''تم انہیں نہیں جانتے۔ وہ بہت بدذات لوگ ہیں۔ ان کے پاس جدید اسلحہ ہے اور وہ اس کا استعمال بھی جانتے ہیں۔ پھر تم تنہا ہو ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہاری زندگی قیمتی ہے تم ایک بڑے مقصد کے لیے لڑ رہے ہو۔ ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات میں پھنس کر اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈالو۔''

''موت کا ایک دن معین ہے اس سے قبل زندگی کوئی نہیں چھین سکتا۔ رہا سوال ایسے چھوٹے معاملات کا تو میں بتا چکا ہوں، ہماری سرزمین کو آزاد کرنا ہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ بھارتی درندوں کی طرح ان کے یہ ایجنٹ بھی میری لسٹ پر ہیں۔ ان کا قلع قمع کرنا میرے لیے فرض ہے۔''

''تم آخر کرنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں ان کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''بستی کے لوگ تیار نہیں ہوں گے۔''

''انہیں تیار کرنا میرا کام ہے۔ مجھے تو صرف آپ کی اجازت درکار ہے۔ باقی کام میں خود کر لوں گا۔''

''ٹھیک ہے میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔ علم قیافہ کی رو سے تم میں اتنی صلاحیت ہے کہ تم یہ ناممکن کام بھی کر سکتے ہو۔''

''آپ بستی کے سارے لوگوں کو جمع کر لیں، میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

☆======☆======☆

''اس بچے کا بار بار یہ کہنا کہ میں دیوان اللہ مدد شاہ ہوں۔ اس کی وجہ میں نے دریافت کر لی ہے۔'' کیتھی نے غلام رسول کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیسے، ذرا میں بھی سنوں۔'' غلام رسول نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں شاید علم نہ ہو کہ انسان بھی بعض سمندری پودوں اور پھولوں کی طرح ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے۔ موت اس کے لیے بے معنی بن سکتی ہے۔ سائنس اس کلیہ، اس فارمولے کے قریب پہنچ چکی ہے۔ جینگ سائنس کے ماہر پروفیسر ٹام وڈ نے گزشتہ دنوں اپنی تھیوری پیش کی ہے۔''

''کون سی تھیوری؟''

''انسان کے لیے اب غیر فانی ہونا ناممکن نہیں رہا۔ بعض حیوانات ایسے ہیں جن پر گزرتے وقت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سمندر کی تہوں میں پائے جانے والے پھول جو گل لالہ سے مشابہت رکھتے ہیں، ایسی ہی غیر فانی مخلوق میں شمار ہوتے ہیں اور کئی صدی کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود ان کی تازگی اور شگفتگی میں قطعاً کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ ہمیشہ تر و تازہ رہتے ہیں۔ اس طرح انسان کے جسم میں بعض ایسے خلیے ہیں جو فنا کی دست برد سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔''

''اچھا، تم نے بالکل نئی بات بتائی۔'' غلام رسول نے اسے کریدنے کے لیے چھیڑا کیونکہ یہ باتیں اس کے علم میں اضافہ کا باعث تھیں۔

''ایک اور نئی بات سنو، انسانی خصیوں اور بیضوں میں موجود خلیے کبھی فنا نہیں ہوتے۔''

''اچھا، اسی لیے دنیا کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔'' غلام رسول نے ہنس کر کہا۔

''انسانی جسم میں سرطان کا مرض اس وجہ سے اور بھی شدت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ یہ خلیے ہمیشہ زندہ اور فعال رہتے ہیں۔ انسانی ڈی این اے میں موجود جینز کا ہمارے غیر فانی ہونے سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ سمندری پھولوں کی مانند یہ جینز انسانوں میں بھی موجود ہوتے ہیں۔ تاہم انسانی جسم میں غیر فانی جینز اس کے تولیدی خلیوں تک ہی محدود رہتے ہیں لیکن وہ بیدار اور متحرک نہیں ہوتے۔ جس دن انہیں بیدار کرنے کا راز کھل گیا، بس یوں سمجھ لو کہ انسان زندۂ جاوید ہو جائے گا۔''

''تمہاری سائنس کیا کہتی ہے، مجھے نہیں معلوم۔ میں تو بس ایک بات جانتا ہوں کہ دنیا کے تمام علوم اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیے تبھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شافع امت کا لقب ملا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا تمام علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم کو اپنی آل و اصحاب رضی اللہ عنہ میں تقسیم کیا تبھی تو اصحاب اکرام رضی اللہ عنہ کو اتنا بلند مقام ملا۔ بغیر علم کے کسی کو بلندی ملتی ہی نہیں ہے۔''

''کسی کو کیا ملا، مجھے اس سے مطلب نہیں ہے، میں کہہ رہی تھی کہ......'' کیتھی نے اتنا ہی کہا تھا کہ غلام رسول نے بات کاٹی اور بولا۔

''حضرت علی کرم اللہ وجہہ ''نہج البلاغہ'' میں فرماتے ہیں۔ (اے انسان!) تیرا علاج

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیرے وجود کے اندر موجود ہے جس کا تُو شعور نہیں رکھتا اور تیری بیماری تجھی سے ہے تم نہیں سمجھتے اور تیرا وجود کھلی ہوئی کتاب ہے کہ جس کے حروف سے پوشیدہ امور ظاہر ہوتے ہیں۔ کیا تُو اپنے آپ کو ایک چھوٹا سا جسم تصور کرتا ہے حالانکہ تیرے وجود کے اندر ایک بڑا عالم سمایا ہوا ہے۔'' غلام رسول نے مسکرا کر کہا۔ ''اب تم سمجھ لو کہ سائنس کچھ کہہ رہی ہے، اسے چودہ سو سال پہلے بتا دیا گیا تھا۔''

''یہ تمہارے مذہب کی باتیں ہیں۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ ہاں جنیٹک انجینئرنگ کا کوئی فارمولا ہوتا تو میں ڈسکس کرتی۔ فی الحال تو بس اتنا کہنا ہے کہ میں بہت حد تک اس بچے کی بیماری کو سمجھ چکی ہوں۔ اس کے ڈی این اے پر آخری رپورٹ میں پروفیسر عثمان کے آنے پر ہی لکھوں گی۔ پتا نہیں وہ کب لوٹیں گے۔''

☆======☆======☆

پروفیسر عثمان اور کمانڈر علی کو ساتھ لے کر سردار شیر بابا اس جگہ پہنچے جہاں پہلے بہت سارے لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں جوان کم اور بوڑھے زیادہ تھے پھر بھی وہ سب سردار شیر بابا کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ سردار شیر بابا نے اپنے دائیں بائیں ان دونوں کو بٹھایا پھر اجتماع عام سے مخاطب ہوئے۔ ''میرے ساتھیو! میرے ساتھ جن دو آدمیوں کو آپ دیکھ رہے ہیں یہ دونوں آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے بارے میں، میں اتنا کہوں گا کہ میرے تجزیے کے مطابق یہ بہترین قائدانہ صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ اگر یہ ہمارے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو میں اسے اپنی بستی کی خوش نصیبی قرار دوں گا۔ ان کی صلاحیتوں پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کرتا ہوں۔ بقیہ باتیں آپ لوگوں سے یہ کریں گے۔''

مجمع پر مکمل سکوت طاری تھا اور سب کی نگاہیں کمانڈر علی و پروفیسر پر ٹکی ہوئی تھیں۔ پروفیسر عثمان نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر بولا۔ ''مجھے فخر ہے کہ آج میں ایسے بہادر وشجاع قبیلے کے لوگوں سے مخاطب ہوں جن کی بہادری کے قصے زبان زد عام ہیں۔ بہادروں سے یہ کہنا کہ آپ اس جہاد میں حصہ لیں تو یہ عبث ہے۔ فخر تو مجھے کرنا چاہیے کہ میں ضعیفی کے عالم میں بھی ایسے بہادروں کے ساتھ مل کر ان غداروں کا مقابلہ کروں جنہوں نے مسلمانانِ کشمیر کو بے بس سمجھ لیا ہے۔ یاد رکھیے اگر ان کے پاس جدید اسلحہ ہے تو ہمارے پاس حوصلہ ہے۔ آج کل کی جنگ بازوؤں کی قوت پر نہیں لڑی جاتی، بلکہ حکمت عملی اور عزم و حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''ہماری بستی میں نوجوان بہت کم ہیں۔ ہم کس طرح ان کا مقابلہ کریں گے؟'' ایک عمر رسیدہ شخص نے اٹھ کر کہا۔

''بزرگو! میں نے کہا ناں آج کل جنگ بازو کی قوت سے نہیں لڑی جاتی۔ جنگ ہوتی ہے بندوق سے اور بندوق کا گھوڑا دبانے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی ہے، سامانِ حرب اور عددی برتری سب کی سب دھری رہ جاتی ہیں۔'' پروفیسر نے تقریر روک کر ان کا جائزہ لیا۔

''ہم تیار ہیں ہم لڑیں گے۔'' مجمع میں سے مختلف النوع آوازیں سنائی دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب مرنے مارنے کے درپے ہو گئے جنہوں نے مصلحتوں کے پیش نظر غداروں سے جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''اب یہ بتایا جائے بستی میں کل کتنی بندوقیں ہیں؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''دو لائسنس یافتہ، چھ بغیر لائسنس کی۔ ان میں رائفلز بھی ہیں۔'' سردار بابا نے جواب دیا۔

''کارتوسوں کی صورتِ حال کیا ہے؟''

''فاضل کارتوس اتنے ہیں کہ ہم آٹھ ہتھیاروں سے آٹھ گھنٹے مقابلہ کر سکتے ہیں۔''

''اتنے اسلحے سے تو پوری بٹالین کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔'' پروفیسر نے جوش بھری آواز میں کہا۔ ''اب یہ بتائیں آپ میں سے کتنے افراد بندوق چلا سکتے ہیں۔''

''ہر شخص اسلحے کے استعمال سے واقف ہے۔'' سردار نے بتایا۔

''آٹھ افراد میری مدد کے لیے آ جائیں۔ یہ آٹھوں بستی کے باہر ایسی جگہ چھپ کر بیٹھیں گے کہ بادی النظر میں دکھائی نہ دیں۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ وہ لوگ کتنی تعداد میں ہوں گے مگر جتنے بھی ہوں گے، ان میں سے کچھ بستی کے باہر رکیں گے اور دو یا تین آدمی ہی اندر آئیں گے اس لیے تم......'' پروفیسر عثمان نے ایک نوجوان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''تم سڑک پر کھڑے رہو گے۔ وہ تم سے رقم کی بابت پوچھیں گے کہ انتظام ہوا یا نہیں۔ تم کہو گے کہ ہاں رقم کا بندوبست ہو گیا ہے۔ وہ تم سے پوچھیں گے رقم کہاں ہے تو تم جواب میں عبداللہ کو پکار کر کہو گے کہ رقم کا تھیلا لے آئے۔''

''کون عبداللہ؟'' ایک نوجوان نے پوچھا۔

''عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ! یہ ایک فرضی نام ہے۔ جب تم آواز دو گے تو میں ایک تھیلا لے کر باہر نکلوں گا۔ وہ خوش ہو جائیں گے اور تب میں موقع دیکھ کر فائر کروں گا۔ یہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سگنل ہوگا۔ باہر موجود افراد فوراً ان کے ساتھیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیں گے۔"

اس کے بعد مدافعت کے طریقہ کار پر غور کیا جانے لگا۔ ہر ایک کی ڈیوٹی مناسب جگہ پر لگا دی گئی۔

اگلے دن صبح ہی سے لوگ پُر جوش تھے۔ سب کو انتظار تھا کہ وہ لوگ رقم کا مطالبہ کرنے کب آتے ہیں۔ آدھا دن ڈھل گیا لیکن کوئی نہ آیا۔ جو لوگ مورچہ سنبھالے بیٹھے تھے، ان میں بے چینی پھیلنے لگی۔ یہ بات علی اور پروفیسر عثمان کی نظروں سے چھپ نہ سکی۔ وہ سمجھ رہے تھے حالات بہت نازک ہیں۔ یہ دفاعی انتظام فیل بھی ہو سکتا ہے۔ تخت کی جگہ تختہ بھی مقدر ہو سکتا ہے لیکن کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ خاموش رہ کر منتظر تھے۔

دوپہر ڈھل گئی۔ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا کہ دور کچھ دھبے سے نظر آئے۔

جب حدِ نگاہ تک سفید برفیلا میدان ہو تو کئی میل دور کی چیز بھی بہ آسانی نظر آجاتی ہے۔ کمانڈر علی اور پروفیسر عثمان ایک مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان متحرک دھبوں کو دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ کچھ لوگ بستی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ پوری طرح ہوشیار ہو گئے۔ پروفیسر عثمان کو سردار شیر بابا نے جرمن ساخت کا فوجی ریوالور دیا تھا، اسے کمر سے نکال کر انہوں نے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ بستی کے باہر پہرے پر موجود نوجوانوں میں سے ایک دوڑتا ہوا پہنچا اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان میں بولا۔ "وہ...... وہ آرہے ہیں۔"

"میں نے دیکھ لیا، لیکن تم نے اپنی پوزیشن کیوں چھوڑی۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔" پروفیسر عثمان نے کہا اور نیچے کی جانب بڑھنے لگے۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "سر کے سفید کنٹوپ کو اچھی طرح برابر کرو اور جا کر اپنی پوزیشن سنبھالو۔"

وہ گھر میاں مبارک علی نامی ایک ایسے شخص کا تھا جس کی عمر پچاسی سال سے کم نہ تھی۔ اس نے پروفیسر کو سیڑھیوں سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تمہارا ننھیال کہاں ہے؟"

"یہ لو، کیا سٹھیا گئے ہو۔ تمہیں یاد نہیں ہے کہ میرا ننھیال ننگار میں ہے جو اب پاکستانی حدود میں واقع ہے۔" بڑی بی نے میاں کو جھڑکا۔

"دراصل میں تمہیں یاد دلا رہا تھا۔ تم نے ننگار میں ایک شخص اسد الکبیر الغازی کا نام تو سنا ہوگا؟"

"ہاں کیوں نہیں، وہی نا جس نے برسوں پہلے اس ریاست کو تبتیوں کے حملے سے بچایا تھا اور جسے وہاں کے لوگ اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں۔ اس سے کفر کی حد تک عقیدت رکھتے ہیں اور اس کی دوبارہ آمد کے منتظر ہیں۔"

"میں نے وہاں ایک بار اسد الکبیر کی قلمی تصویر دیکھی تھی۔ کسی بہت اچھے مصور نے بنائی تھی۔ تصویر میں جو چہرہ تھا، وہ چہرہ میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا ہے۔"

"یہ آج تمہیں اسد الکبیر کیوں یاد آنے لگا ہے؟" بڑی بی نے پھر سوال کیا۔

"دراصل یہ صاحب جو علاقے کے نوجوانوں کو مروانے کے لیے جمع کیے بیٹھے ہیں، ان کے چہرے میں مجھے اسی اسد الکبیر کی شباہت نظر آرہی ہے۔"

پروفیسر عثمان جو اسد الکبیر کا نام سن کر سیڑھیوں پر ٹھٹک گئے تھے، ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے سوچا۔ "یہ اسد الکبیر کا نام تو مجھ سے بھوت بن کر چمٹ گیا ہے۔ ہر جگہ پیچھا کر رہا ہے۔"

"پروفیسر صاحب!" کمانڈر علی جو نیچے اتر چکا تھا، اس نے آواز دی۔ انہوں نے قریب پہنچ کر کہا۔ "ہاں اس بات کا خیال رکھنا تمہارا مورچہ سب سے اہم ہے۔ اگر تم ہٹے تو وہ بہ آسانی بستی میں گھس آئیں گے اور اگر وہ اندر آ گئے تو سمجھ لو اس بستی کا حشر نشر ہو جائے گا۔"

علی کو بھیجنے کے بعد پروفیسر عثمان، سردار شیر بابا کی طرف بڑھتے چلے گئے کیونکہ اس معرکہ میں سردار بابا کا رول بھی بہت اہم تھا۔ سردار بابا کو ہدایت دینے کے بعد پروفیسر عثمان چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے بستی کے آخری مکان کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ وہ اس مکان کی آڑ میں کھڑے ہو کر ادھر ہی دیکھ رہے تھے جدھر سے دشمن بڑھتے چلے آرہے تھے۔ پہلے جو دھبوں کی صورت میں نظر آرہے تھے، وہ اب واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی تعداد بیس تک ہو گی۔ وہ ان ہی پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس گھر میں کوئی بچی بڑے دلکش انداز میں گا رہی تھی گو کہ زبان کشمیری تھی پھر بھی ان کی سمجھ میں آرہی تھی۔

"اے وطن، پیارے وطن! کاش وہ دن پھر لوٹ آئیں، جب تیری فضائیں، اے میرے وطن، آزاد تھیں کرگسوں کی یلغار سے، تیرے دامن میں امید کے پھول تھے، آہ وہ ان کیا ہوئے، وہ راتیں کہاں کھو گئیں، آہ وہ آزادی کے روز و شب میرے وطن، میرے پیارے وطن، آہ تجھے کس کی نظر کھا گئی، تیری آزادی کو موت نے آ لیا، ہم وہ سورج

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیکھیں گے ضرور، جب اجالا ہوگا۔ آزادی کی نوید ہوگی۔ ہم آزاد ہوں گے۔"

پروفیسر کی یکسوئی ٹوٹ گئی۔ سامنے سے بڑھتے ہوئے اس دستے نے ان کے خیالات کو سبوتاژ کر دیا تھا۔ وہ اب پوری طرح سے تیار تھے۔ ان کے اندر سخت تشویش اور اضطراب کا دریا بہہ رہا تھا۔ وہ سمجھ کر بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اسی وقت ان کے کانوں میں اس نوجوان کی آواز آئی جسے دشمنوں سے بات کرنا تھی۔ وہ بستی کی طرف دیکھ کر آواز لگا رہا تھا۔ "عبداللہ! عبداللہ! کہاں ہو، رقم کا تھیلا اٹھا لاؤ۔"

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ آگے بڑھیں اور ان لوگوں سے بات کریں۔

پروفیسر عثمان نے کندھے سے لٹکے ہوئے بیگ کو تھپتھپایا اور اس مکان کی آڑ سے نکل آئے۔ وہ نپے تلے قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بستی کے داخلی راستے پر تین افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھ میں کلاشنکوفیں تھیں جبکہ تیرا بندہ اسی بستی کا تھا جس نے آواز لگائی تھی۔ وہ دونوں پروفیسر پر نشانہ لگائے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بس ایک پل میں انہیں ڈھیر کر دیں گے۔

☆======☆======☆

نزدیک پہنچ کر پروفیسر نے کہا۔ "رقم کا انتظام ہو گیا ہے۔ دوں؟"

"لاؤ، وہ رقم مجھے دے دو۔" اس نے بے پروا انداز میں بیگ لینے کے لیے بائیں ہاتھ میں کلاشنکوف تھام کر داہنا ہاتھ بڑھا دیا۔ شاید اس کی وجہ پروفیسر عثمان کا حلیہ اور عمر تھی۔ وہ دیکھنے میں ہی مدقوق نظر آ رہے تھے اسی لیے حملہ آور غافل ہو چکے تھے۔ اسی کی طرح اس کا ساتھی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ یہی وہ موقع تھا جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ پروفیسر نے بھی فائدہ اٹھا لیا۔ انہوں نے اسی موقع کے لیے کانچ کی ایک بوتل تیار کر رکھی تھی۔ انہوں نے اس بوتل کو نکالنے کے لیے بیگ کو کندھے سے اتارا۔

ان دونوں کی نظریں پروفیسر پر ٹکی ہوئی تھیں لیکن پروفیسر ہر طرف سے بے پروا تھے۔ انہوں نے بیگ کو کھولا، اندر ہاتھ ڈالا۔ ان دونوں مسلح نوجوانوں نے شاید یہ سمجھا تھا کہ وہ بیگ کے اندر سے نوٹوں کی گڈیاں نکال رہے ہیں مگر جب ان کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹی سی بوتل تھی۔ کانچ کی اس بوتل کو باہر نکالنے سے پہلے انہوں نے جائزہ لے لیا تھا کہ کہیں کوئی اور تو کھڑا نہیں ہے مگر ان دونوں کے ساتھی کافی دور تھے۔ دور تک پھیلی لمبی لمبی سرکنڈوں کی جھاڑیاں تھیں جس کی وجہ سے ان کے ساتھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید وہ بہت زیادہ خود اعتماد تھے۔ انہیں پتا تھا کہ پورا نامی اس گاؤں کے باشندے حد سے زیادہ سہمے ہوئے ہیں۔ وہ مقابلہ کرنے سے گریز کریں گے لیکن انہیں کیا پتا تھا کہ چیونٹی نے ہاتھی سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پروفیسر نے اسی مغالطے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے بوتل نکالی پھر اپنی سانس روک کر اسے زمین پر گرا دیا۔ پتھریلی زمین سے ٹکراتے ہی وہ بوتل چور چور ہو گئی اور ایک تیز قسم کی بو چاروں طرف پھیل گئی۔ وہ بو اتنی تیز تھی کہ دونوں کلاشنکوف بردار اور گاؤں والے چکرا کر زمین پر گر گئے۔ پروفیسر پھرتی سے دور ہٹتے چلے گئے تھے۔ کچھ دور جا کر انہوں نے جھاڑیاں ہٹائیں اور وہاں کھڑے ان دونوں دراندازوں کے ساتھیوں پر پستول سے فائر کیا۔ ان میں سے ایک سینہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان لٹیروں پر ہر طرف سے فائر ہونے لگے۔ وہ سب گھبرا کر پوزیشن لینے کی کوشش کر رہے تھے مگر انہیں کہیں بھی جائے اماں نہیں مل رہی تھی۔ رہ رہ کر فائر ہو رہا تھا اور ہر فائر خراج وصول کر رہا تھا۔ ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ مقابلہ کی بجائے بھاگنے کی راہ تلاش کر رہے تھے مگر کمانڈر علی نے ایسی منصوبہ بندی کی تھی کہ انہیں بھاگنے کی راہ نہیں مل رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد اتنی کم ہو گئی کہ وہ ہاتھ اٹھا دینے پر مجبور ہو گئے۔

گرفتار شدگان کی تعداد تیرہ تھی۔ ہلاک ہونے والوں کو گنا گیا تو آٹھ نکلے۔ دو بے ہوش تھے جنہیں پروفیسر نے گیس کے ذریعے بے ہوش کیا تھا۔ ہلاک ہونے والے سب کے سب ہندو تھے۔ قیدیوں نے بتایا کہ ہمیں خصوصی طور پر جموں سے یہاں بلایا گیا ہے۔ حکومت کا پلان یہ ہے کہ علاقہ کے مکینوں پر دوطرفہ حملہ کیا جائے۔ یہ لوگ اسی پلان کی تکمیل کے لیے حملہ کرتے تھے۔ یہ لوگ لوٹ مار کرنے کے بعد بھاگ جاتے، بعد کے کام فوجی کرتے، وہ تلاشی کے نام پر گاؤں والوں کی بھرپور انداز میں بے عزتی کرتے اور نوجوانوں کو گرفتار کر کے سزا دیتے۔ شاید اسی لیے گاؤں والے حد سے زیادہ خوفزدہ تھے۔

اس ناکام حملے پر گاؤں والے بہت زیادہ خوش تھے۔ انہیں ذرا بھی امید نہیں تھی کہ وہ اس معرکے کو سر کر لیں گے۔

معرکہ کے خاتمہ پر گاؤں کے بزرگوں نے باری باری کمانڈر علی اور پروفیسر کو سینے سے لگایا اور دعائیں دیں۔

قیدیوں کو باندھ کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا جب کہ مقتولین کی لاشیں خچروں پر لاد کر کئی گھنٹے کی مسافت پر واقع مرکزی سڑک کے کنارے لے جا کر پھینک دی گئیں تاکہ بی ایس ایف والے ان کا کریا کرم کر دیں۔ کچھ بھی ہو گاؤں والے مسلمان

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھے اور مسلمان کسی کی بھی لاش کی بے حرمتی پسند نہیں کرتے خواہ کتنے ہی بڑے دشمن کیوں نہ ہو۔

ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد عبادت حسین جو اس گاؤں کے سرکردہ افراد میں سے تھے۔ انہوں نے تمام لوگوں کو اپنے گھر بلایا تا کہ صلاح مشورہ کیا جا سکے۔ جذبات میں انہوں نے یہ قدم اٹھا تو لیا تھا مگر اب وہ ڈر رہے تھے کہ بی ایس ایف والے اپنے ایجنٹوں کی موت کا بدلہ ضرور لیں گے۔

اس میٹنگ میں پروفیسر عثمان اور کمانڈر علی کو بھی بلایا گیا تھا۔ وہ دونوں پہنچے تو گاؤں کے تمام لوگ وہاں آ چکے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو مرکزی جگہ پر بٹھایا اور میٹنگ کا آغاز ہوا۔

"میرے عزیز دوستو! بزرگو! ہم نے جوش و جذبات میں ایک بہت بڑا قدم اٹھایا ہے لیکن ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔ ہم آخر کب تک گھٹ گھٹ کر مرتے۔" عبادت حسین نے باضابطہ تقریر شروع کر دی۔

"شمالی ہندوستان سے آنے والے یہ غاصب لٹیرے ہمیں اس طرح لوٹ رہے ہیں کہ ہم آہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ حال صرف ہمارا نہیں ہے۔ اس پورے ملک کا ہے، کشمیر کی ایک ایک انچ زمین پر ان لوگوں نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ نہ ہماری جان محفوظ ہے اور نہ مال۔ اب تو عزتیں بھی غیر محفوظ ہو گئی ہیں۔ غور کریں کیا یہ انصاف ہے کہ ہمارے ہی ملک میں ہم محکوم بنا دیئے جائیں۔ ہمارے ہزاروں بھائی بند اس ظلم و ستم سے تنگ آ کر آزاد کشمیر کی طرف چلے گئے۔ یہ ہجرت اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ یہ زمین ہماری ہے یہ ہمارا ملک ہے۔ ہم اسے آزاد کرائیں گے اور مملکت خداداد سے الحاق کر کے رہیں گے۔ ہمارے کچھ نوجوان جو بڑے شہروں میں ہیں انہوں نے جدوجہد تیز کر دی ہے اب تو ہمیں بھی خدا نے موقع دے دیا ہے۔ یہ دونوں شخص جو فرشتہ بن کر ہمارے علاقے میں آئے اور ہمیں ہماری قوت کا احساس دلایا ہے کہ اگر ہم تھوڑی سی ہمت کریں تو ان غاصبوں کو پیچھے دھکیل سکتے ہیں۔ یہ لٹیرے جو عرصہ دراز سے ہمیں لوٹ رہے تھے جب انہیں ان کی اوقات بتا سکتے ہیں تو کیا بی ایس ایف والوں سے بدلہ نہیں لے سکتے؟ اگر آپ تیار ہیں تو آگے کی حکمت عملی بنائی جائے۔"

"ہم تیار ہیں۔" کئی لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"مجھے یہی امید تھی کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔ کافر اپنی شمشیر پر بھروسہ کرتا ہے ہم

بے تیغ لڑنے والوں میں سے ہیں۔ اگر آپ ساتھ دینے کا وعدہ کریں تو میں ان نوجوانوں سے رابطہ کروں جو جہاد کر رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ ہمیں بھرپور امداد دیں گے۔"

"آپ حزب المسلمین، جمعیت المجاہدین یا لشکر طیبہ سے رابطہ کریں۔ حزب المومنین سے بھی بات کی جا سکتی ہے۔" ایک شخص نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔

"یہ تو بعد کا مسئلہ ہے، فی الحال یہ سوچا جائے کہ ان قیدیوں کا کیا کیا جائے گا۔" ایک دوسرے شخص نے کہا۔

"ان سے پوچھا جائے کہ ان کی پیٹھ پر کون کون ہیں پھر ہم ان لوگوں کو نشانہ بنائیں گے۔ اس طرح جموں اور لداخ کے وہ ہندو جو بلوہ کے لیے یہاں بلوائے جا رہے ہیں، ان کا راستہ رک جائے گا۔" پروفیسر عثمان نے کہا۔

"ہاں یہی مناسب ہے۔" عبادت حسین نے کہا۔

میٹنگ ختم کر کے وہ سب قیدیوں کے پاس آئے۔ ان سے پوچھ گچھ کے بعد معلوم ہوا کہ بی ایس ایف کا کرنل اروڑا، میجر ستونت اور بریگیڈیئر رام پال ان لوگوں کو بلاتا ہے اور اسی کی ایما پر مسلم بستیوں پر شب خون مارا جا رہا ہے۔ کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہر روز پانچ پانچ کی تعداد میں قیدیوں کو رہا کیا جائے گا لیکن ان سے وعدہ لے لیا جائے گا کہ وہ یہاں سے نکل کر سیدھے اپنے گھروں کو جائیں گے۔ یہاں کے کیمپ سے کسی طرح بھی رابطہ نہیں کریں گے۔ اگر کوئی انکار کرے تو اسے فوراً گولی مار دی جائے تا کہ دوسروں پر دہشت طاری ہو جائے۔ ایک فیصلہ اور ہوا کہ ان تینوں بدمعاش افسروں کو بھرپور سبق دیا جائے تا کہ وہ مسلمانوں سے ٹکرانا بھول جائیں اور اس سلسلے میں کمانڈر علی ان کی مدد کریں گے۔ علی فوراً تیار ہو گیا اور اس نے کہہ دیا کہ وہ آج کل میں بارہ مولہ و دیگر علاقوں سے اپنے ساتھیوں کو بھی بلا لے گا تا کہ غاصبوں کو بھرپور جواب دیا جا سکے۔

کمانڈر علی کی بات پر پروفیسر نے کہا۔ "میاں! اتنی دور کی نہ سوچو۔ خدا اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جسے خود اپنی حالت بدلنے کی فکر نہ ہو۔ انہیں خود بدلہ لینا ہو گا۔ انہیں ٹرینڈ کر دو، یہی ان کے حق میں بہتر ہے۔"

پروفیسر کے کہنے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور علی نے اعلان کر دیا کہ میں جتنے دن یہاں ہوں، یہاں والے لڑنے کی ٹریننگ لیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اگر آپ چاہیں تو میری خدمت لے سکتے ہیں۔ میں ریٹائرڈ فوجی ہوں۔ برما کے محاذ پر لڑ چکا ہوں۔" ایک درمیانی عمر کے شخص نے کمانڈر علی سے کہا۔

"آپ کا نام؟" علی نے پوچھا۔

"فقیر محمد! میرا گھر اسی گاؤں میں ہے مگر میں نزدیکی قصبے میں رہتا ہوں۔ وہاں میری دکان ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں یوں بھی ایک مقامی آدمی کی اشد ضرورت ہے۔ آپ یقیناً یہاں کے لوگوں کی طرح بہادر اور جری ہوں گے۔ آپ کا ایک بڑا حلقہ بھی ہوگا۔ قصبے کے تقریباً تمام لوگوں کو پہچانتے ہوں گے۔"

"بالکل!" اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

"تو ہم آج ہی سے آپریشن کا آغاز کر دیتے ہیں کیونکہ ہمیں جلد سے جلد پاکستان لوٹنا ہے کیونکہ اگر یہاں کی حکومت کو علم ہوگیا کہ ایک پاکستانی ان کے علاقے میں آیا ہوا ہے تو یہ لوگ آسمان سر پر اٹھا لیں گے۔ ان کا میڈیا زور شور سے چیخے گا کہ پاکستانی یہاں گڑبڑ کرتے ہیں۔" علی نے کہا۔

"ایک مگر آپ تو دو ہیں؟" فقیر محمد حیرت سے بولا۔

"میں یہیں کا ہوں۔ صرف بڑے صاحب پاکستان کے ہیں۔"

"تو یوں سمجھ لیں کہ بڑے صاحب میرے لیے بہت اہم ہیں معزز مہمان!" کہہ کر اس نے سانس لیا پھر بولا۔ "اس آپریشن کے لیے کچھ ایسی چیزیں میرے پاس ہیں جن کی وجہ سے کافی آسانی ہوگی۔ پچھلے دنوں قصبے کے قریب ایک فوجی جیپ حادثے میں تباہ ہوئی تھی۔ اس جیپ سے مجھے کچھ چیزیں ملی تھیں۔ میرا تعلق فوج سے تھا اس لیے میں نے ان کی اہمیت فوراً سمجھ لی اور جن بچوں نے اسے اٹھایا تھا ان سے وہ تمام چیزیں خرید لیں۔ جانتے ہیں ان میں کیا کیا چیزیں تھیں؟"

"کیا؟" علی نے پوچھا۔

"ان میں شورٹ رینج کا وائرلیس سیٹ، بکس وغیرہ تھے اگر کہیں تو میں وہ لے آؤں؟"

"ضرور، ضرور، یہ تو بڑے کام کی چیزیں ہیں۔ اسلحہ تو وغیرہ ہاتھ نہیں لگا تھا؟"

"اسلحہ دیگر لوگوں نے لوٹ لیا اگر وہ اسے بھی پہچانتے تو لے جاتے۔"

"ٹھیک ہے، لے آؤ۔"

وہ سامان لینے چلا گیا۔ کمانڈر علی اور پروفیسر عثمان لائحہ عمل ترتیب دینے لگے۔ اسی گاؤں کے ایک صاحب نے انہیں اپنی جیپ دے دی۔ اس علاقے میں جیپ کی اہمیت زیادہ تھی اس لیے انہوں نے شکریہ کے ساتھ وہ تحفہ قبول کر لیا۔

مکمل تیاری کے ساتھ پروفیسر عثمان، کمانڈر علی اور فقیر محمد آپریشن کے لیے روانہ ہو گئے۔

فقیر محمد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور علی اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا جب کہ پروفیسر عثمان اور ایک دوسرا حنیف نامی مقامی شخص پیچھے بیٹھ گئے تھے۔ یہ شخص بھی ریٹائرڈ فوجی تھا اسی لیے انہوں نے اسے ساتھ لے لیا تھا۔

وہ لوگ گاؤں سے نکل کر اس کچے راستے پر چل پڑے تھے جو قصبے کی طرف جا رہا تھا۔ اسی قصبے میں بی ایس ایف کا کیمپ تھا اور اسی کیمپ میں وہ تینوں افسر تھے جنہیں نشانہ بنانا تھا۔

آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ قصبے تک پہنچ گئے۔ قصبے کے اگلی طرف بس اسٹاپ تھا۔ یہاں سے بسیں دور دراز کے علاقوں تک جاتی تھیں۔ بس اسٹاپ پر قطار میں بسیں کھڑی تھیں اور خاصہ ہجوم تھا۔ سبزیوں اور پھلوں کے تھیلے والے اور خوانچہ فروش بکھرے ہوئے تھے۔ مزدور پیٹھ پر بوریاں لادے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ ایک فوجی جیپ سے سامان اتارا جا رہا تھا۔ کچھ بسوں میں مسافر بیٹھے تھے، کچھ خالی تھیں۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر ٹولیوں میں کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سبزی، پھل، مچھلی اور تیل کی ملی جلی بو ان کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ شور و غل اور کیسٹ کے گانوں سے کان کے پردے پھٹ رہے تھے۔ بھیڑ سے دم گھٹ رہا تھا۔

ان کی نگاہیں ہر شخص کے چہرے اور ہاتھوں کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کہیں ان میں کوئی دشمن نہ ہو۔

دشمن کا انتظار زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ کچھ آگے بڑھتے ہی فقیر محمد نے کہا۔ "سر! وہ رہا میجر ستونت!"

علی نے ادھر دیکھا۔ ملٹری کی وردی میں ملبوس ایک سکھ جیپ میں بیٹھا تھا۔ وہ سب بھی اپنی جیپ سے اترے اور ادھر ہی بڑھنے لگے۔ پروفیسر کے دائیں طرف تین بسیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھیں۔ اچانک بھگدڑ مچ گئی۔ ان کے قریب کی بس میں بیٹھی ہوئی عورت نے پھرتی سے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔ علی نے مڑ کر فقیر محمد کی طرف دیکھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیکے کوٹ کی اندرونی جیب سے پستول نکال رہا تھا۔ اس نے جلدی سے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور جھکا جھکا بس کے سامنے والے حصے کی طرف پھر بس کے نیچے جھانکنے لگا تو اسے دوسری طرف کیچڑ میں لتھڑے ہوئے دو بڑے بڑے پھٹے پرانے بوٹ نظر آئے۔ وہ بس کے نیچے سے رینگ کر دوسری طرف نکلا تو وہاں ایک ہوا شخص اچھل کر اس پر گرا مگر علی چوکنا تھا۔ وہ قلابازی کھا کر ایک طرف ہٹ گیا اور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ وہ شخص بھی فوراً سنبھل گیا لیکن اس سے پہلے کہ اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اپنا کام کرتا، علی نے لپک کر اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے لنگڑی دے کر زمین پر گرا دیا۔ اسی وقت ایک گولی زن سے اس کے سر پر سے گزر گئی اور ساتھ ہی اسے ریوالور کی آواز سنائی دی۔ ایک اور گولی آئی اور زمین پر گرا ہوا شخص اٹھ کر علی سے لپٹ گیا۔ اس نے علی کے سر، چہرے اور شانوں پر دائیں ہاتھ کی بند مٹھی سے گھونسوں کی بارش کر دی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں پستول اسی طرح دبا ہوا تھا۔ علی نے اسے غور سے دیکھا تو وہ ایک فقیر تھا اس کے جسم پر پیوند لگا لباس تھا۔ اس کا آدھا چہرہ مسخ تھا اور دائیں آنکھ کی جگہ صرف ایک حلقہ تھا۔

اس بھیانک شکل والے میں غضب کی قوت تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ بری طرح جلا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سے جلد ادھڑی ہوئی تھی اور رگیں نظر آ رہی تھیں لیکن وہ اسی ہاتھ سے علی پر گھونسے برسائے جا رہا تھا۔ علی نے اپنا ریوالور اس کے حلق میں ٹھونس دیا۔ وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کیوں حملہ کیا ہے۔ معاً ایک اور گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کے سر پر سے گزر گئی اور بس کی ونڈ اسکرین چکنا چور ہو گئی۔ علی کرچیوں سے بچنے کے لیے نیچے جھک گیا اور بھکاری کو موقع مل گیا وہ اسے دھکا دے کر بھاگ نکلا۔

علی بس کے نیچے گھس گیا تھا۔ اس کے ہاتھ اور گھٹنے پھر کیچڑ اور تیل میں لتھڑ گئے تھے۔ وہ اس سمت کا تعین کر رہا تھا جہاں سے گولیاں آئی تھیں۔ جلد ہی دو بسوں کے پرے اسے دو جوتے نظر آئے۔ وہ ملٹری بوٹ تھے اور پالش سے چمک رہے تھے۔

☆======☆======☆

''یعنی تم نے وہ راز دریافت کر لیا جس کے زیر اثر علی مدد شاہ خود کو دیوان اللہ شاہ کہتا ہے؟'' غلام رسول نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

''اس کا فیصلہ تو پروفیسر عثمان کریں گے۔ میں نے جینیٹک سائنس کے ذریعے اس راز کو کھولنے کی کوشش کی ہے، کہاں تک کامیاب ہوں یہ بات مجھ سے زیادہ تجربے کار شخص ہی بتا سکتا ہے۔'' کیتھی نے جواب دیا۔

''ہنہ! جینیٹک سائنس! یہ جینیٹک سائنس کیا ہے؟ پوری تھیوری قرآن مجید میں بیان کر دی گئی ہے۔ سورۃ الحاقہ آیت 38 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''مجھے قسم ہے ان چیزوں کی جو تم کو دکھائی دیتی ہیں اور مجھے قسم ہے ان چیزوں کی جو تمہیں دکھائی نہیں دیتیں۔'' یعنی کہ اس کائنات میں ایسی لاتعداد اشیاء و جاندار ہیں جو دکھائی نہیں دیتے۔ طاقتور خوردبینوں کے ذریعے جراثیموں کی دنیا دریافت کی گئی جن سے پہلے کے لوگ ناواقف تھے۔ جنین کہتے کسے ہیں؟ آج سے سو سال پہلے کے لوگ نہیں جانتے تھے۔ جراثیم نقصان رساں ہیں، اس سے بھی لاعلم تھے تبھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ کی ہے۔ ''پانی کے ظروف، مشک وغیرہ کو بند رکھا کرو کیونکہ دوران سال ایسی شب بھی آتی ہے جب ایک خاص مخلوق سفر کرتی ہے۔ جب وہ کھلے برتن اور مشک کے قریب پہنچتی ہے تو ان میں داخل ہو جاتی ہے۔'' اس زمانے میں جراثیم نام نہیں دیا گیا تھا اس لیے مخلوق کہا گیا۔ آج جب سائنس نے بھرپور ترقی کر لی اور انتہائی طاقتور خوردبینوں سے پتا لگا لیا گیا کہ گرمی کی آمد کے ساتھ جی تھری نامی وائرس پیدا ہو جاتے ہیں جو سورج کی روشنی سے مرتے ہیں اس لیے رات میں فضا میں پھیلتے ہیں اور پانی میں افزائش نسل کرتے ہیں۔''

زبانی جہاد جاری و ساری تھا کہ باورچی اختر نے آ کر کہا۔ ''آپ سے ملنے کچھ لوگ آئے ہیں۔''

''آج کی بحث کل کے سر پر۔'' غلام رسول نے ہنس کر کہا اور باہر نکل گیا۔

باہر گاؤں کے سرکردہ افراد آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے غلام رسول کو سلام کیا پھر ان میں سے ایک بولا۔ ''صاحب جی! یہ لوگ پوچھنے آئے ہیں کہ بڑے صاحب کب تک واپس آئیں گے۔''

''مجھے خود خبر نہیں، میں کیا بتا سکتا ہوں۔''

''وہ گئے کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

غلام رسول کے دل میں آیا کہ وہ کہہ دے کہ پروفیسر صاحب انڈیا گئے ہوئے ہیں مگر اس نے مصلحت سے کام لیا اور کہا۔ ''بڑے صاحب مجھے بتا کر نہیں گئے۔ شاید گلگت گئے ہوں۔ چلاس بھی جانے کا کہہ رہے تھے۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آپ پتا تو کریں، ایک ہفتہ ہونے کو آ گیا۔ اب تک تو انہیں لوٹ آنا چاہیے تھا۔"

"میں خود پریشان ہوں۔"

"بات یہ ہے کہ ہم اس بار بڑے پیمانے پر محفل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے لیے بہت بڑی بات ہے کہ ہماری زندگی میں ہمارا نجات دہندہ لوٹ آیا۔ اسد الکبیر لوٹ آنے کی خوشی میں ہم دن بھر خوشیاں منانا چاہتے ہیں۔"

"آپ لوگ تیاری کریں، وہ بہت جلد لوٹ آئیں گے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ پھر وہ ہماری کسی غلطی کی وجہ سے ہم سب کو ٹھکرا کر گئے۔ اگر ایسا ہوا تو سمجھ لیں تباہی ہمارا مقدر ہے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ایک ضروری کام سے گئے ہیں اور جلد لو آئیں گے۔" غلام رسول بولا۔

"آپ کہتے ہیں تو ہم یقین کر لیتے ہیں مگر یاد رکھیے گا، جب تک اسد الکبیر نہیں آتے، آپ یہاں سے جا نہیں سکتے۔" پھر اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کہا "چلو بھائیو! ہم کل آ کر پھر پتا کریں گے۔"

ان کے جانے کے بعد بھی غلام رسول سوچ میں ڈوبا رہا۔ وہ حالات کی نزاکت بھانپ چکا تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ یہ اجڈ دیہاتی لوگ جس بات پر اڑ جائیں، ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹتے۔ پروفیسر صاحب کو انہوں نے اپنا نجات دہندہ مان لیا ہے تو مان لیا اور حسب منشاء انہیں جواب نہ ملا یا پروفیسر صاحب نہیں لوٹے تو وہ میری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ ابھی تک تو وہ پُراسرار عورت ہی دماغ کی چولیں ہلا رہی تھی اب یہ بھی مسئلہ پیدا کرنے آ گئے ان کا علاج کیا کیا جائے۔

جب کچھ نہ سوجھا تو وہ برآمدے سے اترا اور لان سے ہوتا ہوا گیٹ سے باہر آیا۔ گلابی گلابی سی یہ دھوپ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے کافی آگے نکل آیا بستی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ آگے نشیبی وادی تھی۔ دور دور تک صنوبر و چنار کے درخت ہوئے تھے۔ جنگل کا سا منظر نظر آ رہا تھا۔ چلتے چلتے اس نے نگاہ ادھر اُدھر دوڑائی تو دیکھتا ہے کہ وہ مڑا تڑا راستہ جس پر سفر شروع ہوا تھا، کہیں پیچھے رہ گیا ہے اور وہ اسے کرناک کی سیدھ میں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ احساس بھی اسے اس کے کانشس نے تھا کہ آگے کوئی چیز حائل ہے۔ اب جو دیکھا تو سامنے ایک بلند ٹیلہ اونٹ کے کوہان

مانند اس کی راہ روکے کھڑا تھا۔

یہ پہاڑی ٹیلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اس کی خطرناک ترچھی ڈھلان پر جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان کہیں کہیں کبڑے درخت جیسے گردن نیہوڑائے کھڑے تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم راستہ بھٹک کر ادھر آ گیا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ٹیلہ عبور کر کے دوسری طرف پہنچا جائے چنانچہ وہ بائیں جانب سے ترچھی ڈھلان پر چڑھنے لگا۔ ذہن میں سوچ بچار کی تمام کھڑکیاں بند کر دیں کیونکہ ڈھلان کہیں اونچی، کہیں نیچی تھی۔ اگر بے دھیانی میں پاؤں غلط جگہ پڑ جاتا تو وہ نیچے لڑھک جاتا۔

ڈھلان پار کر کے وہ ٹیلے کے اس حاشیے پر پہنچ گیا جو ایک سفید لکیر کی شکل میں اوپر جاتا تھا۔ وہ اس لکیر پر گھومتا ہوا آگے بڑھا۔ زندگی میں آدمی کو مشکلات کے کئی پہاڑ عبور کرنے پڑتے ہیں جو اس ٹیلے سے کہیں زیادہ دشوار گزار ہوتے ہیں۔ وہ ان مشکلات کا عادی تھا لہٰذا ٹیلے کی بلندی تک پہنچنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی مگر بلندی پر پہنچ کر انکشاف ہوا یہ ٹیلہ نہیں بلکہ شمالی پربت کا سلسلہ ہے جو اونچی نیچی پہاڑیوں کے ذریعے اس بلند پہاڑ تک چلا گیا تھا۔ جس کی ترائی میں خوبصورت، پیالہ نما وادی پھیلی ہوئی تھی اور اب اسے حویلی تک پہنچنے کے لیے ان ہی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنا تھا۔ وہ پہاڑی اونچ نیچ اور ان مشکلوں کی پروا کیے بغیر چل پڑا جو کوہستانی راستوں میں عموماً پیش آتی ہیں پھر یہاں تو کوئی راستہ تھا ہی نہیں بس اسے پہاڑی نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنا تھا۔

پہاڑوں کے ٹیڑھے میڑھے حاشیے پر چلتا ہوا ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ اچانک جلترنگ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس ویرانے میں جلترنگ کون بجا رہا ہے۔ بانسری یا ڈفلی چرواہے بجا سکتے ہیں مگر جلترنگ؟ یہ ایک ایسا ساز ہے جو ہر کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ سدھا ہوا ہاتھ، کٹھن ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ حیران حیران سا آگے بڑھا۔ چھوٹی سی پہاڑی کا موڑ مڑتے ہی اسے دائیں جانب آٹھ دس فٹ کی بلندی سے پانی کی ایک دھار پتھروں سے ٹکراتی نظر آئی جو جلترنگ پیدا کرتی ہوئی کسی گھاٹی میں گر رہی تھی۔ یہ گھاٹی کہیں چھ سات فٹ، کہیں تین چار فٹ چوڑی اور کافی گہری تھی۔ پانی اس کے اندر ہی اندر بہتا ہوا نجانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔

وہ ایک تنگ جگہ سے گھاٹی عبور کر کے آگے بڑھا۔ اس پہاڑی سلسلے میں کہیں کہیں درخت بھی تھے مگر سرسبز جھاڑیوں سے ڈھکی چھپی ڈھلان ایک حسین منظر پیش کرتی تھی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھوڑی دور چلنے کے بعد ہموار جگہ نظر آئی جس پر سفر آسان ہو گیا لیکن یہاں ایک ایک گہری گھاٹی دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا جس کے کناروں پر جھاڑیاں اپنی لمبی لمبی بانہیں پھیلائے جھول رہی تھیں۔ گھاٹی میں جھانک کر دیکھا تو پانی کی لکیر ہلکی آواز میں بہہ رہی تھی۔ دراصل یہ وہی چشمہ تھا جو دو ڈھائی فرلانگ پیچھے ایسی ہی گھاٹی میں غائب ہو کر پہاڑیوں کے اندر ہی اندر بہتا ہوا یہاں آ نکلا تھا۔ یہ انکشاف بڑا عجیب تھا کہ ان پہاڑیوں کا سینہ کہیں کہیں سے کھوکھلا ہے جس کے اندر پانی کا چشمہ بہتا ہے۔ وہ یہ گھاٹی بھی عبور کر کے ایک ایسی گھاٹی پر چڑھنے لگا جو کچھوے کی کھوپڑی کی طرح گول تھی۔ اس چڑھائی میں پہلے ٹیلوں کے برعکس زیادہ اینچ پیچ نہیں تھے۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ گھاٹی کی کھوپڑی پر کھڑا تھا۔

بلندی پر پہنچ کر دیکھا تو چند فرلانگ کے فاصلے پر سامنے اس علاقے کا مشہور پہاڑی سلسلہ نظر آیا جس کی ترائی میں گھنا اور خوبصورت جنگل حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ بلتستان کا سب سے خوبصورت پہاڑی سلسلہ اور مظاہر قدرت کا سب سے عجیب و دلکش نمونہ تھا۔ اس کی برف پوش چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں جن کا سلسلہ تبت کے پہاڑوں سے جا ملتا۔ اس عظیم سلسلۂ کوہ کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ جب اس نے اس پہاڑی کے ترچھے نشیب کو دیکھا تو دنگ رہ گیا کیونکہ کم و بیش تین میل تک پھیلا ہوا نشیب ایک قدرتی اسٹیڈیم کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ دراصل شمالی پربت کی ڈھلان چھوٹے چھوٹے مگر طویل قطعوں میں بٹ گئی تھی جنہوں نے سیڑھیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ قدرتی سیڑھیاں کہیں دس پندرہ کہیں بیس پچیس فٹ چوڑی مگر ڈھلان کے ساتھ ساتھ قریباً تین میل تک لمبی اور قدرت کی صناعی کا حیرت انگیز شاہکار تھیں۔ قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نے انہیں بڑی خوبصورتی سے بنایا تھا۔ اس نے ایسا عجیب اور دلفریب نظارہ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی تھیں، وہاں سے ترائی شروع ہو گئی تھی جس میں مہاگنی، صنوبر، شاہ بلوط، سیابرچھ اور چھتنار کے درخت تھے۔ گھنے جھنڈ کی صورت میں دور تک پھیلے ہوئے۔

وہ اس جنگل پر نظریں دوڑا رہا تھا کہ بری طرح چونک گیا۔ کہیں یہ اس کی نظروں کا دھوکہ تو نہیں، یہ سوچ کر اس نے پھر دیکھا۔ نہیں یہ نظروں کا دھوکہ نہیں ہے، وہ بڑبڑایا۔ یقیناً کوئی عورت ہے جس نے سفید ساڑھی پہن رکھی ہے۔

آبادی سے دور اس گھنے جنگل میں یہ کون عورت ہے، یہی سوچ کر وہ پہاڑیوں کو

پھلانگتا، چھپتا ہوا آگے بڑھا پھر ڈھلان کو تیزی سے طے کرتا ہوا نیچے پہنچا۔ قدرت کے حسن کا شاہکار اب اسے بہلا نہیں پا رہا تھا وہ تمام مناظر کو نظر انداز کر کے ادھر بڑھتا جا رہا تھا جدھر وہ عورت نظر آئی تھی۔

وادی میں پہنچ کر اس نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ عورت چھپ سکتی تھی پھر وہ کہاں گئی۔ یہی سوچتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔

غلام رسول کی متلاشی نظریں ادھر سے اُدھر چکرا رہی تھیں مگر وہ عورت اسے نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ اب اس پر مایوسی غالب آتی جا رہی تھی کہ اس نے ایک عجیب سی آواز سنی جو ہوا کے دوش پر گھومتی ہوئی اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی مگر اس نے اس آواز کو جنگل کا شور یا ہوا کی لہر سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور آگے بڑھتا رہا۔ اچانک پھر کسی آواز نے اسے چونکا دیا۔ پہلے جسے وہ ہوا کی لہر سمجھا تھا، وہ دراصل ایک انسانی بلکہ نسوانی آواز تھی جو کہیں نیچے اور نیچے بہت نیچے سے آئی تھی اور مسلسل آ رہی تھی۔ ان ہی قدموں پر رک کر اس نے آواز کی سمت میں نظر دوڑائی تو یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ نیچے اور نیچے جہاں اس گھاٹی کا نشیب ختم ہوتا تھا، وہ عورت ایک چٹان پر کھڑی اسے ہی پکار رہی تھی اور ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ سمجھا بھی رہی تھی۔ پہلے تو یہی خیال آیا کہ وہ اسے اپنی موجودگی کی اطلاع دے رہی ہے اور اپنے پاس بلا رہی ہے مگر اس کے ہاتھ کے اشاروں اور چیخ پکار سے پتا چلا کہ وہ اسے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی ہے۔ وہ قریباً ڈھائی سو فٹ نیچے کھڑی تھی۔ ہوا مخالف تھی اور وہ اس کے الفاظ ٹھیک طرح سن نہیں پا رہا تھا، تاہم اس نے کسی خطرے کا احساس ضرور دلایا تھا اور وہ ان ہی قدموں پر کھڑا اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے بڑھنے سے منع کیا پھر چند الفاظ بھی اس تک پہنچے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ یہاں سے پیچھے ہٹ جاؤ اور گھاٹی کی بائیں ڈھلان سے نیچے اترو۔ جب اس کا مطلب سمجھ کر وہ واپس مڑا تو وہ عورت بھی اسی جانب بھاگی جدھر سے نیچے اترنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ غلام رسول گھاٹی پر سے گھومتا ہوا بائیں جانب کا نشیب اترنے لگا۔ وہ عورت اب دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر وہ اس کی آواز سن رہا تھا۔

"ادھر...... غلام رسول! ادھر، ادھر آؤ میری طرف!" اور وہ پتھر پھلانگتا ہوا ٹھوکریں کھاتا پھسلتا سنبھلتا ہوا آواز کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

جب آدھے سے زیادہ راستہ طے ہو گیا تو اس کا سر دکھائی دیا۔ وہ جھاڑیوں سے نکلتی پتھروں پر سے گزرتی اسی کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ نزدیک پہنچ کر وہ ہانپنے لگا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھا۔

''غلام رسول! جس طرف سے تم نیچے اتر رہے تھے، ادھر ایک بڑا کھڈ ہے، جس میں سانپوں کی بانبی ہے۔ وہ کھڈ اوپر سے دکھائی نہیں دیتا۔ جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ ذرا سا آگے بڑھتے تو سیدھے اس میں جا گرتے۔'' اس کی آواز میں عجیب سا لوچ تھا۔

''آؤ نیچے چلتے ہیں۔'' کہہ کر اس نے غلام رسول کا ہاتھ پکڑ لیا پھر آگے بڑھنے لگی۔ اس کی چال میں ہرنی کی سی تیزی تھی۔ وہ پتھروں کو پھلانگتی، جھاڑیوں کے درمیان میں سے گزرتی نیچے اترتی جا رہی تھی۔

غلام رسول ہپناٹزم کے زیر اثر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کا ذہن ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اب تک اس نے یہی دیکھا تھا کہ اس عورت کی ہر ادا، ہر بات میں پُراسراریت تھی۔ وہ کیا چاہتی تھی، یہ اب تک کھل کر سامنے نہیں آیا تھا۔

☆======☆======☆

علی نے سیدھے پاؤں کے جوتے پر گولی چلائی تھی۔ اسے چیخ سنائی دی تھی اور دھڑام سے گرنے کی آواز آئی تھی۔ علی اٹھ کر ادھر دوڑ پڑا۔ بس کے پیچھے اسے میجر ستونت کا فوجی ریوالور مل گیا اور ستونت پاؤں پکڑے زمین پر گرا ہوا تھا۔

علی نے اپنا اور اس کا ریوالور جیب میں رکھا۔ اسی وقت پروفیسر بھی بھاگتے ہوئے ادھر ہی آ گئے۔

پروفیسر اور علی نے میجر ستونت کا ایک ایک بازو پکڑا اور اسے گھسیٹتے ہوئے چلے۔ پاؤں پر بوجھ پڑا تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ راستے میں کھڑے ہوئے بس ڈرائیوروں، ٹھیلے والوں اور مزدوروں میں سے کسی نے بھی ان کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ سب میجر ستونت کی حالت دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ اس بات سے علی نے اندازہ لگا لیا کہ وہاں کے لوگ میجر ستونت سے ناخوش ہیں یا پھر ان لوگوں کے دل میں آزادی کی تمنا ہے۔ وہ بھارتی افسران سے نفرت کرتے ہیں۔

گاہک، مسافر، بچے اور عورتیں سہم کر پیچھے ہٹ گئیں۔ اچانک ایک پولیس والا بہادری دکھانے کے جوش میں پستول تانے سامنے آ گیا۔ علی نے بلا توقف، بغیر سوچے سمجھے اس کے پیٹ میں کھڑی لات ماری۔ وہ پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ علی کے لیے اتنا موقع کافی تھا، وہ جھپٹ کر آگے بڑھا۔ پولیس والے نے اسے آگے بڑھتے دیکھ کر

گولی چلا دی۔ اتفاق سے وہ گولی سیدھی جا کر میجر ستونت کے شانے میں دھنس گئی۔ وہ چیخ مار کر گر پڑا۔ پولیس والا پیٹ پر پڑنے والی لات سے ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ علی نے اس کا پستول چھین لیا اور پوری قوت سے اس کے جبڑے پر گھونسا جما دیا۔ وہ بلبلا کر زمین پر جھک گیا اور علی اور پروفیسر، ستونت سنگھ کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

دو منٹ گزرے تھے کہ فقیر محمد کی جیپ ہارن بجاتی ہوئی آ گئی۔ علی نے جھٹکے سے ستونت سنگھ کو اوپر اٹھایا اور جیپ میں پھینک دیا پھر خود بھی چڑھ آیا۔ پروفیسر بھی سوار ہو چکے تھے۔ جیپ چل پڑی۔

فقیر محمد نے بڑی مشکلوں سے بسوں اور ٹھیلوں کے درمیان سے جیپ باہر نکالی اور مرکزی شاہراہ پر لے آیا۔ علی نے نیم جاں ستونت سنگھ کے زخموں کا معائنہ کیا۔ اس کا پیر ایک طرح سے بیکار ہو کر رہ گیا تھا۔ البتہ شانے میں لگنے والی گولی ہڈی کے برابر سے گزر گئی تھی۔ زخم سے خون اب تک رس رہا تھا اور اس کی وردی کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ علی نے ستونت کے زخم پر انگوٹھے سے دباؤ ڈال کر پوچھا۔ ''اس علاقے میں تم لوگوں نے کتنے خفیہ عقوبت خانے بنا رکھے ہیں؟''

''ہم محب وطن سپاہی ہیں، ایسی کسی بات کا جواب نہیں دیتے۔'' ستونت سنگھ نے بے خوفی سے جواب دیا۔

''ہمارے ساتھ تعاون کرو، تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی جائے گی۔ اگر نہیں کرو گے تو سخت اذیت کے ساتھ مرو گے اور تمہارے گھر والوں اور دوستوں کو تمہاری بہادری اور قربانی کا کوئی علم نہیں ہو گا۔ انہیں تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔ ہم ان سے کہیں گے کہ تم نے خود کو ہمارے ہاتھ فروخت کر دیا تھا اور ایک شاندار نئی زندگی گزارنے کے لیے بمبئی چلے گئے ہو، وہ تمہیں غدار کہیں گے۔ ہمارے ساتھ تعاون کرنے کی صورت میں ہم تمہیں چھوڑ دیں گے اور تم لوگوں کو بتا سکو گے کہ جرأت اور بہادری سے ہمارے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوئے ہو۔ اپنے بیوی بچوں میں ہنسی خوشی رہو گے۔ سیدھے سیدھے ہمارے سوالوں کا جواب دو۔''

''اب وقت نکل گیا ہے۔'' ستونت نے پھولی ہوئی سانس سے کہا۔ ''تم لوگ اس خطے کو ہم سے چھین نہیں سکتے۔ یہ بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ ہم یہاں کے مالک ہیں، مالک رہیں گے۔ ایک ایک انچ دھرتی پر ہمارا قبضہ رہے گا۔''

''مجھے ریوالور دو، میں اسے سکون کی نیند سلانا چاہتا ہوں۔'' پروفیسر نے خلاف توقع

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے علی کے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں، یہ ہم سے تعاون کرے گا اور زندہ رہے گا۔''

پروفیسر نے اس کی بات نہ مانی اور کمر سے ریوالور نکال کر ستونت کی کھوپڑی سے لگا دیا۔ پھر دانت پیس کر بولے۔ ''پروا نہیں گولی کی آواز دور تک جائے گی۔ میں اس کا قصہ پاک کیے دیتا ہوں۔''

''بتاتا ہوں۔'' ستونت اچانک بول پڑا۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔ ''ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس علاقے سے مسلمانوں کا تناسب کم کرنا ہے۔ پوری وادی کشمیر میں اسی پلان کے تحت کام کیا جائے گا تاکہ کہیں سے بھی آزادی کی آواز نہ اٹھے۔''

''اچھا، یہ بتاؤ کرنل اروڑا کہاں ملے گا؟''

''وہ کیمپ میں نہیں رہتا۔ بیوی بچوں کے ساتھ ریسٹ ہاؤس پر قبضہ کیے بیٹھا ہے۔''

''یہ ریسٹ ہاؤس کہاں ہے؟ تم ہمیں وہاں لے چلو گے؟''

''ابھی؟'' ستونت نے پوچھا۔

''ہاں، ابھی!'' علی نے کہا۔

''ابھی تو میں زخمی ہوں۔'' ستونت نے جواب دیا۔

''اچھا پتا بتا دو۔''

ستونت نے پتا بتایا۔ علی نے نوٹ بک میں لکھ لیا پھر اس نے ستونت کے منہ آنکھوں اور کانوں کو ٹیپ چپکا کر بند کر دیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے گولی مار کر کہیں کسی جھاڑی میں پھینک دیں گے۔ پھر وہ لوگ اپنے پلان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مضافاتی علاقے کی طرف نکل گئے۔ ایک سنسان سڑک پر پہنچ کر علی نے ریوالور نکالا اور کئی گولیاں اس کے سینے میں مارنے کے بعد اسے جیپ سے نیچے پھینک دیا۔ اس کام سے فرصت پا کر وہ لوگ واپس ہو گئے۔

انہیں ستونت کے بتائے ہوئے پتے کی تلاش تھی مگر وہ ریسٹ ہاؤس مل کر نہیں دے رہا تھا۔ بالآخر انہیں یقین آ گیا کہ ستونت نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ پروفیسر نے مشورہ دیا کہ علی بھٹکے ہوئے سیاح کا رول ادا کرے اور ٹیکسی میں بیٹھ جائے۔ ٹیکسی والا خود ہی اسے ریسٹ ہاؤس میں پہنچا دے گا۔

علی جیپ سے اتر گیا اور چند قدم چلا تھا کہ ایک ٹیکسی آ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے

اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

علی نے اندر بیٹھ کر ریسٹ ہاؤس چلنے کے لیے کہا۔ ٹیکسی چل پڑی۔ کچھ دور جانے کے بعد جھٹکے سے رک گئی۔ جیسے اس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ علی نے چونک کر دیکھا۔

عین اسی وقت ٹیکسی کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی پھرتی سے اندر آ کر علی کے برابر میں بیٹھ گیا۔ علی نے چابک دستی سے ریوالور نکال کر اس شخص کی طرف رخ کیا تو بری طرح چونک گیا۔ یہ وہی شخص تھا جس سے کچھ دیر پہلے بس اسٹینڈ پر ہاتھا پائی ہوئی تھی۔ یہ وہی یک چشم فقیر تھا جس کے منہ میں اس نے ریوالور گھسایا تھا مگر وہ بچ نکلا تھا۔ وہ علی کی طرف دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔ ''تمہیں کرنل اروڑا سے کیا کام ہے؟''

علی نے جواب نہیں دیا اور ریوالور کی نال اس شخص کے سینے پر رکھ دی۔

''مجھے احمد کہتے ہیں۔ کبھی میں ایم ایس سی کا طالب علم تھا۔'' بھکاری نے اپنا تعارف کرایا۔ ''ہم بھی ستونت اور اروڑا کے دشمن ہیں۔'' پھر اس نے کہا۔ ''اتفاق کی بات ہے کہ آج ہم بھی ستونت کا شکار کرنے آئے ہیں۔ ان لوگوں کا ظلم حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ پرسوں انہوں نے ہمارے ایک اہم ساتھی کو اذیت دے دے کر شہید کیا ہے اسی کا بدلہ لینا تھا۔''

''تم نے تو بس اسٹینڈ پر ہمیں مارنے کی کوشش کی تھی؟''

''بس غلط فہمی ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ تم نے پورو بستی میں ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے تو ہم نے سوچا کہ چلو مل کر شکار کھیلتے ہیں کیونکہ تم باہر سے آئے ہو تمہیں میری رہنمائی کی بہت زیادہ ضرورت پڑے گی۔ تم صحیح طور پر ان سے واقف بھی نہیں ہو گے جبکہ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ تمہیں شاید اندازہ بھی نہ ہو کہ یہ لوگ کتنے ظالم ہیں۔ میرا چہرہ دیکھ رہے ہو ناں، یہ ان ہی لوگوں کا کارنامہ ہے کیونکہ ہم اپنے ملک کشمیر میں غیر ملکیوں کی دراندازی کے خلاف ہیں۔ کشمیر ہمارا ہے، بھارتیوں کا نہیں۔'' پھر اس نے ہاتھ سے ریوالور کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال اسے جیب میں رکھ لو۔''

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟''

''تم ایسی کوئی حماقت نہیں کرو گے جو خود تمہیں پھنسا دے۔ تم اس وقت پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے کھڑے ہو۔ میری موت کے بعد تم بھی بچ نہ سکو گے۔''

''ہاں، تم نے ٹھیک کہا۔'' علی نے گہری سانس لے کر کہا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسی وقت فقیر محمد کی جیپ ٹیکسی کے قریب آ گئی اور پروفیسر نے کہا۔ ''فقیر محمد نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ ایک مجاہد ہے۔ اس سے کہو کہ جیپ میں آ جائے۔''

احمد فوراً مان گیا۔ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر نیچے قدم رکھا دوسری طرف سے علی بھی اترا۔ اس نے اتنی دیر میں دیکھ لیا تھا کہ وہاں دو موٹر سائیکل سوار مستعد کھڑے ہیں۔

''تم لوگ خاصے منظم ہو۔'' علی نے بائیک کی طرف دیکھ کر کہا۔

''منظم تو نہیں، بس ایک چھوٹا سا گروپ بنا رکھا ہے۔'' کہہ کر جیپ میں سوار ہو گیا۔ اس کے پیچھے ہی علی تھا، وہ بھی سوار ہو گیا۔ احمد نے فقیر محمد کا جائزہ لے کر کہا۔ ''تم شاید پوروا کے رہنے والے ہو؟''

''جی ہاں!'' فقیر محمد نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''اب آپ دونوں بھی اپنا تعارف کرا دیں۔'' احمد بولا۔

''میرا نام علی ہے اور میں بارہ مولا کے علاقے میں پیدا ہوا وہیں پلا بڑھا اور آج کل کارگل کے علاقے میں سبق سکھا رہا ہوں۔ یہ ہمارے مہمان پاکستان کے پروفیسر عثمان ہیں۔ مولانا باقر کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ انہوں نے ہی انہیں بلایا تھا مگر عین وقت پر غداروں کی وجہ سے پلان بدل دیا گیا۔ دراصل ہم لوا ٹریپ ہو گئے تھے۔ ہمارے درمیان میرا ہم نام ایک غدار بھی تھا۔ اسی نے پلان چوپٹ کیا پھر ایک انٹیلی جنس افسر سامنے آیا۔ اپنی چالاکی سے اس نے مولانا باقر کو ٹریپ کر لیا تھا۔ اسی کے کہنے پر مولانا نے انہیں واپس جانے کا مشورہ دیا۔ وہ حرامزادہ راستے میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ دراصل وہ ان کا شکار کرنا چاہتا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم نے انہیں بچایا۔ ادھر سے کنٹرول لائن پار کرنا مشکل تھا اس لیے ہم ادھر چلے آئے کہ یہاں سے انہیں پار کرا دوں گا۔''

''تو میں خواہ مخواہ خوش فہمی میں آ گیا تھا کہ آپ لوگ ہماری مدد کریں گے۔'' احمد کے لہجے میں دکھ تھا۔

''نہیں میاں! میں ان تینوں کا شکار کر کے ہی کنٹرول لائن پار کروں گا۔'' پروفیسر عثمان نے کہا۔

''تو پھر وقت برباد کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ مجھے کرنل اور بریگیڈیئر کے ٹھکانوں کا پتا ہے۔ آپ میری ٹیکسی کے پیچھے پیچھے آئیے۔''

علی اور پروفیسر نے آنکھوں آنکھوں میں مشورہ کیا اور علی اسلحہ کا تھیلا لے کر احمد کے

ساتھ جیپ سے اتر گیا پھر وہ اسی ٹیکسی میں آ گئے اور ایک بار پھر سفر شروع ہو گیا۔ ٹیکسی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی ملٹری کیمپ تک پہنچی۔

کیمپ بہت بڑا نہ تھا۔ درمیان میں ایک عمارت تھی بالکل گودام جیسی، اس کے گرد خاردار تار لگا دیے گئے تھے۔ احمد نے ٹیکسی عمارت سے کچھ فاصلے پر رکوائی تھی۔ جیپ بھی رک گئی تھی۔ علی اور احمد ٹیکسی سے اتر کر عقبی حصے کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ کرنل اروڑا کے دفتر کی کھڑکی سے روشنی نظر آ رہی ہے۔ پروفیسر اور فقیر محمد نے ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ مل کر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ان تینوں نے ٹیکسی اور جیپ کی آڑ لے رکھی تھی۔

احمد اور علی عقبی حصے میں پہنچے تو وہاں ایک سنتری رائفل لے کر کھڑا تھا۔ کچھ فاصلے پر دوسرا سنتری رائفل کا بٹ زمین پر ٹکائے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ علی دبے پاؤں پہلے سنتری کی پشت پر پہنچا اور اس کے بال پکڑ کر اسے اپنی طرف گھمایا اور دوسرے ہی لمحے احمد نے سائیلنسر لگے ہوئے ریوالور کی گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ وہ دھڑام سے گرا تو دوسرے سنتری نے سگریٹ پھینک کر رائفل سیدھی کر لی لیکن احمد کی گولی نے اس کا بھی کام تمام کر دیا۔ علی نے گودام کا عقبی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ احمد بھی اس کے پیچھے تھا۔ سامنے فوجی جوان کریٹوں میں آتشیں اسلحہ بھر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتے رہے۔ پھر احمد نے درمیان میں بنے لوہے کے زینے کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں دبے پاؤں ادھر ہی بڑھتے چلے گئے۔ اوپر گودام کا آفس تھا۔ کرنل اروڑا میز پر نقشہ پھیلائے اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ اس پر باز کی طرح جھپٹے اور پھرتی سے اس کا منہ دبا دیا اور زور آزمائی ہونے لگی۔ علی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کرنل اندر سے بزدل ہے۔ زیادہ دیر ٹک نہیں سکتا۔ اس نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ''کرنل! اب تک تم دوسروں کو اذیت دے دے کر ہلاک کرتے تھے، اب تمہاری باری ہے۔ بولو، زندہ رہنا چاہتے ہو؟''

کرنل نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تو سنو! اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو میگا فون اٹھا کر اپنے آدمیوں سے کہو کہ مجاہدین نے کیمپ کو گھیر رکھا ہے۔ سب اپنی اپنی جان بچانے کی کوشش کریں۔ ہری اپ! جلدی کرو۔''

کرنل کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''مجھے...... مجھے میگا...... فون دو۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

احمد نے دیوار پر لٹکے میگا فون کو اتار کر اسے دے دیا جسے اس نے منہ کے قریب کر کہا۔ ''الرٹ جوانو! الرٹ! چاروں طرف سے کشمیری مجاہدین نے کیمپ کو گھیر لیا ہے۔ الرٹ! الرٹ! باہر پوزیشن لو۔''

اس کی آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ باہر بھگدڑ مچ گئی۔ سب لوگ کام چھوڑ کر دروازے کی طرف بھاگے اور دھکم پیل کرتے ہوئے باہر نکلنے لگے۔ حیرت کی بات تھی کہ ایک کے بھی ہاتھ میں اسلحہ نہیں تھا، سب کا رخ گیٹ کے پاس بنی کوٹھڑی کی طرف تھا۔

شاید وہی اسلحہ خانہ تھا۔ تبھی تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں پروفیسر، فقیر محمد اور ٹیکسی ڈرائیور باہر نکلنے والوں کو اپنی اسپیشل مشین گنز سے بھون رہے تھے۔ بھارت کی ویرینا کو بھیڑ بکریوں کی طرح مرتے دیکھ کر کرنل اروڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

☆======☆======☆

وہ پُراسرار سندری زونو جھاڑیوں کو ہٹاتی، پتھروں کو پھلانگتی غلام رسول کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ترائی کے حاشیے پر صنوبر کے درختوں کے چھدرے جھنڈ تھے جن سے گزر کر وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ آگے ایک چشمہ تھا جو شمالی پربت کی ڈھلان سے اتر کر جنگل میں ناگن کی طرح بل کھاتا مغرب کی طرف بہہ رہا تھا۔ اس کے دونوں کناروں کو گھنی جھاڑیوں نے ڈھانپ لیا تھا۔ اس گھنے اور خوبصورت جنگل میں چشمہ دیکھ کر غلام رسول پر وجد سا طاری ہونے لگا۔

زونو اسے تقریباً کھینچتی ہوئی ایک بڑے سے پیڑ کے قریب لائی پھر بولی۔ ''غلام رسول! یہ وہی جگہ ہے جہاں آ کر پروفیسر بیٹھتے ہیں۔ انہیں یہ پیڑ بہت پسند ہے۔ تم بھی کچھ دیر یہاں بیٹھ جاؤ۔''

غلام رسول نے اپنے تھکے ہوئے جسم کو پیڑ کے نیچے چبوترا نما جگہ پر ڈال دیا۔

یہ ماحول کا اثر تھا یا کوئی اور بات کہ غلام رسول پر نیند غالب آنے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی جا رہی تھیں جب کہ وہ حسینہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اس کے سامنے کسی سنگی مجسمہ کے مانند ایستادہ تھی۔ اس کی نگاہیں غلام رسول کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں اور غلام رسول کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بند آنکھوں سے جنگل کے تمام مناظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے متحرک مصوری تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چل رہا ہو، اکیلا، بلا مقصد، تبھی اسے کسی نے پکارا۔ وہ ٹھٹک گیا پھر اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک نوجوان

لڑکی تیز تیز قدموں سے چلی آ رہی تھی۔ غلام رسول کو ایسا لگا جیسے وہ اس کو پہچانتا ہو۔ شاید اسی لیے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر ابھر آئی تھی۔ وہ پوچھتا ہے۔ ''کیا بات ہے؟ کیوں راستہ کاٹ رہی ہو؟''

''چلو، تمہیں ماں نے بلایا ہے۔''

''کس نے؟'' غلام رسول کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ماں نے بلایا ہے۔ اسے خبر ہو گئی ہے کہ تم ناراض ہو۔''

''میں ناراض نہیں تو کیا خوش ہو جاؤں۔ یہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔'' غلام رسول نے کہا۔

''اچھا، اچھا میں ماں کو سمجھا دوں گی۔ اب وہ ایسی کوئی بات نہیں کرے گی۔'' لڑکی نے کہا اور اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے کر چل پڑی۔ یہ علاقہ اسے جانا پہچانا لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس علاقے کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہاں اس نے ایک عرصہ گزارا ہے۔ یہ علاقہ بہت حد تک اس بستی ''نگار'' سے ملتا جلتا تھا، جس میں ان دنوں غلام رسول رہ رہا تھا۔ جہاں پروفیسر عثمان نے لیبارٹری بنا رکھی تھی۔ اسی گاؤں کی طرح یہ گاؤں بھی برف پوش پہاڑوں اور صنوبر کے جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ نگار کی آبادی پھیلی ہوئی تھی، مکانوں کی تعداد بھی زیادہ تھی مگر اس گاؤں کی آبادی مٹھی بھر تھی۔ پختہ مکان بھی صرف ایک تھا۔ گاؤں کے آخری سرے پر بنی حویلی ہی واحد پختہ عمارت تھی۔ عمارت پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گیا۔ یہ تو وہی عمارت ہے جس میں پروفیسر نے لیبارٹری بنائی ہے۔ ''کیا میں نگار گاؤں کے ماضی میں پہنچ گیا ہوں؟'' غلام رسول نے خود سے سوال کیا۔

وہ یہی کچھ سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ لڑکی نے کہا۔ ''بھائی! اماں کو کوئی سخت جواب نہ دینا۔ وہ بیمار ہیں ناں! حکیم صاحب نے خاص طور سے تاکید کی ہے کہ انہیں ہول سے بچایا جائے۔ ایسی کوئی بات نہ کی جائے جس سے ان کا دل ہولنے لگے اور خدانخواستہ ان کا دل بیٹھ جائے۔''

''اچھا اچھا میری عقلمندوں کی سرخیل بہن! خاموش رہ اور یہ سوچ کہ اماں اب کون سا پینترا بدلیں گی۔'' غلام رسول جواباً بولا۔

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے ایک بڑے سے جھونپڑے کے قریب جا پہنچے اور اس کے بھڑے ہوئے کواڑوں کو دھکا دے کر اندر داخل

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو گئے۔

''آ گئے۔'' ایک بارعب آواز سنائی دی۔

''جی اماں!'' لڑکی نے فوراً جواب دیا۔

''میں نے تجھ سے نہیں، اس بے وقوف سے پوچھا ہے۔'' ماں نے جھڑکا۔ ''ہاں! بول کیوں اس طرح سے بغیر کچھ کھائے پیے نکل گیا تھا۔ میں کوئی تیری دشمن ہوں؟ تیرے بھلے کے لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔''

''مگر اماں! آپ کا یہ فیصلہ صحیح نہیں ہے۔ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔'' غلام رسول نے منمنا کر جواب دیا۔

''تو پھر کیا بڑھاپے میں شادی کرے گا؟ جانتا ہے تجھے کتنا بڑا منصب ملنے والا ہے؟ تو نگر کے راجا کا اکلوتا بیٹا ہے۔ بھلے ہی میں تیری سگی ماں نہیں ہوں مگر تیری اناؤ ہوں۔ تجھے دودھ پلایا ہے اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ باپ کا تخت سنبھالنے کے بعد تُو ایک ساتھ دو علاقوں پر راج کرے۔''

''مگر اماں! تاشی نے مجھے اپنا نائب سپاہ سالار تو بنا ہی دیا ہے۔''

''یہ ابتدا ہے۔ وہ تجھ سے خوش ہے۔ تجھے اپنے قریب لانا چاہتا ہے اسی لیے تجھے یہ اعزازی منصب دیا ہے۔ اب تجھ پہ فرض ہے کہ خود کو سپاہ سالاری کا اہل ثابت کرے اور کوئی ایسا بہادری کا کام کر، کوئی کارنامہ انجام دے کہ تاشی تجھے سپاہ سالار بنا دے۔'' وہ بولتے بولتے ہانپنے لگی تھی۔ بڑھاپے کا اثر جو تھا اسی لیے اس نے رک کر گہری سانس لی تھی پھر بولی۔ ''اس کا سب سے آسان راستہ یہ ہے کہ تُو زونو کو سیڑھی بنا۔ تُو اس کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کر۔ اگر اس نے تجھے قبول کر لیا تو سمجھ لے کہ بیڑا پار یہاں اور وہاں دونوں جگہ کی حکومت ملے گی۔ ''غور'' کے بادشاہ کے بعد اتنا بڑا بادشاہ صرف تُو بنے گا۔'' ماں نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''تُو خود سوچ اماں! جو لڑکی میرے قریب نہیں پھٹکتی، وہ مجھے اپنے دل میں کیسے بٹھا لے گی؟ کوئی اور بات کیوں نہیں سوچتی؟ کسی اور لڑکی کے بارے میں بتاؤ۔''

''نہیں، تُو ہر حال میں اسی کے قریب رہے گا۔ وہی تیری منزل ہے۔ کبھی عقل سے بھی کام لیا کر۔ وہاں نگر میں تیرے سوتیلے بھائی تیری جان کے دشمن ہیں اسی لیے تو تیرا بابا تجھے یہاں چھوڑ گیا ہے کہ میں تیری پرورش کروں، جہانبانی کے آداب سکھاؤں۔ تجھے فنِ حرب میں طاق کروا کر اس قابل بناؤں کہ تُو صحیح معنوں میں ولی عہد ثابت ہو سکے۔''

ماں نے اسے سمجھانے کی سعی کی۔

''جب تُو ضد پر اتر آئی ہے تو میں بھی کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔''

''ہاں، یہ ہوئی ناں شہزادوں والی بات! تُو خود سوچ، شہزادے بھی کبھی ناکامی کا اعتراف کرتے ہیں؟ ان کی تو سرشت میں لوگوں کو جھکانا شامل ہوتا ہے۔ تُو بھی یہی کر، زونو لڑکی ہے اور لڑکی کو ہر حال میں جھکنا پڑتا ہے۔''

''بھائی! اگر تم کہو تو میں تمہاری ملاقات زونو سے کرا دوں؟'' لڑکی نے پہلی بار دخل دیا۔

''میں کیا اجنبی ہوں۔ بچپن سے اسے دیکھتا آیا ہوں۔ ہزاروں بار بات کی ہے۔''

''لیکن اس تین سال میں تم اس سے کہاں ملے ہو، گلگت میں گزارے وقت نے اس میں بہت تبدیلی کر دی ہے۔ اب تو وہ باتیں بھی ایسے دھیرے دھیرے کرتی ہے کہ جیسے سرگوشی کر رہی ہو مگر کیا پیاری پیاری باتیں کرتی ہے۔''

''اچھا، اچھا، زیادہ تعریفیں مت کر، ایسا کر کہ اپنے بھائی کی ملاقات اس سے کرا دے بس۔'' ماں نے کہا۔

''آؤ بھائی! میں اس سے ملاقات کراتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس وقت وہ کہاں ہوگی۔'' کہہ کر لڑکی اسے کھینچتی ہوئی لے کر چل پڑی۔

جنگل کا وہ حصہ خوبصورتی کا مرقع تھا۔ پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں اور ان کے درمیان ایک بڑے سے پیڑ میں لگے جھولے پہ پینگ لیتی لڑکیاں! وہ پتھر کا بت بن گیا تھا۔ اس کی نظریں جیسے ٹھہر گئی تھیں۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس تین سال کے عرصے میں وہ اتنی خوبصورت ہو جائے گی۔ جوانی اس پر ٹوٹ کے برسی تھی۔ پہلی ہی نظر میں یوں لگا جیسے وہ جنت کی کوئی حور ہو جو آسمانوں کا سینہ چیر کر زبردستی دھرتی پر آ گئی ہو، واقعی وہ بہت بدل گئی تھی۔ مرکزِ جمال، پیکرِ شباب بن گئی تھی۔ اس کے گلابی گلابی نشیلے نین، رسیلے ہونٹ، ہنس کی طرح لمبی گردن، شاخِ بید جیسی لچکیلی کمر تمام رنگ اس میں یکجا ہو کر جادو جگا رہے تھے۔ اس کا ہر رنگ نیارا، ہر شے پیاری بن چکی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک سندرتا کی مورت بن چکی تھی۔ کسی شاعر کی حسین غزل بن چکی تھی۔

وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا کہ کسی نے کہا۔ ''ارے! یہ کون مرد یہاں آ گیا؟''

اس آواز پر اس کی محویت ٹوٹ گئی اور وہ الٹے قدموں جلدی جلدی چلنے لگا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ہر حال میں زونو کو اپنائے گا اور اسی خیال نے اس کی چال میں تیزی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھر دی تھی۔ وہ جلد سے جلد ماں کے پاس پہنچ کر کہنا چاہتا تھا کہ اس کا خیال غلط تھا۔ وہ شادی کرے گا، ضرور کرے گا اور صرف زونو سے کرے گا۔

تیز تیز چلنے سے اس کا جسم پسینے سے بھیگنے لگا تھا مگر اسے فکر نہ تھی۔ تبھی اس کی یہ تیزی ٹھوکر کا سبب بنی اور وہ گر پڑا۔

گرنے کے اس عمل نے اسے چونکا دیا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس پیڑ کے نیچے بیٹھے بیٹھے وہ سو گیا تھا اور اس دوران میں اس نے خواب دیکھ لیا مگر وہ لڑکی کہاں گئی جو اسے لے کر آئی تھی؟ لڑکی کا خیال آتے ہی غلام رسول نے ادھر اُدھر نگاہیں دوڑانا شروع کیں لیکن وہ نظر نہ آئی تو وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ''کہیں یہ وہی پیڑ تو نہیں جس کے نیچے بیٹھ کر پروفیسر عثمان قسط وار خواب دیکھتا ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔ ''یہ سب کیا ہے؟ زونو پہلے پروفیسر کے خواب میں آ رہی تھی۔ اس سے محبت جتا رہی تھی اور اب میرے خواب میں آنے لگی۔ وہ بھی اس حالت میں کہ میں اس کا چاہنے والا ہوں۔ یعنی کہ میں اور پروفیسر ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ پھر یہ لڑکی بھی پتا نہیں، کہاں غائب ہو گئی؟ کہیں سب اسی کی چال تو نہیں ہے کیونکہ ہر بار وہ نہایت پُراسرار انداز میں سامنے آتی ہے اور یہی دعویٰ کرتی ہے کہ وہ ہی زونو ہے۔ آخر اس قسم کے خواب کیوں نظر آ رہے ہیں؟ کیوں آخر کیوں؟'' وہ خود سے سوال کرنے لگا۔

☆======☆======☆

وہ سب اروڑا اور ستونت سے نمٹ چکے تھے۔ اب باری تھی بریگیڈیئر کی۔ وہی ایک ایسا فرد بچا تھا جس کی رہنمائی میں یہاں کے چھوٹے افسران مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے۔ اب اس کا نمبر آنا ضروری ہے۔ یہ سوچ کر پروفیسر نے آواز دی اور وہ سب باہر نکل آئے۔ فقیر محمد اور ٹیکسی ڈرائیور باہر تھے۔ پروفیسر نے اسے بھی اشارے سے جیپ میں بلا لیا اور یہ چھوٹا سا قافلہ دوبارہ چل پڑا۔ اب بریگیڈیئر رام پال سے نمٹنا تھا۔ فقیر محمد کی اطلاع کے مطابق رام پال کیمپ میں نہیں رہتا، وہ اپنی داشتہ کے ساتھ ایک بڑے سے بنگلے میں رہتا ہے۔ سب سے زیادہ لوٹ مار اسی نے مچا رکھی ہے۔ اگر اسے قابو کر لیا جاتا ہے تو پورے علاقے میں امن ہو جائے گا۔ وہ کہاں رہتا تھا، اس کی خبر فقیر محمد کو بھی تھی اور اس نئے گروپ لیڈر کو بھی، انہی دونوں کی رہنمائی میں پروفیسر اور علی چھاپہ مارنے چلے تھے۔

صرف پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر وہ سب اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں بریگیڈیئر

رام پال کا عالی شان بنگلا تھا۔ وہ بنگلا کیا، ایک قلعہ تھا۔ دیواروں پر خاردار تار لگے ہوئے تھے اور گیٹ پر ایک سنتری رائفل سنبھالے اٹینشن کھڑا تھا۔ اندر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی متواتر آ رہی تھیں۔ آوازیں بتا رہی تھیں کہ کتے خطرناک نسل کے ہیں۔ علی کے کہنے پر فقیر محمد جیپ آگے لیتا چلا گیا۔ بنگلے سے کچھ دور آگے ایک شراب خانہ نظر آیا۔ یہ بھی حیرت کی بات تھی۔ مجاہدین کی سرگرمیاں تیز ہوتے ہی کشمیر کے شراب خانے تقریباً بند ہو گئے تھے۔ اکا دکا کھلے ہوئے تھے مگر ان میں بھی چوری چھپے خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس طرح کھلے عام کہیں بھی کاروبار نہیں ہو رہا تھا۔

''یہاں کا تو نظام ہی الٹ کر رہ گیا ہے۔ یقیناً یہ دکان بھی انہی تینوں کے اشارے پر چل رہی ہوگی۔'' علی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''ہاں، یہی بات ہے۔'' فقیر محمد نے تائید کی۔

''تو ٹھیک ہے، اسی کی بندوق سے نشانہ بناؤں گا۔'' کہہ کر علی نے جیپ رکوائی اور نیچے اتر کر بولا۔ ''میں سنتری کو قابو میں کرتا ہوں۔''

پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس شراب خانے میں داخل ہو گیا۔ اندر دیسی شراب کی میٹھی میٹھی سی مگر ناگوار بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سیدھا کاؤنٹر پر پہنچا اور ایک چھوٹی بوتل خریدی پھر واپسی کے لیے چل پڑا۔ باہر نکلتے نکلتے اس نے آدھی شراب اپنے کپڑوں پر گرالی تھی۔ وہ عادی شرابی کی طرح لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کا رخ بنگلے کی طرف تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا پکڑ رکھا تھا۔

لہراتا سنبھلتا ہوا وہ اس عمارت تک پہنچا پھر اس بڑے سے گیٹ کی طرف مڑ گیا۔ وہ گیٹ بند تھا اور باہر ایک سنتری کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر مسکرانے لگا۔ تبھی علی کی نظر ذیلی گیٹ میں لگی سلاخوں کے اندر تک پہنچی اور وہ چونک اٹھا۔ سلاخوں کے پیچھے بھی ایک سنتری بیٹھا ہوا تھا۔ بریگیڈیئر رام پال نے حفاظت کا بھرپور انتظام کر رکھا تھا۔ عیاش فطرت لوگ بزدل ہوتے ہیں اور بزدل اپنی حفاظت پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے بریگیڈیئر نے بھی اپنی حفاظت کا خصوصی انتظام کر رکھا تھا۔

علی ہاتھ میں پکڑے کاغذات کے ٹکڑے کو لہراتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کی لڑکھڑاہٹ، دائیں بائیں جھکنا، سنبھلنا دیکھ دیکھ کر دونوں نوعمر سنتری مسکرا رہے تھے۔ اتنی دیر میں وہ ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے کپڑوں سے اٹھتی ناگوار بو کی وجہ سے باہر والے سنتری نے ناک بند کر لی اور چیخ کر بولا۔ ''بھاگو، ورنہ گولی مار دوں گا۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"گولی...... گولی...... مارو گے...... مگر کیوں؟ مجھے...... مجھے...... صاحب نے یہ...... یہ دیکھو...... دیکھو...... یہی پتا ہے ناں!" علی نے لڑکھڑاتی آواز میں کہہ کر اندر والے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس سنتری نے ہاتھ بڑھا کر وہ کاغذ تھام لیا۔ علی لڑکھڑاتے ہوئے باہر والے سنتری سے ٹکرا گیا۔ اس سنتری نے غصے سے علی کو دھکا دیا۔

"تم...... تم نے مجھے...... مارا...... آں!...... مارا...... میں نہیں چھوڑوں گا۔" کہہ کر علی نے گھٹنا چلا دیا۔ گھٹنے کا وار نپا تلا تھا۔ سنتری پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"ارر...... اور مارو گے...... کہاں ہو......؟ ارے کہاں گئے؟" علی نے خواہ مخواہ میں گھونسا چلاتے ہوئے کہا مگر اس کی نظریں اندر والے کا جائزہ لینا نہیں بھولی تھیں۔ اندر والا سنتری گھبرا کر چھوٹے گیٹ کو کھول کر باہر نکل آیا۔ جیسے ہی اس نے باہر قدم رکھا علی نے نپا تلا پنچ رسید کیا تو اس کی ناک نے خون اگلنا شروع کر دیا۔ علی نے ایک نظر پیٹ پکڑے سنتری پر ڈالی اور پھرتی سے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہتھوڑا سا بنایا پھر اس ہتھوڑا نما مکے کو پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ اس دوسری افتاد نے اسے زمین پر گرا دیا۔ چت گرا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا کہ علی نے پلٹ کر اسی طرح کا وار دوسرے سنتری پر کیا۔ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو وہ اپنی بیلٹ سے ریوالور نکال چکا ہوتا۔ ریوالور کے دستے پر ہاتھ رکھے وہ ڈکراتا ہوا زمین پر لوٹنے لگا۔ اتنی دیر میں باقی افراد بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے پھرتی سے ان دونوں کے اسلحے قبضے میں لیے اور انہیں کھینچ کر جیپ میں لے آئے۔

جیپ میں پہنچ کر پروفیسر اور فقیر محمد نے مستعدی کا خاص مظاہرہ کیا اور ان دونوں کے ہاتھ، پیروں اور منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ سرجری میں استعمال ہونے والا ٹیپ ان دونوں کے لیے ہتھکڑی بیڑی بن چکا تھا۔

"اب اندر چلو!" علی نے کہا تو وہ سب نیچے اتر آئے۔

اتنی دیر میں پیچھے والی گاڑی بھی پہنچ گئی تھی۔ اس گاڑی میں سوار افراد بھی کود کر اترے اور دوڑتے ہوئے ذیلی گیٹ سے بنگلے کے اندر گھس گئے۔ اندر پہنچ کر پروفیسر اور فقیر محمد نے پوزیشن سنبھال لی۔ دوسرے افراد نے بھی پوزیشنیں لے لی تھیں جب کہ علی کی نظریں کتوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہو گیا تھا کہ کتوں کو باندھ کر ایک سلاخوں والے کمرے میں رکھا گیا ہے۔ سلاخیں کافی موٹی تھیں اور وہ کمرہ لان کے آخری سرے پر تھا۔

کتوں کی طرف سے وہ مطمئن ہو کر وہ مشین پسٹل سنبھالے برآمدے پر چڑھ

جبھی اس کی نظر سامنے والے کمرے پر پڑی اور وہ پھرتی سے ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ اس کمرے میں ایک عورت بالکل مینکا کے انداز میں کھڑی تھی۔ گوری رنگت کی پتلی دبلی سی عورت نے لال بارڈر کی سفید ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ ساڑھی گھٹنوں سے ذرا نیچے تھی جس کی وجہ سے اس کی ننگی پنڈلیاں باہر سے بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس نے شاید بلاؤز بھی نہیں پہنا تھا کیونکہ ساڑھی کا آنچل یہی بتا رہا تھا یوں بھی ہندو مائیتھولوجی کی وہ مشہور کردار بھی کب بلاؤز پہنتی تھی۔ علی نے تمام مندروں میں اس کی بغیر بلاؤز کی مورتی رکھی دیکھی تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ سورگ کی اپسرا تھی اور رشی کی تپسیا توڑنے کے لیے زمین پر آئی تھی۔ اسی تپسیا توڑنے والی مینکا کے انداز میں وہ عورت کھڑی تھی۔ اس نے بالوں کو ترچھے جوڑے کی شکل دے رکھی تھی اور اس جوڑے میں پھولوں کی لڑیاں سجی ہوئی تھیں۔ گلے اور بازو پر بھی سفید موتیا کے گجرے بندھے ہوئے تھے مگر گلے میں سرخ پھولوں کا ہار تھا۔ وہ ہو بہو مینکا لگ رہی تھی۔ اس نے پوز بنانے کے لیے گھڑا بھی اٹھا رکھا تھا کہ علی نے دوسرے کونے میں کھڑے آدمی کو دیکھ لیا۔ اس کے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔ اب علی کی سمجھ میں آیا تھا کہ وہ عورت کیوں ایسے عجوبہ لباس میں کھڑی ہے۔ یقیناً وہ تصویریں بنوا رہی تھی۔

وہ لوگ اپنے کام میں اس طرح منہمک تھے کہ انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ باہر کی دنیا بدل چکی ہے۔ علی نے ان کی بے خبری سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھرپور انداز میں چھلانگ لگائی اور کسی جن کی طرح ان کے سامنے کودا۔ یکا یک اس طرح سے کسی کو اپنے سامنے پانے والے کا چونکنا ضروری ہے۔ وہ بھی بری طرح چونکے تھے۔ اسی گھبراہٹ میں اس عورت کے ہاتھ سے گھڑا پھسل گیا تھا۔ علی نے اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہ دیا اور پوری قوت سے اس کے گال پر طمانچہ مارا۔ وہ الٹ کر دور جا گری۔ علی نے فوراً رُخ بدلا اور چھلاوے کی طرح اچھلا۔ وہ ہوا میں تیرتا ہوا اس کیمرے والے کے سر پر پہنچا تھا۔ اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو پانسہ پلٹ چکا ہوتا۔ کیمرے والا شخص داہنا گھٹنا زمین پر ٹیکے ہولسٹر سے پستول نکال رہا تھا۔ اسی وقت اس کے سر سے علی کا بوٹ ٹکرایا تھا۔ فلائنگ کک کی چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ اپنی چیخ کو روک نہ سکا تھا اس کے سر سے خون کا فوارہ سا ابلا تھا جو اس کے چہرے کو مزید دہشت ناک بنا گیا تھا۔ علی نے تیزی سے گھوم کر راؤنڈ کک چلائی۔ بائیں ٹانگ پر تیزی سے گھوما تھا۔ اس کی لات اس شخص کے چہرے سے ٹکرائی تھی اور ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اب سر اور ناک سے ایک ساتھ خون بہہ رہا تھا۔ علی نے مڑ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر دیکھا۔ باقی لوگ بھی اسلحہ سنبھالے اندر آ گئے تھے۔ انہی لوگوں نے پھرتی سے اس عورت کو شکنجے میں جکڑا تھا اور کمرے کی تلاشی لینے لگے تھے۔ اس تلاشی میں ایک بہت اہم کاغذ ملا تھا۔ وہ ایک لسٹ تھی۔ اس لسٹ میں ایسے نام تھے جن کو ختم کرنا تھا یا کر دیا گیا تھا۔ یہ سب کے سب مشہور لوگ تھے جو ختم ہو چکے تھے۔ ان کے ناموں کے آگے کراس لگا ہوا تھا۔

تلاشی جاری تھی کہ اس کمرے میں ایک اسموک بم آ کر گرا۔ اس کا دھواں کمرے میں پھیلنے لگا تھا۔ دھویں میں ایسی گیس بھی شامل تھی جس کی وجہ سے انہیں اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ زمین پر گرنے ہی والے تھے۔

☆======☆======☆

"یہ چوٹ بھلائی نہیں جا سکتی۔ بریگیڈیئر رام پال زخمی سانپ بن چکا ہے۔ وہ کسی بھی وقت پورے قصبے کو ڈس لے گا۔" علی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"پورے قصبے کو نہیں، ہمیں ڈسنے کی کوشش کرے گا۔" فقیر محمد بولا۔

"میں نے کہا ناں وہ پورے قصبے کو ڈسے گا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ ہم نے دیکھنے میں آیا ہے کہ جب دھوبی پر بس نہیں چلتا تو لوگ گدھے کے کان اینٹھتے ہیں۔ ہمارا بدلہ وہ قصبے کے نہتے لوگوں سے لے گا۔"

"بات غلط نہیں ہے۔ اب تک یہاں یہی تو ہوتا آیا ہے کہ مجاہدین کا بدلہ نہتے لوگوں سے لیا جا رہا ہے۔ پورے پورے گاؤں کو آگ لگا دی جاتی ہے۔" احمد نے سرد آہ کھینچ کر کہا۔

"ہر مرض کا علاج ممکن ہے۔ اس مرض کی جڑ تلاش کرو، یہ ناسور خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔" پروفیسر عثمان جو ایک طرف لاتعلقی سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے بول پڑے۔

"اس مرض کا واحد علاج ہے دور دراز سے ظلم ڈھانے کے لیے منگوائے گئے فوجیوں میں خوف پیدا کرنا۔" فقیر محمد نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"میرے خیال میں بریگیڈیئر رام پال کیمپ میں چھپا بیٹھا ہے۔ اگر ہم نے حملہ کر کے کیمپ کو اجاڑ دیا تو سمجھ لیں کہ بھارتیوں میں دہشت پھیل جائے گی۔" کمانڈر علی نے وہاں بیٹھے لوگوں پر نظریں دوڑا کر کہا۔

"میرے محسنو! آپ لوگوں نے اس علاقے میں آ کر نئی زندگی دوڑا دی ہے۔ ہم دو زہریلے سانپوں سے نجات دلائی ہے۔ اب باقی رہ گیا ایک، جو سب سے زیادہ زہریلا

اسے مارے بغیر یہاں بھڑکتی آگ کبھی بجھ ہی نہیں سکتی۔ پھر ایک بات اور ہے اس پر بھی غور کرنا ہوگا۔ تین تین بڑے افسروں کی موت سے ہلچل مچ جائے گی۔ سری نگر تک ہل جائے گا۔"

"ہاں یہ تو ہونا ہے۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"جب یہ بات پھیلے گی تو یہاں والوں کو دبانے کے لیے مزید کمک بھیجی جائے گی، ظلم کا نیا باب رقم ہوگا۔ اس ظلم کا جواب دینے کے لیے ہمیں بھی تیار رہنا ہوگا اور لڑنے کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت پڑے گی۔" احمد جوشیلے لہجے میں بولا۔

"تو کیا اب ہتھیار بھی ہمیں ہی لا کر دینا ہوں گے؟" کمانڈر علی سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ جھلاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

اس کے لہجے کی تلخی کو احمد نے محسوس کر لیا۔ اس نے علی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"نہیں میرے دوست! میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔ ہم کیمپ پر حملہ کر کے اسلحہ لوٹیں گے۔ لگے ہاتھوں بریگیڈیئر کو بھی اغوا کر لائیں گے۔"

"بریگیڈیئر نہ ہوا بکری کا بچہ ہو گیا کہ دوڑے اور پکڑ لائے۔" پروفیسر عثمان جل کر بولے۔

"بھارتی فوج کے افسر کتنے بہادر ہیں اس کا نمونہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا۔ کتنی آسانی سے ہم نے کرنل اروڑا اور میجر ستونت سنگھ کا شکار کر لیا۔ بالکل ایسا ہی بریگیڈیئر رام پال کے باب میں ہوگا لیکن اس کے لیے ہمیں مورال سپورٹ چاہیے۔ باقی کام ہم کر لیں گے۔" احمد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو یہ بھی کر لیتے ہیں۔ تمہارے ساتھ حملے میں ہم بھی شریک رہیں گے۔" پروفیسر عثمان نے فیصلہ سنا دیا۔

"میں اپنے ساتھیوں کو جمع ہونے کا حکم جاری کر دوں گا۔ شام چار بجے تک سب آ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے ہم رات میں ہی حملہ کر دیں گے۔" کمانڈر علی نے کہا تو تمام لوگوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ احمد نے اٹھ کر اجازت لی اور باہر نکل گیا۔

شام کے چار بجے احمد لوٹا تو اس کے ساتھ کئی اور نوجوان بھی تھے۔ ان کا تعارف کرانے کے بعد اس نے کہا۔ "علی بھائی! اطلاع حوصلہ افزا ہے۔ میرے دوستوں نے خبر دی ہے کہ آج صبح تین ٹرکوں پر لد کر فوجی واپس سری نگر چلے گئے ہیں۔ دوسری ٹکڑی ان

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی جگہ لینے کے لیے پرسوں پہنچے گی۔ یہی موقع ہے کیونکہ کیمپ میں برائے نام نفر ہے۔ رام پال بھی وہیں چھپا ہوا ہے۔ وہ پناہ کے لیے تیسری چالی میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ا نے اعلیٰ افسروں کو خبر بھیجی ہے کہ یہاں آتنک وادیوں کا بہت زور ہے۔ انہوں نے کرا اروڑا اور ستونت سنگھ کو مار دیا ہے اس لیے مزید نفری کے ساتھ کمانڈو بھی بھیجے جائیں۔"

"چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ نیا افسر پہلے ہی سے دہشت زدہ ہوگا۔ اس کا شکار بھی کر جائے گا۔" فقیر محمد نے کہا۔ "موسم کے تیور اچھے نہیں ہیں بارش بھی ہو سکتی ہے۔"

"یہ تو ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ بارش کی وجہ سے پہرے دار خیموں میں د رہیں گے اور ہم با آسانی ڈپو تک پہنچ جائیں گے۔" فقیر محمد کی بات سے سب متفق ہو گئے

رات کا اندھیرا اترنے تک بارش تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ جس وقت وہ لوگ پو تیاری کے ساتھ نکلے اس وقت بھی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آ پورا علاقہ آب باراں میں ڈوب جائے گا۔ درختوں کے پتوں پر گرتی ہوئی بوندیں عج شور پیدا کر رہی تھیں۔ یہ بات ان لوگوں کے حق میں بہت بہتر تھی۔ اس طرح ان کے چلنے سے جو آہٹ ہو رہی تھی وہ اس شور میں دب ہی تھی۔

کیمپ کے نزدیک پہنچ کر سب کے سب زمین پر سینے کے بل لیٹ گئے تھے اور ا کیچڑ میں لت پت تھے۔ وہ سب اسی حالت میں کرولنگ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے تھے۔ فقیر محمد، علی اور احمد وغیرہ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی مگر پروفیسر عثمان کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اگر کوئی شناسا انہیں اس حالت میں دیکھ لیتا تو اسے اپنی بینائی شبہ ہو جاتا۔ وہ حیرت کے کرشمے میں ڈوب کر مر جاتا کیونکہ پروفیسر عثمان کوئی معمو آدمی نہ تھے۔ دنیا بھر کے چنیدہ سائنسدانوں میں سے ایک تھے۔ ان کی زندگی کا محو مائکرو اسکوپ، ڈیجیٹل ڈاٹا انڈیکس، ٹیسٹ ٹیوب وغیرہ تھے۔ انہوں نے خلیہ پر تحقیق کر کے ثابت کیا تھا کہ انسان چلتی پھرتی دنیا ہے جس کے اندر سینکڑوں نہیں ہزاروں شہر آبا ہیں۔ جہاں نظم و نسق کے ساتھ زندگی رواں دواں ہے۔ انہوں نے تجربات کے ذریعہ جنات کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے پوری تیاری کر لی تھی۔ جس طرح الیکٹرونک مائکرو اسکوپ سے ننھے ننھے ذروں سے بھی کئی ہزار گنا چھوٹے جرثوموں کو با آسانی دیکھ جا سکتا تھا اسی قسم کی انہوں نے بھی ایک مائکرو اسکوپ بنائی تھی جو سائے کو مجسم بنا کر دکھ سکتی تھی۔ انہوں نے پروفیسر آرونٹن ڈملو کے نظریے کو تجربات کے ذریعہ صحیح ثابت کر د تھا کہ سائے کا بھی وزن ہوتا ہے۔ جب ان سے اخباری نمائندوں نے پوچھا کہ آپ

نے ایسا نادر خیال کہاں سے ڈھونڈا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ پروفیسر آرونٹن ڈملو نے 1968ء میں سائے کے وزن کا نظریہ پیش کیا جب کہ قرآن مجید فرقان الحمید میں یہ بات 14 سو سال پہلے ہی بتا دی گئی تھی۔ سورہ الرعد آیت آٹھ "اور ہر شے اس کے نزدیک ایک اندازے سے ہے۔" پھر انہوں نے سیدنا امام زین العابدینؓ کی مشہور کتاب صحیفہ کاملہ میں مرقوم ایک دعا کی کئی سطریں سنائی تھیں۔

"میں تیری تسبیح کرتا ہوں کہ تُو سماوات (ارض و سما) کا وزن جانتا ہے۔"

"میں تیری تسبیح کرتا ہوں کہ تُو تاریکی و روشنی کا وزن جانتا ہے۔"

"میں تیری تسبیح کرتا ہوں کہ تُو سائے اور ہوا کے وزن کو جانتا ہے۔"

"میں تیری تسبیح کرتا ہوں کہ تُو ہر خوشبو اور بدبو کے وزن کو جانتا ہے۔"

سورۂ الرعد کی آٹھویں آیت اور سیدنا امام زین العابدین کی یہ مناجات میری رہنمائی کرتی ہیں، کیونکہ یہ مناجات اس وقت کی ہے جب دنیا والے روشنی اور سائے، خوشبو، بدبو اور ہوا کے بارے میں کوئی نظریہ نہیں رکھتے تھے۔ بس اتنا جانتے تھے کہ آگ جلتی ہے شعلہ نکلتا ہے تو روشنی پھیل جاتی ہے۔ روشنی کے آگے کوئی چیز آ جائے تو سائے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اچھی چیز کی خوشبو اور بری چیز کی بدبو ہوتی ہے مگر اسے نہ پکڑ سکتے تھے اور نہ اس کے بارے میں اس کی کوئی تحقیق تھی پھر بھی ایک ایسا شخص، جو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کا بیٹا ہے، وہ نہ تو سائنسداں ہے اور نہ اس دور میں کوئی اور سائنسداں تھا پھر اسے کیسے پتا چلا؟ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے۔ جو بات خدا بتا دے وہ غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی پوائنٹ پر میں نے تحقیق کی۔ تھیوری آف لائٹ اور ایکٹو پاور آف ڈارکنس کا انلائسیس کیا اور اس کی ابتداء Alfa Rays الفاریز، بیٹاریز Beeta Rays اور گاماریز Gama Rays سے کی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتیں۔ انہیں دیکھنے کے لیے خصوصی خوردبین بنائی۔ اس کامیابی نے مہمیز کیا اور میں نے روشنی اور سائے کا وزن معلوم کر لیا۔ اب میں بہت جلد ایک تھیوری پیش کرنے والا ہوں جو ایک خاص مخلوق کے بارے میں ہے۔"

دراصل پروفیسر عثمان جنات کو انسانوں کے سامنے لانے والے تھے۔ ان کا تجربہ کامیاب ٹھہرا تھا مگر اس سے پہلے ہی انہوں نے بددل ہو کر امریکہ چھوڑ دیا۔ اسی تحقیق کو مکمل کرنے کے لیے وہ بلتستان کے اس دور افتادہ علاقے میں لیبارٹری بنا کر تجربہ کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے تھے۔ جنات پر تجربہ مکمل کر کے وہ جہنم کی آگ کی تپش پر تجربہ کرنے والے تھے کہ قسمت انہیں مقبوضہ کشمیر میں کھینچ لائی۔

وہی اتنا بڑا سائنٹسٹ اس وقت کسی ٹرینڈ گوریلا فائٹر کی طرح کیچڑ میں کرولنگ کر رہا تھا۔ ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دن رات اسی کام میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے چہرے پر پھیلے آثار بتا رہے تھے کہ انہیں اس کام میں بہت لطف آ رہا ہے۔ وہ اس کا ذکر کئی بار کر چکے تھے کہ انہیں کفار سے ٹکرانے میں خاص مزا ملتا ہے۔ یقیناً جہاد میں لطف ہی لطف ہے۔ تبھی تو ان کٹیلی جھاڑیوں کے کانٹے بھی پھول لگتے ہیں۔

وہ سب جھاڑیوں سے نکل کر جب ڈھلوان پر پہنچے تو رات کا پہلا پہر ختم ہو رہا تھا۔ کسی بھی ذی روح کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ صرف بارش کی بوندوں کا شور تھا۔ کیمپ تک پہنچنے میں کسی رکاوٹ کا سامنا نہ ہوا۔ کیمپ کے گرد تار لگے ہوئے تھے۔ جب سے مجاہدین کی کارروائی تیز ہوئی تھی پورے مقبوضہ کشمیر میں کیمپوں کے گرد خاردار تار لگا دیے گئے تھے۔ جہاں جہاں مجاہدین کا زور تھا وہاں تاروں میں کرنٹ بھی چھوڑ دیا جاتا تھا لیکن یہاں امن کا دور دورہ تھا اس لیے اتنی مستعدی نہ تھی۔

احمد کے پاس کٹر تھا۔ اس نے تاروں کو دو جگہ سے کاٹا تو اتنی جگہ بن گئی کہ ایک آدمی با آسانی اندر داخل ہوسکتا تھا۔

اسی راہ سے ایک کے بعد ایک سب اندر داخل ہوئے۔ اندر پہنچ کر وہ سب پھر پیٹ کے بل لیٹ گئے اور آہستہ آہستہ آگے کی جانب کھسکنے لگے۔ احمد سب سے آگے تھا۔ وہ ٹین کی چادروں سے بنے اس کیبن کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے اندر بارش سے بچنے کے لیے ایک سپاہی کھڑا پہرا دے رہا تھا۔ احمد کرولنگ کرتا ہوا اس کے سر پر جا پہنچا پھر اس نے پیر سے بندھا ایک بڑا سا خنجر نکالا اور کھڑکی پر پہنچ کر کمال پھرتی سے اس نے خنجر سپاہی کے گلے میں اتار دیا۔ اس کا یہ وار نپا تلا تھا۔ اگر بالکل صحیح انداز میں یہ کام کیا جائے تو شکار کے حلق سے ذرا بھی آواز نہیں نکلتی اور اس کے پھیپھڑوں میں خون بھر جاتا ہے، وہ محض ہلکی سی کھانسی جیسی آواز نکال کر مر جاتا ہے۔

احمد نے شاید غور نہیں کیا تھا۔ کیبن کے برابر میں برساتی پہنے ایک اور سپاہی کھڑا تھا یا کیبن کی طرف آ رہا تھا۔ اسے شاید گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھا تھا کہ فقیر محمد نے برسوں پرانا طریقہ استعمال کر دیا۔ تقریباً ایک صدی پہلے یہ طریقہ بہت مقبول تھا۔ رومال کے ایک کونے میں سکہ باندھتے اور دوسرے کونے کو چٹکی

سے پکڑتے پھر اسے جھٹکے سے مالدار مسافر کے گلے میں ڈال کر کھینچتے اور وہ بے چارا مسافر مر جاتا۔ ٹھگوں کے اسی انداز کو فقیر محمد کام میں لایا تھا اور وہ سپاہی چیخ بھی نہ سکا۔ اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا اور اس کی سانس گھٹ کر رہ گئی۔ اس کا کام تمام کرنے کے بعد وہ سب مزید آگے بڑھے۔ کیمپ کے فوجی خود کو بہت زیادہ محفوظ سمجھ کر نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ احمد، علی اور فقیر محمد کیچوے کی طرح بے آواز رینگتے ہوئے اتنی پھرتی سے آگے بڑھ رہے تھے جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سب اس کام میں ماہر ہیں۔ آخر کو مجاہدین تھے ناں! سرد گرم کے عادی تو ہونا تھا۔

وہ سب اس جانب بڑھ رہے تھے جدھر چوبی دیوار پہ چھت ڈال کر ڈپو بنوایا گیا تھا۔

وہ سب ڈپو کے بہت قریب پہنچ گئے تھے کہ ڈپو کے پہرے دار کو ان کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ اس نے شاید ہی انہیں دیکھا ہو، یقیناً اسے چھٹی حس نے کسی کی موجودگی کا احساس دلایا ہوگا اور اس نے خوفزدہ ہو کر ایل ایم جی کا پورا برسٹ چلا دیا تھا۔

وہ سب اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے۔ حرکت کرنے سے دیکھ لیے جانے کا خطرہ تھا۔ دشمن نے برسٹ مارنے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ روشنی پھیلانے والے ہلکے گولے بھی چھوڑے تھے۔ روشنی پھیلانے والا بم ہوا میں معلق دھیرے دھیرے نیچے گر رہا تھا اور اس کی چکاچوند روشنی میں ذرہ ذرہ چمک رہا تھا۔ فلئر بم کی روشنی بیک وقت کئی سمتوں میں پھیلتی ہے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کے کئی کئی سائے بن گئے تھے اور سب کے سب متحرک تھے۔ ان کے اسلحے بھی سایہ پیدا کر رہے تھے۔ پورا کیمپ منور ہو گیا تھا۔ اتنی روشنی پھیلی تھی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو صاف نظر آ جاتی۔

اس کے بعد تو گویا قیامت برپا ہو گئی تھی۔ ان پر براہ راست فائر ہونے لگے تھے اور جواب میں انہوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ وہ خاردار بارڈر کے اتنے اندر آ چکے تھے کہ اب لوٹنا بھی ناممکن بن چکا تھا۔

☆======☆======☆

غلام رسول کا ذہن جواب دینے سے قاصر تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ وہ پُراسرار لڑکی ہر بار ایک نئے انداز میں سامنے آ رہی ہے اور ہر بار اس کا ایک ہی جملہ سننے میں آتا ہے کہ وہی زدنو ہے۔ ماضی قریب میں اس علاقے پر جس راجا کی حکمرانی تھی وہ اسی کی بیٹی ہے اور یہ پروفیسر کا دوسرا جنم ہے۔ یہی کچھ پروفیسر کو خواب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں بھی نظر آ رہا تھا مگر اب وہی خواب اسے نظر آ رہے ہیں۔ پروفیسر عثمان نے بھی تو یہ بتایا تھا کہ اسے قسط وار خواب ایک پرانے پیڑ کے نیچے نظر آتا ہے۔ کیا یہ وہی پیڑ ہے؟ اسے زونو محبوبہ کی شکل میں کیوں نظر آ رہی ہے۔ پروفیسر اور وہ دونوں دوست ہیں پھر خواب میں رقیب کیوں نظر آ رہے ہیں؟ یہی کچھ سوچتا ہوا وہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا اسے خواب کے مناظر یاد آ رہے تھے۔ اسے اچھی طرح یقین تھا کہ اس نے خواب میں اسی ''نگار'' کو ہی دیکھا ہے۔ اس گاؤں کا چپہ چپہ پرانی حالت میں دیکھ چکا ہے۔ اس حویلی کو بھی وہ پہچان چکا تھا جس میں آج کل وہ رہ رہا تھا۔ یہی وہ حویلی تھی جو اسے خواب میں نظر آئی تھی۔

وہ اپنی سوچ میں گم حویلی تک پہنچ چکا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، کیتھی سے ٹکراؤ ہو گیا۔

''کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں تمہیں کہاں سے سناؤں۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں ذہنی طور پر دیوالیہ ہو گیا ہوں۔''

''آخر ایسا کیا ہوا؟''

''تمہیں یاد ہے ناں کہ پروفیسر کو ایک دلچسپ خواب مسلسل نظر آ رہا تھا جس میں کسی لڑکی کے عشق میں گرفتار تھے۔''

''شاید انہوں نے اس لڑکی کا نام زونو بتایا تھا۔''

''ویسا ہی خواب آج مجھے بھی نظر آیا اور مزے دار بات یہ ہے کہ میں نے خود کو زونو کے محبوب کی شکل میں دیکھا۔''

''ہو سکتا ہے وہ خواب تمہارے تحت الشعور میں چھپا رہ گیا ہو۔'' کیتھی نے برملا جواب دیا۔

''اور اس مقام تک جہاں بیٹھ کر میں نے خواب دیکھا، مجھے وہی پُراسرار لڑکی لے گئی تھی جس کے بارے میں مَیں نے کئی بار تمہیں بھی بتایا ہے۔''

''وہی لڑکی جو بضد ہے کہ یہ پروفیسر کا دوسرا جنم ہے؟''

''ہاں وہی لڑکی۔''

''بہت ساری باتیں وقت بتاتا ہے۔ تشریح کرتا ہے۔ ابھی سے ذہن پر زور نہ دو۔ تمہارے دلائل نے تو مجھے قائل کر ہی دیا ہے کہ دوسرا جنم نہیں ہوتا۔ اس لیے انتظار کرو۔

آہستہ آہستہ بات کھل جائے گی کہ وہ لڑکی کیا چاہتی ہے؟ وہ کون ہے؟ اتنے پُراسرار انداز میں کیوں مل رہی ہے؟''

''مجھ میں انتظار کا یارا نہیں ہے۔''

''تم ہی نے خلیفہ دوم حضرت عمرؓ فاروق کا قول سنایا تھا کہ علم تین چیزوں میں ہوتا ہے۔ بولتی ہوئی کتاب، جاری رہنے والی سنت اور ''مجھے معلوم نہیں'' پھر تم، اس مجھے نہیں معلوم پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ کتنی گہرائی ہے اس لفظ میں۔ جب تک ذہن میں یہ جملہ رہتا ہے، معلوم کرنے کا تجسس بڑھتا چلا جاتا ہے۔''

''یہی تو کر رہا ہوں، اسی تجسس کو دور کرنے میں کوشاں ہوں۔''

''میرے خیال سے تم اس لڑکی کو ذہن پر سوار نہ کرو۔'' کیتھی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ ذہن کو کھلا چھوڑ دو۔ کچھ عرصہ کے لیے ذہن کو آزاد چھوڑ کر دوسری دلچسپیوں کی طرف مڑ جاؤ، اپنی دوربین کی طرف توجہ دو۔ ستاروں پر ذہن کو مرکوز کر دو اس طرح سے ذہنی رو خود بخود مڑ جائے گی۔''

''تم کیسی متضاد باتیں کرنے لگی ہو کبھی کہتی ہو تجسس بڑھاؤ پھر کہتی ہو ذہن کو آزاد چھوڑ دو، کیوں بھئی یہ کیسے مشورے دے رہی ہو؟''

''مجھے یہ خیال آیا کہ کہیں تم ذہنی طور پر دباؤ کا شکار تو نہیں ہو اور یہ سب ذہن کی کرشمہ سازی ہے۔''

''تم نے کیا مجھے ذہنی دیوالیہ پن کا شکار سمجھ لیا ہے؟''

''میں نے بس ایک خیال پیش کیا ہے۔ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ آزمانے میں کیا حرج ہے؟ آزما کر دیکھ لو۔''

''چلو تمہارا مشورہ بھی مان کر دیکھ لیتا ہوں۔''

''عقلمندوں کی باتوں کو رد کرنے والا بے وقوف ہوتا ہے اور یقیناً تم ان میں سے نہیں ہو۔'' کیتھی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا، تو تم اب عقلمند بننے کی کوشش کر رہی ہو، کرو کرو شاید کامیاب ہو جاؤ۔'' غلام رسول نے جوابی چوٹ کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں ذرا ہوا خوری کرنے جا رہا ہوں۔ اس طرح روح کو بھی تازگی ملے گی۔'' پھر وہ باہر کی طرف نکلتا چلا گیا۔

غلام رسول کس مقصد کے لیے دوبارہ اس درخت کے نیچے پہنچا تھا، یہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ بے چینی تھی جو اس کے اندر سے اٹھی تھی اور اسے حویلی سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باہر کھینچ لائی تھی۔ پھر وہ کسی معمول کی طرح یہاں تک کھنچ آیا تھا اور اب لڑکی کے کہنے اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کی رگ رگ میں سکون سا اتر آیا ہے۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئی تھیں اور وہ بند آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ پہاڑ کی ترائی طے کرتے ہوئے وہ دونوں ساتھ ساتھ آگے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ترائی کے حاشیے پر چنار کے درختوں کے جھنڈ تھے جن سے گزر کر وہ اونچے نیچے بوڑھے اور گھنے درختوں کی طرف بڑھنے لگے اور ایک چشمے پر پہنچ گئے جو شمالی پہاڑی سے اتر کر جنگل میں ناگن کی طرح بل کھاتا مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے دونوں کناروں کو گھنی جھاڑیوں نے ڈھانپ لیا تھا۔ اس گھنے، خوبصورت جنگل میں چشمہ دیکھ کر انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آدم کی گمشدہ جنت میں آ گئے ہوں ان کے انگ انگ سے مستی جھلکنے لگی تھی۔ وہ دونوں چڑیوں کی طرح چہک رہے تھے۔ پھر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئے۔ چشمے کا پانی اس پتھر سے ٹکرا ٹکرا کر جھاگ اڑا رہا ان دونوں سے چند ہاتھ کی دوری پر آ کر وہ بھی کھڑا ہو گیا تھا مگر اس نے ایک پیڑ کی لے رکھی تھی۔ وہ اس کے اتنے نزدیک تھا کہ ان کی آواز با آسانی سن سکتا تھا۔ لڑکی پیار کے رس میں شرابور لہجے سے خاموشی توڑی۔

''اسد الکبیر! تم تپتے ہوئے صحرا سے نکل کر اس سرد ترین خطے، برفانی علاقے میں میرے لیے ہی آئے ہو، میری قسمت تمہیں کھینچ لائی ہے۔ میری محبت نے تمہیں کھینچا ہے ورنہ تم اس جنت نظیر وادی میں کبھی نہ آتے۔''

''ہاں زونو! واقعی یہ جنت نظیر وادی ہے بلکہ نئی جنت ہے اور میں ایک نیا آدم ہوں اور اس نگار کی جنت میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ نیکی اور بدی کے درختوں کی پہچان کروں اور اس حوا کو جو زونو کی شکل میں سب سے تنہا، سب سے اکیلی ہے، سہارا دوں کیونکہ یہاں بھی ایک شیطان ہے۔ احسن نامی شیطان جو اسی بستی میں رہتا ہے۔ سانپ کے روپ میں بسیرا لیتا ہے۔''

اسد الکبیر اپنی رو میں بولے چلا جا رہا تھا اور زونو اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''تم نے جب مجھے اس کھڈ میں گرنے سے روکا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ اس میں سانپ رینگ رہے ہیں یقیناً وہ سانپ احسن کا ایک روپ ہے۔''

''یہ تم احسن احسن کی رٹ کیوں لگائے ہوئے ہو۔ فی الحال سب کچھ بھول جاؤ

برے الفاظ کی مٹھاس کو محسوس کرو۔ تم یہاں صرف میری خاطر آئے ہو۔ تمہیں اللہ نے بھیجا ہے۔ میری آنکھوں کی چمک کو دیکھو، میرے دل میں اٹھتے مدوجزر کا احساس کرو، میں قسمت کی آنکھ کا آنسو ہوں اور تم ''دامن'' اس آنسو کو اپنی قسمت کا ستارا بنا لو جو نگار کے کالے آسمان پر چمکا ہے اور زہرہ کی طرح ایک نئی سمت اشارہ کر رہا ہے۔'' زونو نے جذبات سے سرشار آواز میں کہا۔

''واقعی، کیا تم یہ مان رہی ہو کہ میں آیا نہیں، تمہارے لیے بھیجا گیا ہوں؟''

''یہ میرا وہم نہیں یقین ہے۔'' زونو نے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا۔

اسد الکبیر کا تمتمایا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ زونو کی قربت کی گرمی اور تازگی محسوس کر رہا ہے۔ اس نے اپنے سر کو زونو کے کندھے سے لگا دیا تھا۔

تبھی زونو جیسے چونک اٹھی، نیند سے بیدار ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ''نہیں نہیں۔ ابھی تم میرے کچھ نہیں ہو، پہلے گواہ بناؤ پھر مجھے اپنانا، میں پوری کی پوری تمہاری ہوں گی۔''

پھر وہ جھٹکے سے اٹھی تھی اور دوڑتی چلی گئی تھی۔ اسد الکبیر سکتے میں بیٹھا رہ گیا تھا اور وہ جو پیڑ کے پیچھے کھڑا سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا، زونو کے جاتے ہی آگے بڑھا تھا کہ اس کا پاؤں کسی پتھر پر آ گیا تھا اور خود کو سنبھالتے سنبھالتے بھی گر پڑا تھا۔

غلام رسول اسی پیڑ کے نیچے بیٹھا سر پکڑے ہوئے تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیونکہ وہ لڑکی پھر کسی چھلاوے کی طرح سامنے آ کر غائب ہو گئی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور واپس حویلی کی طرف چل پڑا۔ وہ جلد سے جلد حویلی میں پہنچنا چاہتا تھا، کیتھی سے ڈسکس کرنے کا خواہاں تھا۔ اسی لیے وہ تیز تیز چل رہا تھا۔

حویلی میں داخل ہوا تو اس کی نظر سامنے کی جانب اٹھ گئی۔ لان میں گارڈن چیئر پر کیتھی بیٹھی تھی۔ سامنے میز پر چائے کے لوازمات تھے۔ وہ جا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

کیتھی نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ غلام رسول کے چہرہ پر فکر کی چھائیاں رقصاں تھیں۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ میرے بوڑھے شیر! یہ چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

''بس وہی ایک مسئلہ ہے جو دل و دماغ کو مفلوج کیے دے رہا ہے۔''

''کیا وہ لڑکی پھر ملی تھی؟''

''ہاں اور آج پھر وہی خواب نظر آیا۔ اس خواب کی اگلی کڑی دیکھی ہے۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''واہ...... بہت خوب! لوگ قسط وار کہانیاں پڑھتے ہیں، قسط وار ڈرامے دیکھتے ہیں اور تم قسط وار خواب دیکھ رہے ہو۔ اس بار میں گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں تمہارا نام درج کراؤں گی۔''

''ابھی میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ پلیز سنجیدگی اختیار کرلو۔''

''تو سنو! جس طرح یہ کائنات اسرار سے بھری ہے اسی طرح یہاں رونما ہونے والی ہر بات پُراسرار ہے۔ ذہن کے دریچے کھلتے ہیں مگر وقت آنے پر۔ وقت سے پہلے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔'' کیتھی نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''ذہن پر زور دینے سے کچھ نہیں ہوتا بس انتظار کرو۔ وقت خود ہی اسرار کا نقاب ہٹا دے گا۔''

''اور اب کتنا انتظار کروں، دماغ کی رگیں پھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی ہیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔''

''تمہی نے ایک بار بتایا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عباس نامی کوئی صحابی یا تابعی تھے۔ بے شمار احادیث کے راوی اور بہترین مفسر قرآن تھے۔ انہوں نے ہی ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ قرآن کا سب سے اچھا مفسر وقت ہے۔ جب وہ پریکٹیکل انداز میں تشریح کرتا ہے تو ہر ایک کی سمجھ میں ایک ایک نکتے آجاتے ہیں۔ اس مثال کو مدنظر رکھو۔ جب قرآن مجید جو الہام ہے وہ وقت کی تشریح سے آسان ہوجاتا ہے تو عام باتوں کا ذکر کیا۔ وہ بھی سمجھ میں آجائیں گی، صرف انتظار کی عادت ڈالو، اس لڑکی کو ذہن پر طاری نہ کرو۔''

''مگر کیا کروں اس کی حرکات ہی ایسی ہیں کہ موقع ملتے ہی وہ یادوں کا نشتر بن کر چبھنے لگتی ہے۔ ایسی پُراسرار لڑکی سے پہلی بار واسطہ پڑا ہے ناں۔''

''تم خود کو عقلِ کل سمجھتے ہو اور کسی خاص سبجیکٹ کو ذہن سے جھٹک نہیں سکتے۔ مجھے تو ایسا لگنے لگا ہے کہ یہ سب کچھ تمہارے ذہن کی اختراع ہے۔ کہیں وہ لڑکی تمہارے تخیل کی پیداوار تو نہیں ہے؟''

''میں قسم کھا سکتا ہوں کہ یہ بات نہیں ہے۔''

''ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ لڑکی تمہیں ذہنی طور پر ورغلا رہی ہو۔ ٹرانس میں لے کر خیالی پیکر تراش رہی ہو۔''

''میں ہپناٹزم پر یقین نہیں رکھتا۔ ہاں! میں مسلمان ہوں ناں اس لیے مبشرات پر یقین رکھتا ہوں۔''

''یہ مبشرات کیا ہے پہلے تو تم نے اس کا ذکر نہیں کیا تھا؟''

''بس یوں سمجھ لو کہ......''

☆======☆======☆

اس کے بعد تو قیامت برپا ہوگئی۔ تمام مجاہدین نے پوزیشن لے کر جوابی حملہ شروع کردیا تھا۔ وہ تو مرنے ہی کے لیے اپنے ٹھکانوں سے روانہ ہوئے تھے اس لیے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بھارتی فوجی تعداد میں زیادہ نہ تھے لیکن ان کے پاس جدید مشین گنیں اور گرینیڈ تھے۔ گنوں کی تڑتڑاہٹ اور بموں کے دھماکوں سے کانوں کے پردے پھٹے جارہے تھے۔

مقابلہ چونکہ آمنے سامنے کا تھا اس لیے زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا، جلد ہی سکوت چھا گیا۔ فضا میں گردوغبار اور دھوئیں کے بادل صاف ہوئے تو ان لوگوں نے اٹھ کر صورتِ حال کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دشمن کا تقریباً صفایا ہوچکا تھا۔ میدان میں کھڑی پانچ جیپوں میں سے ایک کم نظر آرہی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ کچھ لوگ فرار ہوئے ہیں۔ فرار ہونے والے افسران ہوں گے۔ بریگیڈیئر رام پال بھی ہوسکتا تھا۔ دشمن کے بارے میں اندازہ لگانے کے بعد انہوں نے اپنے شہداء کی گنتی شروع کی۔ وہ بھی تین ساتھیوں سے محروم ہوچکے تھے۔

ان کے ساتھیوں میں سے ایک شدید زخمی نظر آرہا تھا۔ اس کا نام جان محمد تھا۔ ایک گولی اس کی پسلیوں سے دوسری بازو سے پار ہوگئی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک خون میں شرابور تھا۔ علی نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بھی مردہ سمجھ کر یہیں چھوڑ جاؤ۔ میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گا۔ مجھے اٹھانے سے بہتر ہے کہ کچھ اور اسلحہ اٹھالو۔ یوں بھی مردہ آدمی بھاری ہوجاتا ہے۔''

وہ سب کچھ دیر تک خاموش رہے پھر علی بولا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ جب تک سانس تب تک آس۔ ہم اپنے شہیدوں کو تو مجبوراً چھوڑتے ہیں لیکن زخمیوں کو نہیں۔''

تبھی احمد بولا۔ ''اس مشن کا کمانڈر میں ہوں۔ اس لیے حکم دیتا ہوں کہ حجت کرنے میں وقت برباد نہ کرو۔ صرف بارہ میل کے فاصلے پر ایک اور چوکی ہے۔ وہاں تک یہ خبر پہنچ چکی ہوگی اور وہاں سے کمک پہنچنے ہی والی ہوگی۔''

اس حملے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اسلحہ حاصل کیا جائے۔ اسلحے کی اشد ضرورت تھی۔ ان سب نے بوروں میں اسلحہ بھر کر اپنی اپنی پیٹھ پر لاد لیے۔ احمد اور علی نے ڈائنامائٹ کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سلاخوں کا بنڈل بنا کر اپنی کمر سے باندھ لیا۔

''اس طرح انہیں لے جانا آسان ہوگا۔'' احمد بولا۔

اچھی طرح لد پھند کر وہ سب چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ کچھ آگے جانے کے بعد احمد بولا۔ ''اگر ہم لکڑی کا پُل پار کرنے میں کامیاب ہو گئے تو محفوظ ہو جائیں گے۔''

اس نے جان محمد کو کندھے پر اٹھا لیا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ باقی سب اس کے پیچھے تھے۔ احمد نے جان محمد کو اتنی احتیاط سے اٹھایا ہوا تھا کہ اگر وہ پانی کا بھرا ہوا گلاس ہوتا تب بھی اس میں سے ایک قطرہ نہ چھلکتا اس کے باوجود وہ تیز بھی چل رہا تھا۔

تاروں کی مدھم روشنی میں انہوں نے چڑھائی عبور کی اور ایک بار پھر جنگل میں داخل ہو گئے جہاں تاریکی تھی۔ جنگل کے اختتام پر پہاڑی نالا تھا۔ ایک مقام پر اس کی چوڑائی بہت کم تھی لیکن وہاں بھی تقریباً بیس فٹ تھی۔ اس جگہ پر اسے پار کرنے کے لیے لکڑی کا پُل بنا ہوا تھا۔

احمد سب سے پہلے نالے تک پہنچا لیکن وہاں پہنچتے ہی وہ اس طرح رک گیا جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہوں۔ باقی لوگ جب وہاں پہنچے تو انہیں بھی اس کے یوں رک جانے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ اس نالے پر جو لکڑی کا بنا ہوا پُل تھا، وہ اب وہاں نہیں تھا۔

پہاڑیوں کی بلندی پر شاید شدید بارش ہو رہی تھی اسی لیے نالے میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ اگر ہاتھی بھی اترتا تو بہہ جاتا۔ پانی ہی کے بہاؤ نے پُل کو ٹکڑوں میں تبدیل کر کے بہا دیا تھا۔ تاہم دونوں کناروں پر جہاں اس کے سرے گڑے ہوئے تھے وہاں پُل کے کچھ ٹکڑے باقی رہ گئے تھے اس کے علاوہ نالے میں جن دو ستونوں پر پُل ٹکا ہوا تھا وہ خاصی شکستہ حالت میں دکھائی دے رہے تھے۔ تاہم جھاگ اڑاتا پانی کبھی کبھی انہیں بھی اپنے دامن میں چھپا لیتا تھا۔

وہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے تھے۔ اسی اثناء میں ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا۔ وہ کافی چھوٹا تھا، جہاد میں حصہ نہیں لے سکتا تھا اس لیے پیغام رسانی کا کام کرتا تھا۔ دشمن کے پاس پیغام رسانی کا جدید نظام تھا تو مجاہدین کے پاس انسانی قوت۔ ایسے ہی کم عمر بچے جگہ جگہ مجاہدین کے لیے کام کرتے تھے۔ غاصب ہندو پیغام رسانی کے لیے لاکھوں روپے خرچ کرتا تھا۔ جب کہ مجاہدین کے یہ پیغام رساں چندہ اکٹھا کرنے میں بھی

بچے تھے۔ اپنی عمر سے بڑھ کر تیزی سے ایک جگہ کا پیغام دوسری جگہ پہنچاتے تھے اور کوئی اجرت بھی نہیں لیتے تھے۔ بچے نے ہانپتے ہوئے بتایا۔ ''بہت سے فوجی ادھر ہی آ رہے ہیں۔''

''تم نے کہاں دیکھا ہے؟''

''میں دوسرے پہاڑ کی چوٹی پر بھیڑیں چرا رہا تھا۔ باجی بھی ساتھ تھیں۔ انہوں نے دیکھا اور مجھے خبر دینے بھیج دیا۔ ابھی دشمن تیسری سڑک پر ہے۔'' لڑکے نے کہا۔

''یہاں تک پہنچنے میں ہم نالہ پار کر سکتے ہیں۔'' احمد بولا۔

''پُل ٹوٹا ہوا ہے کیسے پار کریں گے؟''

''نیا پُل بنائیں گے۔ دو گھنٹے بہت ہیں۔''

''مگر کیسے؟''

''بس دیکھتے جاؤ۔ اپنے اپنے رسے اور کلہاڑیاں نکال لو۔'' احمد نے کہا۔

اس علاقے میں ہلکی کلہاڑیاں کمر سے باندھ کر چلنے کا رواج ہے۔ یہ کلہاڑیاں جھاڑی کاٹنے، حملہ روکنے اور دیگر ضرورت کے وقت کام آتی ہیں۔ مجاہدین تو خاص طور سے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ تمام لوگ کلہاڑیاں لے کر بڑے بڑے پیڑوں پر پل پڑے۔ ایک ناممکن بات کو ممکن بنانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ کیونکہ یہ کام اتنا آسان نہ تھا اتنے تیز بہاؤ پرستے کو ٹھہرانا ایک ناممکن سی بات تھی مگر وہ لوگ جی جان سے لگے ہوئے تھے۔

احمد نے جان محمد کو نالے کے کنارے کافی دور لے جا کر ایک درخت کے سہارے بٹھا دیا تھا پھر بولا۔ ''جان محمد! تمہارے اندر اتنا حوصلہ ہے کہ بندوق تھام سکو؟''

جان محمد نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔ ''ہاں!''

''جنگل پر نظر رکھ سکو گے؟''

جان محمد نے نقاہت سے بند ہوتی آنکھوں کو زبردستی کھول کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

احمد نے ایک رائفل اس کی گود میں ٹکا دی پھر اس نے دو فاضل رائفلیں لیں۔ ایک رائفل کو وہ دائیں ہاتھ پر ایک درخت کے تنے سے باندھ آیا اور دوسری رائفل کو اس سے کافی دور بائیں ہاتھ پر ایک درخت سے باندھ دیا پھر اس نے دونوں رائفلوں کے ٹرائیگرز کے ساتھ ایک ایک ڈوری باندھی اور ان کا دوسرا سرا لا کر جان محمد کی دونوں ٹانگوں سے باندھ دیا۔

جان محمد کی آنکھوں میں موت کے سائے اتر رہے تھے مگر وہ سب کچھ بڑی دلچسپی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے دیکھ رہا تھا۔ احمد نے اسے سمجھایا۔ ''ہم سب تو جنگل میں اپنے اپنے کام میں مصروف ہوں گے۔ اگر تم جنگل میں دشمن کی آمد محسوس کرو تو اپنے دونوں گھٹنوں کو جوڑ لینا۔ دونوں رائفلیں آٹو میٹک ہیں، فوراً ہی مخالف سمتوں سے فائر شروع ہو جائے گی۔ تیسری رائفل تم خود استعمال کرنا۔ دشمن یہی سمجھے گا کہ بہت سے آدمی مختلف سمتوں میں چھپے ہوئے ہیں اور اس کی پیش قدمی کچھ دیر کے لیے رک جائے گی۔ ہمیں بھی کچھ مہلت مل جائے گی۔''

احمد نے ہدایت دینا موقوف کیا اور باقی ساتھیوں کے پاس آ گیا پھر اس نے کہا۔

''بسم اللہ! آپ سب اپنے اپنے محاذ پر ڈٹ جائیں۔ وقت بہت کم ہے اور مقابلہ سخت ہے۔ دشمن پہنچنے ہی والا ہے۔ اس سے پہلے ہمیں نالا پار کرنا ضروری ہے۔''

☆======☆======☆

''بس یوں سمجھ لو کہ یہ بھی الہام کی ایک قسم ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ۔ ''میرے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا مگر مبشرات کا دروازہ کھلا رہے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ یہ مبشرات کیا ہے تو آپ نے جواب دیا، سچے خواب۔'' یقیناً سچے لوگوں کو غیب کی باتیں خواب کے ذریعہ معلوم ہو جاتی ہیں۔''

''مگر سچے لوگوں کو، اس میں تمہارا ذکر کہاں ہے؟'' کیتھی نے ہنس کر کہا۔

''پلیز سنجیدہ ہو جاؤ۔'' غلام رسول نے ہاتھ جوڑ کر جھلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا بتاؤ، خواب کے بارے میں کیا بتا رہے تھے؟''

''میں مسلمان ہوں اس لیے قرآن کی ہر بات پر ایمان ہے۔ سورۂ یوسف، سورۂ صافات میں حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب کا تذکرہ ہے۔ نیویارک کی ڈریم سوسائٹی خوابوں پر تحقیق کے لیے ہی بنی ہے۔ گزشتہ دنوں میں اس سوسائٹی کی ایک رپورٹ پڑھ رہا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ کیلی فورنیا کے فورسیکل نامی گاؤں کی ایک بچی نے ماں کو بتایا کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے کہ سیاہ پہاڑ کے دامن میں بنے جس سکول میں وہ پڑھتی ہے، اس سکول کو سیاہ بادلوں نے گھیر لیا ہے۔ ماں نے بچی کی بات پر توجہ نہ دی اور اسے زبردستی سکول بھیج دیا۔ اسی دن سیاہ پہاڑ میں دھماکے ہوئے اور اس کی چوٹی ٹوٹ کر سکول کی عمارت پر آ گری۔ تمام بچے دب کر ہلاک ہو گئے۔''

''یہ اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے؟''

''خواب جھوٹے ہو سکتے ہیں مگر ان لوگوں کے جو گناہ آلود زندگی گزار رہے ہیں۔

سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوتے ہیں۔''

''تو کیا تم نبوت کا دعویٰ کرنے والے ہو کہ مجھے قسط وار خواب آ رہے ہیں۔''

''میں نے ایسا کچھ تو نہیں کہا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے جو خواب نظر آ رہے ہیں اس میں کہیں نا کہیں سچائی ضرور ہے۔''

''میرا کہا مانو تو اپنے دل و دماغ کو کسی دوسری دلچسپی کی طرف موڑ لو۔ تمہیں ستاروں سے خاصی دلچسپی ہے ناں، کچھ دنوں کے لیے تم اپنی خود ساختہ آبزرویٹری میں بیٹھ جاؤ۔ اس طرح ذہنی کیفیت میں تبدیلی آئے گی اور ذہن پُرسکون ہو جائے گا۔''

''ایسا کرتے ہیں ہم دونوں ساتھ چلتے ہیں۔ آج تم بھی میری دوربین سے کھلے آسمان کا نظارہ کر لو۔ مائیکروسکوپ سے تو تم نے چھوٹے چھوٹے ذرات سے بھی کئی گنا چھوٹے خلیوں کو ہزار بار دیکھا ہے، آج دوربین سے مطالعہ کر لو۔''

''چلو آج میں تمہاری دلچسپ دنیا کو بھی دیکھ لوں۔'' کہہ کر کیتھی اس کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف چل پڑی وہ اسے بہلائے رکھنا چاہتی تھی تاکہ اس کا ذہن لڑکی کے خیال سے ہٹا رہے۔

وہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں طے کرتی ہوئی اوپر چڑھ رہی تھی۔ غلام رسول اس کی بے تابی دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

سیڑھیاں طے کر کے وہ اوپر پہنچی۔ چھت پر نصب دوربین دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ غلام رسول کے پاس اتنی قیمتی، بڑی اور کمپیوٹرائز دوربین ہو گی۔ اس نے خوردبین کی بہت ساری قسمیں دیکھی تھیں مگر دوربین کی اتنی اعلیٰ قسم پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اس کی حیرت غلام رسول سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''پسند آئی میری دوربین؟''

''یہ اتنا بڑا سیٹ تم لائے کہاں سے؟''

''امریکہ سے منگوائی ہے۔ تین ٹکڑوں میں آئی تھی۔ مزے دار بات یہ ہے کہ اسے لانے والے بھی سمجھ نہیں سکے تھے کہ ان تینوں حصوں کو جوڑنے سے اتنی بڑی دوربین بن جائے گی پھر اس کا رابطہ کمپیوٹر سے میں نے خود ملایا ہے۔''

کیتھی نے دوربین سے آنکھ لگا دی۔ اسے آسمان پر روئی کے گالے ہی گالے نظر آ رہے تھے۔ وہ بولی۔ ''اس وقت تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ شاید بادلوں نے سارے آسمان کو ڈھک رکھا ہے۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''وہ بادل نہیں قدرت کا ایسا کارخانہ ہیں جہاں انسانی زندگی کے لیے نعمت پیدا کی جاتی ہے۔''

''میں سمجھی نہیں؟'' کیتھی نے بادلوں کا دوربین سے مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔

''اللہ تعالیٰ سورۂ نور کی پینتالیسویں آیت میں فرماتا ہے۔ ''اور خدا نے ہی تمام جانداروں کو پانی سے پیدا کیا۔'' سیدنا امام جعفر صادقؓ سے کسی نے پوچھا کہ پانی کا اصل ذائقہ کیسا ہے؟ تو جواب ملا۔ ''اس کا ذائقہ زندگی کا ذائقہ ہے۔'' یہ پانی آتا کیسے ہے اس بارے میں بھی قرآن مجید نے تعریف کی ہے۔ سورۂ نور کی 43 آیت ہے۔ ''کیا تم نے غور سے نہیں دیکھا کہ یقیناً خدا ہی بادل کو چلاتا ہے پھر وہی باہم اسے جوڑتا ہے۔ پھر وہی اسے تہہ بہ تہہ رکھتا ہے تب تو بارش اس کے درمیان سے نکلتی ہوئی تم دیکھتے ہو اور آسمانوں میں جو (جمے ہوئے بادلوں کے) پہاڑ ہیں ان میں سے وہی اسے برساتا ہے۔'' یوں سمجھو کہ سورج کی شعاعیں جب سمندر سے خالص پانی کو بخارات کی صورت میں فضا میں ہوا کے دوش پر پہنچاتی ہیں تو پھر کیمیائی عمل سے بادلوں میں طرح طرح کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ چنانچہ سورۂ نور کی آیت میں خلاق عالم کا ارشاد ہے کہ ''یولف'' یعنی وہ بادلوں کو ملاتا ہے یعنی دو مختلف قسم کی بجلی رکھنے والے بادلوں کے درمیان تجاذب و ملاپ کا کام ہوتا ہے تو برف وصوعق، بارش اور اولے گراتے ہیں اور ان کے ملنے سے تکاثف در کام کا عمل ہوتا ہے۔ بادلوں کی دس بڑی اقسام ہیں۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ ''خدا بادلوں کو ملاتا ہے۔'' دو مختلف قوت و بجلی رکھنے والے بادلوں کے درمیان تجاذب و ملاپ کا کام ہوائیں انجام دیتی ہیں جیسا کہ سورۂ حجر کی آیت میں خالق عالم کا ارشاد ہے کہ ''اور ہم نے بار آور کرنے والی ہوائیں چلائیں تو پھر ہم نے آسمان سے پانی برسا کر تم کو اس سے سیراب کیا۔'' ارشاد ربانی سے یہ بات واضح ہے کہ جس طرح ہوائیں نباتات میں مختلف درختوں و پودوں کے درمیان رابطہ قائم کر کے ان کو بار آور کرتی ہیں اسی طرح بارش اور برف و بجلی پیدا کرنے کے لیے ہوائیں دو مختلف قوت و بجلی رکھنے والے بادلوں کو ملانے کا کام انجام دیتی ہیں جس سے بارش و برف اور رعد و برق پیدا ہوتی ہے۔ بادلوں میں جب بجلی چمکتی ہے تو اس سے اردگرد کی آکسیجن، نائٹروجن میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بارش کے قطرات اس نائٹروجن کے ذخیرے کو زمین پر اپنے ساتھ لاتے ہیں اور یہی نائٹروجن دنیا و نباتات کے لیے غذا ہے۔''

وہ دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ اچانک ایسا لگا جیسے روشنی کا تیز جھماکا سا ہوا۔

صرف ایک لمحہ کے لیے پھر وہی خاموشی اور بلب کی مدھم روشنی...... وہ دونوں ہی چونک گئے تھے۔ اس سے پہلے بھی غلام رسول نے اس حویلی میں کئی محیر العقول مناظر دیکھے تھے۔ سفید ساڑھی میں ملبوس ایک اجنبی لڑکی کو دیکھا تھا۔ چاندنی کی پٹی پر بھیانک چہرہ بھی دیکھا تھا اس لیے اس وقت بھی اس نے یہی سوچا کہ شاید کوئی پُراسرار واقعہ نظروں سے گزرے گا۔ اسی لیے اس کی متلاشی نظریں ادھر اُدھر چکرانے لگی تھیں۔

کیتھی بھی چونک گئی تھی۔ وہ بھی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ گھنگھرو کی جھنکار گونجی۔ گو کہ آواز بہت ہلکی تھی مگر اسی وقت کسی گجر سے کم نہ تھی۔ وہ دونوں ہی اچھل پڑے تھے اور چونک کر آواز کا مخرج تلاش کرنے کے لیے دائیں بائیں دیکھنے لگے تھے اور تبھی وہ آواز پھر ابھری تھی۔

اس بار آواز کے مخرج کا صحیح اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ آواز سیڑھیوں کی طرف سے آئی تھی۔ غلام رسول فوراً ہی کرسی سے اٹھ گیا تھا اور دبے قدموں سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا۔ تبھی اس کی نظر ایک سفید ساڑھی میں ملبوس عورت کے ہیولے پر پڑی تھی۔ وہ عورت پل بھر کے لیے نظر آئی تھی اور آڑ میں چلی گئی تھی مگر چھن چھن کی آواز ہنوز آ رہی تھی۔ وہ کسی قسم کی آہٹ پیدا کیے بغیر اپنی جگہ سے آگے بڑھا اور سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ ایک قدم دو قدم کرتے ہوئے وہ نیچے اترتا چلا گیا۔

کیتھی بھی اس کے قدم سے قدم ملا کر اترتی چلی آئی تھی۔ وہ بھی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ ابھی تک اس نے جو کچھ سنا تھا وہ غلام رسول کی زبانی سنا تھا اس لیے وہ کچھ سہم گئی تھی اور غلام رسول کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔

غلام رسول نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے قدم اسی جانب اٹھ رہے تھے جدھر سے وہ آواز آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پاؤں میں گھنگھرو باندھے کوئی آگے آگے جا رہا ہے۔ آواز کے سہارے وہ دونوں اس کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں ایک بار پہلے بھی غلام رسول گیا تھا۔ اسے وہی پُراسرار عورت لے گئی تھی۔ جہاں چمکدار چہرے والا ایک شخص ملا تھا۔ اس وقت بھی رات تھی اور وہ گھنگھرو کی آواز پر کھنچا چلا جا رہا تھا۔

سیڑھیوں سے اتر کر وہ گلیارے میں پہنچا پھر اس کمرے میں داخل ہو گیا جس میں تہہ خانہ تھا۔ اس وقت تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نیچے اترتی سیڑھیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ انہی سیڑھیوں کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس سے صرف دو قدم پیچھے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیتھی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف ہی خوف تھا۔ بے چاری امریکہ میں رہی تھی۔ امریکہ والے یوں بھی مشرق کو پُراسراریت کی سرزمین کہتے ہیں۔ اب تک روح وغیرہ کے بارے میں اس نے صرف سنا تھا۔ آج پُراسراریت کا زندہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ چیخ چیخ کر روئے یا آواز دبا کر لوٹ جائے۔

وہاں سے بھاگنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن میں جان نہیں ہے۔ وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ غلام رسول اس سے آگے تھا اس لیے پہلے سیڑھیوں تک پہنچ گیا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، کیتھی نے بھی آگے بڑھنا چاہا مگر اسے ایسا لگا جیسے درمیان میں نادیدہ رسّی آ گئی ہو۔ وہ الجھ کر رک گئی تھی اور تہہ خانے کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ تمام مجاہدین اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ تین تین کی تعداد میں لوگ پیڑوں کو کاٹنے کے لیے کلہاڑیاں چلا رہے تھے۔ چنار کے اونچے اونچے پیڑوں پر کلہاڑیاں چل رہی تھیں ابھی تک ایک بھی پیڑ گرا نہیں تھا۔ احمد کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ دو پیڑوں کو باندھ کر پُل کا کام لے گا۔ دونوں پیڑ مل جاتے تو دوسری طرف جانے کا راستہ بن جاتا۔ عام حالت میں نالہ پار کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا مگر اس وقت نالے کی رفتار کئی گنا تیز تھی۔ اس عالم میں جو بھی نالے میں اترتا، بہہ جاتا۔

ابھی وہ لوگ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے کہ دوسرے کنارے پر سعیدہ نظر آئی۔ سعیدہ کا شمار اس علاقے کے سرگرم ہمدردوں میں ہوتا تھا۔ وہ مجاہدین کی بھرپور امداد کرتی تھی۔ کافی عرصہ پہلے اس کا بھرا پُرا گھرا تھا۔ دو بھائی تھے۔ ماں تھی اور ناز اٹھانے والا باپ تھا مگر ایک رات سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ ظلم کی تیز آندھی نے سب کچھ تباہ کر دیا تھا۔ وہ رات سعیدہ کی آنکھوں میں ہمہ وقت تازہ رہتی تھی۔

اس رات وہ سب سوئے ہوئے تھے کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی تھی۔ پھر وہ دستک تھپتھپاہٹ میں بدل گئی تھی پھر دروازے پر لات پڑنے لگی تھی۔ ایسا لگنے لگا تھا جیسے دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ سعیدہ کے باپ نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔ ”کون؟“

”دروازہ کھولو۔“ حکم کا انداز بتا رہا تھا کہ BSF یا پولیس ہے۔ دروازہ کھولے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ اندر آنے والے BSF کے جوان تھے جو بارڈر پر بھیگی بلی بنے کونے کھدروں میں چھپتے ہیں مگر نہتوں پر وار کرنا

سمجھتے ہیں۔ برسوں پہلے اسی ملک میں شیواجی راؤ تھا، بدنام ترین لٹیرا مگر متعصب ہندوؤں نے اسے ہیرو مان لیا تھا۔ یہ بھی اسی قوم کے فرد تھے۔ لوٹنا ان کی فطرت میں شامل تھی۔ وہ سب لوٹنے کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے اندر آتے ہی کہا۔ ”اے بڈھے! آتنک وادیوں کو کہاں چھپا رکھا ہے؟“

”سر! ہم لوگ غریب ہیں۔ ہمیں کسی سے کیا مطلب، محنت مزدوری کرتے ہیں۔“

”بہت بولتا ہے۔“ کہہ کر ایک نے رائفل کا دستہ اس کے چہرے پر مارا۔ چوٹ زبردست تھی۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔

شوہر کو خون میں لت پت دیکھ کر بیوی آگے بڑھی تو ایک دستہ اسے بھی لگا۔ وہ کراہ کر وہیں بیٹھ گئی۔ بی ایس ایف والے پھیل گئے۔ ادھر سے اُدھر تک ایک ایک چیز کو الٹ رہے تھے۔ گندم کے ”مٹار“ کو الٹ دیا۔ زعفران جمع کرنے کے ”کچکولیا“ کو گرا دیا۔ کپڑوں کے بکس کو خالی کر دیا۔ چند لمحے میں وہ کمرہ کباڑ خانے کا منظر پیش کرنے لگا۔ ان لوگوں نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ دیواروں پر بھی کندے مارے تاکہ مٹی کی دیواروں میں کہیں پر کوئی خفیہ خانہ ہو تو پتا چل جائے۔ ادھر سے فارغ ہوئے تو سب ایک ساتھ جمع ہو گئے۔ اس وقت ان کے سامنے صرف بڑے میاں اور بڑی بی تھیں۔ بچے سب چھت پر دبکے ہوئے تھے۔ وہ خود کو وہاں محفوظ سمجھ رہے تھے لیکن ان کا یہ خیال دیرپا ثابت نہ ہوا۔ ایک سپاہی اوپر پہنچ گیا اور ڈپٹ کر بولا۔ ”چلو نیچے چلو۔“

دوسرے بچوں کے ساتھ سعیدہ بھی نیچے آ گئی۔ نیچے پہنچ کر اس سپاہی نے کہا۔ ”لو بھئی جس کام کے لیے آئے تھے وہ تو ہو گیا مگر صرف ایک نگ ملا ہے۔“

اس کی بات سن کر سب کانپ گئے۔ یہ ایک عام سی بات تھی کہ ہر جوان لڑکی کو تفتیش کے بہانے کیمپ میں بلایا جاتا۔ تفتیش کے نام پر کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ سب کو تھا مگر واپس آنے والی کسی کو کچھ بھی بتاتی نہیں تھی۔ گھر آتے ہی خودکشی کر لیتی تھی۔

بی ایس ایف کے یہ بہادر اس گھر پر کیسے کیسے ظلم ڈھائیں گے، سعیدہ کو اس کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے خوف سے خود کو چھپا لیا تھا پھر وہی ہوا جس کا خوف تھا۔ ان کا افسر آگے بڑھا۔ اس نے سعیدہ کا ہاتھ پکڑا۔ چھوٹا بھائی تڑپ کر آگے بڑھا۔ اس کی اس جسارت پر اس افسر نے پستول نکالا اور اسے نوخیز شہید بنا دیا۔ اس کے سینے پر گول سا سرخ تمغہ لگا دیا۔ اسے تڑپتا دیکھ کر ماں لپکی، ماں کو آگے بڑھتے دیکھ کر اس کے سفید بالوں کو سرخ کر دیا۔ دو گولیاں چلی تھیں اور زندگی کی دو شمعیں بجھ گئی تھیں۔ اتنا بڑا سانحہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیکھ کر بوڑھا باپ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور وہ برابر میں کھڑے سپاہی کی رائفل چھین کر اس افسر پر آگ برسانے لگا تھا۔

ایک وردی پوش آقا پر محکوم ہاتھ اٹھائے یہ کون سہہ سکتا ہے؟ تمام بہادر اس بوڑھے پر ٹوٹ پڑے۔

تمام لاشیں پڑی رہ گئی تھیں اور وہ لوگ سعیدہ کو کھینچتے ہوئے کیمپ میں لے گئے تھے۔ پھر وہ ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں منتقل ہوتی رہی تھی۔ تقریباً سات ماہ بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ جب وہ واپس آئی تو کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ جو بات اظہر من الشمس ہو اسے پوچھنے کا فائدہ۔ بس وہ اپنے گھر میں بند ہو گئی تھی۔ اس کا یوں گوشہ نشین ہو جانا پڑوس کے دانا بابا کو پسند نہیں آیا تھا۔ وہ رشتے میں اس کے ماموں بھی تھے اس لیے انہوں نے اپنا فرض نبھانے کی سعی کی۔ اسے کھانا پہنچانے لگے۔ گزرتے وقت کے ساتھ سعیدہ کا غم بھی کم ہو گیا۔ وہ باہر نکلنے لگی۔ اب اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا مجاہدین کی امداد کرنا۔ یہاں بھی وہ اسی نیت سے آئی تھی اور دوسرے کنارے پر کھڑی ہو کر مجاہدین کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ احمد نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”دیکھ آدھا کام یہ کر دے گی۔ شاید اسے ہی معجزہ کہتے ہیں کہ خدا نے اسے بھیج دیا۔“

وہ سب سخت جان تھے۔ جہاد کی قوت نے انہیں قوی تر بنا دیا تھا۔ صعوبتوں میں پرورش پانے والے قوی ہوتے ہی ہیں۔ انہوں نے ایک پیڑ کو کاٹ گرایا پھر اس کی شاخیں اتنی آسانی سے کاٹ لیں جیسے وہ موم کی بنی ہوئی ہوں۔ جڑیں جو پھیلی ہوئی تھیں وہ ذرا مشکل سے صاف ہوئیں پھر اس تنے کو اٹھانے کی کوشش ہوئی لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ اس وقت تک ایک اور درخت کٹ چکا تھا۔ اس کے ساتھ زور آزمائی کرنے والے بھی ادھر ہی آ گئے۔ پھر دونوں تنوں کو باری باری لے جا کر اس مقام پر رکھا گیا جہاں پُل کی باقیات تھی۔ اب انہیں باندھ کر پانی میں ڈالنا تھا مگر یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ کوئی بھی چیز اپنی جگہ رک ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے روکنے کا بس ایک طریقہ تھا کہ پانی میں کوئی اترتا اور اسے سنبھال کر دوسرے کنارے پر ٹکاتا۔ جبکہ یہ اتنی آسان بات نہیں تھی۔ کوئی بھی شخص اس تیز بہاؤ میں پیر جما ہی نہیں سکتا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ کسی بھی وقت دشمن پہنچ سکتے تھے۔ تبھی پردیسر نے کہا۔ ”رسی سے کلہاڑی باندھ کر دوسری طرف پھینکو۔ وہ لڑکی اسے کسی پیڑ سے باندھ دے گی اور اس طرح کام ہلکا ہو جائے گا۔“

احمد نے کلہاڑی کو رسی میں باندھا اور پوری قوت سے نالے کی دوسری طرف پھینکا۔ نالے کی چوڑائی زیادہ تھی اس لیے وہ کلہاڑی فاصلہ طے نہ کر سکی اور کنارے پر پہنچنے سے کچھ پہلے ہی نالے میں گر گئی۔ اسے کھینچ کر احمد نے دوبارہ کوشش کی لیکن کامیابی ملی۔

لڑکی دوسری طرف کھڑی حیرت سے اس کوشش کو دیکھ رہی تھی۔ پانچویں یا چھٹی بار میں وہ کلہاڑی دوسری سمت کی پتھریلی زمین پر جا کر گری۔ احمد نے چیخ کر لڑکی سے کہا کہ وہ رسی کو پیڑ سے باندھ دے۔ لڑکی نے اسی طرح کیا۔ احمد نے رسی کھینچ کر مضبوطی کا اندازہ کیا پھر وہ رسی پکڑ کر پانی میں اتر گیا۔

دونوں طرف کے پیڑوں میں دونوں سرے بندھے تھے اس لیے اسے آگے بڑھنے میں آسانی ہو رہی تھی مگر پانی کا بہاؤ بھی کم نہیں تھا۔ پانی کا ریلا اس سے ٹکرا کر اسے اچھالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر وہ اپنی جگہ ڈٹا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر اس نے اشارہ کیا کہ پیڑ کا تنا آہستہ آہستہ آگے بڑھایا جائے۔

مجاہدین نے پیڑ کے تنے کو دھیرے دھیرے آگے بڑھانا شروع کیا۔ یہ کام بھی خاصہ دشوار تھا کیونکہ پانی سے ٹچ ہوتے ہی پانی کا ریلا اسے بہانے کی پوری کوشش کرتا اس لیے تمام لوگوں نے مل کر تنے کو کچھ اوپر اٹھا رکھا تھا۔ تا کہ وہ پانی سے اوپر رہے اسی حالت میں وہ تنا انچ انچ سرکتا ہوا احمد کے پاس پہنچ گیا۔ احمد نے اسے بائیں ہاتھ سے تھام لیا اور دھیرے دھیرے مزید آگے بڑھنے لگا۔ کنارے پر جب اس تنے کا بہت تھوڑا حصہ باقی رہ گیا تو اس نے تنے کو رسے سے باندھ دیا اور پھر دوسرے تنے کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔ وہ تنا جب پہلے والے کے برابر آ گیا تو اس نے علی سے کہا۔ ”تم تنے کو کندھے پر رکھ کر آگے بڑھو۔“

علی نے داہنے ہاتھ سے رسی پکڑی اور بائیں ہاتھ سے کندھے پر لدے تنے کا دوسرا سرا احمد کے کندھے پر تھا وہ بھی اسی طرح رسی پکڑے آگے بڑھ رہا تھا۔ جب اس تنے کا اگلا حصہ کنارے پر پہنچ گیا تو احمد نے کہا۔ ”اب اسے باندھ دو علی!“

علی نے اپنی کمر میں باندھی رسی کو کھولا اور اس سے تنے کو ملا کر باندھنے لگا۔ دونوں تنے آپس میں بندھ گئے تو پل جیسی چیز تیار ہو گئی تب اس نے اشارہ کیا کہ ایک ایک کر کے لوگ آتے جائیں۔

بارود کو پانی سے بچانا ہی اصل مقصد تھا ورنہ رسی پکڑ کر تیر کر بھی نالہ پیار کیا جا سکتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھا۔ وہ سب تنے پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ آگے کھسکنے لگے۔ ایک کے بعد ایک تقریباً سب نے نالا پار کرلیا۔ آخر میں پروفیسر اور زخمی کو دوسرے کنارے پر پہنچایا گیا۔

دوسرے کنارے پر پہنچ کر انہوں نے رسی کاٹ دی۔ اتنی مشکلوں سے باندھے گئے تنے پانی کے ریلے میں بہہ گئے۔ اب وہ لوگ محفوظ تھے پھر بھی وہاں رکے نہیں جلدی جلدی آگے بڑھتے چلے گئے۔

اب وہ لوگ اتنی دور آچکے تھے کہ دوسرے کنارے سے نشانہ لینا بھی آسان نہیں تھا۔ تب ہی ان سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور ان سب نے خود کو زمین پر گرا لیا پھر سینے کے بل رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اس احتیاطی تدبیر کی وجہ وہ سپاہی تھے جو دوسرے کنارے پر کھڑے بے بسی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ سب ابھی ابھی پہنچے تھے۔

''ارے مردارو، فائر کیوں نہیں کرتے۔'' کسی کی آواز گونجی اور سپاہیوں کو جیسے ہوش آ گیا تھا۔ انہوں نے گولیوں کی بارش کر دی نالے کے بعد ڈھلان تھی اس لیے وہ بہت حد تک محفوظ تھے ورنہ کرولنگ کے باوجود چھلنی ہو جاتے۔ گولیاں برستی دیکھ کر ان لوگوں نے اب تیزی سے کرولنگ شروع کر دی تھی۔ ڈھلان کی وجہ سے وہ آسانی سے آگے بڑھنے لگے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ خدا کا شکر بھی ادا کر رہے تھے کہ وہ اتنے بڑے معرکہ کو سر کر آئے ہیں۔ مال غنیمت کے طور پر اچھی خاصی مقدار میں گولہ بارود بھی اٹھا لائے تھے۔ ہینڈ گرینیڈ، راکٹ مع لانچر اور اسٹین گنز کے تین بورے پیٹھ پر لدے ہوئے تھے۔ اب انہیں کئی ماہ تک نئے اسلحے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس خیال سے وہ سرشار تھے۔

سب کے چہروں پر خوشی تھی کیونکہ اب وہ بالکل محفوظ علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ بھارتیوں کے لیے نالہ پار کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ انجینئرنگ کورپ کو بلا کر پل بناتے بناتے مجاہدین قصبے تک پہنچ جاتے۔

چونکہ اب ڈھلان ختم ہو چکی تھی اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ کھیتوں کے بعد یہ سڑک تھی۔ یہ سڑک کنٹرول لائن سے چلتی تھی اور قصبہ تک پہنچ کر بارہ مولا کی طرف مڑ جاتی تھی۔ اسی کی ایک شاخ گنگوتری کی طرف مڑ جاتی تھی جہاں سے گنگا ندی نکلتی تھی۔ اس مقام کو ہندوؤں نے مقدس مقام کا نام دے رکھا ہے۔ ہندو مذہب میں کہا گیا ہے کہ گنگا ندی شیوشنکر کی جٹا (چوٹی) سے نکلی ہے۔ ایسی بے وقوفی کی بات پر پڑھے لکھے لوگ بھی یقین کرتے ہیں کہ انسانی چوٹی سے اتنی بڑی ندی نکلی۔ بات کچھ بھی ہو مگر ہر سال

ہزاروں کی تعداد میں اس مقام پر پوجا کرنے بھارت کے کونے کونے سے ہندو آتے ہیں۔

احمد اور اس کے ساتھیوں کو نہ بارہ مولا جانا تھا نہ گنگوتری اور نہ ہی کنٹرول لائن کی طرف، اس وقت تو وہ قصبہ پہنچنا چاہتے تھے تاکہ ہتھیاروں کو چھپا سکیں پھر کہیں جا کر علی اور پروفیسر کو اجازت ملتی کہ وہ کنٹرول لائن پار کریں۔

پروفیسر عثمان نے جوش میں آکر جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس میں کامیابی مل گئی تھی اس لیے وہ لوگ انہیں روکنے کا جواز نہیں رکھتے تھے۔ اس بات سے پروفیسر عثمان بھی خوش تھے اور تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے تاکہ جلد از جلد منزل مقصود پر پہنچ جائیں۔

سڑک اب قریب آچکی تھی۔ جہاں سے سواری با آسانی مل جاتی اس لیے بھی وہ سب جلد بازی کر رہے تھے کہ سب کے سب چونک گئے۔ جدھر سے وہ لوگ آرہے تھے اس طرف سے گڑگڑاہٹ سنائی دی تھی۔ اس آواز کو سب نے پہچان لیا تھا سب کے چہروں پر پریشانی کی جھلک آگئی تھی۔ وہ آواز ہیلی کاپٹر کی تھی، شاید اس کے ذریعے ان کی تلاش شروع ہو چکی ہے۔

☆======☆======☆

غلام رسول تہہ خانے کے اندر تھا اور کیتھی باہر، تب ہی دروازہ بند ہو گیا۔ کیتھی نے گھبرا کر آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔ اس کی چیخ و پکار پر تمام نوکر جمع ہو گئے تھے اور بند دروازے پر کندھوں سے ضرب لگا رہے تھے۔ دیودار کی لکڑیوں سے بنا دروازہ ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ جبکہ دوسری طرف غلام رسول ہر جانب سے بے خبر گھنگھرو کی آواز پر کھنچ رہا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک سیڑھیاں طے کرتے ہوئے نیچے اترتا جا رہا تھا۔ تہہ خانے میں گھپ اندھیرا تھا صرف آواز گونج رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی گھنگھرو چھنکاتے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

بالآخر سیڑھیاں ختم ہو گئیں۔ وہ تہہ خانے میں اتر چکا تھا اور اب اندازے سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی نادیدہ ڈور میں بندھا کھنچا جا رہا ہو۔ ابھی وہ تہہ خانے کے درمیان میں پہنچا ہی تھا کہ زوردار دھماکہ ہوا۔ اس دھماکے نے اس کے ذہن پر چھائی دھند کو ختم کر دیا۔ اس نے مڑ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ دروازہ ٹوٹ چکا تھا اور سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے چوکیدار اور باورچی کئی دوسرے نوکروں کے ساتھ اندر داخل ہو رہے تھے۔ کیتھی بھی ان کے ساتھ تھی۔

''ٹارچ لاؤ، ٹارچ لاؤ۔'' کیتھی نے آواز دی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ سب سیڑھیاں طے کرتے ہوئے نیچے اتر رہے تھے کہ غلام رسول نے کہا:

''تم......تم لوگ کیوں آ گئے؟''

''خیریت تو ہے؟'' کیتھی نے کہا۔ ''ہم سب لوگ پریشان ہو گئے تھے کہ تم کسی مصیبت میں تو گرفتار نہیں ہو گئے۔''

''مصیبت میں تو نہیں مگر وہ ایک آواز...... گھنگھرو بجنا کیوں بند ہو گئے؟'' غلام رسول بولا۔

ایک نوکر ٹارچ لے آیا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں سوئچ بورڈ ڈھونڈا اور سوئچ آن کر دیا۔ تہہ خانہ ٹیوب لائٹ کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ غلام رسول ہی نہیں تقریباً سب حیران تھے کیونکہ تہہ خانہ بالکل خالی تھا۔ ان کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں تھا۔

''اگر یہاں کوئی نہیں تو پھر وہ گھنگھرو کی آواز کیسی تھی؟'' غلام رسول نے کہا۔

''گھنگھرو کی آواز تو میں نے بھی سنی تھی۔'' کیتھی بولی۔ ''اسی آواز کے تعاقب میں ہم ادھر آئے تھے۔''

''پتا نہیں یہ کیسا گورکھ دھندا ہے۔ میرا تو دماغ ماؤف ہونے لگا ہے۔ اتنے دنوں تک انگلینڈ اور امریکہ میں رہے مگر وہاں ایسی کوئی بات نہ دیکھی۔ یہاں آتے ہی پروفیسر نے قسط وار خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ میں اس کا مذاق اڑا رہا تھا کہ بالکل ویسا ہی خواب مجھے نظر آنے لگا اور آج گھنگھرو کی آواز نے کھینچ لیا۔ پہلے بھی ایسے ہی حالات سے سابقہ پڑ چکا ہے۔'' غلام رسول جھلاہٹ بھری آواز میں بولتا ہی چلا گیا۔

''صاحب جی! آپ نے گھنگھرو کی آواز سنی تھی؟'' انور علی نے کہا۔

''ہاں۔''

''وہ ادھر دیوار پر دیکھیے۔''

''وینٹی لیشن کے برابر میں گھنگھرو کی جوڑی لٹک رہی تھی۔ لگتا تھا کسی نے ابھی ابھی اسے کھول کر لٹکایا ہو۔

وہ سب حیرت سے گھنگھرو کی جوڑی کو دیکھنے لگے۔

''چلو بھئی یہ راز تو کھلا۔ وینٹی لیشن سے آتی ہوا سے گھنگھرو کی جوڑی ہلتی ہوگی جسے سن کر ہم دوڑے چلے آئے۔'' کیتھی بولی۔ ''اب باہر نکل چلو۔ یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

وہ سب باہر آ گئے۔ کیتھی اور غلام رسول اسٹڈی میں آ کر بیٹھ گئے۔ انور علی کو وہ کسی کام کے لیے کہہ آئے تھے۔

''ان سب باتوں پر تمہاری کیا رائے ہے؟'' غلام رسول نے کیتھی سے پوچھا۔

''بھئی میں ٹھہری یورپی اور تم مشرق کے جسے ہم پُراسرار سرزمین کہتے ہیں۔ تم ہی بہتر بتا سکتے ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ کوئی یہ نہیں چاہتا کہ ہم یہاں رہیں۔''

''کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ یوں بھی اس گاؤں کے لوگ بڑے سیدھے سادے ہیں۔''

''یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ پہلے ہمیں Rebirth کے چکر میں ڈالنے کی کوشش ہوئی پھر پُراسرار چکر چلنے گا۔''

''میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ایک پسماندہ علاقہ ہے۔''

''اصل خطرہ ہمیں اس علاقے سے نہیں، باہر کے لوگوں سے ہے۔ پروفیسر کی شخصیت معمولی نہیں ہے۔ بڑے بڑے ملکوں کے لوگ کبھی بھی یہ نہیں چاہیں گے کہ پاکستان کا کوئی سائنٹسٹ کوئی بڑا تجربہ کرے۔ پروفیسر کا تجربہ کامیاب ہو جاتا ہے تو دنیائے سائنس میں انقلاب آ جائے گا۔''

''مگر باہر والوں کو علم کیسے ہوا کہ پروفیسر اتنے پسماندہ علاقے میں رہ رہے ہیں؟''

''معمولی سی بات ہے جب تم ہم لوگوں کو ڈھونڈتی ہوئی یہاں پہنچ سکتی ہو تو کیا بڑے بڑے گھاگ لوگ یہاں نہیں پہنچ سکتے۔ بھول گئیں ایک دن کچھ لوگ جیپ میں آئے تھے اور حویلی کے سامنے فائر کر کے چلے گئے تھے اس فائرنگ کا کیا مطلب تھا؟''

''میری مانو تو عقل لگانا چھوڑ کر دوسرے کاموں پر دھیان دو۔'' کیتھی بولی۔

''جب ذہن بار بار ادھر کھنچ رہا ہے تو کیسے میں اپنی توجہ کسی اور جانب مبذول کروں؟'' غلام رسول نے بے چارگی سے کہا۔

''اس کا ایک ہی علاج ہے تم اس پیڑ کی طرف چلے جاؤ جہاں جا کر تمہیں قسط وار خواب نظر آ رہے ہیں۔''

''ہاں مجھے وہاں ضرور جانا چاہیے تاکہ میں اس پیڑ کا راز جان سکوں کہ آخر اس میں کون سی خاص بات ہے۔''

''ٹھیک ہے تو ابھی جاؤ تاکہ مجھے بھی اس کا راز معلوم ہو جائے۔''

''تم معلوم کر کے کیا کرو گی؟''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اس کی قلم لے جا کر امریکہ میں لگاؤں گی، جب پیڑ گھنا ہو جائے گا تو بورڈ لگا دوں گی دو دو ڈالر میں خواب دیکھو، خوب آمدنی ہو گی۔ لائن لگ جائے گی۔" کیتھی نے ہنس کر کہا۔

"تم میری باتوں کو مذاق سمجھ رہی ہو، چلو میرے ساتھ۔ ابھی معلوم ہو جائے گا میں سچ بول رہا ہوں یا جھوٹ۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے چلو۔" کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ دونوں اسی پیڑ کی طرف چل دیے۔

☆======☆======☆

ہیلی کاپٹر کی آواز سنتے ہی مجاہدین دبک گئے تھے۔ گندم کے لہلہاتے کھیت کا کیمو فلاج کر لیا تھا۔ سب کے سب دم سادھے، سانس روکے پڑے تھے انہیں یقین ہو چلا تھا کہ ہیلی کاپٹر ان کی تلاش میں آیا ہے مگر وہ ان پر سے گزرتا ہوا کنٹرول لائن کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ اس پر بھارتی ہوائی فوج کا نشان بنا ہوا تھا۔ شاید یہ مشق کرنے والی پرواز تھی۔

"اسی کو کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا۔" احمد قہقہہ لگا کر بولا تو سب کھل کھلا اٹھے۔ ایک بار پھر یہ چند نفوس پر مشتمل قافلہ سڑک کی جانب چل پڑا۔

سڑک پر پہنچ کر لڑکی نے انہیں الوداع کہا اور اپنے راستے پر چل دی جبکہ باقی سب وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔ انہیں انتظار تھا کہ قصبے کی جانب جانے والا کوئی نہ کوئی ٹرک مل جائے گا۔

"پروفیسر صاحب ایک بات پوچھوں؟" احمد نے کہا۔

"فرمائیں۔"

"پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ میں نے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھا ہے؟" احمد بولا۔

"تم نے شاید غور نہیں کیا، ان کا چہرہ اس تصویر سے ملتا ہے جو مولانا باقر کے گھر میں لگی ہوئی ہے۔ اسد الکبیر کی شباہت بہت زیادہ ہے شاید انہی کی تصویر تم نے دیکھی ہو گی۔" کمانڈر علی بولا۔

"ہاں یاد آ گیا، واقعی یہ اسد الکبیر کی کاپی ہیں۔" احمد کے لہجے میں حیرت تھی۔ "مگر وہ تو عرب تھے اور یہیں کہیں دفن ہیں جبکہ یہ پنجابی اسپیکنگ ہیں پھر اتنی زیادہ مشابہت

کیوں؟"

"میں بتاتا ہوں۔" پروفیسر نے کہا تو سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"جب تک گاڑی نہیں آ جاتی اسی بہانے وقت گزر جائے گا۔" احمد بولا۔

"جب میں امریکہ میں مقیم تھا تو ایک سائنس میگزین میں بہت دلچسپ کہانی پڑھی تھی۔ پہلے وہ کہانی سن لو۔" پروفیسر عثمان نے کہا۔ "وہ کہانی ایک سائنس دان کی تھی۔ اس کا نام ڈاکٹر سالوے تھا۔ وہ اپنے فرانسیسی اسسٹنٹ مارسلے کے ساتھ مل کر ایک خاص تجربہ کر رہا تھا۔"

"کس قسم کا تجربہ؟" کمانڈر علی نے پروفیسر کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر سالوے دراصل جینٹک سائنٹسٹ تھا۔ جینین پر تجربہ کر رہا تھا۔ شاید آپ کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ انسان دراصل خلیے کا مجموعہ ہے۔ ایک انسان کے جسم میں ستر ٹریلین خلیے ہوتے ہیں۔ ہر خلیے کا کام الگ الگ ہے مگر ان میں اتنی گہری ہم آہنگی، اتنا زیادہ ڈسپلن ہے کہ عام انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہر خلیہ اپنے اندر ایک کارخانہ ہے۔ ایک پوری دنیا ہے۔ اس کے اندر پاور ہاؤس ہے جو ایندھن فراہم کرتا ہے۔ اس میں پروڈکشن ہیں ہے۔ اس میں خام مال کی درآمد اور تیار مال کی برآمد کے علاوہ فضلہ کی نکاسی کا انتظام ہے اور ان تمام کاموں کا نگراں ہے۔ لیکن یہ نظام یہیں ختم نہیں ہے۔ خلیے کے نظام کو صحیح رکھنے کے لیے بھی منتظم ہے جس کا حکم ملتے ہی، جس کام کے لیے جو خلیے مختص ہیں، وہ فوراً کام پر لگ جاتے ہیں۔ ادھر آپ نے سوچا کہ داہنے ہاتھ کی درمیانی انگلی کو حرکت دینا ہے ادھر ہزاروں خلیے ایندھن لے کر چل پڑے۔ کئی ہزار خلیے متحرک ہوئے اور وہ انگلی حرکت کرنے لگی۔ جیسا حکم ملا اسی انداز میں حرکت ہوئی۔ کس خلیے کو کون سا کام انجام دینا ہے۔ یہ سب کچھ پہلے سے DNA میں درج ہوتا ہے۔"

"یعنی DNA ان کا منتظم اعلیٰ ہے۔" احمد نے پوچھا۔

"یہی سمجھ لیں، لاکھوں بلکہ ہزاروں خلیے کے حاکم DNA آپ کے جسم میں ہیں اور ان سب کا ایک دوسرے سے رابطہ بھی ہے۔ ایک ہی خلیہ کان کی لو بھی بناتا ہے اور ناخن و بال بھی مگر انہیں کنٹرول میں DNA رکھتا ہے اگر وہ حکم نہ دے تو خلیے کچھ کا کچھ کر دیں۔ آپ کی پیشانی پر دانت اگنے لگیں اور زبان پر بال کیونکہ تمام خلیوں میں ایک جیسی قوت پیداوار ہوتی ہے۔ وہی خلیے یادداشت بھی بڑھاتے ہیں اور قوتِ سماعت بھی، ڈاکٹر سالوے اسی نہج پر کام کر رہا تھا۔ وہ اپنے کام سے اتنا مخلص تھا کہ بیوی کو بھی صحیح طور پر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وقت نہیں دیتا تھا جس کی شکایت وہ اس کے اسسٹنٹ سے کرتی رہتی تھی۔ ایک دن اس کی بیوی ہیلن نے جھلا کر پوچھا کہ تم لیبارٹری میں گھسے دن رات کیا کرتے رہتے ہو، اتنے انہماک سے کون سا تجربہ کر رہے ہو۔ ڈاکٹر سالوے بولا کہ تم نے دیکھا ہوگا پرندے کس ہنرمندی سے کسی مشین، کسی اوزار کی مدد کے بغیر گھونسلہ بنا لیتے ہیں۔ بعض پرندے تو اتنا عمدہ گھونسلہ بناتے ہیں کہ ان کی ہنرمندی قابلِ تعریف ہوتی ہے۔''

''جی ہاں بیا کا گھونسلہ میں نے بھی دیکھا ہے۔ واقعی ہنرمندی کا شاہکار ہوتے ہیں۔ ہر گھونسلے میں اندر ہی اندر کئی منزلیں ہوتی ہیں۔'' کمانڈر علی بولا۔

''اب یہ سوچو کہ یہ کام اسے کس نے سکھایا۔ نہ جانے کتنی نسلوں قبل ان کے آباؤ اجداد میں سے کسی نے ایسا گھونسلہ ایجاد کیا ہوگا وہی ہنر لاکھوں سال سے ورثے میں منتقل ہو رہا ہے۔ اسی طرح مکڑی کا جالا انجینئرنگ کا شاہکار ہے دیگر جانوروں کو بھی ایسے ہی ہنر ورثے میں ملے ہیں مگر انسان میں یہ قوت نہیں ہے۔ انسان کا بچہ سب کچھ ابتدا سے ہی سیکھتا ہے۔ باپ دادا کی ایک دو عادات کے علاوہ اسے ورثے میں کچھ نہیں ملتا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے؟'' احمد نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''انسان کے پاس جتنا علم ہے، ایک شہد کے چھتے کی تیاری اور اس کا نظام اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور مشکل کام ہے۔ جب ایک شہد کی مکھی میں یہ علم خود بخود نسل در نسل منتقل ہو سکتا ہے تو انسان کا علم اس کی اگلی نسل میں منتقل کیوں نہیں ہو سکتا۔''

''واقعی یہ بات غور طلب ہے۔'' احمد نے کہا۔

پروفیسر اپنی رو میں بولتے رہے۔

''ڈاکٹر نے اپنی بیوی کو بتانا شروع کیا کہ میں نے اس رخ پر تجربہ کرنا شروع کیا ہے کہ یقینی طور پر اگلی نسل میں علم کی منتقلی کے راستے میں کوئی رکاوٹ ہے۔ لگاتار تجربے نے کامیابی بھی دی ہے۔ دراصل DNA متحرک نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے کام اس انداز سے نہیں کر رہا ہے جس کی ضرورت ہے۔ ان افعال کو انجام نہ دینے کی وجہ سے آہستہ آہستہ DNA اس طرف توجہ دینا بند کر چکا ہے اگر ہم اس کلیو کو متحرک کر دیں تو کام نہایت آسان ہو جائے گا۔''

''یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے میرے علم کے مطابق ستر ہزار DNA فعال ہوتے ہیں۔'' ہیلن نے کہا تھا۔

''میں نے ایسی دوا تیار کر لی ہے کہ اسے انجیکٹ کر دیا جائے یا کھانے میں شامل کر دیا جائے تو یقیناً اپنا اثر دکھائے گی اور تمام DNA ایک مخصوص کوڈ نشر کرنا شروع کر دیں گے جس سے اس جاندار میں منتقل ہونے والا DNA اتنا فعال ہوگا کہ نومولود میں اس کے بزرگوں کا تجربہ بھی منتقل ہو جائے گا اس طرح پیدا ہونے والا بچہ لاکھوں میں ایک ہو گا۔ اسے تجربے کی سیڑھی طے کرنے کے لیے وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی وہ تجربہ کار پیدا ہوگا۔''

''اور یہ سوچا ہے کہ اس کے نقصانات کتنے ہیں؟ بچے کے باپ میں جتنی بری عادتیں ہوں گی وہ سب اس میں آ جائیں گی۔ اس طرح تو یہ دنیا جہنم بن جائے گی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے، میں بعد میں اس نہج پر بھی کام کروں گا کہ صرف مخصوص یادداشتوں کا کوڈ، ڈی کوڈ ہو۔ تمام باتیں ہو بہو نہ یاد آئیں۔ میں تو صرف ترقی کا راستہ کھولنا چاہتا ہوں۔ میڈیکل سائنس میں انقلاب لانا چاہتا ہوں۔'' ڈاکٹر سالوے نے کہا۔ ''اور میرا تجربہ کامیاب رہا ہے۔ گزشتہ دنوں میں نے چوہوں پر تجربہ کیا تھا۔ ایک چوہیا پر میں نے دوا آزمائی پھر اسے مختلف قسم کے تجربوں سے گزارا۔ ان تجربوں میں سے ایک تجربہ یہ بھی تھا کہ اسے ایک نہایت پیچ دار سرنگ میں سے کھانے تک پہنچایا آہستہ آہستہ وہ اچھی طرح سے واقف ہو گئی اور بغیر بھٹکے کھانے تک پہنچنے لگی پھر میں نے اس کا ملاپ کرایا۔ بچے پیدا ہوئے تو انہیں الگ جگہ رکھا۔ ایک مہینے بعد جب وہ کچھ بڑے ہو گئے تو میں نے انہیں دو دن تک بھوکا رکھا پھر انہیں اسی سرنگ میں چھوڑ دیا جہاں کبھی اس کی ماں رہتی تھی۔ یقین کرو وہ بچے بغیر بھٹکے انتہائی پیچیدہ سرنگ میں سے گزر کر کھانوں تک پہنچ گئے۔ اس طرح کئی دوسرے جانوروں پر بھی تجربہ کر چکا ہوں۔''

اس کی بات ختم ہوئی تھی کہ ہیلن آپے سے باہر ہو گئی اس نے غصے میں کہا۔ ''تم اپنا یہ شیطانی تجربہ بند کر دو ورنہ بہت برا ہوگا۔''

ڈاکٹر سالوے نے بڑی مشکلوں سے اپنی بیوی کو ٹھنڈا کیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس کی بیوی نے پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے تم اپنے اسسٹنٹ مارسلے کو نوکری سے برخاست کر رہے ہو؟''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہاں! وہ اتنے دنوں میں بھی صحیح طرح سے انگریزی نہیں سیکھ سکا اور فرنچ نہیں سمجھتا نتیجتاً تجربہ کرتے وقت بہت زیادہ پریشانی کا سامنا ہوتا ہے پھر وہ اپنی منطق بھی مجھ پر تھوپنے لگا ہے اس لیے میں اسی ہفتے اسے برخاست کر رہا ہوں۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈاکٹر نے واقعی اپنے اسسٹنٹ کو نکال باہر کیا۔ وہ بیچارہ واپس فرانس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر زیادہ وقت بیوی کو دینے لگا۔

وقت بڑے اچھے انداز سے گزر رہا تھا کہ ایک رات ہیلن کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ ایک اچھی خبر تھی مگر وہ کانپ اٹھی۔ اس وقت اس کا شوہر بے خبر سو رہا تھا کہ اس نے اسے اٹھا دیا پھر بولی۔ "تم نے آخر کار مجھے بھی تجربہ گاہ کی چوہیا بنا دیا۔ اب میں سمجھی تم بار بار اپنے ہاتھوں سے کھانا کیوں کھلا رہے تھے۔ تم کھانوں میں دوا ملا کر مجھے کھلاتے رہے ہو۔"

ڈاکٹر سالوے نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "تمہیں اس پر فخر ہونا چاہیے کہ تم ایک ایسے بچے کی ماں بننے والی ہو جو اپنی مثال آپ ہو گا۔ اگر میرا یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو تمہارا نام تاریخ میں زندہ جاوید بن جائے گا۔ یہ تجربہ انسانی زندگی کا رخ بدل دے گا۔ نسلِ انسانی صرف ایک جست میں نہ جانے کتنا فاصلہ طے کر لے گی۔"

بہت مشکلوں سے اس نے بیوی کو ٹھنڈا کیا تھا ورنہ وہ طلاق لینے پر تل گئی تھی۔ ڈاکٹر نے طلاق کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا نقشہ اتنے بھیانک انداز میں کھینچا کہ صبح ہونے تک ہیلن کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے خود کو حالات کے رحم پر چھوڑ دیا تھا لیکن اب وہ شوہر سے قطع تعلق کر چکی تھی۔ نہ وہ اس سے کوئی بات کرتی اور نہ کسی بات کا جواب دیتی۔ اس نے الگ کمرے میں سونا شروع کر دیا تھا۔

☆======☆======☆

وہ دونوں آگے پیچھے اس مقام تک پہنچے تھے جسے یہاں کے لوگ مقامِ نحس کہتے تھے کیونکہ یہیں وہ کھڈ تھا جس کے بارے میں علی مدد شاہ کے خاندان میں یہ بات پھیلی ہوئی تھی کہ جب ان کے مرد چالیس سال کے ہو جاتے ہیں تو اس کھڈ میں گر کر معذور ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے اس طرف ان کے خاندان کا کوئی فرد نہیں آتا تھا۔ غلام رسول اور پروفیسر کو بھی یہاں آنے سے منع کیا گیا تھا مگر وہ دونوں ہی بلا خوف ادھر جاتے تھے۔

غلام رسول نے وہاں پہنچ کر کہا۔ "میں تو چلا اس پیڑ کے نیچے آرام کرنے تاکہ ادھورے خواب کی اگلی کڑی دیکھ سکوں۔"

"تم وہاں تو میں یہاں۔" کہہ کر کیتھی ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔

غلام رسول کے قدم اس پیڑ کی طرف اٹھنے لگے پھر وہ جا کر اس پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو

گئیں، پتا نہیں یہ اس پیڑ کا کمال تھا یا نفسیاتی اثر کہ وہ کچھ ہی دیر میں گہری نیند سو گیا۔ ادھر اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر اس کے ذہن کے دریچے کھلتے چلے گئے۔ وہ دوبارہ اسی منظر میں دیکھنے لگا۔ اسی پیڑ کے پیچھے وہ کھڑا تھا جہاں اسد الکبیر اور زونو بیٹھے تھے۔ زونو کسی بات پر خفا ہو کر جا رہی تھی کہ اسد الکبیر بولا۔ "خدا کے لیے رک جاؤ۔" لیکن وہ رکی نہیں تب ہی پیڑ کے پیچھے کھڑے احسن نے آگے بڑھنا چاہا تھا کہ اس کا پیر رپٹ گیا۔ وہ گرتے گرتے سنبھلا پھر آگے بڑھا۔ اسد الکبیر کی پیٹھ اس کی طرف تھی اس لیے وہ دیکھ نہیں پایا تھا کہ احسن، اس کا دشمن نمبر ایک اس کے پیچھے پہنچ چکا ہے۔ وہ تیزی سے ڈھلان اترتی جا رہی تھی۔ احسن کی نگاہیں بھی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں مگر وہ نگاہیں پیار کی نہ تھیں، اس کی نگاہوں میں حسد کی آگ تھی۔ وہ اب اتنا آگے آ چکا تھا کہ اسد الکبیر اس سے صرف دو ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ آہٹ سن کر اس نے مڑ کر دیکھا، احسن کو دیکھتے ہی وہ چونک کر کھڑا ہو گیا۔ احسن نے دو قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "کیوں اجنبی! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں اجنبی نہیں ہوں، تمہارا سردار مجھے محسن کہتا ہے۔" اسد الکبیر نے غرا کر جواب دیا۔ دونوں ایک دوسرے کو غصیلی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"محسن ہو گے سردار کے لیکن میں یہاں کا سپہ سالار ہوں اس لیے اس سلطنت میں آنے والے ہر غیر ملکی کو شک کی نظروں سے دیکھنا میرا فرض ہے۔"

"یہ بھول گئے کہ جب دشمن نے حملہ کیا تھا تو سب سے پہلے ہتھیار پھینک کر بھاگنے والوں میں تم تھے۔ یہ میری ذات تھی جس نے دشمنوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اتنا منظم حملہ اکیلے پسپا کیا۔ رہا سوال غیر ملکی ہونے کا تو جناب آپ بھی تو نگار کے نہیں ہیں، گلگت سے آئے ہیں۔ گلگت سے آنے والے کے لیے بھی یہاں کی سرزمین اجنبی کہلائے گی۔"

اسد الکبیر کے اکھڑ لہجے میں جتائی گئی باتیں سچائی کا مرقع تھیں پھر بھی احسن کے دل پر تیر کی طرح لگیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے تلوار کے دستے پر جھٹکے سے ہاتھ رکھا تھا کہ اسد الکبیر نے اس سے بھی زیادہ پھرتی دکھائی۔ وہ اچھل کر پیچھے ہو گیا اور اسی تیزی سے اپنی تلوار کو بے نیام کر لیا۔

احسن کو احساس تھا کہ وہ اپنے علاقے میں سب سے بہتر شمشیر زن ہے مگر وہ عرب کے اس جوان سے زیادہ پھرتیلا اور تلوار بازی میں طاق نہیں ہے اس لیے پیچھے ہٹ

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیا۔ اس کی طرف زونو کا باپ تھا، یہاں کے امراء تھے مگر عوام کا دل اسد الکبیر کے ہار پر دھڑکتا تھا اگر لوگوں کو پتا چل جائے کہ وہ شمشیر زنی میں اسد الکبیر سے ہار گیا ہے تو لوگ اسے سپاہ سالار کے عہدے سے بھی محروم کر دیں گے۔ عوام کی طاقت سب سے اہم ہے اس لیے ہی وہ مڑ گیا تھا، مڑتے مڑتے بولا تھا۔ ''مجھے صرف زونو کی عزت پیاری ہے اگر میں تم سے دو دو ہاتھ کرتا ہوں تو یہ خبر عوام تک پہنچے گی اور زونو بدنام ہو جائے گی۔ جاؤ میں نے معاف کیا۔'' کہہ کر وہ مڑ گیا۔ اسد الکبیر کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ وہ کچھ کہتا کہ احسن دوبارہ بول اٹھا۔ ''ہاں یاد رہے یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری طرف سے غافل ہوں، بس مجھے تمہاری غریب الوطنی پر رحم آ جاتا ہے کہ پردیسی ہو، بے وطن ہو۔''

''سنو، دریا دلی کے موجود اعظم! زیادہ بک بک نہ کرو ورنہ منصف بننے کے لیے تلوار کو زحمت دینا پڑے گی۔''

اس دھمکی کا اثر الٹا پڑا اور احسن تلوار سونت کر پلٹ آیا۔

خواب کی حالت میں بھی غلام رسول کو ایسا لگ رہا تھا جیسے احسن کے روپ میں وہ خود ہے اور اسد الکبیر کی جگہ پروفیسر عثمان، وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل اس طرح کھڑے تھے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو نگل جائیں گے۔

☆======☆======☆

الگ کمرے میں سو کر بھی وہ ڈاکٹر سالوے سے الگ نہیں ہو سکی تھی۔ آخر کار وہ اس کا شوہر تھا۔ شوہر سے ناراض تو ہوا جا سکتا ہے، ہمیشہ کے لیے الگ نہیں۔

ڈاکٹر سالوے بھی بیوی سے الگ ہو کر الگ نہ ہو پایا تھا۔ وہ اپنے تجربے کا نتیجہ جاننے کے لیے بے چین تھا۔

پروفیسر عثمان سواری کے انتظار میں کھڑے ساتھیوں کو اکتاہٹ سے بچانے کے لیے کہانی سنائے جا رہے تھے۔ یہ کہانی اتنی دلچسپ تھی کہ سب کے سب ہمہ تن گوش تھے۔ پروفیسر عثمان نے سلسلہ کلام کو آگے بڑھایا۔

''بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب وہ بیوی کو لے کر میٹرنٹی ہوم پہنچا۔ اس وقت ہیلن بھی پریشانی محسوس کر رہی تھی اور ڈاکٹر سالوے بھی، ڈاکٹر سالوے اپنے تجربے کا نتیجہ جاننے کے لیے بے چین تھا اور ہیلن یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ وہ ایک تجرباتی بچے کی ماں بننے والی ہے۔

بچہ ہوا تو وہ حد درجہ مطمئن تھی کیونکہ ڈاکٹر نے بتا دیا تھا کہ بچہ نارمل بچوں جیسا ہے۔ اس خبر نے ڈاکٹر سالوے کو مایوس کر دیا تھا اس لیے بھی اس کی توجہ کچھ کم ہو گئی تھی۔ بچے کے لیے نرسری ہاؤس اوپر کی منزل میں بنایا گیا تھا۔ وہیں بچے کے ساتھ ہیلن رہتی تھی اس طرح اس کا رابطہ ڈاکٹر سالوے سے تقریباً ٹوٹ گیا تھا۔ ڈاکٹر سالوے نے کئی بار سوچا کہ وہ جا کر بچے کو دیکھے مگر ہیلن نے منع کر دیا۔ ہر بار وہ کہتی کہ بچہ سو رہا ہے۔ پریشان ہو گا۔ اس طرح تقریباً آٹھ ماہ گزر گئے۔ ایک روز ڈاکٹر سالوے حد سے زیادہ ضد کرنے لگا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ہیلن کیوں اسے روکنا چاہ رہی ہے۔ اسے شک ہونے لگا تھا کہ کہیں اس کا تجربہ کامیاب تو نہیں ہو گیا جسے ہیلن دانستہ چھپا رہی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ زبردستی اوپر جانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہیلن نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اوپر پہنچ گیا۔ بچہ پالنے میں لیٹا تھا۔ آہٹ پر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر سالوے کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ بچے کی آنکھوں میں خوف تھا۔ وہ ڈاکٹر کو دیکھ کر بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا لیکن جیسے ہی اس کی نظر ہیلن پر پڑی وہ پُرسکون ہو گیا۔ ہیلن اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھی تو آٹھ مہینے کے بچے نے فرفر بولنا شروع کر دیا۔ اسے بولتے دیکھ کر ڈاکٹر سالوے خوش ہوا تھا۔ اس نے خلیوں پر جو تجربہ کیا تھا، وہ کامیاب رہا تھا۔ DNA نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ بچہ فرفر بولنے میں کم سے کم ڈھائی سال لیتا ہے مگر یہ بچہ صرف آٹھ مہینے میں روانی سے بول رہا تھا، اس کے یہی معنی تھے کہ اس کا تجربہ کامیاب تھا۔ DNA کوڈ کھل چکا تھا۔ ماں باپ کا تجربہ اس میں آ چکا تھا لیکن جب اس نے الفاظ پر غور کیا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا کیونکہ بچہ انگلش کی بجائے فرنچ بول رہا تھا۔

پروفیسر کی کہانی ختم ہوتے ہی احمد اور علی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

''بے چارہ ڈاکٹر!'' احمد بولا۔ ''DNA کوڈ نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا۔''

اسی وقت مخالف سمت سے آتا ہوا ٹرک نظر آیا، اسے دیکھ کر علی نے کہا۔ ''اتنا وقت بھی گزر گیا اور بوریت بھی نہیں ہوئی۔ آپ نے اچھی کہانی سنائی۔''

''اس کہانی میں میرا اپنا تجربہ بھی شامل ہے۔ میں خود بھی اس نہج پر تجربے کر رہا ہوں۔ DNA کی پیوند کاری میرے تجربے کی بنیاد ہے۔ میں نے DNA پر ری سرچ کر کے دنیائے سائنس کو بہت کچھ دیا ہے۔'' پروفیسر عثمان نے کہا۔

احمد ٹرک رک چکا تھا اور سب کو بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک سب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ں ٹرک پر سوار ہو گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ سب قصبے کے اس گھر میں موجود تھے جسے بطور ہیڈ کوارٹر استعمال کر رہے تھے۔

''ایسا کرتے ہیں کہ آج رات آرام کرتے ہیں پھر کل صبح کنٹرول لائن کی طرف چل دیں گے تاکہ شام میں اپنی سرزمین پر پہنچ جائیں۔'' علی نے پروفیسر کو دیکھ کر کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی، آخر ہمیں بھی تو کچھ وقت دیں۔ آپ نے ہم مظلوموں کے لیے اتنا کچھ کیا اب کیا ہم ایسے احسان فراموش نہیں کہ اپنے محسن کی ذرا سی بھی خاطر نہ کریں۔ دو ایک روز آرام کریں پھر جانے کی سوچیں۔'' احمد نے کہا۔

''نہیں بھائی! ہمارے پاس اب بالکل وقت نہیں ہے۔ وہاں میرے ساتھی پریشان ہو رہے ہوں گے کہ آخر ہم گئے تو کہاں گئے۔ پھر کچھ ادھورے تجربے ہیں جنہیں پورا کرنا بھی ضروری ہے۔'' پروفیسر عثمان نے کہا۔

فی الحال آپ کچھ دیر آرام کریں، میں سرینگر میں اپنے ایک دوست کو فون کر کے آتا ہوں۔'' علی نے کہا۔ ''تاکہ وہاں کی تازہ صورتِ حال معلوم ہو سکے۔''

علی چلا گیا۔ پروفیسر آرام کرنے کے خیال سے لیٹ گئے مگر یہ دورانیہ طویل ثابت نہ ہوا۔ علی نے لوٹ کر کہا۔ ''بہت بری خبر ہے۔''

☆======☆======☆

غلام رسول بند آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ اسد الکبیر اور احسن ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ابھی کسی نے پہل نہ کی تھی مگر کسی بھی وقت تلواریں ٹکرا سکتی تھیں کہ زونو لوٹ آئی۔ اسے دیکھ کر احسن سنبھل گیا۔ وہ مڑنا چاہتا تھا کہ زونو نے غصے میں اسے زور کا دھکا دیا اور وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی گر گیا۔ اس کے پیچھے ڈھلان تھی۔ وہ لڑھکتا ہوا نیچے گرنے لگا۔

تب ہی غلام رسول کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ سامنے ہی کیتھی کھڑی تھی۔ وہ بغور اس کے چہرے کا مطالعہ کر رہی تھی۔

''چلو۔'' اس نے کیتھی سے کہا اور اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑا۔

''تم نے ایسا کیا دیکھا؟'' کیتھی نے پوچھا مگر غلام رسول نے جواب نہیں دیا حویلی میں پہنچ کر اس نے کیتھی سے کہا۔ ''چلو آبزرورٹری میں چلتے ہیں۔''

کیتھی سمجھ گئی کہ وہ باتوں کا رخ بدلنا چاہتا ہے اس لیے خاموشی سے اوپر آئی اور دوربین سے آنکھ لگا کر بولی۔ ''یہ کیا ہے، ہر طرف سفید دھند ہے۔''

''یہ آسمان ہے اور آسمان کی وسعت کو جان لینا آسان نہیں ہے۔'' غلام رسول نے ہنس کر کہا۔

''آسمان کیا ہے، گیسوں کا مجموعہ، کرۂ ارض کے باہر جو خلا ہے، اس کے آگے گیسوں کا پردہ ہے۔ یہی سائنس نے بتایا، تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر بتایا۔'' کیتھی جواب میں بولی۔

''سائنس نے یہ بات آج کہی ہے جبکہ قرآن الحکیم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہہ دی تھی۔ سورہ مومنون کی سترہویں آیت ہے۔ ''اور ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنائے اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں ہیں۔'' قدیم عربی میں سات بمعنی بہت کے ہیں اور لاتعداد کے لیے چالیس استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آیت کی تشریح میں کہا جا سکتا ہے کہ خداوند کریم نے آسمان پر بہت سے راستے بنائے ہیں۔ ہر راستہ کسی نہ کسی منزل کے لیے ہوتا ہے اور منزل کسی سیارے کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے یعنی کسی سیارے تک پہنچنے کی بات کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں باری تعالیٰ فرماتا ہے۔ ''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ (اس وقت) دھواں تھا۔ تو اس نے اس سے اور زمین سے کہا تم دونوں آؤ (اطاعت کرو) خوشی سے یا کراہت سے۔ دونوں نے کہا ہم بخوشی حاضر ہیں (حکم کے تابع) ہیں پھر اس نے دو دن میں اس (دھویں) کے سات آسمان بنائے۔'' گیس کو دھواں بھی کہا جا سکتا ہے۔ اب بتاؤ آسمان کی حقیقت سائنس نے پہلے بتائی یا قرآن نے۔''

''بھئی میں کب کہتی ہوں، سائنس نے پہلے بتائی۔ یہ تو تم مسلمانوں کی غلطی ہے کہ تم لوگ قرآن پر ری سرچ نہیں کرتے۔ غور نہیں کرتے۔ ثواب کے لیے رٹتے رہتے ہو۔ میں اکثر سوچتی ہوں کاش قرآن حکیم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترتا پھر دیکھتے ہم اس کتاب اللہ سے کتنا فائدہ اٹھاتے کیونکہ اس میں علم جغرافیہ، علم تاریخ، علم ہیت، علم فلسفہ، علم طب غرضیکہ ہر علم اس میں ہے۔ تم سے بحث کا ایک فائدہ مجھے یہ بھی تو ہوا کہ مجھے قرآن کی جامعیت کا علم ہو گیا۔''

''تم نے علم طب کی بات کہی تو میں بتاتا چلوں۔ اس کتاب اللہ میں طب کے بارے میں اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ اسے اگر حدیث کریم کی روشنی میں سمجھ لیا جائے تو کبھی کوئی بیماری نہ ہو۔ مزیدار بات یہ ہے کہ قرآن کریم کو جتنے بہتر انداز میں رسول اکرم صلی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے سمجھایا، آل رسول رضی اللہ عنہ نے سمجھایا، اس انداز پر غور کر لیا جائے تو انسانی زندگی کا راز پوری طرح کھل جائے۔ ہر ٹریلین خلیہ کا مجموعہ ہے یہ انسان اور ان خلیوں کا راز بھی قرآن نے سمجھایا ہے مگر ہم سمجھ نہیں سکے۔ جس نے سمجھا اس نے انسانی جسم کی صحیح صحیح تشریح کر دی۔ ایک مشہور واقعہ سنو جسے علامہ رشید الدین ابو عبداللہ محمد بن علی ابن شہر آشوب مازندرانی التوفی 588 نے نقل کیا۔ یہ واقعہ منصور عباسی کے دربار کا ہے کہ 144 ہجری میں ایک طبیب ہندی بغداد پہنچا۔ اس زمانے میں ہند کا سسٹم آف میڈیسن (آیورویدک) بہت بہتر مانا جاتا تھا۔ ہند کے طبیب کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ اس طبیب نے بھی عرب کے لوگوں پر اپنی قابلیت کی دھاک بٹھانے کے لیے کئی گنجلک سوالات کیے۔ عرب کے طبیب اس کا جواب نہ دے سکے۔ عربوں کے وقار کا سوال تھا۔ خلیفہ منصور وانقی نے اس طبیب سے ٹکر لینے کے لیے کئی علماء و اطباء کو طلب کیا۔ ان میں سے ایک نے اس کے تمام سوالات کا تسلی بخش جواب دیا پھر کہا اب تم میرے سوالات کا جواب دو۔ اس نے پوچھیے کہا تو انہوں نے کہا۔ ”بتاؤ سر پر بال کیوں ہیں؟ پیشانی بالوں سے خالی کیوں ہے؟ آنکھیں بادام جیسی کیوں ہیں؟ ناک کا سوراخ نیچے کی طرف کیوں ہے؟ منہ پر دو ہونٹ کیوں بنائے گئے ہیں؟ سامنے کے دانت تیز اور داڑھ چوڑی کیوں ہے؟ ان دونوں کے درمیان میں لمبے لمبے دانت کیوں ہیں؟ ہتھیلیوں پر بال کیوں نہیں ہوتے؟ ناخن اور بال میں جان کیوں نہیں ہوتی؟“

طبیب ہندی گھبرا اٹھا کیونکہ ان باتوں کا جواب نہ طب ہندی (آیورویدک) نہ طب یونانی میں تھا۔ انگلش سسٹم آف میڈیسن (میڈیکل سائنس) نے تو صحیح طور پر جنم بھی نہیں لیا تھا اس لیے اس بے چارے کو بھی معلوم نہ تھا، اس نے کہا۔ ”تو کیا آپ نے طب یونانی، طب ہندی سے ہٹ کر کوئی اور طب بھی پڑھی ہے؟ اس طب کا نام کیا ہے؟“

اس طبیب ہندی کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے مشہور مسلم سائنس دان ”جابر بن حیان“ کے استاد، حضرت امام حسینؓ کے پڑپوتے سیدنا حضرت امام جعفر صادقؒ بنا سیدنا امام محمد باقرؒ انہوں نے کہا۔ ”ہم اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خدا نے اتنا علم دے رکھا تھا کہ وہ شہر علم کہلائے۔ وہی علم مجھ تک پہنچا ہے۔ جسم انسانی کو خلق کرنے والے سے زیادہ اندرونی حالات کون بیان کر سکتا ہے۔ سنو طبیب ہندی! بال سر پر اس لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کاسہ سر میں دماغ کو ایسے

ہے جیسے پھولوں کے زیرہ کے حفاظت کے لیے پھولوں کی پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ اتنی اور نازک شے کی حفاظت کے لیے انتظامات بھی اعلیٰ رکھے ہیں۔ سانس (ہوا) دماغ منتقل دے کر کثیف ہو جاتی ہے اسے باہر نکلنا ضروری ہے۔ اس کے مخرج کے ہزاروں نے بنا دیے ہیں جس میں سے بخارات نکلتے ہیں جبکہ چکنائی (تیل) بہ آسانی اندر جا کر دماغ کو قوی کرتی ہے اس طرح گرمی اور سردی سے دماغ محفوظ رہتا ہے۔ ان مخرج کی حفاظت کے لیے تاکہ چکنائی کے اثر کے علاوہ کوئی اور چیز اندر نہ چلی جائے۔ اس کے لیے ہی بال پیدا کیے ہیں۔ پیشانی پر بال اس لیے نہیں ہوتے کہ پیشانی آنکھوں کا چھجہ ہے، نور اس سے ٹکرا کر ضروری حصہ کو پتلی تک پہنچاتا ہے۔ اگر وہاں بال ہوتے تو نور سیدھا آنکھوں میں جاتا اور آنکھیں بچپن میں ہی ناکارہ ہو جاتیں۔ پیشانی پر خطوط اور شکنیں اس لیے ہیں کہ سر کا پسینا آنکھوں میں نہ گرے۔ پسینے کی بوند خطوط میں اس طرح جمع ہو جاتی ہیں جیسے بارش کا پانی گڑھوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ پلکیں آنکھوں پر اس لیے بنائی گئی ہیں کہ ضرورت کے مطابق ہی نور آنکھوں تک پہنچے، اضافی روشنی کو پلکیں روک لیں۔ تم نے دیکھا ہوگا انسان جب بلندی کی طرف دیکھتا ہے تو آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجا بنا لیتا ہے تاکہ صاف نظر آ سکے۔ ناک کو آنکھوں کے درمیان اس لیے بنایا ہے کہ روشنی ایک مخصوص خط (زاویہ) پر سفر کرتی ہے وہ دونوں آنکھوں میں تقسیم ہو کر پہنچے۔ زیادہ روشنی میں سے کچھ پیشانی جذب کرتی ہے کچھ پلکیں اور باقی کو ناک کا اوپری حصہ اور وہ برابر حصوں میں بہ آسانی تقسیم ہو جاتی ہے۔ آنکھیں بادامی اس لیے ہیں کہ ان کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص پانی بنایا ہے جو اندرونی حصوں کو دھو کر با آسانی باہر نکل سکے اور دوا آسانی سے اندر چلی جائے۔ ناک کا سوراخ نیچے کی طرف اس لیے ہے کہ دماغ کی رطوبات آسانی سے بہہ کر نکل سکیں۔ اگر اوپر ہوتا تو یہ بات نہ ہوتی اور بو بھی دماغ تک صحیح طور پر پہنچ نہ پاتی۔ ہونٹ لچکیلے اس لیے ہیں کہ منہ میں ڈالی گئی چیز منہ میں ہی رہے اور باہر نہ نکل آئے اور حلق سے نکلنے والی جھٹکے دار (آواز) کو صحیح شکل دی جا سکے۔ آگے کے دانت اس لیے تیز ہیں کہ انہیں کترنے کا کام ملا ہے جبکہ داڑھوں کو پیسنے، چبانے کا۔ لمبے دانت دونوں کے استحکام کے لیے ہیں جس طرح مکان کی مضبوطی کے لیے ستون ہوتے ہیں۔“

غلام رسول مزید باتیں بتاتا کہ آبزرورٹری کے دروازے پر دستک ہوئی اور باورچی نے باہر ہی سے کہا۔ ”صاحب جی! کچھ لوگ آئے ہیں۔ بڑے غصہ میں ہیں۔“

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''نہیں بٹھاؤ، میں آ رہا ہوں۔'' کہہ کر وہ دوربین کو پیچھے کرنے کے لیے ویگر گھمانے لگا۔ بھاری بھرکم دوربین آہستہ آہستہ چھوٹی ہونے لگی پھر اسے بند کر کے اُس نے کیتھی سے کہا۔ ''چلو نیچے چلتے ہیں۔''

جب وہ نیچے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہاں گاؤں کے سرکردہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسوائے علی مدد شاہ کے دادا، غلام رسول کو دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے تقریباً چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ ''صاحب جی! آپ لوگوں کو یہ گاؤں چھوڑنا پڑے گا۔''

''مگر کیوں...... ایسی کیا بات ہو گئی؟'' غلام رسول کے لہجے میں حیرت تھی۔

''بات یہ ہے کہ ہم لوگ اب تک نہایت پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ باہر کا کوئی آدمی ادھر نہیں آتا تھا اور نہ کوئی پُراسرار بات رونما ہوتی تھی۔''

''اب ایسی کون سی بات ہو گئی؟'' غلام رسول نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔

''علی مدد شاہ پر پھر سے دورہ پڑنے لگا ہے۔ اس کی رٹ ہے کہ آپ لوگوں کو گاؤں سے باہر نکال دیا جائے۔''

''آخر اس دشمنی کی کوئی وجہ ہو گی؟''

''یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں۔''

''ہمیں تو ابھی آپ ہی کی زبانی پتا چلا ورنہ ہم تو اس کا انسانیت کے ناطے علاج کر رہے تھے۔ کیونکہ اس کی بیماری بڑی پیچیدہ ہے۔''

''اسے بیماری شیماری کچھ نہیں وہ عذاب گزیدہ ہے۔''

''عذاب آخرت کے لیے ہے ناکہ اس دنیا کے لیے۔ جہالت کی وجہ سے بیماری کو عذاب کا نام دینا بھی گناہ ہے۔'' غلام رسول نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ کیسی بیماری ہے کہ عمر کے ایک مخصوص حصے میں پہنچ کر اس خاندان کا ہر آدمی ایک مخصوص کھائی میں گر کر ہاتھ پیر تڑوا لیتا ہے۔ یہ کیسی بیماری ہے کہ ایک بچہ سو سال پہلے کے ایک شخص کی نجی باتیں فرفر بتانے لگتا ہے۔''

''بیماری کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں، ابھی آپ کو کیا معلوم، یہ جو انسانی جسم ہے نا، یہ اسراریت کی بہت بڑی دنیا ہے۔''

''ہم کچھ نہیں جانتے، یہ موٹی موٹی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ آپ لوگ ابھی علی مدد شاہ کے ہاں چلیں۔ اگر اسے کوئی بیماری ہے تو علاج کر دیں ورنہ گاؤں چھوڑ کر چل دیں۔'' ایک دوسرے شخص نے کہا اور باقی لوگوں نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔

ہر جانب سے دباؤ پڑتے دیکھ کر غلام رسول کھڑا ہو گیا۔ ''چلیے! چل کر اسے دیکھ لیتے ہیں۔''

''چلیے! ہم اسی لیے تو آئے ہیں کہ آپ چل کر اسے دیکھ لیں۔'' وکیل حسین نامی شخص نے کہا۔

وہ سب علی مدد شاہ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ کیتھی بھی ان کے ساتھ ہی نکل آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ غلام رسول ٹھہرا سیدھا سادا پڑھا کو بندہ اسے میڈیکل سائنس کا کیا علم، اگر واقعی وہ بیمار ہے تو اسے فرسٹ ایڈ تو وہ دے ہی سکتی ہے۔

جیسے ہی وہ لوگ علی مدد شاہ کے گھر میں داخل ہوئے، غلام رسول کو زبردست قسم کی بدبو کا احساس ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے نزدیک میں ہی کوئی جانور مر کر سڑ گیا ہو۔ اس بدبو نے غلام رسول کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ بدبو اشارہ تھی کہ غلیظ روح کی آمد ہے۔

☆======☆======☆

یہ سنتے ہی پروفیسر عثمان چونک گئے۔ بستر پر سے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ''ایسی کیا بات ہو گئی، کیا پاک بھارت جنگ شروع ہو گئی؟''

''ابھی ہوئی نہیں ہے مگر آثار ایسے ہی ہیں۔'' کمانڈر علی نے کہا۔ ''ایک بہت بڑی سازش رچائی گئی ہے۔''

''کیسی سازش؟''

''ایسی سازش کہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ ناگزیر ہو جائے گی۔ برسرِ اقتدار پارٹی متعصب ہندوؤں کی ہے۔ یوں تو بھارت کی تمام پارٹیوں کو پاکستان کا وجود کھٹکتا ہے اسی لیے اس پارٹی نے بہت خطرناک منصوبہ بنایا ہے۔''

''کھل کر بتاؤ۔ پہیلیاں نہ بجھواؤ۔''

''ہمارے دوست نے خبر دی ہے کہ کنٹرول لائن کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ بھارتیوں نے پوری تیاری کر لی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جنونیوں نے جنگ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ کنٹرول لائن کی طرف اتنی بڑی تعداد میں فوجیوں کو منتقل کیا جا رہا ہے جیسے ایام جنگ نزدیک تر ہو، اس لیے اس طرف جانے کی حماقت نہ کی جائے۔''

''تو پھر کیا ہم یہیں چکراتے رہیں گے؟'' پروفیسر نے جھلاہٹ بھری آواز میں کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''نہیں، ہم کنٹرول لائن پار کریں گے مگر ایسے نہیں جیسے عام لوگ کرتے ہیں۔''

''تو کیا ہوا میں اڑ کر پار کریں گے؟'' پروفیسر طنزیہ انداز میں بولے۔

''ایسا لگ رہا ہے، آپ ہری مرچیں چبا رہے ہیں، ہم کنٹرول لائن پار کریں گے، پاکستان پہنچیں گے مگر اس طرح نہیں...... بس آپ دیکھتے جائیں۔ آپ کو پاکستان پہنچانا میری ذمے داری ہے اور میں اپنی ذمے داری پوری کرنا جانتا ہوں۔''

''آخر میں بھی تو سنوں کہ تمہارا پروگرام کیا ہے؟''

''مجھ تک جو اطلاعات پہنچی ہیں، ان کے مطابق یہ قصبہ بہت جلد عتاب میں آنے والا ہے۔ اس قصبے کے خلاف گرینڈ آپریشن کی تیاری ہو چکی ہے۔ اس لیے ہمیں فوراً ہی یہاں سے کہیں اور منتقل ہو جانا ہے۔'' علی نے کہا۔

''تو پھر دیر کیسی چلو کہیں اور چل دیتے ہیں۔'' پروفیسر اداس لہجے میں بولے۔

''اچھا احمد! تم بھی ہوشیار رہنا، پوری تیاری رکھنا۔ میں نے مختصراً پوری بات ہیڈ کوارٹر میں بتا دی ہے اگر وہ مناسب سمجھیں گے تو افرادی قوت بھیج دیں گے۔ ویسے آپ سب اپنے طور پر بھی تیاری مکمل رکھیں چونکہ حملہ آپ پر ہوگا، سری نگر پر نہیں پھر اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا، اپنی لڑائی آپ لڑنا ہوتی ہے۔''

کہہ کر علی، پروفیسر کے ساتھ نکل پڑا۔ دونوں نے پیٹھ پر بیگ لٹکا رکھے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں ٹورسٹ ہیں اور بھٹکتے ہوئے اس دور افتادہ علاقے میں آگئے ہیں۔ بس اسٹینڈ دور نہ تھا۔ وہ دونوں دھیرے دھیرے اسی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک ساتھ کئی افراد نے ان کا راستہ روک لیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی خاطر ان دونوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی۔ ان میں احمد بھی تھا اور فقیر محمد بھی، دیگر ساتھی بھی تھے۔ ان لوگوں نے ان دونوں کو روک لیا تھا گویا وہ انہیں آگے بڑھنے نہیں دے رہے تھے۔

''کیا بات ہے، تم لوگ کیا چاہتے ہو اور راستہ کیوں روکا ہے؟'' علی نے درشت لہجے میں سوال کیا۔

''ہم آپ کو ابھی جانے نہیں دیں گے۔ آپ ہمارے محسن ہیں۔ ایک احسان اور کر دیں۔'' احمد نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' علی بولا۔

''ابھی بریگیڈیئر رام پال زندہ ہے پھر ہم پر ایک بڑی قیامت ٹوٹنے والی ہے ایسی حالت میں ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔'' احمد گھگیایا۔ ''آپ کا سہارا ہمارے لیے

بہت اہم ہے۔ جلد بازی میں ہی سہی، ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پروفیسر کی ذات سے ہم وہ فائدہ اٹھائیں گے جو مولانا اٹھانا چاہتے تھے۔''

''کس قسم کا فائدہ؟'' علی نے پوچھا۔

''آپ کو تو معلوم ہے کہ اس علاقے میں غیر مسلم بھی بہت بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ ان میں بدھسٹ بھی ہیں۔ لاما بھی اور سناتن دھرمی ہندو بھی۔ یہ سب مجاہدین کے دشمن ہیں کیونکہ انہیں اکسانے والا مہندر ونشی انہیں ہمارے مقابل کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ واپس چلیں تو میں ایک اہم بات بتاؤں گا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے؟'' علی نے پروفیسر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کنٹرول لائن پر کڑا پہرہ ہے۔ کوئی اور راستہ ابھی نظر میں نہیں ہے، ڈھونڈنا پڑے گا اس لیے میرا خیال ہے، دو چار دن کے لیے یہیں رک جاتے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں کی مناسب ٹریننگ بھی ہو جائے گی۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، چلیے!'' کہہ کر علی مڑ گیا۔

تمام لوگوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سب جلدی جلدی چلنے لگے۔ اس گھر میں جہاں ان دونوں کو ٹھہرایا گیا تھا، وہاں پہنچ کر ان دونوں نے بیگ اتارے اور ایک جانب رکھ کر بیڈ پر لیٹ گئے۔ تکیے کا سہارا لے کر علی نے کہا۔ ''ہاں میاں! تم کچھ کہنے والے تھے۔''

''جی ہاں! خبر بہت اہم ہے۔ اتنی اہم کہ بھوک اڑ جائے گی اس لیے پہلے کچھ کھا پی لیا جائے۔'' احمد نے مشورہ پیش کیا پھر اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ دیا۔ فوراً ہی کھانے کی پرات آگئی۔

اس علاقے میں کھانا کھانے کا اپنا انداز ہے۔ ایک بڑی سی پرات کے گرد کئی افراد بیٹھ جاتے ہیں اور ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ پروفیسر عثمان اور کمانڈر علی کے ساتھ احمد، نگارت اور عنایت بیٹھے تھے۔ گوشت ملے چاول کا منفرد ذائقہ تھا۔ سب نے پیٹ بھر کر کھایا پھر شکر خدا کر کے لیٹ گئے۔

پروفیسر اور علی آرام کرنے کے خیال سے لیٹے ہی تھے لیکن ان کے ذہن میں سوالات کلبلا رہے تھے۔ علی سے صبر نہ ہوا تو وہ پوچھ بیٹھا۔ ''بھائی احمد! تم کچھ بتانے والے تھے؟''

''ہاں! میری اطلاع کے مطابق مہندر ونشی کی پارٹی ''وی ایچ پی'' کچھ کرنے والی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ یہ سب کٹر متعصب لوگ ہیں۔ ان کا نعرہ ہے کہ مسلمانوں کو مٹا دو یا ہندو بنالو۔ بابری مسجد کے انہدام کی سازش بھی انہی لوگوں کی تھی۔ ان کی پارٹی کینسر کی طرح پھیل رہی ہے۔ یہاں بھی اب یہ پیر جما رہے ہیں۔ ان کا لیڈر مہندر ونشی کبھی غنڈہ گردی کے لیے بدنام تھا لیکن یہ اب اس کوشش میں ہے کہ کسی بھی طرح اس علاقے کے مسلمانوں کو مزید دبا دیں۔ مجاہدین کے تو یہ لوگ کٹر دشمن ہیں۔" احمد نے بتایا۔

"یہ کوئی نئی اطلاع تو ہے نہیں۔ وی ایچ پی اور شیو سینا کے غنڈے ہر جگہ پیر جمانے کی کوشش میں لگے ہیں۔ ان کی بھرپور مدد ہو رہی ہے۔ سیکولر کہے جانے والے ملک کے حکمران ہی انہیں بڑھاوا دے رہے ہیں۔" علی نے منہ بنا کر کہا۔

"کل ناگ پنچمی ہے۔ ہندوؤں کا ایک تہوار، جس میں وہ لوگ ناگ کی پوجا کرتے ہیں۔ اس موقع پر قصبے کے باہر بڑے میدان میں میلہ لگتا ہے۔ اس میلے سے مہندر ونشی خطاب کرنے والا ہے۔"

"تو کیا ہوا، ہر شخص کو تحریر و تقریر کی آزادی ہے۔" پروفیسر عثمان بولے۔

"آپ شاید سمجھے نہیں، وہ اپنی تقریر میں عام ہندو کو بھڑکائے گا۔ اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ ہندو مسلم فساد ہو جائے اور بھارت اس کا الزام پاکستان پر لگا سکے، یہاں کے مسلم نوجوانوں کو جیل میں بھر سکتے۔"

"ایسا کرتے ہیں کہ کل ہم بھی اس میلے میں پہنچ جاتے ہیں تاکہ اپنے کانوں سے ان کی باتیں سن سکیں۔"

"ہاں! میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔" احمد نے ہنس کر کہا۔ "آپ لوگ تو منہ کی بات بھی چھین لیتے ہیں۔"

"بس، بس، زیادہ تعریف نہیں۔ جاؤ جا کر آرام کرو اور ہمیں بھی کرنے دو۔"

اگلے دن شام کے وقت احمد، کمانڈر علی اور پروفیسر عثمان ٹہلتے ہوئے اس میدان میں پہنچ گئے جہاں میلہ لگا ہوا تھا۔ جگہ جگہ پیٹرومیکس روشن تھے۔ چھوٹی چھوٹی عارضی دکانوں پر بھی رش کا یہ عالم تھا کہ راستہ چلنا دشوار تھا۔ وہ سب آگے بڑھتے ہوئے جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔

وہ علاقہ صفائی کا مظہر تھا۔ صاف ستھری زمین پر لوگ آرام سے بیٹھے تھے۔ وہ تینوں ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے اسٹیج کے نزدیک جا کر بیٹھ گئے۔ اسٹیج کے پیچھے کچھ سازندے بیٹھے ہوئے تھے جو رباب پر کسی قسم کے گیت گا رہے تھے۔

دفعتہً ساز رک گیا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اسٹیج پر ایک شخص پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"یہی مہندر ونشی ہے۔" احمد نے سرگوشی کی۔ اسٹیج پر جابجا سانپوں کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ گویا انہی سے اسٹیج کو سجایا گیا تھا۔ ساز کی آواز خاموش ہوتے ہی مہندر ونشی اٹھ کھڑا ہوا اور جادوگروں والے انداز میں دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی آستین کندھوں تک سمٹ گئی تھی۔ شاید وہ سنسکرت میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ تبھی مجمع میں شامل تمام افراد اس کے الفاظ کو دہرانے لگے اور ہزاروں آوازیں اس سے ہم آہنگ ہو گئیں۔

"دوستو! آج ہم ناگ دیوتا کی خوشنودی کے لیے معمول کے مطابق جمع ہوئے ہیں۔ آج ہی کے دن وہ شبھ گھڑی آتی ہے جب ناگ دیوتا ہمیں بے خوفی سے ناگوں کی طرح اپنی خواہشات کی تکمیل کی اجازت دیتے ہیں لیکن اس سے پہلے ہم اس کی ہدایت کے مطابق ایک عہد کریں گے کہ ان لوگوں کو مقدس سرزمین پر خوش آمدید کہیں گے جو ناگ دیوتا کے پجاری ہیں۔ یہ ناگ دیوتا کا حکم ہے اور اس کی تکمیل ہمارا مقدس فریضہ ہے۔ تم سب لوگوں کو معلوم ہے کہ ناگ دیوتا میری زبان سے اپنے احکامات ادا کرواتا ہے اور پھر میں تمہاری بھلائی کے لیے قدم اٹھاتا ہوں۔"

مجمع نے اس کی تائید میں نعرے بلند کیے۔ وہ سب خاصے خوش نظر آ رہے تھے۔ مہندر ونشی بول رہا تھا۔

"بھارت ماتا کے اور ٹکڑے کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔ مٹھی بھر آتنک وادی پڑوسی دیش سے آ کر یہاں والوں کو بہکا رہے ہیں اس لیے آپ سب ہوشیار ہو جائیں۔ خود کو مجاہدین کہنے والوں سے بھی میرا یہی کہنا ہے کہ شرافت کا راستہ اختیار کر لیں ورنہ بھارت ماتا کے سنتان جوابی کارروائی کریں گے۔ یہی ناگ دیوتا کا بھی حکم ہے۔"

ابھی وہ کچھ اور بھی کہتا کہ احمد کھڑا ہو گیا۔ "میرے ہم وطنو! یہ سب جھوٹ ہے۔"

مہندر ونشی کھڑے ہوتے ہی چلایا۔ "بیٹھ جاؤ۔" مگر احمد بیٹھا نہیں، وہ بولتا رہا۔

"میں کئی بار تمہیں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ ناگ دیوتا ایسی کوئی بات اس شخص کی زبان سے نہیں کہلواتا۔ یہ سب پھوٹ ڈلوانے کے لیے ہندو مسلم فساد کرانے کے لیے یہ شخص خود گھڑ رہا ہے۔" پھر اس نے دل پر جبر کر کے کہا۔ "ناگ دیوتا تو صرف دشمن کے لیے دشمن ہے، اور ہم سب آپس میں دوست ہیں۔ اس بات کی تصدیق کے لیے ملک کے مشرقی حصے سے ایک معزز شخص یہاں آیا ہوا ہے جس کا دل

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہاں کے حالات سننے کے بعد خون کے آنسو رو رہا ہے۔" یہ کہہ کر احمد نے پلٹ کر پروفیسر کی طرف دیکھا تو وہ احمد کا اشارہ سمجھتے ہوئے مہندرونشی کی شعلہ بار نظروں کی پروا کیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔

"محترم احمد سچ کہہ رہے ہیں۔" پروفیسر نے تقریر شروع کر دی۔ سچویشن بھی کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی کہ اسے ہر حال میں مثبت انداز میں اپنے لب کھولنا تھے۔ "ناگ دیوتا نے میری سرزمین پر مجھے پیغام دیا ہے کہ یہاں امن تبھی قائم ہو سکتا ہے جب بھوکے پیٹ بھرے ہوں گے۔ غلام نہیں، آزاد بن کر جینا ہو گا۔"

"یہ خبیث بڈھا جھوٹ بول رہا ہے۔" مہندرونشی حلق پھاڑ کر چیخا۔ "میری صداقت کی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں۔ مقدس ناگ دیوتا میری پشت پر ہیں۔ اس کی ساری ہمدردیاں میرے ساتھ ہیں۔ میں اس کا سچا پیروکار ہوں۔ کیا تم لوگوں نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں نے مجھے جھٹلایا، ان کا "یتی دیوتا" نے کیا حشر کیا؟"

پروفیسر کو کچھ پہلے سنی ہوئی تمام باتیں یاد آ گئیں۔ احمد نے بتایا تھا کہ اس علاقے میں دھاک بٹھانے کے لیے مہندرونشی نے "یتی" کا کھڑاگ پھیلا رکھا ہے۔ صدیوں سے توہم پرستی یہاں عام ہو رہی ہے۔ انہی میں سے ایک "یتی" کا ہوا بھی ہے۔ یہاں والوں کا خیال ہے کہ برفانی میدانوں میں ایک ایسی قوم بستی ہے جو برف سے بنی ہے۔ جس کا قد بیس پچیس فٹ ہے۔ وہ برفانی انسان دیوتاؤں کا سپاہی ہے۔ جو بھی دیوتاؤں کی مخالفت کرتے ہیں، وہ ان برفانی انسانوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی کٹی پھٹی لاش برفانی میدانوں میں ملتی ہے جس کی تشہیر بھی مہندرونشی خود کرتا ہے کہ اسے "یتی" نے سزا دی ہے۔ یتی ایک ڈھکوسلہ ہے۔ یہ بات پروفیسر کہنے ہی والے تھے کہ انہیں بروقت خیال آ گیا کہ اس خطے کے لوگ ضعیف الاعتقاد ہیں، توہم پرست ہیں اور برفانی انسان ان کے لیے ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اس لیے انہوں نے صرف یہ یقین دلانے پر اکتفا کیا۔

"دوستو! میری بات غور سے سنو آج کے بعد برفانی انسان کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہ میرا تم سب سے وعدہ ہے۔"

یہاں سے وہاں تک میدان میں بھرے توہم پرست ہندوؤں کو ان کے عقائد کے خلاف للکارنا آسان بات نہ تھی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میدان میں جمع ہندوؤں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ لوگ زور زور سے بولنے لگے۔ کچھ لوگ تو اشتعال میں کھڑے ہو گئے تھے۔

دشمن کی سرحد میں، شیر کی کچھار میں پہنچ کر اسے للکارنا آسان نہیں ہے مگر اس شیر دل مجاہد احمد نے یہ کام کر دکھایا تھا۔ اس نے ناگ دیوتا کی پوجا کے نام پر منعقد جلسے میں کھڑے ہو کر مہندرونشی کو للکار دیا تھا۔ ہندوؤں کے بھرے مجمع میں ان کے عقائد کو ایک مسلمان غلط کہے، انہیں چیلنج کر دے یہ معمولی بات نہ تھی، تمام شرکاء غصے سے بھرا اٹھے تھے۔ زور زور سے بولنے لگے تھے۔ کچھ لوگ اشتعال میں آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

حالات نے یکا یک ہی نازک موڑ لے لیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس حالت میں مہندرونشی عقل سے کام لیتے ہوئے معاملہ کو سنبھالتا مگر اس نے الٹ کیا۔ اس نے غصیلی نظروں سے احمد کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم مجھے برفیلے میدان میں جا کر ایک رات ٹھہر کر دکھاؤ۔ اگر تم بہ خیر و عافیت وہاں سے لوٹ آئے تو میں تمہاری سچائی کو مان لوں گا۔"

"مجھے یہ شرط منظور ہے۔ میں وہاں جاؤں گا اور بہ خیریت واپس آؤں گا۔"

احمد کے جواب نے مجمع پر سناٹا طاری کر دیا۔ وہ سب سکتے کے عالم میں بیٹھے مہندرونشی کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ بولا۔ "تمہیں اگر کچھ ہو جاتا ہے تو اس کی ذمے داری خود تم پر ہو گی۔"

حاضرین نے مہندرونشی کی بات پر زور زور سے تالیاں بجانا شروع کر دی تھیں۔ احمد نے جھک کر پروفیسر کے کان میں سرگوشی کی۔ "صیاد خود اپنے دام میں آ رہا ہے۔ اس نے خود ہی اپنے پیر پھنسا لیے ہیں۔"

پروفیسر کے چہرے پر چھایا جمود ٹوٹ گیا۔ احمد جب اتنی ثابت قدمی سے کہہ رہا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی پلان تھا۔ وہ اسی پر غور کر رہا تھا کہ مہندرونشی کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ہاتھوں کو اٹھائے مجمع سے مخاطب تھا۔ "میرے عزیز ساتھیو! ناگ دیوتا کو خوش کرنے کا وقت آ چکا ہے سب متوجہ رہیں۔"

ابھی اس کے جملے کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ سازندوں نے ہاتھ چلانا شروع کر دیے۔ عجیب و غریب موسیقی فضا میں پھیلنے لگی۔

پروفیسر نے اپنی زندگی میں سینکڑوں موسیقاروں کے کمالات سنے تھے۔ طرح طرح کی موسیقی کا لطف لیا تھا مگر یہ موسیقی اپنے آپ میں منفرد تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ سازندے اپنے فن میں مہارت رکھتے ہیں کیونکہ یہ موسیقی اپنے اندر مجموعہ تھی۔ ابتدا میں تو یہ پُرجوش تھی جس پر تھرکنے کو دل چاہنے لگتا پھر لے بدلنے لگی۔ مدھم ہوئی پھر اور مدھم لیکن اس میں بھی ایک عجیب سا تواتر تھا، کرب تھا۔ وہ لوگ رگ و پے میں کھبتی ہوئی

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

محسوس کر رہے تھے کیونکہ یہ انوکھی موسیقی کبھی انتشار تو کبھی تناؤ اور کبھی ہیجان پیدا کر رہی تھی۔

پروفیسر نے مڑ کر مجمع پر نظر ڈالی، ہر ایک چہرے پر ہیجان کے اثرات نمایاں تھے۔ ویسا ہی ہیجان خود پروفیسر اپنے اندر بھی محسوس کر رہے تھے کیونکہ انہیں کبھی انتشار کا احساس ہوتا تو کبھی تناؤ کا۔ انہوں نے اس افتاد کے گرداب سے ابھرنے کے لیے اپنی توجہ کا رخ موڑنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوئے کیونکہ موسیقی کے ہیجان کو فزوں تر کرنے میں وہ سسکاریاں بھی اپنا کام دکھا رہی تھیں جو سامعین کے ہونٹوں سے رہ رہ کر فضا میں پھیل رہی تھیں پھر اچانک ہی بھس میں چنگاری کا سامان پیدا ہو گیا۔

اسٹیج پر شمعیں اٹھائے آٹھ لڑکیاں تھرکتی ہوئی آئیں اور شمعیں قطار میں رکھ کر موسیقی کی تیز دھن پر مجنونانہ انداز میں رقص کرنے لگیں۔ ان کا لباس بالکل خانہ بدوشوں کا سا تھا۔ ایسے خانہ بدوش جو انہی پہاڑیوں میں بہ کثرت ملتے ہیں۔

موسیقی کی تیز لے، مشعلوں کی عجیب سی بو اور ان آٹھ لڑکیوں کا ہیجانی رقص۔ پروفیسر صاحب عمر کے اس حصے میں تھے جہاں DNA افزائش نسل کی تحریک پر پابندی لگانے کا حکم نامہ جسم کے تمام خلیوں کو ارسال کرنے لگتا ہے، پھر وہ اسلام کے صحت افزاء اصولوں پر کاربند رہنا اپنا ایمان سمجھتے تھے لیکن اس وقت وہ خود کو بہت مجبور پا رہے تھے۔ اب انہیں معلوم ہوا تھا کہ غیر مسلم افراد روحانی محفلوں کے نام پر اس قسم کی محفلیں کیوں برپا کرتے ہیں۔ کیوں لوگ شرکت کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھارت کے گورو رجنیش کے آشرم میں کیوں اتنی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ایسی بھیڑ کہ انہیں تتر بتر کرنے کے لیے امریکی حکومت کو ہوائی جہاز سے بم گرانے پڑے تھے۔ صحیح کہا ہے کہ گناہ میں بڑی جذبیت ہے۔ وہ اپنی کشش سے اچھوں کے کردار کو مسخ کر دیتی ہے۔ تبھی تو اتنی جلدی اتنے سارے لوگ جمع ہو گئے تھے۔

کچھ ہی دیر میں وہ طوفانِ بدتمیزی شروع ہو گیا جس کی توقع تھی۔ پروفیسر نے احمد کا بازو پکڑ کر کہا۔ ''جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے نکلو۔ اب میں یہ گناہ کے مناظر نہیں دیکھ سکتا۔''

''تقریب کے دوران میں اٹھ جانا ناگ دیوتا کی نافرمانی ہے۔ مہندر رونشی کو موقع مل جائے گا، وہ عوام کو بھڑکا دے گا۔ وہ کہے گا کہ ناگ دیوتا کے خوف اور میرے علم نے بزدل کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ بھرپور فائدہ اٹھائے گا۔''

''فائدہ گیا بھاڑ میں، جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے نکلو ورنہ نتیجہ بہت برا ہو گا۔ جان جانے سے زیادہ بری بات ہے کہ ایمان چلا جائے۔'' پروفیسر نے جھلا کر کہا اور اسے گھسیٹتے ہوئے باہر کی جانب بڑھے۔ ''تم نے چیلنج قبول کیا ہے اور چیلنج کا فیصلہ ہونے تک کوئی تم کو کچھ نہیں کہہ سکتا، پھر اعتراض کون کرے گا، کسے ہوش ہے۔ مہندر رونشی کی طرف دیکھو وہ کس حالت میں ہے۔''

''لیکن......'' احمد نے کچھ کہنا چاہا مگر پروفیسر نے موقع نہیں دیا اور آگے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ راستے میں مہندر رونشی کی دو تین چیلیوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی مگر پروفیسر کے تھپڑ نے ان کی ساری حیوانیت پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا اور وہ خوفزدہ ہو کر ہجوم میں گھس گئیں۔

باہر آ کر پروفیسر نے ٹھنڈی ہوا میں گہرے گہرے سانس لیے تب ان کی کیفیت معمول پر آئی۔ یہی حال احمد کا تھا۔

وہ دونوں ٹہلتے ہوئے اس مکان تک پہنچے جہاں انہیں ٹھہرایا گیا تھا۔ پروفیسر نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تو میاں! تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''چیلنج کی تکمیل کے لیے میں دوپہر کے بعد برفیلے میدان کی طرف چل پڑوں گا۔ درے پر چار پانچ غیر متعلقہ افراد پہرے پر کھڑے رہیں گے تاکہ کوئی اور ادھر نہ چلا جائے۔ اگر کوئی اس میدان کی طرف سے آتا نظر آیا تو وہ اسے بھی پکڑ لیں گے۔''

یہ انتظام خاصہ معقول تھا تبھی پروفیسر کو خیال آیا کہ رات کو اگر کسی وقت مہندر رونشی میدان کی طرف جانا چاہے گا تو اسے کون روکے گا؟ پہرے داروں میں آدھے ہندو آدھے مسلمان ہوں گے۔ ہندو اس کا ادب و احترام کرتے ہیں۔ وہ ان کے لیے اہمیت کا حامل ہے اس لیے اسے مسلمانوں کی نظروں سے بچا کر اوپر پہنچا دیں گے۔

اگلے روز دن کے بارہ بجے پروفیسر، احمد کو لے کر برفیلے میدان میں پہنچا۔ علی اور دیگر ساتھی بھی ہمراہ تھے۔ جب وہ لوگ درے میں داخل ہوئے تو وہاں انہیں مہندر رونشی بھی کھڑا نظر آیا تھا۔ اس نے احمد کو دیکھ کر کہا۔ ''میں بھی تمہیں الوداع کہنے آیا تھا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم زندہ نہیں لوٹو گے۔''

''بے فکر رہو، میں علاقے کے معصوم لوگوں کو دکھا دینا چاہتا ہوں کہ برفیلے انسان کا کوئی وجود نہیں ہے۔''

پروفیسر کی نظریں مہندر رونشی کے پیروں پر جمی ہوئی تھیں انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے پیروں پر برف کی پرتیں جمی ہوئی ہیں۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ اوپر والے میدان سے آ رہا ہے۔ اس کا یوں میدان میں جانا خالی از علت نہ تھا۔

مہندر ونشی نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ پروفیسر کی نظریں اس کے جوتوں پر ٹکی ہوئی ہیں۔ وہ ہنس کر بولا۔ ''میں اکثر برفیلے میدان کے کسی غار میں بیٹھ کر گیان دھیان (پوجا) کرتا ہوں۔ کل رات بھی میں اسی وجہ سے میدان میں ٹھہر گیا تھا۔''

''یہ صحیح کہہ رہا ہے۔'' احمد نے سرگوشی میں کہا۔ ''واقعی وہ گیان دھیان کے لیے اوپر جاتا رہتا ہے۔''

پروفیسر نے کوئی جواب نہیں دیا، احمد ہی بولتا رہا۔ ''میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ عبادت کا صحیح لطف ویرانے میں آتا ہے۔''

پروفیسر نے احمد کی معصومیت پر دل ہی دل میں لعنت کہی۔

''اچھا دوستو! کل ملاقات ہو گی۔'' کہہ کر احمد برفیلے میدان میں جانے کے لیے درے کی طرف بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

بدبو سے غلام رسول کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ ایک دو ہی نہیں وہاں پر موجود سب لوگوں نے بدبو کے بھبکے محسوس کیے تھے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی ناک بند کر لی تھی۔ غلام رسول قرآن پاک کی شدبد تو رکھتا تھا مگر عالم دین نہ تھا۔ قرآن پاک پڑھنا اور سمجھنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ وہ لوگ جو قرآن پاک کو صرف ثواب کے لیے پڑھتے ہیں انہیں صرف ثواب ملتا ہے گناہوں کا بوجھ کم نہیں ہوتا لیکن جو لوگ قرآن کریم کو کرامت حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں انہیں کرامت ملتی ہے۔ جو لوگ علم اجسام سمجھنے کے لیے پڑھتے ہیں انہیں جسم انسانی کا علم مل جاتا ہے۔ جو کائنات کو سمجھنے کے لیے پڑھتے ہیں انہیں علم نباتات و جمادات و فلکیات و ارضیات مل جاتے ہیں۔ اس نے بھی قرآن کو صرف ایک رخ سے سمجھنے کی کوشش کی تھی اس لیے صرف ایک رخ سمجھ میں آیا تھا جس طرح یہ کائنات پُراسراریت کا مخزن ہے۔ اسی طرح غلام رسول نے اس کی جامعیت کا تو ادراک کر لیا تھا مگر اس کے دیگر زاویوں پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اس لیے اس قسم کی سچویشن سے کیسے نمٹا جائے اس بارے میں کبھی نہ تو سوچا اور نہ کبھی علم حاصل کرنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً آج شرمندہ ہونا پڑ رہا تھا۔

''اوئے تُو کیا سوچ رہا ہے؟'' علی مدد شاہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں، میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تُو نے یہ کیا کھڑاگ پھیلایا ہے۔''

''اسے تُو کھڑاگ کہتا ہے۔ میری انسلٹ کرتا ہے، یو بچ! اگر میں نے تجھے تباہ نہ کر دیا تو میرا نام نہیں۔'' وہ کسی پڑھے لکھے شخص کی طرح بول رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی پوری زندگی شہر میں گزری ہے۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔

''ایسے دور افتادہ گاؤں کا بچہ اس لہجے میں بات کرے تو سمجھ لیں کہ وہ اپنے حواس میں نہیں ہوگا۔'' کیتھی نے سرگوشی میں کہا۔

وہاں کھڑے تمام لوگ عجیب سی نظروں سے علی مدد شاہ کو دیکھ رہے تھے۔ ہر ایک کی آنکھوں میں جذبہ ہمدردی تھا۔

''آپ ایک کام کریں۔'' غلام رسول نے علی مدد شاہ کے دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اسے پھر سے ہماری حویلی میں پہنچا دیں۔ یوں بھی اس کا علاج ابھی ہوا نہیں تھا اور آپ لوگ اسے گھر لے آئے۔''

''آخر اسے بیماری کیا ہے، آپ لوگوں کے آنے سے پہلے تو اسے ایسی کوئی بیماری نہیں تھی۔''

''انسان کے جسم میں بیماریاں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں۔ بس انہیں ابھرنے کا موقع چاہیے۔ علی مدد کے اندر بھی بیماری موجود تھی۔ اسے موقع ملا اور وہ ابھر آئی۔'' غلام رسول نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب آپ ہی لوگوں کی کارستانی ہے۔ آپ لوگوں نے کوئی ایسا جادو کیا ہے جس کا سیدھا اثر اس بچے پر پڑا ہے۔'' ایک شخص نے ناگوار لہجے میں کہا۔

''کیا آپ لوگوں نے مجھے جادوگر سمجھ رکھا ہے۔ ہم لوگ پڑھے لکھے بندے ہیں۔'' غلام رسول نے بھی تلخ لہجے میں جواب دیا۔

''پڑھے لکھے لوگ ہی تو دعا تعویذ کرتے ہیں۔ ہم جیسے جاہل کہاں ایسا کچھ کر سکتے ہیں۔'' اسی شخص نے جواب دیا۔

''آپ اس وقت غصہ میں ہیں اور غصہ حرام ہے۔ آپ نے سورۃ الطور آیت 48 تو پڑھا ہوگا۔ ''اور اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کر۔ بے شک تُو ہماری نگاہ میں ہے۔'' جب سب کچھ اس پروردگار کی نگاہ میں ہے تو پھر ہم لوگ کیوں فکر کریں۔ اس کو بیماری ملی ہے تو شفاء بھی وہی دے گا۔ آپ فکر نہ کریں اور اسے میرے ساتھ بھیج دیں۔''

شاید یہ قرآنی آیت کا معجزہ تھا کہ وہی لوگ جو غلام رسول پر غصہ میں چڑھ دوڑے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھے بالکل ٹھنڈے پڑ گئے۔

''ٹھیک ہے اسے آپ لے جائیں۔''

غلام رسول اور کیتھی علی مدد شاہ کو ساتھ لے کر چلے آئے۔ انہیں گھر پہنچا کر غلام رسول نے کار نکالی اور بازار جانے کے لیے چل پڑا۔

وہ گلگت روڈ پر چل رہا تھا۔ اسے صبح ہی صبح باورچی نے بتایا تھا کہ ضرورت کی تمام چیزیں ختم ہو رہی ہیں۔ انہی چیزوں کی خریداری کے لیے وہ برابر والے قصبہ کے بازار کی طرف جا رہا تھا۔ ڈرائیونگ کے دوران میں بھی اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ علی مدد شاہ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہے کہ وہ بار بار پڑھے لکھے لوگوں کی طرح گہری گہری باتیں کرنے لگتا ہے۔ کیا واقعی اس کا یہ دوسرا جنم ہے؟ اس کا دعویٰ صحیح ہے؟ اسلام نے قرآن نے دوسرے جنم کا انکار کیا ہے پھر یہ کیا راز ہے؟ کیوں وہ بار بار اس قسم کا الجھاؤ پیدا کر رہا ہے؟

غلام رسول اپنے خیالوں میں اس طرح ڈوبا ہوا تھا کہ اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ وہ داہنے جانب مڑنے کی بجائے سیدھا چل رہا ہے۔ نتیجتاً وہ اس قصبے میں پہنچنے کی بجائے ایک دوسرے قصبے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ قصبہ مرکزی سڑک کے ساتھ تھا اس لیے پہاڑ کے اوپر سے ہی نظر آ رہا تھا۔ غلام رسول ادھر ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ اس قصبے میں پہنچ گیا۔ اس نے کار کو ایک پیڑ کے نیچے روکا اور نیچے اتر کر پیدل ہی بازار کی طرف بڑھنے لگا۔

یہ بازار خاصہ بڑا تھا۔ چھوٹا موٹا شہر تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر خوبصورت عمارتیں بھی تھیں اور یقینی طور پر یہ عمارتیں وہاں کے رئیس کی ملکیت تھیں۔ ان کا طرز تعمیر زیادہ تر ہندوانہ تھا۔ وہ ایک بڑے سے خوبصورت مکان کے سامنے سے گزر رہا تھا جو قدیم طرز تعمیر کا نمونہ تھا لیکن اس کا ایک حصہ جسے بغلی حصہ کہا جا سکتا ہے بہت خوبصورت بنایا گیا تھا۔ اصل عمارت سے الگ زمین حاصل کرنے کے بعد اس کا ایک معین احاطہ بنایا گیا تھا اور اس احاطے میں خوبصورت باغ لگایا گیا تھا۔ احاطہ ایسا تھا کہ باہر سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ حالانکہ اگر وہ لوگ چاہتے تو اس خوبصورت عمارت کے گرد اونچی چار دیواری بنا سکتے تھے لیکن نہ جانے کیوں اسے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

باغ میں ایک سنگِ مرمر کی بنچ بنی ہوئی تھی۔ غلام رسول کی نظر اس بنچ پر پڑی تو ٹھہر کر رہ گئی۔ بنچ پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ غلام رسول اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ غیر محرم

لڑکی کی طرف دیکھنا گناہ کے زمرے میں آتا ہے مگر وہ لڑکی کچھ اس طرح بیٹھی تھی کہ وہ بے خیالی میں ہی یہ گناہ کر بیٹھا۔ اس لڑکی کے بال کھلے ہوئے تھے۔ بال اتنے گھنے اور لمبے تھے کہ وہ اس کی کمر سے بھی نیچے تک لٹک رہے تھے۔ بالوں کا ایک انبار تھا جس کے ہالے میں اس کا حسین چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کی شکل وصورت کچھ ایسی تھی کہ بے ساختہ غلام رسول کی زبان سے کلمہ تحسین نکل پڑا۔ عورت کی حس مردوں کے مقابلے میں تیز ہوتی ہے۔ لڑکی نے بھی اس کی نظروں کی چبھن محسوس کر لی اور اس نے سر اٹھا کر غلام رسول کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر تک وہ اسے دیکھتی رہی پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور تیزی سے اس کے پاس پہنچی۔ غلام رسول کو ایک لمحہ میں یہ احساس ہوا کہ لڑکی کو اس کا یوں دیکھنا پسند نہیں آیا ہے اور اب وہ اسے سرزنش کرنے کے لیے آ رہی ہے۔ مگر وہ قریب آ کر اس کے سامنے اس طرح کھڑی ہو گئی جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو پھر اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے اور مدھم سی آواز سنائی دی۔ ''تم......''

''جی آپ نے کچھ کہا؟'' غلام رسول نے چونک کر پوچھا۔

''تم...... عامر...... عامر ہو نا میرے عامر۔'' لڑکی نے عجیب انداز میں کہا اور آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

انسان بعض اوقات بہت کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں ہوتا۔ اگر اس وقت اس لڑکی کی جگہ کوئی توپ لیے کھڑا ہوتا تو وہ اسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیتا۔ مار مار کر اس کا حلیہ خراب کر دیتا لیکن اس وقت تو اس پر بوکھلاہٹ کا ایک عجیب سا دورہ پڑ گیا تھا۔ اس نے وحشت ناک نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا پھر لڑکی کی کلائیاں پکڑ کر اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

''ن...... نہیں...... میرا مطلب ہے کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں تو غلام...... غلام رسول ہوں۔''

''جھوٹ...... جھوٹ...... مت بولو...... نہیں چھوڑوں گی...... تم...... تم عامر ہو...... پھر بھاگ جاؤ گے...... دوڑو...... پکڑو۔'' وہ زور زور سے چیخنے لگی۔

اس کی چیخ وپکار پر مکان کے اندر سے بہت سارے لوگ نکل آئے۔ ان میں ایک بارعب شخص بھی تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سے زائد ہو گی۔ اس نے سنہرے فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا اور سر پر کشمیری ٹوپی تھی جبکہ دوسرا شخص بھی سرخ وسفید رنگت کا تھا مگر گوری رنگت پر بڑی مونچھیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اس کی عمر تیس بتیس سال ہو گی۔ ان دونوں کے علاوہ کئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نوکر بھی تھے۔

وہ سب پریشانی کے عالم میں باہر آئے اور غلام رسول کے گرد کھڑے ہو گئے تھے۔ غلام رسول پر بوکھلاہٹ کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ ہکلا ہکلا کر کہہ رہا تھا۔ ''کک..... کچھ بھی نہیں ہوا جناب..... مم..... میں..... میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ یہ اندر سے آئیں اور..... اور میرے گریبان کو پکڑ کر چیخنے لگیں۔ آپ یقین..... یقین کریں..... میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔''

غلام رسول اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ اس وقت اس کی ساری تیزی طراری ہوا ہو گئی تھی۔ معمر شخص جس نے چشمہ لگا رکھا تھا آگے بڑھا اور اس لڑکی سے بولا۔ ''بیٹی شانو! چھوڑ دو اسے..... یہ کیا بدتمیزی ہے چھوڑ دو اسے۔''

''نہیں چھوڑوں گی..... نہیں چھوڑوں گی..... بہت دن بعد ہاتھ آیا ہے..... اسے چھوڑ دیا تو یہ پھر بھاگ جائے گا۔'' لڑکی نے چیخ کر کہا۔

''نہیں بھاگے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں یہ نہیں بھاگے گا۔ عامر تم بھاگو گے تو نہیں۔'' معمر شخص نے غلام رسول کی طرف دیکھ کر کہا، ساتھ ہی ساتھ اس نے داہنی آنکھ دبا دی۔

غلام رسول نے حیران نگاہوں سے معمر شخص کو دیکھا۔ دوسرا آدمی بھی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے غلام رسول کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''خدا کے لیے..... خدا کے لیے مان لو اس کی بات، چند لمحوں کے لیے مان لو، تمہارا بڑا احسان ہوگا ہم پر.....''

غلام رسول حقیقت میں ڈر گیا تھا۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ وہ لوگ نزدیک آتے ہی برس پڑیں گے۔ خوب لعن طعن کریں گے۔ پٹائی بھی ہو سکتی ہے۔ ان کے ساتھ ملازم بھی ہیں۔ اتنے لوگوں سے نمٹنا آسان نہ ہوگا لیکن ان لوگوں کے لہجے نے ڈھارس دی تو وہ سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ تبھی تو نوجوان نے التجائیہ انداز میں دونوں آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی۔ غلام رسول بات کی تہہ تک نہ سہی مگر کچھ حد تک اندازہ کر چکا تھا اسی لیے اس نے نرم لہجے میں لڑکی سے کہا۔ ''میرا لباس تو چھوڑو..... کپڑے چھوڑو شانو..... دیکھو قمیض پھٹ جائے گی۔''

''تم بھاگ جاؤ گے..... مجھے پتا ہے تم بھاگ جاؤ گے..... نہیں چھوڑوں گی۔'' لڑکی نے گویا ضد باندھ لی تھی۔

''نہیں بھاگوں گا یہ میرا وعدہ ہے کہیں نہیں جاؤں گا۔''

''جاوید..... بیٹے عامر کو اندر لے کر جاؤ، یہ بہت دنوں بعد ملا ہے۔'' معمر شخص نے کہا۔

☆======☆======☆

برفیلے میدان کے درے میں داخل ہوتے ہوتے احمد رکا پھر مڑ کر مہندر ونشی سے بولا۔ ''کل جب میں صحیح سلامت واپس آؤں گا تو تمہارے جھوٹ کی قلعی کھل جائے گی اور تمہارے شیطانی منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ تم لوگ ہمیں غلام بنائے رکھنے کے لیے جو چالیں چلتے ہو ان میں سے ایک کا تو خاتمہ ہو جائے گا۔ یاد رکھو کل میں صحیح سالم تمہارے سامنے آؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور برفانی میدان میں جانے والے درے میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

اس کی چال میں استقامت تھی۔ وہ فخر و غرور سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے پیٹھ پر بیگ لٹکا رکھا تھا اور کندھے پر رائفل۔ بیگ میں کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ دیگر ضرورت کی چیزیں بھی تھیں۔

پروفیسر نے مہندر ونشی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ جبکہ احمد کے ساتھیوں کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ پروفیسر نے تمام ساتھیوں کو واپس چلنے کا اشارہ دیا اور خود بھی مڑ گئے۔

گھر واپس آ کر پروفیسر بستر پر لیٹ گئے۔ ان کے ذہن پر عجیب قسم کے خیالات کی یلغار تھی۔ وہ انہی لوگوں کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔ جب پوری طرح آنکھیں بند ہونے لگیں تو وہ بے خبر سو گئے۔

اگلے روز دن چڑھے ان کی آنکھیں کھلیں۔ احمد کے ساتھیوں نے ناشتہ لا کر ٹیبل پر لگا کر رکھ دیا تھا۔ علی بھی کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ کہیں گیا ہوا تھا۔ انہوں نے ناشتہ کیا اور کمرے سے نکل آئے۔ انہیں اب احمد پر غصہ آنے لگا تھا کہ وہ خواہ مخواہ برفیلے میدان میں رات گزارنے چلا گیا تھا۔ مجاہدین تو دو ٹوک فیصلہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس طرح کی بازی نہیں لگاتے۔ مارو یا مر جاؤ کی حکمت عملی پر یقین رکھتے تھے۔ وہ انہی سوچوں میں غرق اِدھر سے اُدھر ٹہلتے رہے۔ پھر وہ گلیوں میں گھومنے کے خیال سے باہر آ گئے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ سورج اپنی مریل شعاعیں سمیٹ کر قریب کی پہاڑیوں میں گم ہو گیا مگر احمد نہیں لوٹا۔ وہ واپس گھر آئے جہاں احمد کے ساتھی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے ان پر ایک نظر ڈالی پھر کمانڈر علی سے بولا۔ "میں برفیلے میدان میں جا رہا ہوں کیونکہ احمد کو اب تک واپس آنا چاہیے تھا۔"

علی بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور اپنی ٹوپی دار جیکٹ، دستانے اور کوہ پیمائی کے جوتے وغیرہ پہننے لگا پھر تیار ہو کر بولا۔ "ایسا کرتے ہیں دو مقامی ساتھیوں کو بھی لے لیتے ہیں۔"

"ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔" احمد کے ساتھیوں میں سے پانچ آدمیوں نے کھڑے ہو کر کہا پھر وہ سب ایک ساتھ مکان سے نکلے اور درے کی جانب بڑھنے لگے۔

درے کے بعد برفیلا میدان تھا۔ اس میدان میں جابجا احمد کے جوتوں کے نشان تھے۔ ان نشانات کی وجہ سے انہیں بڑی آسانی ہو رہی تھی۔ رات میں برفباری نہیں ہوئی تھی لہٰذا نشانات صاف طور سے نہ سہی البتہ کسی حد تک نظر آ رہے تھے۔ ان نشانات کی وجہ سے انہیں ادھر اُدھر بھٹکنا نہیں پڑ رہا تھا اور وہ سب خاصے وثوق سے صحیح سمت میں بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

ابھی تک شفق کی سرخی مغرب میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سب ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں ایک اونچی پہاڑی پر غار نما جگہ بنی ہوئی تھی۔ ایسے قیامت خیز ہواؤں والے میدان میں یہ قدرتی پناہ گاہ نعمت سے کم نہ تھی۔ اسے بطور پناہ گاہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یوں بھی انہیں ایک محفوظ پناہ گاہ کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ احمد نے بھی اس غار کو پڑاؤ کے لیے منتخب کیا ہوگا کیونکہ یہاں راکھ، کوئلے اور ادھ جلی لکڑیاں بکھری پڑی تھیں لیکن زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ احمد کا وہ تھیلا بھی ایک طرف کھلا پڑا تھا جس میں وہ اپنا ضروری سامان لے کر رخصت ہوا تھا۔ تھیلے کی تمام چیزیں ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ اس مقام پر برف بھی جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھی جیسے دو بھینسوں کی لڑائی ہوئی ہو۔ خوب ادھم چوکڑی مچی ہو۔

"یتی!" دفعتاً ایک شخص دہشت زدہ آواز میں چیخا۔ یتی برفانی انسان کو کہتے ہیں۔ وہ برف پر موجود قدموں کے نشان دیکھ کر ہی دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ اس پر بری طرح دہشت سوار ہو چکی تھی۔ ان نشانات نے علی اور پروفیسر کو بھی حیران کر دیا تھا۔ انہوں نے بغور دیکھا تو ان نشانات میں آگے کی طرف ریچھ کا سا پنجہ تھا لیکن پچھلی طرف کا حصہ ریچھ کے تلوے جیسا نہیں تھا بلکہ انسانی پاؤں سے مشابہ تھا۔ البتہ سائز میں کئی گناہ بڑا تھا۔

پروفیسر نے ٹارچ روشن کر لی۔ اس کی دائرہ نما روشنی دھند کی چادر کو چیرتی ہوئی پیروں کے عجیب و غریب نشانات کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔ ان نشانات کے ساتھ

کچھ ایسے نشانات بھی تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ کسی بھاری چیز کو گھسیٹتے ہوئے لے جایا گیا ہو۔

وہ سب نشانات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ایک موڑ مڑتے ہی وہ سب ٹھٹک گئے۔ سامنے ہی ایک انسانی جسم کے اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ انسانی جسم کے باقیات اس حالت میں تھے کہ انہیں دیکھ کر دل ہولنے لگا۔ پروفیسر خود کو بیمار بیمار سا محسوس کرنے لگے تھے۔ انہیں چکر سا محسوس ہوا تھا۔ کپڑوں سے ہی انہوں نے پہچان لیا تھا کہ وہ باقیات احمد کے ہیں۔ گوشت کے لوتھڑے ادھر اُدھر اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے کسی خبیث درندے نے بڑی بے رحمی سے بھنبھوڑا ہو۔ برف پر جابجا خون پھیلا ہوا تھا جو جم کر لوتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے دونوں بازو کندھوں سے الگ الگ پڑے تھے اور ٹانگوں کو آپس میں ملا کر رسی کی طرح بل دے دیا گیا تھا۔ پیٹ چاک تھا اور آنتیں ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ بلاشبہ یہ ایک ہولناک منظر تھا۔

احمد کے تمام ساتھیوں پر دہشت طاری تھی۔ جس نے پہلی بار اس نشان کو دیکھا تھا وہ اب تک ہذیانی انداز میں یتی یتی کی تکرار کیے جا رہا تھا۔ اس کی کیفیت کا رخ موڑنے کے لیے پروفیسر نے اس کے گال پر زوردار طمانچہ مارا پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ کسی درندے کا شکار ہوا ہے۔

پروفیسر کی بات پر اس نے خفگی سے دیکھا پھر پنجوں کے نشانات کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "کیا ایسے پنجے کسی درندے کے ہوتے ہیں؟"

"درندہ شکار کرنے کے بعد کھاتا ہے مگر یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔ تمام اعضاء سلامت ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صرف غصہ اتارا گیا ہے۔" ایک دوسرے شخص نے کہا۔

پروفیسر نے دوبارہ لاش کا جائزہ لیا۔ پیٹ چاک تھا اور آنتیں ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ سینہ کھلا ہوا تھا اور اس پر جتنا گوشت تھا نوچ لیا گیا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی پسلیاں ادھر اُدھر نکلی ہوئی تھیں۔ یہ صاف ظاہر تھا احمد کو جس درندے نے بھی ہلاک کیا تھا اس کے پنجے بھی تھے اور چیتے کی طرح نوکیلے تیز دھار دانت بھی۔

احمد کے ساتھیوں نے موٹے موٹے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔ علی نے ان میں سے ایک کے کمبل کو لیا اور زمین پر پھیلا دیا۔ پھر احمد کے اعضاء کو جمع کرنے لگا۔ دوسرے لوگ بھی اس کی مدد کر رہے تھے پھر اسے گٹھڑی سی بنائی اور مریل قدموں سے واپس ہو لیے۔ آبادی میں پہنچتے ہی برفانی انسان کی اس تازہ کارروائی کی خبر جنگل میں لگی آگ کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرح پھیل گئی۔ لوگ بھاگ بھاگ کر آنے لگے۔

تدفین سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ مہندر وشی کا نمائندہ آ گیا کہ اس نے اجلاس طلب کیا ہے۔ اصولاً وہ شرط جیت چکا تھا۔ روایت کا تقاضہ تھا کہ احمد کے ساتھی جا کر اعترافِ شکست کرتے۔

حسن اور دیگر ساتھی کھڑے ہو گئے۔ ''پروفیسر صاحب ہم اعترافِ شکست کرنے جا رہے ہیں۔'' وہ مضمحل آواز میں بولے۔

''ہم بھی تم لوگوں کے ساتھ چلیں گے۔'' پروفیسر اور علی بھی تیار ہو گئے۔

وہ سب خاموشی سے اس میدان کی طرف جا رہے تھے جہاں یہ شرط منظور ہوئی تھی۔ اس میدان میں پہنچ کر پروفیسر کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہاں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مہندر وشی کے گر کے اپنے مطلب کی بات پھیلانے اور لوگوں کو جمع کرنے کے معاملے میں نہایت مستعد تھے۔

مہندر وشی حاضرین سے خطاب کر رہا تھا۔ اس کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ ناگ دیوتا کا صحیح اور جائز نمائندہ ہے اس کے موقف کی صداقت کی کئی مرتبہ پہلے بھی گواہی مل چکی ہے۔ برفانی انسان ''یتی'' نے ایک بار پھر ظاہر کر دیا ہے کہ جو بھی اس کی مخالفت کرے گا دیوتاؤں کا عذاب اس پر نازل ہو گا اور دردناک موت اس کا مقدر ہو گی۔ ناگ دیوتا کا فرمان ہے کہ اس پورے علاقے کے ہندوؤں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھارت ماتا کی رکھشا کریں گے اور آتنک وادیوں کو اپنے علاقے سے مار بھگائیں۔

ہجوم کی جانب سے زبردست جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ نعرے بلند ہو رہے تھے۔ پتا نہیں کس جذبے کے تحت پروفیسر نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چیخ کر بولے۔ ''دوستو! میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے۔ میں احمد کے چیلنج کو سچ ثابت کر دکھاؤں گا۔ آج رات میں اس برفانی میدان میں وقت گزاروں گا اور صبح صحیح سلامت لوٹ کر آپ لوگوں کو برفانی انسان کی حقیقت سے آگاہ کروں گا۔''

پروفیسر کے الفاظ میں جادو تھا۔ میدان میں سناٹا چھا گیا۔ دوسرے ہی لمحے مہندر وشی کی آواز سنائی دی۔ ''ایک بار پھر صداقت کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ ایک بار پھر برفانی انسان میرے منکروں کو سزا دینے کے لیے نکلے گا۔ برفانی میدان پھر سے خون سے رنگین ہو گا۔ کل پھر ایک بار یہاں جلسہ طلب کیا جائے گا تاکہ تم لوگ خود آ کر اس کے انجام سے آگاہی حاصل کرو۔''

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب جلسہ برخواست کیا جاتا ہے۔ لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر دو دو چار چار کی ٹولیوں میں واپس جانے لگے۔ کچھ لوگ پروفیسر وغیرہ کی طرف دیکھ کر طنزیہ ہنسی ہنس رہے تھے۔

علی کو پروفیسر کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ وہ بولا۔ ''سر! آپ نے یہ بہت غلط حرکت کی ہے۔ خوامخواہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ آپ کی جان بہت قیمتی ہے۔ مجھ پر یہ ذمے داری ہے کہ میں آپ کو بہ حفاظت پاکستان تک پہنچا دوں اور آپ ہیں کہ نئی نئی الجھنوں میں خود کو پھنساتے چلے جا رہے ہیں۔''

''نہیں میرے دوست یہ بہت ضروری ہے۔ میں نہ صرف احمد کا انتقام لینا چاہتا ہوں بلکہ یہاں کے معصوم لوگوں کو اس سازشی کے چنگل سے نجات بھی دلانا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں بھی ساتھ چلوں گا۔''

''نہیں یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہو گی۔ مجھے اکیلے جانا ہو گا۔'' پروفیسر نے واضح الفاظ میں منع کر دیا۔

جس وقت پروفیسر نے پہاڑی درے کی طرف بڑھنا شروع کیا تو رات کی تاریکی خاصی گہری ہو چکی تھی۔ انہوں نے کوشش کی تھی کہ ٹارچ کی روشنی میں انہی قدموں کے سہارے آگے بڑھیں جس کے سہارے چل کر احمد کی لاش تک پہنچے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھ ضروری سامان کا بیگ اور اسلحہ بھی لے لیا تھا۔ اسلحے میں ریوالور کے علاوہ جرمن ساخت کی ایک رائفل بھی تھی۔ یہ رائفل اتنی طاقتور تھی کہ اس سے بہ آسانی ہاتھی کا شکار کیا جا سکتا تھا۔

وہ برفیلی پہاڑیوں پر نہایت احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ قدم قدم پر برف کی نوکیلی قلمیں کھڑی تھیں جو ذرا سی بے احتیاطی سے جسم کے آر پار ہو جائیں۔ پھر گہری کھائیاں بھی تھیں جو بھوکے درندے کی طرح منہ کھولے تاک میں تھیں۔ ادھر ذرا سا قدم لڑکھڑایا اور ادھر سالم انسان کو نگل گئیں۔ سرد ہوائیں جسم میں سوئیوں کی طرح پیوست ہو رہی تھیں۔

خدا خدا کر کے وہ اس مقام تک پہنچ گئے جہاں احمد نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہ جگہ برفانی ہواؤں سے نسبتاً محفوظ تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہاں ایسے سوکھے درخت بھی تھے جن کی شاخوں کو آگ جلانے کے کام میں لایا جا سکتا تھا۔ انہوں نے سوکھی ٹہنیوں کو جلا کر الاؤ روشن کیا اور آگ کی گرمی سے ہاتھ سینکنے لگے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وقت گزرتا رہا۔ کئی بار جھپکی بھی آئی مگر انہوں نے نیند کو قریب پھٹکنے نہ دیا۔
رات کافی گزر چکی تھی کہ انہیں بیک وقت چیخ اور غراہٹ سنائی دی اور وہ چونک کر کھڑے ہو گئے۔

☆======☆======☆

''نہیں بھاگوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔'' غلام رسول نے دامن چھڑانے کی کوشش کی۔
''شانو چھوڑ دو، میں اسے اندر لے جا رہا ہوں۔'' نوجوان نے کہا۔
لڑکی نے کپڑے چھوڑ دیے تو غلام رسول نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''چلیے۔''
اس عجیب وغریب صورتِ حال نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو کر رہ گئی تھی لیکن اب آہستہ آہستہ اس کے حواس واپس آ رہے تھے۔ وہ لوگ اسے اندر کی طرف لے چلے۔ اس لڑکی یا عورت نے اسے ایسے گھیر رکھا تھا کہ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرے تو فوراً پکڑ میں آ جائے۔ ویسے اس لڑکی کے چہرے پر نہ تو دیوانگی تھی اور نہ وہ پاگل لگ رہی تھی۔ اچھی خاصی شکل وصورت کی مالک تھی۔ ایک نگاہ دیکھ کر اس کے تاثرات ذہن پر طاری ہوتے تھے۔ قد وقامت بھی اچھا خاصا تھا۔ جسمانی لحاظ سے لڑکی نہیں عورت لگتی تھی۔ غلام رسول سوچ رہا تھا کہ نہ جانے نہیں کیا قصہ ہے۔

وہ ان لوگوں کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ مکان بہت خوبصورت تھا۔ وہ لوگ اسے لیے ہوئے ایک ڈیوڑھی نما عمارت حصے میں آ گئے۔ اس کے بعد صحن تھا اور پھر عمارت کا دوسرا اندرونی حصہ۔ عورت نے غلام رسول کی آستین پکڑ لی تھی وہ اسے کھینچتی ہوئی ایک سمت لے آئی اور ایک کرسی پر بٹھا دیا پھر خود بھی قریب بیٹھ گئی۔
''دیکھو عامر اب، اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی جو کچھ کہو گے تمہاری ہر بات مان لوں گی۔ بس اب کہیں جانے کی کوشش نہ کرنا۔ اب مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ میں اس سے زیادہ تمہیں تلاش کرنے کی یا تم سے دور رہنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ اب تو میری التجا مان لو۔ دیکھو اب تو میری بات مان لو۔ اب یہاں سے کہیں مت جانا۔''
''نہیں اب میں کہیں نہیں جاؤں گا یہ میرا وعدہ ہے۔'' اب وہ صورت حال کو پوری طرح سمجھ چکا تھا چنانچہ کسی حد تک پُرسکون ہو گیا تھا۔ لڑکی کے لہجے پر اب اس نے خاص طور پر سے غور کیا تھا اور یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ کچھ ذہنی طور پر معتدل نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی اسے شکر گزار نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور اس تعاون پر غلام رسول سے بہت متاثر

نظر آ رہے تھے۔ شانو محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی کہ اسے دیگر لوگوں کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ اس نے ان لوگوں کا جائزہ لے کر کہا۔ ''آپ لوگ ہمارے سر پر کیوں نازل ہیں۔ جائیے یہاں سے چلے جائیے میں عامر سے کچھ باتیں کروں گی۔ اتنے دنوں کے بعد تو مجھے موقع ملا ہے اور آپ لوگ مجھے باتیں بھی نہیں کرنے دیتے۔ جائیے میں کہتی ہوں کمرے سے نکل جائیے۔ آپ لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔''
''ہاں ہاں ہم جاتے ہیں۔ ہم تو ایسے ہی عامر کی خیریت معلوم کرنے آ گئے تھے۔ اصل میں ہم ان سے یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ یہ اتنے دن کہاں رہے اور یہ کہ آئندہ یہ کبھی یہاں سے چلے تو نہیں جائیں گے۔ اگر تم اجازت دو تو ہم دو چار منٹ کے لیے عامر کو باہر لے جا کر پوچھ لیں کہ یہ پھر تو کہیں نہیں چلے جائیں گے۔''
''آپ لوگ پوچھنے والے کون ہوتے ہیں؟ میں پوچھ لوں گی سب کچھ۔ سب کچھ پوچھ لوں گی۔ جائیے آپ لوگ نکل جائیے یہاں سے۔ شرم آنی چاہیے آپ لوگوں کو۔''
''جا رہے ہیں جا رہے ہیں۔ اٹھو بھئی چلو!'' معمر شخص نے نوجوان سے کہا۔
نوجوان آدمی چند لمحے یونہی بیٹھا رہا پھر اس نے غلام رسول کا بغور جائزہ لیا۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ معمر شخص بھی اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ عجیب صورتِ حال تھی۔ غلام رسول کے ذہن میں بہت سارے خیالات آ رہے تھے۔ بہر طور اس کے لیے یہ بھی ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ نہ جانے کیا قصہ تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا رہا۔ عورت بدستور اسے دیکھتی رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''بتاؤ گے نہیں، تم کہاں چلے گئے تھے؟''
''پلیز شانو کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' غلام رسول نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''تاکہ تم پھر بھاگ جاؤ، نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ مجھ سے میرا حق نہ چھینو عامر مجھ پر رحم کرو۔'' عورت نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔
غلام رسول اب پوری طرح سمجھ چکا تھا کہ یہ عورت پاگل ہے۔ اس کے گھر والے باہر لے جا کر یہی بات اسے بتانا چاہتے تھے۔ اس پاگل عورت سے کیسے نجات ملے وہ تنہا سوچنے لگا۔ دروازے پر دستک ہوئی اور نوجوان نے اندر آ کر کہا۔ ''ارے شانو تُو عامر کو کچھ کھلائے پلائے گی نہیں۔ بے چارہ بھوکا بیٹھا ہے۔''
''ارے ہاں مجھے تو خیال ہی نہیں تھا۔ چلو عامر کچھ کھا پی لو۔'' کہہ کر اس نے بے تکلفی سے غلام رسول کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لے کر باہر آئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک بڑے کمرے میں دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ اس کی جانب اشارہ کر کے وہ بولی۔

''چلو بیٹھو! آج میں تمہیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤں گی۔''

غلام رسول کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے کہ اب پتا نہیں یہ عورت میرے ساتھ کیا کرے گی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''شاید تمہیں پتا نہیں ہے کہ میری طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے بہت سی چیزوں سے پرہیز بتایا ہے۔''

''اچھا! کوئی بات نہیں تم صرف انگور کی روٹیاں کھالو۔'' شانو جلدی سے بولی۔ ''یہ تو بیماروں کے لیے بھی فائدے مند ہے۔''

انگور کی روٹیاں اس علاقے کی مخصوص ڈش ہے۔ غلام رسول کو بھی بہت پسند تھی پھر بھی وہ ہچکچا رہا تھا۔ اسی وقت ایک عورت نے گلاس میں سرخ رنگ کا کوئی مشروب لا کر شانو کو دیا۔ ''لو باجی تمہارے لیے شربت لے آئی ہوں پی لو۔''

شانو نے اس عورت کے ہاتھ سے گلاس لیا اور غلام رسول کی طرف بڑھا کر بولی۔

''لو یہ تم پی لو میرے ہاتھوں سے پی لو۔ دیکھو پی لو ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔''

''نہیں شانو، کھانے پینے میں مجھے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ پرہیزی کھانوں کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کھاتا۔''

''ارے کچھ نہیں ہوتا، پی لو۔'' کہہ کر عورت نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگانا چاہا۔

''خدا کے لیے شانو سمجھنے کی کوشش کرو میں بیمار ہو جاؤں گا۔ میری بیماری بگڑ سکتی ہے۔'' غلام رسول جلدی سے بولا۔

''اچھا! یہ تو پریشانی کی بات ہے تمہاری بیماری تو میں نہیں چاہتی۔ خیر میں خود پی لیتی ہوں۔''

شانو کے اس انداز پر وہاں کھڑے تقریباً سب افراد نے اطمینان کی سانس لی۔ شانو نے مشروب کا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی پھر اس نے کہا۔ ''آپ لوگ کھائیے میں عامر کو لے کر ذرا باہر جا رہی ہوں۔'' اور زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ اس کا ہاتھ مڑ گیا اور وہ پلکیں جھپکانے لگی۔ معمر شخص نے مشروب کا گلاس لانے والی کو اشارہ کیا اور اس نے شانو کو تھام لیا۔ وہ لڑکھڑاتی آواز میں بول رہی تھی۔ ''ارے مجھے کیا ہوا۔ مجھ سے اٹھا کیوں نہیں جا رہا۔''

غلام رسول بھی حیرت زدہ رہ گیا تھا مگر فوراً ہی بات کی تہہ میں پہنچ گیا۔ اس کے

اندازے کی تصدیق بڑے میاں نے کر دی۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ ضروری تھا۔ جب تک وہ جاگتی رہتی ہم آپ سے کوئی بات نہیں کر سکتے تھے اسی لیے میں نے مشروب میں خواب آور دوا ملا کر اسے دے دی۔''

اس علاقے کی مخصوص زبان ''شینے'' تھی مگر یہ لوگ نہایت روانی سے اردو بول رہے تھے۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ ان لوگوں کا رابطہ پاکستان کے دیگر علاقوں سے بھی تھا۔ پھر وہ ایک عورت کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''جاؤ اسے آرام سے لے جا کر سلا دو۔''

عورت کو ہدایت دے کر وہ پھر سے غلام رسول کی طرف مڑ گئے اور بولے۔ ''یہ واقعہ عجیب و غریب ہے بہر طور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ آؤ بھائی ہم تو تمہیں جانتے بھی نہیں۔ پھر چہرے مہرے اور لباس سے بھی تم ادھر کے نہیں لگتے لیکن تم نے ہمارے ساتھ جو احسان کیا ہے جو تعاون کیا ہے اس کے لیے ہم سچے دل سے تمہارے احسان مند ہیں۔ بالکل بے فکر رہو۔ ہم تمہیں اس کا معاوضہ دیں گے۔ آؤ باہر کے کمرے میں بیٹھتے ہیں تاکہ تمہیں آرام سے بتا سکیں کہ ہماری بیٹی کیا تکلیف ہے۔''

بڑے میاں کے لہجے میں ایسا درد تھا کہ غلام رسول کا دل بھی پسیج گیا۔ وہ ان کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا جو نشست گاہ تھی۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے بھی رکھے تھے۔ وہ معمر شخص غلام رسول کا ہاتھ تھامے ہوئے گاؤ تکیے تک آیا اور اس کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

غلام رسول خاموش تھا مگر اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔ اس کے تجسس کو بھانپ کر معمر شخص بولا۔ ''تم نے جس طرح ہماری مدد کی اس کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں سمجھ نہیں آتا۔ آپ کے تعاون کی وجہ سے ہم احسان مند ہیں۔ ورنہ عام طور پر تو لوگ دوسرے کی مجبوری کا مذاق اڑاتے ہیں، ہمدرد بہت کم ملتے ہیں۔ تم نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ شانو کا دماغ صحیح نہیں ہے۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''خدا ہی علیم و خبیر ہے۔ وہی جانے کہ اسے کیا بیماری لگی ہے۔ ہم نے بہت کوشش کر لی مگر آج تک پتا نہیں لگا سکے کہ اسے بیماری کیا ہے۔ اس کی شادی کو تین سال ہونے کو آئے مگر یہ پتا نہ لگ پایا کہ اسے بیماری کیا ہے۔''

''اس کی شادی کس کے ساتھ ہوئی ہے؟''

''میرا نام حسن ہے اور یہ میرا بیٹا جاوید ہے۔ اسی کے ساتھ شانو کی شادی ہوئی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔''

غلام رسول نے سر اٹھا کر نوجوان کا جائزہ لیا۔

''میں ابتدا سے تمہیں تمام باتیں بتا رہا ہوں۔ شانو میرے جگری دوست واجد کی اکلوتی بیٹی ہے۔ واجد بہت بڑا زمیندار ہے۔ اس نے خاص طور سے میرے بیٹے کو پسند کیا تھا۔ بڑی دھوم دھام سے اس نے شادی کرائی لیکن شادی والی رات ہی ایک عجیب بات ہو گئی۔ نکاح کے وقت ہی سے شانو نے عامر عامر کی رٹ لگا دی۔ کمرۂ عروسی سے اس نے جاوید کو دھکا دے کر باہر نکال دیا تھا۔ واجد نے قرآن پاک اٹھا کر قسمیں کھائی ہیں کہ اس کے گاؤں میں کیا، آس پاس کے کسی گاؤں میں کوئی عامر نامی نوجوان نہیں ہے اور نہ وہ کسی عامر کو جانتا ہے۔ واجد کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ جھوٹ بھی نہیں بولتا ہے۔ بیٹی کا غم اس نے سینے پر لے لیا اور وہ بستر سے لگ گیا۔ اسی حالت میں اس نے اپنی تمام جائیداد بیٹی کے نام کر دی۔ یہ جائیداد کم نہیں تھی مگر یقین کرو گے، اس جائیداد میں سے ایک تنکا تک ہم نے نہیں لیا ہے۔ اس کی بیماری پر خرچ کرتے جا رہے ہیں۔ پہلے آس پاس کے حکیموں، ڈاکٹروں کو دکھایا پھر راولپنڈی تک لے گئے مگر وہ اب تک ویسی ہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے ہوا کیا ہے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ یہ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی ہے۔ رات میں بھی بس کچھ دیر کے لیے باہر آتی ہے۔ اب تک اس نے ایسا کوئی بھی کام نہیں کیا ہے جو اسے شک کے گھیرے میں لا دیتا پھر بھی میرا بیٹا ناراض ہے۔ اب تم ہی بتاؤ یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ دوست کی نشانی کو اس حالت میں گھر سے نکال دیا جائے؟''

باتیں ابھی جاری تھیں کہ اندر والے دروازے کا پردہ ہٹا اور شانو ظاہر ہوئی۔ اس نے اندر آتے ہی کہا۔ ''یہ کیا پلا دیا تھا مجھے؟ میں بیٹھے بیٹھے سو گئی۔''

اس کی یہ بات حیران کر دینے کے لیے کافی تھی۔ اتنی دقیق بات اس کی سمجھ میں آئی کیسے؟ سب یہی سوچ رہے تھے۔

اس کی ذہانت آمیز بات کو سن کر بھی بڑے میاں نے اسے نظر انداز کر دیا اور بولے۔ ''ہم نے تو کچھ نہیں دیا۔''

''میں سب کو پہچانتی ہوں۔ ابھی سب نے میری شرافت دیکھی ہے غصہ نہیں'' لڑکی نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اب دیکھیے گا میں کیا کرتی ہوں۔''

☆======☆======☆

اور پھر اس چیخ نے انہیں متوجہ کر لیا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ خوف میں ڈوبی، دل ہلا دینے والی چیخ سنی سنی سی لگی ایسا لگا جیسے وہ اس آواز کو پہچانتے ہیں۔ پہلے بھی سن چکے ہیں۔ اس ویرانے مین ان کے علاوہ کسی اور کے ہونے کا سوال نہیں تھا۔ وہ پکنک پر نہیں آئے تھے۔ شرط لگا کر، جان کی بازی لگانے آئے تھے۔ مہندر روشی کے آدمی درے پر پہرہ دے رہے ہوں گے۔ صرف اس ڈر سے کہ کہیں کوئی اور بھی ان کی مدد کو نہ آ جائے۔ انہیں اکیلے ہی شکار کھیلنا تھا۔ یہی تو شرط تھی۔ کہیں کوئی بے ایمانی نہ کرے اس ڈر سے علاقے کی معتبر شخصیات نے بھی پہرے پر اپنے آدمی بٹھا رکھے تھے۔ اتنے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کوئی کیسے آ سکتا تھا۔ اسی لیے پروفیسر چونکے تھے۔

انہوں نے رائفل اور ٹارچ اٹھا لی تھی۔ چھجے سے باہر جھانکا تھا: اس طرف لمبا چوڑا میلوں تک پھیلا میدان تھا۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی ایسے علاقوں میں کچھ زیادہ ہی چمکتی ہے۔ برف پر پھسل کر آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ آنکھوں کو نقصان نہ پہنچے اس قادر مطلق نے اس کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ بھاپ جیسا کہر ہر طرف پھیلا دیا تھا۔ پھر بھی اس گدلی روشنی میں دور دور تک نظر آ رہا تھا۔

پروفیسر متجسس نظروں سے آس پاس کے علاقے کا جائزہ لے رہے تھے۔ چیخ کے مخرج کو تلاش کر رہے تھے۔ بالآخر انہیں دو سائے نظر آ گئے۔ وہ دونوں آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آگے والے کو اپنی موت نظر آ رہی ہے تبھی تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا اور پیچھے والا حیرت انگیز طور پر پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ قلانچیں بھر رہا تھا۔ چھلانگیں لگا رہا تھا۔ تبھی آگے والا دوڑتے دوڑتے پھسلا تھا اور لڑھکنیاں کھاتا ہوا دور جا گرا تھا۔ اسے گرتے دیکھ کر پیچھے والے نے چھلانگ لگائی تھی اور اسے چھاپنے کی کوشش کی تھی۔ نیچے والا بھی کم پھرتیلا نہ تھا۔ وہ لڑھک کر دور چلا گیا تھا۔ اب ایک نیا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ گرنے والا کبھی ادھر لڑھکتا اور کبھی اُدھر۔ پروفیسر رائفل لے کر اس کی طرف دوڑے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو دور سے بھی فائر کر سکتے تھے مگر وہ چہرہ دیکھنا چاہتے تھے تاکہ دوست دشمن کی پہچان کر سکیں لیکن نزدیک پہنچتے ہی وہ بری طرح چونک گئے تھے۔ انہیں اپنی بصارت پر شبہ ہوا تھا اسی لیے وہ اپنی آنکھیں ملنے لگے تھے۔ آج تک انہوں نے پڑھا یا سنا تھا مگر اس وقت وہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ نہ تو مکمل انسان تھا اور نہ درندہ۔ اس کے پورے جسم پر بڑے بڑے بال تھے، ریچھوں کی طرح جسم کو ڈھکے ہوئے بال۔ وہ بلاشبہ چوپایہ نہیں تھا۔ دونوں پیروں سے چل رہا تھا،

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اچھل رہا تھا۔ پھر کیا چیز ہے یہ اور یہ کون ہے، اس خیال کے تحت انہوں نے نظریں گھمائیں اور گرے ہوئے آدمی کو پہچاننے کی کوشش کی۔

پہلی ہی نظر میں وہ اسے پہچان گئے۔ وہ علی تھا، کمانڈر علی۔ یقیناً وہ خود پر قابو نہیں رکھ پایا ہوگا اور کسی نہ کسی طرح پہرے داروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل آیا ہوگا علی کی جان خطرے میں تھی تو وہ کیسے خاموش رہتے۔ پھرتی سے انہوں نے رائفل سیدھی کی اور اس درندے کا نشانہ لیا ہی تھا کہ علی اور وہ گتھم گتھا ہو گئے۔ اب گولی چلانا خطرناک تھا۔ دونوں اس طرح گتھے ہوئے تھے کہ ایک ہو گئے تھے۔ چلائی گئی گولی علی کو بھی لگ سکتی تھی۔ اسی لیے وہ مخمصے میں تھے۔ کبھی ادھر سے نشانہ لیتے اور کبھی اُدھر سے۔ اسے روکنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ انہوں نے اللہ کا نام لے کر ہوائی فائر کیا۔ فائر کی آواز برفیلے میدان میں گونج اٹھی۔ جہاں ہر طرف سناٹے کا راج ہو، فضا پر سکوت ہو، گہری خاموشی چھائی ہوئی ہو وہاں ہلکی سی آواز بھی سماعت شکن محسوس ہوتی ہے، گولی کی آواز توپ کے گولے جتنی گونجدار محسوس ہوئی تھی۔

اس عجیب الخلقت درندے نے چونک کر گردن اٹھائی تھی۔ پروفیسر نے دوسرا پھر تیسرا فائر کیا۔ پے در پے فائر نے اس درندے کو بوکھلا دیا تھا۔ اس نے کمانڈر علی کو ایک طرف دھکا دیا تھا اور پروفیسر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ عجیب صورتِ حال تھی۔ پروفیسر چڑھائی پر تھے وہیں سے نیچے کی طرف دوڑے تھے اور درندے نے اوپر چڑھنا شروع کیا تھا۔ پروفیسر خود کو روکنا بھی چاہتے تو روک نہیں سکتے تھے لیکن اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ رکے تھے۔ اس کوشش میں ان کے جسم کو جھٹکا لگا تھا اور وہ پھسل گئے تھے۔ اب دونوں کے درمیان کا فاصلہ کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پروفیسر نے اپنے اعصاب پر قابو رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ رائفل کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اس دوران میں وہ مخلوق بہت زیادہ قریب آ گئی تھی۔

اس نے شکار کو قریب پا کر غیر انسانی چنگھاڑ بلند کی۔ اتنی تیز چنگھاڑ تھی کہ پروفیسر کو کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے تھے پھر اس نے ان کی طرف زقند لگائی تھی۔ پروفیسر نے رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکے تھے پھر بھی انہوں نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ گولی اس کے کندھے کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس کے غیظ و غضب میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ مارے غصے کے اپنی جگہ اچھلنے اور سینہ کوٹنے لگا تھا۔

پروفیسر نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ ایک زقند میں اس پر آ کر گرے گا۔

علی نے بھی صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کر لیا تھا۔ گو کہ وہ خود بھی زخمی ہو چکا تھا۔ اس درندے کے تیز ناخنوں نے اس کے جسم پر جگہ جگہ خراشیں ڈال دی تھیں جن سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ اس کے کپڑے بھی کئی جگہ سے پھٹ چکے تھے پھر بھی وہ خود کو روک نہ سکا اور شور مچاتا ہوا اس درندے کی جانب دوڑا تھا۔

پروفیسر نے اس درندے کے اچھلنے اور سینہ کوبی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ذرا سا سنبھل کر اس پر ایک اور فائر جھونک مارا۔ یہ گولی یقیناً کارگر ثابت ہوتی مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ عین اس وقت ان کے پیروں کے نیچے کی برف کھسک گئی تھی جس کی وجہ سے جسم میں لغزش آ گئی تھی اور نشانہ چوک گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ لڑکھڑا کر گر پڑے تھے۔ ان کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ پروفیسر کو یقین تھا کہ وہ گولی اس درندے کو نہیں لگی ہے۔ اسی لیے وہ غراتے اور چنگھاڑتے ہوئے پروفیسر پر جھپٹا تھا۔ اگر وہ سیدھا ان پر آ گرتا تو ان کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی مگر وہ بروقت ایک جانب لڑھک جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان کا داہنا ہاتھ رائفل کی نال پر پڑا اور انہوں نے اسے اسی طرح سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ وہ درندہ انہیں گھورتے ہوئے اٹھا اور دوبارہ لپکا۔

پروفیسر نے نالی کی طرف سے پکڑی ہوئی رائفل کو لٹھ کی طرح استعمال کیا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ وہ اس کے بھاری جبڑے سے ٹکرائی۔ رائفل کے کندے کی ضرب اتنی شدید تھی کہ اگر عام انسان کے چہرے سے ٹکراتی تو چہرہ لہو میں تر ہو جاتا لیکن اس پر صرف اتنا اثر ہوا تھا کہ وہ لڑکھڑا گیا تھا پھر جلد ہی سنبھل کر دوبارہ جھپٹا۔ انہیں اتنا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ رائفل کو سیدھا کرتے اسی لیے انہوں نے دوبارہ لٹھ کی طرح دے مارا۔ اس بار بھی ان کا نشانہ اس کی کھوپڑی تھی۔ وہ پھر لڑکھڑایا۔ انہیں اس بار موقع مل گیا اور انہوں نے رائفل کو سیدھا کر کے ہوائی فائر کر دیا۔

فائر کی آواز سے وہ ایک لمحے کے لیے خوفزدہ ہوا مگر فوراً ہی اس نے جمپ لگا دی۔ پروفیسر نے پھرتی سے خود کو نیچے گرا لیا۔ وہ ان پر سے ہوتا ہوا پیچھے والی چٹان سے جا ٹکرایا۔ کمانڈر علی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ شاید افراتفری میں گر گیا تھا۔ ایک دو دھاری چاقو جو وہ اپنے پیروں پر باندھے رکھتا تھا اسے نکال کر وہ لہراتا ہوا دوڑا آ رہا تھا۔ اس کا شور، چاقو کی چمک اور پروفیسر کی رائفل کی گرج نے درندے کو بوکھلا دیا۔ اس بار وہ اٹھا اور ناک کی سیدھ میں دوڑتا چلا گیا۔ اس نے مقابلے کی بجائے فرار کو ترجیح دی تھی جو اس بات کی دلیل تھی کہ اس کے پاس عقل بھی ہے۔ وہ

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھ گیا تھا کہ اس حالت میں مقابلہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

''یہ کیا چیز تھی علی؟''

''حالانکہ میں نے اس سے جنگ کی تھی۔ نہایت قریب سے اسے دیکھا تھا پھر بھی اب تک مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ ایک حقیقت تھی۔''

''یہی بات تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔''

''مجھے تو اب یقین ہو گیا ہے کہ برفانی انسان کی حقیقت ہے، ایک ٹھوس حقیقت۔''

''ویسے میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ اسے انسان کہوں یا حیوان۔''

پروفیسر نے کچھ دیر رک کر کہا۔ ''بہر حال اس میں شک نہیں کہ ''یتی'' کا وجود ہے اور شاید یہ بھی اسی نسل کا درندہ ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس نے مجھ پر نہیں، تم پر حملے کی ابتدا کی تھی۔ حالانکہ مہندر رونشی کی مخالفت میں نے کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ درندہ صرف مہندر رونشی کی مخالفت کرنے والے پر نہیں بلکہ ہر شخص پر حملہ کرتا ہے پھر بھی میری چھٹی حس کہتی ہے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح مہندر رونشی سے ضرور ہے تبھی تو وہ اتنے دعوے سے کہتا ہے کہ میری مخالفت کرنے والوں پر ہی یہ درندہ حملہ کرتا ہے۔ پھر یہ بھی سچ ہے کہ اس برفیلے میدان سے ہو کر ہر مہینے ایک دو قافلے جاتے ہیں۔ اگر احمد کی اطلاع درست ہے تو ان میں سے کسی نے اس درندے کے بارے میں کیوں نہیں کہا؟''

''یعنی آپ کا یہ خیال ہے کہ اسے مہندر رونشی نے پال رکھا ہے۔''

''ایسا بھی ممکن ہے۔ بعض لوگ خطرناک نسل کے کتوں کو بھی سدھا لیا کرتے ہیں اور بڑے آرام سے رکھتے ہیں۔''

''خیر! اب کیا پروگرام ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ برف کا طوفان شروع ہونے والا ہے۔'' کمانڈر علی نے اردگرد پھیلتی سفید دھند کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اس لیے ہمیں کسی محفوظ مقام پر پناہ لے لینا چاہیے۔''

''جہاں میں نے رات بسر کی تھی وہ مقام بھی برا نہیں ہے۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔''

واقعی وہ پناہ گاہ اس طوفان کے لیے ایک محفوظ جگہ ثابت ہوئی۔ وہ لوگ وہاں بیٹھ کر طوفان کے گزر جانے کا انتظار کرتے رہے۔

کئی گھنٹے بعد جب سفید دھند کی چادر ہٹی اور برف زار دھوپ کی روشنی سے چمک اٹھا تو وہ لوگ وہاں سے باہر نکلے۔ باہر برف کی ایک نئی پرت جم چکی تھی۔ وہ دونوں اندازے سے درے کی جانب چل پڑے۔ ابھی کچھ دور ہی پہنچے تھے کہ انہیں دھمک سی

سنائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سے فوجی بھاری بوٹ پہنے مارچ کر رہے ہوں۔ وہ دونوں بری طرح چونک گئے تھے۔ سامنے ایک چوڑی مگر کم گہری کھائی تھی۔ اسی کھائی سے وہ آوازیں آ رہی تھی۔ انہوں نے اس کھائی میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں درجنوں خیمے لگے ہوئے تھے۔ تقریباً ایک بریگیڈ جتنے آدمی کسی پناہ گاہ سے نکل کر ان خیموں کی طرف آ رہے تھے۔ یہ یقینی طور پر انہی لوگوں کا خیمہ تھا۔ ان سب نے سفید شرٹ اور خاکی نیکر پہن رکھی تھی اور فوجیوں کے انداز میں مارچ کر رہے تھے۔

''یہ...... یہ تو آر ایس ایس کے ورکر ہیں۔'' علی نے حیرت سے کہا۔ ''مگر یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔''

''یقینی طور پر ان لوگوں نے کوئی خاص پلان بنایا ہو گا۔''

''ایسا بھی ہو سکتا ہے انہیں مہندر رونشی نے اپنی مدد کے لیے باہر سے بلوایا ہو گا۔ بات کچھ بھی ہو۔ یہاں کے مسلمان سخت خطرے میں ہیں۔ اب انہیں دو طرفہ نشانہ بننا پڑے گا۔ ایک طرف سے فوجی ظلم ڈھائیں گے دوسری طرف سے یہ لوگ؟''

''یہی ہو گا۔'' پروفیسر بولے۔

''یہ لوگ یقیناً جنوبی پہاڑی عبور کر کے لداخ کے راستے آئے ہوں گے۔ انہیں مہندر رونشی کی مدد سے باز رکھنا ہو گا۔''

''ہمارے پاس اسلحہ بھی نہیں ہے انہیں کیسے روکا جائے۔ یہاں سینکڑوں بہترین پناہ گاہیں موجود ہیں جن سے مورچوں کا کام لیا جا سکتا ہے لیکن ہتھیاروں کی کمی آڑے آئے گی۔''

''اس کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ ہم نہایت خاموشی سے آبادی میں پہنچ جائیں پھر وہاں سے تازہ کمک لے کر آئیں۔''

''بات غلط نہیں ہے ہمیں جلد سے جلد آبادی میں پہنچنا ہے۔ تا کہ کمک لائی جا سکے مگر اس بات کا بھی خیال رکھنا ہو گا کہ یہاں سے نکلتے وقت ہمیں کوئی نہ دیکھے۔''

''تو ہمیں فوراً الٹے ہاتھ کی طرف چلنا چاہیے۔ درے سے ہم کافی فاصلے پر نکلیں گے۔''

یہ دونوں اسی طرف چل پڑے۔ ادھر میدان کا وہ حصہ تھا جہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ سا تھا۔ پہاڑیوں پر چاقو کے پھل کی طرح جگہ جگہ برف جمی ہوئی تھی۔ ان برفیلے چاقوؤں سے بچتے بچاتے ہوئے وہ دونوں سنبھل سنبھل کر آگے کی طرف

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑھتے جا رہے تھے۔ ان کے سامنے پہاڑ کسی اونچی دیوار کی طرح کھڑا تھا۔ وہ اس دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کافی آگے چلنے کے بعد انہیں ایک درہ سا نظر آیا۔ وہ دونوں اس درے میں داخل ہو گئے۔ پتلی سی گلی کی طرح وہ درہ آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس درے سے باہر آتے ہی انہوں نے خود کو آبادی کے عقبی طرف پایا، پھر وہ تیز تیز قدموں سے آبادی کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

آبادی میں پہنچتے ہی انہوں نے حسن سے ملاقات کی اور اسے ساتھیوں کو جمع کرنے کے لیے بھیج دیا اور پھر وہ دونوں آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ تھکن سے چُور بدن کو آرام ملا تو فوراً ہی آنکھوں میں نیند اتر آئی۔

پروفیسر کی آنکھ پہلے کھلی۔ انہوں نے علی کو آواز دی۔ کمانڈر علی نے دستی گھڑی میں وقت دیکھا۔ دس بجنے والے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جسے مناسب ترین کہا جا سکتا تھا۔ اس پورے علاقے میں ایسے ہندوؤں کی اکثریت تھی امن کے خواہاں تھے کیونکہ ان کے بھی چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ بھرا پُرا خاندان تھا اور خاندان کے ہر فرد کو روٹی کی ضرورت تھی۔ روٹی پیڑ میں پھلتی نہیں ہے اسے محنت سے حاصل کرنا پڑتا ہے اور محنت کرنے کے لیے حالات کا سازگار ہونا ضروری ہے۔ جن کے پاس قوت ہوتی ہے وہ بے لگام ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے اٹھے ہوئے سر جھکانے کے لیے بلائی گئی فورس کبھی کبھی ان کے خلاف بھی ایکشن لے لیتی تھی اس کے علاوہ جن مسلمانوں کے خلاف ایکشن ہوتا تھا ان میں کئی جوشیلے نوجوان سینہ سپر ہونے کی کوشش کرتے تھے اور یہ بات ان ہندوؤں کے حق میں بھی بہتر ثابت نہ ہوتی۔ آئے دن کے پولیس مقابلے سے وہ لوگ بھی تنگ تھے۔ پکڑ دھکڑ، ہڑتال، فائرنگ سے زندگی اجیرن بن چکی تھی۔ کاروبار تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اب تو روٹی کے بھی لالے پڑنے لگے تھے۔ پھر انہیں احساس ہو چلا تھا کہ جب تک ظلم و ستم کا یہ طوفان رکے گا نہیں، نئے نئے لوگ بندوق تھامتے رہیں گے اور جب تک بندوق گرجتی رہے گی حالات ایسے ہی رہیں گے۔ حکومت کی جانب سے انہیں امداد ملتی رہتی تھی مگر ایسے لوگ . . صاحب دل تھے وہ دل سے یہی چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے حق کا فیصلہ جلد ہو جائے تاکہ اس خطہ میں امن کا راج قائم ہو سکے اور ایسے ہی لوگوں کے ذہن کو موڑنے کے لیے مہندر روشی جیسے ایجنٹ کام کر رہے تھے۔ انہیں حکومت کی جانب سے بھرپور حمایت حاصل تھی۔ دہلی سے اسلحہ و رقم کے علاوہ دیگر مراعات بھی ملتی رہتی تھیں۔ احمد نے اس سے ٹکرا کر انصاف پسند ہندوؤں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا اور وہ مرحوم احمد

کی حمایت میں دبے لفظوں میں بولنے بھی لگے تھے۔ کمانڈر علی نے پروفیسر سے کہہ دیا تھا ''اگر یہ میری کمانڈ کا علاقہ ہوتا تو میں براہِ راست ان ہندوؤں پر کام کرتا اور بجائے خود بندوق اٹھانے کے انہیں غاصب فوجیوں سے ٹکرا دیتا۔''

پروفیسر میدان جنگ کے لیے صفر تھے، جنگی حکمت عملی سے بالکل ناواقف تھے۔ جواب کیا دیتے خاموش تھے۔ علی اس وقت بھی اس نہج پر غور کر رہا تھا۔ اسے انتظار تھا احمد کے ساتھیوں کا جواب آنے ہی والے تھے۔ انہیں ساتھ لے کر وہ درے میں مقیم آر ایس ایس کے ٹرینڈ ورکروں کو ان کے اصل مقام جہنم میں پہنچانے کا انتظام کرنا تھا۔ یہ لوگ کس مقصد سے اتنے خفیہ انداز میں یہاں جمع ہوئے تھے، اس بارے میں کسی بھی قسم کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی تھی کہ حسن جو احمد کے لڑاکا دستے میں اہم مقام رکھتا تھا، آ گیا۔ اس نے سلام کرنے کے بعد کہا۔ ''میں نے اپنے آدمیوں کو درے کی جانب روانہ کر دیا ہے۔ وہ لوگ حملہ کرنے ہی والے ہوں گے۔ جلدی چلیے۔''

علی ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ تیز تیز قدموں سے اس پہاڑ کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں ایک درے میں اس نے خاکی ہاف پینٹ، خاکی ترچھی ٹوپی اور سفید شرٹ میں ملبوس آر ایس ایس کے ورکروں کو دیکھا تھا۔ وہ سب بڑے منظم انداز میں قطار بنا کر بیٹھے تھے جیسے انہیں کسی خاص حکم کا انتظار تھا۔

پروفیسر اور علی، حسن کے ساتھ اس پہاڑی پر پہنچ گئے جس کے درے میں ان کے شکار چھپے ہوئے تھے۔

درے پر پہنچ کر حسن نے نیچے دیکھا۔ دور دور تک لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی خیمے بھی لگے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ نیچے جمع شدہ افراد کئی دن سے وہاں مقیم ہیں۔ اس نے ان کے کپڑوں کو بغور دیکھا۔ خاکی نیکر اور سفید شرٹ، اس پر خاکی ترچھی ٹوپی۔ اس پوشاک کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن تنظیم آر ایس ایس کی یونیفارم تھی۔ یقیناً یہ اسی کے ورکر تھے۔

حسن نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''یہ تو آر ایس ایس کے کارکن ہیں۔''

''تو میں نے کیا کہا تھا، آسانی فوج جمع ہے یہاں، ارے بھائی انہیں خصوصی طور پر یہاں بلایا گیا ہو گا۔ یہ راجندر روشی کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ راجندر روشی کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اب یہاں کے نوجوان بھی جاگ اٹھے ہیں۔ وہ غلامی پر موت کو ترجیح دینے پر کمر بستہ ہیں۔ اسی لیے اس نے اپنی مدد کے لیے دلی یا ہماچل پردیش سے انہیں بلایا ہو گا

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تا کہ مسلم بستیوں پر حملہ کر سکے۔ اس حملے کا سیدھا فائدہ یہ ہو گا کہ ایسی کارروائی کو مجاہدین کے سر منڈھ دیں گے۔ کہیں گے کہ آتنک وادیوں کے دو گروپ ٹکرا گئے۔ اس طرح انٹرنیشنل میڈیا کو ورغلایا جا سکتا تھا۔ یعنی ایک تیر سے با آسانی دو شکار کیے جا سکتے ہیں۔ یعنی جو مارے جائیں گے وہ بھی مسلمان ہوں گے اور ان کی موت کا ذمے دار ٹھہرا کر جنہیں گرفتار کیا جائے گا وہ بھی مسلمان ہوں گے اور عالمی طور پر بدنام بھی مسلمان ہوں گے۔'' پروفیسر عثمان بولے۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہو گا؟'' حسن نے پوچھا۔

''وہ تعداد میں ہم سے بہت زیادہ ہیں لیکن ہماری پوزیشن زیادہ مستحکم ہے۔ ہم اوپر ہیں اور وہ نیچے، اس لیے ہماری گولیاں زیادہ کارگر ثابت ہوں گی۔'' پروفیسر نے کہا۔

حسن زور سے ہنسا پھر بولا۔ ''یہ پہاڑی تودے دیکھ رہے ہیں ناں۔ دھماکوں سے ٹوٹ کر ہم پر ہی گریں گے، گویا ہمارا کچومر بن جائے گا۔''

''اچھا، تو کیوں نہ ہم انہیں ہتھیار کے طور پر استعمال کر لیں۔'' پروفیسر نے تودوں پر نظر جما کر خیال ظاہر کیا۔

''خیال برا نہیں ہے۔'' علی نے کہا اور آر ایس ایس والوں کے پڑاؤ پر نظر ڈالی۔ ان کا پڑاؤ نشیب میں تھا اور جہاں وہ لوگ موجود تھے وہاں دونوں کناروں پر ہزاروں ٹن برف ریت کے ذرات کی طرح ڈھلان کے کناروں پر جمع تھی وہ بہ نظر غائر جائزہ لے کر بولا۔ ''سر! وہ جگہ مناسب رہے گی۔''

پروفیسر نے جائزہ لیا پھر کہا۔ ''ہاں وہ جگہ خاصی محفوظ ہے۔'' اور پھر وہ سب ادھر ہی بڑھتے چلے گئے، اس جگہ پہنچ کر سب نے اپنی اپنی رائفلوں کی نال اوپر کر لی۔ تبھی حسن نے نعرہ لگایا۔ ''نعرہ تکبیر!''

سب نے ایک ساتھ کہا ''اللہ اکبر!''

پھر ایسا لگا جیسے ان سب پر جنون طاری ہو گیا ہے۔ گویا وہ سب ٹریگر پر انگلی رکھ کر اسے اٹھانا بھول گئے تھے۔ فائروں کی آواز ہم آہنگ ہو کر دھماکوں میں بدل گئی تھی۔ دھماکوں کی وجہ سے خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہوا تھا اور اس سے کھائی کے کناروں پر، ڈھلوانوں پر، ابھرے ہوئے پتھروں پر جمع شدہ برف کے ذرات دھیرے دھیرے کھسک کر کھائی میں گرنے لگے۔ ان کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ٹوٹی ہوئی چٹانیں جو برف میں پھنسی ہوئی تھیں وہ بھی گر رہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ نیچے والے سنبھل پاتے، برف کے گرنے کی رفتار میں حد سے زیادہ تیزی آ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ہو۔ چند سیکنڈ کے اندر ہزاروں بلکہ لاکھوں ٹن برف کھائی میں گر چکی تھی۔

پروفیسر نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ تقریباً دس فٹ اونچی برف جمع ہو چکی تھی۔ خیمے کے کیڈر اس برفیلی بارش میں زندہ دفن ہو چکے تھے۔ اس کامیابی نے سب کے حوصلے بلند کر دیے کیونکہ برف کے ہتھیار سے انہوں نے دشمنوں کی ایک پوری بریگیڈ کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ نئی مدد آتے آتے راجندر روشنی کے چہرے سے نقاب ہٹ چکا ہو گا۔ اس خیال کے آتے ہی پروفیسر نے کہا۔ ''حسن اپنے ساتھیوں کو بھیج دو۔ ہم کچھ دیر بعد آئیں گے۔'' احمد کے ساتھیوں میں غضب کا نظم و نسق تھا۔ مجاہدین کے لیے منظم ہونا، حکم کی پابندی کرنا ضروری ہے، اس کی وہ سب زندہ مثال تھے۔ حکم سنتے ہی وہ سب بغیر کوئی سوال کیے خاموشی سے لوٹ گئے۔ باقی رہ گئے تھے پروفیسر عثمان، کمانڈر علی اور حسن۔ وہ تینوں اسی طرف بڑھ رہے تھے جدھر وہ برفانی انسان قلانچیں بھرتا ہوا غائب ہوا تھا۔ انہوں نے بہ مشکل تین چار فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ پہاڑی کی اوٹ سے ایک گولہ آیا اور سیدھا ان کے قدموں میں گرا۔ اس گولے سے گاڑھا گاڑھا کثیف دھواں نکل رہا تھا۔ وہ ابھی اس پر غور بھی نہیں کر پائے تھے کہ ان کے ذہن پر تاریکی چھانے لگی۔ ایک کے بعد ایک تینوں زمین پر گر گئے۔

سب سے پہلے پروفیسر کو ہوش آیا۔ انہوں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ وہ شاید کوئی غار تھا، سرنگ نما غار۔ وہ اور ان کے ساتھی بندھی ہوئی حالت میں فرش پر پڑے تھے۔

اس غار کا جائزہ مکمل بھی نہ ہو پایا تھا کہ وہ چونک گئے۔ سامنے کی طرف سے راجندر روشنی چلا آ رہا تھا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ''پروفیسر! تم واقعی بہت خطرناک انسان ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''عجیب اتفاق ہے، جب سے میں یہاں آیا ہوں پتا نہیں کتنے لوگوں نے یہی جملہ دہرایا ہے۔ یہ شاید تمہی لوگوں کی کہاوت ہے کہ جا کو راکھے سائیاں، مار سکے نہ کوئے، چاہے سارا جگ بیری ہوئے، پھر تم میرا کیسے کچھ بگاڑ لو گے؟''

''میں تمہیں سسکا سسکا کر ماروں گا۔ بلکہ میں نہیں وہ برفانی انسان تمہیں چیر پھاڑ کر کھائے گا۔''

''برفانی انسان پر یاد آیا، وہ کیا چیز ہے بھئی!''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یتی ہے۔"

"غلط! یتی یعنی برف کا آدمی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ گورا ہوتا ہے، اس کے بال سنہرے ہوتے ہیں اور وہ سات سے دس فٹ کا ہوتا ہے۔"

"تم بہت کچھ جانتے ہو مگر یہ ساری معلومات تمہارے ساتھ اسی برفانی میدان میں دفن ہو جائے گی۔"

"ابھی تو زندہ ہوں، اس کا راز بتا دو، اسے میری آخری خواہش سمجھ کر ہی بتا دو۔"

"تو سنو، وہ یتی نہیں ایک جنگلی انسان ہے۔ کافی پہلے ہمارے اسی گاؤں کی ایک عورت کو ریچھ اٹھا لے گیا تھا۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو گے کہ ریچھ اور عورت کے ملاپ سے بھی بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں دنیا کی مختلف لیبارٹریوں میں محفوظ ہیں جن میں نیشنل میوزیم کلکتہ بھی ہے۔"

"ہاں اسی لیے ڈارون نے تھیوری پیش کی تھی کہ انسان پہلے بندر تھا کیونکہ دونوں کے جسم میں پرورش پانے والے خلیے تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اس لیے بندر اور ریچھ دونوں سے انسانی بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مادہ ریچھ اور عورت دونوں کے اندرونی نظام یکساں ہیں۔"

"تو جناب! اس عورت کو برفانی ریچھ نے اپنے غار میں رکھ لیا تھا۔ وہیں اس عورت کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ جب وہ تین سال کا تھا کہ ایک روز اس کی ماں مر گئی۔ بچہ، ماں کے بغیر اس غار میں رہ نہ سکا کیونکہ ریچھ نے اب اس کے لیے کھانا لانا چھوڑ دیا تھا۔ بھوک سے بے تاب ہو کر وہ باہر نکلا تو اس پر میری نظر پڑ گئی اور میں اسے لے آیا۔ تب سے اس کی پرورش کر رہا ہوں۔ اس میں کچھ خصلتیں انسانوں جیسی ہیں تو کچھ ریچھ جیسی۔ جسم پر بال ریچھ جیسے ہیں تو عیاری انسانوں جیسی۔ اب سمجھے وہ تم سے خوفزدہ کیوں ہو گیا تھا؟ وہ پستول کی ہلاکت خیزی سے آگاہ ہے۔"

"اسے کہاں رکھا ہے؟"

"یہ غار اسی کا تو ہے۔ اندر ایک جگہ میں نے اس کے لیے پنجرہ بنا دیا ہے اسی میں ہے۔ میں اسے اشارہ کرتا ہوں تو وہ میرے دشمن پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ ابھی میں جا کر اسے آزاد کروں گا تا کہ تمہارا ناپاک وجود مٹ سکے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے قدم اندر کی جانب بڑھائے۔

علی اور حسن اب تک بے ہوش تھے۔ وہ اگر چاہتے تو بھی راجندر رونشی کو روک نہیں سکتے تھے۔ اس حالت میں وہ اکیلے کیا کر سکتے ہیں۔ اسی بات پر وہ غور کر رہے تھے کہ

راجندر رونشی لوٹ آیا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر کہا۔ "الوداع پروفیسر میں نے تمہاری موت کو آزاد کر دیا ہے۔ وہ کچھ ہی دیر میں تم تک پہنچ جائے گا۔"

تبھی غار کے اندرونی حصے سے چنگھاڑ بلند ہوئی۔

☆======☆======☆

حسن میر اور جاوید کے درمیان غلام رسول بیٹھا تھا۔ حسن میر اسے شانو کی عجیب و غریب بیماری کے بارے میں بتا رہے تھے کہ شانو ان کی دوست کی بیٹی ہے جسے وہ اپنی بہو بنا کر لائے تھے مگر شادی والے روز جیسے ہی جاوید حجلہ عروسی میں پہنچا، شانو نے چیخنا شروع کر دیا کہ وہ کسی عامر نامی لڑکے سے محبت کرتی ہے جبکہ اس پورے علاقے میں اس نام کا کوئی لڑکا نہیں ہے مگر وہ آج بھی عامر کے آنے کی منتظر ہے کہ تم آ گئے اور اس نے تمہیں عامر مان لیا۔

باتیں جاری تھیں کہ شانو دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "یہ کیا پلا دیا تھا مجھے کہ میں بیٹھے بیٹھے سو گئی؟"

اس کی بات حیران کر دینے کے لیے کافی تھی۔ اس کی ذہانت آمیز بات کو سن کر بھی بڑے میاں نے نظر انداز کر دیا اور بولے۔ "ہم نے...... ہم نے تو کچھ نہیں دیا۔"

"میں سب کو پہچانتی ہوں۔ ابھی سب نے میری شرافت دیکھی ہے۔ غصہ نہیں۔" لڑکی نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "اب دیکھیے گا میں کیا کرتی ہوں۔"

"تو جہنم میں چلی جا۔" جاوید غرا کر بولا۔

حسن میر نے جلدی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "پھر تیرا دماغ گھوما۔ دن رات سمجھاتا ہوں تجھے مگر کبھی کوئی بات مان کر دی تو نے؟"

"چھوڑیے ابا جی! کیا بات مان کر دوں، میری جگہ آپ ہوتے تو میں دیکھتا کہ اپنے غصے پر کتنا قابو پاتے ہیں۔"

"خاموش ہو جا بیٹے خاموش ہو جا۔"

"عامر تم یہاں کیوں بیٹھے ہو چلو میرے ساتھ میرے کمرے میں۔" لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"مم...... میں" غلام رسول کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

"اٹھو، اٹھتے کیوں نہیں ہو۔" شانو نے آگے بڑھ کر غلام رسول کا بازو پکڑ لیا۔

حسن میر بری طرح ہراساں ہو گئے تھے۔ غلام رسول نے سوالیہ نظروں سے ان کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرف دیکھا تو شانو جیسے اس کے دیکھنے کا مطلب سمجھ گئی۔

"کیا تم ان لوگوں سے ڈر رہے ہو؟ کیا بگاڑے گا کوئی میرا؟ ایں...... کوئی روک کر دیکھے تمہیں۔ چلو میرے ساتھ میرے کمرے میں چلو۔"

حسن میر نے آنکھوں سے اشارہ کیا تو غلام رسول بولا۔ "چلتا ہوں، چلتا ہوں میں۔"

وہ حیران تھا کہ اسے ہوش کیسے آ گیا۔ حسن میر نے جس دوا کا نام لیا تھا اس دوا کا اثر اتنی آسانی سے تو ختم نہیں ہوتا پھر ایسا کیوں ہوا؟ یقیناً شانو کی مدافعتی قوت زیادہ ہے۔ اس کا DNA زیادہ گنجلک ہے۔ اس پر غور کرنا ضروری ہے۔ کیتھی کو بلا کرا ے دکھانا پڑے گا۔ وہ DNA کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ وہ یہی سوچتا ہوا شانو کے ساتھ چلتا رہا۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر شانو نے دروازہ بند کر لیا۔ اب وہ اس کمرے میں اکیلا تھا۔ کسی غیر عورت کے ساتھ اکیلے کمرے میں چند لمحے بھی گزارنا شرعی نقطہ نظر سے غلط ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ شانو نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ ہر انسان کے DNA میں جتنی باتیں لکھی ہوتی ہیں ان میں سب سے اہم بات جذبات ہوتے ہیں۔ جب بچہ چھ مہینے کا ہوتا ہے تو DNA کے حکم سے جذبات کے کیمیکل خارج ہونا شروع ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے بچہ خوشی، غمی، درد محسوس کرتا ہے لیکن بچہ جب بارہ سال کی عمر میں پہنچتا ہے تو ایک نیا کیمیکل بننا شروع ہو جاتا ہے اور چودہ سال کی عمر میں پوری طرح اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہوتا ہے جو شہنشاہوں کو تخت و تاج پر ٹھوکر مار دینے پر اکسا دیتا ہے۔ فرہاد سے دودھ کی نہر کھدواتا ہے تو سوہنی کو کچے گھڑے پر چناب پار کراتا ہے۔ تاج محل بنواتا ہے اور حدود کی دفعات کا مجرم بھی مشہور کراتا ہے۔ اکیلے کمرے میں شانو نے جب غلام رسول کے سینے پر سر رکھا تو اس کے اندر بھی جذبات کا طوفان اٹھا۔ جسم میں بجلی سی دوڑ گئی مگر وہ فوراً ہی لاحول پڑھ کر الگ ہو گیا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ حسن میر اور جاوید دور نہیں ہوں گے۔ کمرے ہی کے آس پاس چکرا رہے ہوں گے اور تب اس نے دروازے کے نیچے سے آتی روشنی کو دیکھا جو بار بار کٹ رہی تھی۔ سایہ سا آ کر گزر رہا تھا۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں شانو نے بھی ادھر ہی دیکھا اور چنگھاڑتی ہوئی دروازے پر پہنچی۔

"آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ کیوں ہمارے درمیان مخل ہو رہے ہیں۔ کیوں بار بار

ستانے آ رہے ہیں۔ اتنے دنوں بعد عامر آیا ہے۔ اس سے دو باتیں بھی نہیں کرنے دیتے۔ خدا کے لیے آپ لوگ چلے جایئے ورنہ میں اپنا سر پھوڑ لوں گی یا آپ کا سر توڑ دوں گی۔" کہتے ہوئے اس نے گلدان اٹھا لیا اور دروازہ کھول کر پوری قوت سے پھینکا۔ ان کی قسمت اچھی تھی۔ حسن میر جھک گیا اور گلدان دور جا کر گرا۔ جاوید غصے میں آگے بڑھا تھا کہ حسن میر نے اسے پکڑ لیا۔ "ہاں بیٹا ہم جا رہے ہیں۔ کچھ ضروری باتیں تمہارے عامر سے کرنا تھیں اس لیے رک گئے تھے۔"

"ہاں بولو کیا کہنا چاہتی ہو۔" غلام رسول نے شانو کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔

"میں یہی کہنا چاہتی ہوں کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔"

"نہیں شانو بات سمجھنے کی کوشش کرو، مجھے حسن میر صاحب سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بات ختم ہوتے ہی چلا آؤں گا۔" غلام رسول نے اسے تسلی دی۔

"اچھی بات ہے تم جاؤ مگر زیادہ دیر مت رکنا۔ میں یہاں انتظار کر رہی ہوں۔"

شانو کا اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ادھر اُدھر دیکھتا ہوا وہ ایک بڑے کمرے میں پہنچا۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔ وہاں سب سر جوڑے بیٹھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی حسن میر نے کہا۔ "آیئے جناب وہ کیا کر رہی ہے؟"

"میں بڑی مشکل سے کچھ دیر کے لیے باہر نکلا ہوں۔ سمجھتا ہوں کہ اس وقت آپ لوگوں کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ ویسے بے فکر رہیں میں مسلمان ہوں اور خود کو صرف وہی مسلمان کہہ سکتا ہے جس کا کردار مضبوط ہو۔"

"ہمیں تم پر بھروسہ ہے بیٹے!" حسن میر بولے۔

"میں آپ کے اعتماد کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ سورہ مومنون کی آیت 3 میں مذکور ہے "اور وہ جو بے ہودہ باتوں سے منہ پھیرے رہتے ہیں۔" میں بھی اسی قبیل کا ہوں۔ میں خود بھی بے ہودگی پسند نہیں کرتا۔ اس لیے آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔"

"ہاں بیٹے مجھے تم پر کامل بھروسہ ہے۔" حسن میر نے دوبارہ اپنی بات دہرائی۔

"اتنی دیر میں مَیں نے یہی سمجھا ہے کہ شانو کی بیماری بہت گمبھیر ہے۔"

"اسے بیماری شماری کچھ نہیں ہے وہ مکر کرتی ہے۔" جاوید نے غصے میں کہا۔

"یہی سمجھ کا پھیر ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے۔ "(اے انسان) تیرا علاج تیرے وجود کے اندر موجود ہے جس کا تُو شعور نہیں رکھتا اور تیری بیماری تجھی سے ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جسے تم نہیں سمجھتے اور تیرا وجود وہ کھلی ہوئی کتاب ہے کہ جس کے حروف سے پوشیدہ امور ظاہر ہوتے ہیں۔ کیا تُو اپنے آپ کو ایک چھوٹا سا جسم تصور کرتا ہے حالانکہ تیرے وجود کے اندر ایک بڑا عالم سمایا ہوا ہے۔'' یعنی انسان کا جسم اسراروں کا مرقع ہے۔ اسے سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ پھر بھی وہ گھٹنوں چل رہا ہے۔ ابھی وہ انسان کے ایک عضو کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پایا ہے۔ یہ تم جو اپنی ایک انگلی کو ہلاتے ہو، اسے ہلانے کے لیے لاکھوں کی تعداد میں خلیے کوشش کرتے ہیں۔ اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں تب جا کر تمہاری ایک انگلی ہلتی ہے۔ یعنی کہ یہ پُراسرار جسم واقعی ایک جہان لیے ہوئے ہے۔ اس کی آبادی خلیوں پر مشتمل ہے اور یہ جسم اپنے اندر اتنی ہی پُراسرار بیماریاں بھی پالتا ہے۔ جس طرح یہ عالم، یہ دنیا اسرار سے بھری ہوئی ہے اسی طرح یہ جسم بھی اسرار کا مخزن ہے۔'' غلام رسول نے پوری تقریر کر دی۔

''تمہارا خیال ہے کہ اس پر کوئی آسیب وغیرہ نہیں ہے؟'' حسن میر بولے۔

''جی ہاں! اس کے DNA میں کوئی خرابی ہے۔ تبھی تو یہ ایسی حرکتیں کر رہی ہے۔ دراصل انسانی جسم میں ننھے ننھے ذرات جتنے بے شمار خلیے ہوتے ہیں۔ یہی خلیے بیماری سے بچاؤ بھی کرتے ہیں اور بیماری کا موجب بھی بنتے ہیں۔ سورہ یونس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''زمین و آسمان میں کوئی ذرہ (جوہر، ایٹم) اور ذرے سے چھوٹا (الیکٹرون) یا بڑا (مالیکیول) تیرے رب کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ اس کی کھلی واضح کتاب میں درج ہے۔''

''اللہ تبارک و تعالیٰ کے ارشاد کی روشنی میں جسم کا تجزیہ کریں۔ خود سمجھ لیں گے کہ شانو پر کوئی جن جنات کا سایہ نہیں ہے۔ یہ کسی خاص بیماری میں مبتلا ہے۔''

''ناں جی ناں! اس پر نہ کوئی سایہ ہے اور نہ وہ بیمار ہے۔ حکیم جی نے بتایا ہے کہ یہ پہلے جنم میں کسی عامر نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی اسی کی وجہ سے وہ اسے یاد کر رہی ہے۔'' جاوید کی ماں نے کہا۔

''پھر تم نے بے وقوفی کی باتیں شروع کر دیں۔ حکیم جی کی بات کو چھوڑو۔ دوسرے جنم کو گولی مارو، یاد کرو مولوی صاحب نے کیا کہا تھا کہ کوئی لڑکی کسی عامر نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ اسی کی روح نے اس کے جسم پر قبضہ کر رکھا ہے۔'' حسن میر جلالی سے بولے۔

''آپ دونوں کی باتیں عقل کی کسوٹی پر کھری نہیں اترتیں۔ نہ یہ اس کا دوسرا جنم

ہے اور نہ اس پر کسی روح کا سایہ ہے بلکہ یہ بیمار ہے۔''

غلام رسول نے ابھی اتنا کہا ہی تھا کہ شانو آ گئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''تم...... تم لوگ مجھے چین سے رہنے نہیں دو گے۔ میں کہتی ہوں تم لوگ مجھ پر اتنا ظلم کیوں کر رہے ہو۔ اتنے دنوں بعد تو عامر آیا ہے اور تم لوگ ہمیں باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے۔ چلو عامر بہت ہو گیا۔ اب کمرے میں چلو۔ کچھ دیر آرام کر لو۔''

''تم نے کمرے میں میرا انتظار نہیں کیا۔ بس میں آنے ہی والا تھا۔ تم چل کر کمرے میں بیٹھو۔ میں بس باتیں ختم کر کے آتا ہوں۔'' غلام رسول بولا۔

''ارے ان سازشیوں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بھٹکا دیں گے تمہیں۔''

''نہیں شانو ایسی بات نہیں ہے۔'' غلام رسول نے اسے سنبھالنے کی پوری پوری کوشش کی مگر وہ مان کر نہ دی۔ بولی:

''اگر تم نہیں جاؤ گے تو میں جان دے دوں گی۔''

غلام رسول مجبوری کی زنجیر میں جکڑ گیا تھا۔ بہ حالت مجبوری سے اٹھنا پڑا۔ وہ تقریباً گھسٹتا ہوا کمرے تک پہنچا تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی شانو نے دروازہ بند کر لیا اور کہہ دیا کہ اب اگر فرشتے بھی آ جائیں تو وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔

ایسی شخصیت کو کس طرح راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے۔ غلام رسول کے ذہن میں یہی ایک خیال چکرا رہا تھا لیکن کوئی حل اس کے پاس نہیں تھا۔ شانو نے بڑے آرام سے اس کے سامنے لباس تبدیل کیا۔ یہ منظر غلام رسول کے لیے قیامت کا تھا۔ اس نے فوراً اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر بھی اسے اپنے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ انسان تو بہر حال تھا۔ ایک نوجوان اور خوبصورت عورت جو اپنی تمام چاہتیں اس پر صرف کیے ہوئی تھی۔ تنہا کمرہ ہر طرح کی آزادی لیکن ظاہر ہے اس کے دل و دماغ پر اسلام کی مہر تھی، اور جو مسلمان ہو گا وہ کبھی بہک ہی نہیں سکتا۔ غلط کردار والے مسلمان کب ہوتے ہیں؟ وہ تو مسلمانوں کے نام پر کلنک ہوتے ہیں۔ اسی خیال نے اسے اپنی آنکھیں بند کر لینے پر مجبور دیا تھا۔

شانو بہت مسرور و مطمئن تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بستر پر آئی پھر اس نے بے ساختہ غلام رسول کے گلے میں بانہیں ڈالیں اور زبردستی اسے بستر پر گرا دیا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

☆======☆======☆

راجندر روشی نے غور نہیں کیا تھا۔ پروفیسر باتوں کے دوران میں اپنے ہاتھوں کو آزاد کرانے کے لیے مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ اس کی یہ کوشش نتیجہ خیز ثابت ہوئی تھی اور بندھن ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ جیسے ہی راجندر روشی نے کہا۔ ''الوداع میں جا رہا ہوں۔'' ویسے ہی پروفیسر نے اس پر چھلانگ لگائی تھی۔ دونوں گتھم گتھا ہو کر لڑھکتے چلے گئے تھے۔ غار کا دہانہ قریب تھا اس لیے پروفیسر نے دوبارہ حملہ کرنے کی بجائے باہر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ انہیں پوری امید تھی کہ راجندر روشی ان کا پیچھا کرنے کی بجائے برفانی انسان کو دوڑائے گا کیونکہ وہ عام انسانوں سے کئی گنا زیادہ تیز رفتاری سے برف پر دوڑ سکتا تھا اس طرح باقی ساتھیوں کی جان محفوظ ہو جاتی۔

دوڑتے دوڑتے پروفیسر نے اپنی پنڈلی پر ہاتھ مارا۔ جلد بازی میں راجندر روشی نے ان کی تلاشی نہیں لی تھی یا پھر وہ بہت زیادہ خوش فہمی کا شکار تھا۔ پنڈلی پر بندھا پستول محفوظ تھا۔ انہوں نے دوڑتے دوڑتے اسے نکالنا چاہا پھر کچھ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا کیونکہ عقب سے انہیں چنگھاڑ سنائی دی تھی۔ فی الحال وہ کافی دور تھا لیکن انہیں احساس تھا کہ وہ اسے دوڑنے میں شکست نہیں دے سکتے۔ بالآخر وہ انہیں پکڑ ہی لے گا اور پھر ان کا جسم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ اس شیطان صفت درندے سے رہائی ناممکن تھی۔ اس لیے ان کے ذہن میں بچاؤ کے منصوبوں کی دوڑ ان کے پیروں کی رفتار سے کہیں زیادہ تھی۔ انہیں کسی بلند اور چھجے دار جگہ کی تلاش تھی۔ اندیشہ یہی تھا کہ ایسی کوئی جگہ آنے سے پہلے وہ درندہ آ کر انہیں دبوچ نہ لے۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ جلد ہی انہیں ایک ایسی جگہ نظر آ گئی۔ انہوں نے اچھل کر چھجے کو پکڑا اور بازوؤں پر وزن ڈالتے ہوئے آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگے۔ انہیں اتنی مشقت کی عادت نہ تھی۔ ان کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔ وہ اوپر چڑھ کر لمبے لمبے لیٹ گئے تھے۔ انہیں بہت زیادہ تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ لیٹے لیٹے زندگی اور موت کے درمیانی لمحات کو گن رہے تھے۔

اس خبیث درندے کی چنگھاڑ اور غراہٹ آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی لیکن ابھی وہ نظر نہیں آیا تھا۔ پھر یکلخت خاموشی چھا گئی اور وہ سمجھ گئے کہ اب وہ درندہ چھجے کے نیچے پہنچ گیا ہے۔ اس کی چالاکی پر انہیں شدید حیرت تھی کہ اس نے اپنی سانسوں کی خرخراہٹ پر بھی پا لیا تھا۔ اپنی دانست میں وہ انہیں دھوکے سے گھیر رہا تھا۔

چھجے پر پہلے اس کا سفیدی مائل بالوں سے بھرا ایک پنجہ نظر آیا پھر دوسرا۔ پروفیسر عثمان سانس روکے اس کے اوپر آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ بالآخر اس کا چہرہ آہستہ آہستہ اوپر آیا اور اس سے پہلے کہ وہ صحیح طرح سے انہیں دیکھ پاتا انہوں نے پستول کی نال کو پوری قوت سے اس کی آنکھوں میں گھسا دیا۔ پھر وہی ہوا جس کی انہیں توقع تھی۔ یعنی اس کا خوفناک جبڑا پوری طرح کھل گیا اور ایک تیز چنگھاڑ سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔

پروفیسر نے پھرتی سے اس کے کھلے ہوئے منہ میں ریوالور کی نال داخل کی اور ٹریگر دبا دیا۔ آنکھ حلق تالو وغیرہ یہی وہ نازک حصے تھے جہاں پڑنے والا ہر وار کاری ثابت ہوتا۔ گولیاں اس کے حلق اور تالو کو پھاڑتی ہوئی دماغ میں گھس گئیں۔ اس کا نرخرہ پھٹ گیا تھا اور خون کے چھینٹے دور دور تک بکھر گئے تھے۔ اس کا چھجے پر جما ہوا ہاتھ چھوٹا تھا اور وہ دھپ سے نیچے گر پڑا تھا۔

پروفیسر عثمان نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہ برفیلی زمین پر گرا تڑپ رہا تھا۔ بالآخر وہ ساکت ہو گیا۔ پروفیسر نے کئی گہری گہری سانسیں لیں۔ یہ ان کی زندگی کا ایک دہشت ناک باب تھا جو بالآخر ختم ہو گیا۔

اس عفریت کے مردہ جسم کو برف سے ڈھکے ہوئے میدان کی ڈھلان پر گھسیٹ کر نیچے لانا تو زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا مگر جب وہ بستی میں داخل ہوئے تو انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ برفانی انسان کی ہلاکت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ لوگ پروفیسر کو دیکھ کر ایسے بھاگ رہے تھے جیسے وہ برفانی انسان سے بھی بڑے عفریت ہیں۔ یہ خبر پورے قصبے میں پھیل گئی تھی اس لیے حسن کے ساتھی بھی دوڑ پڑے۔ انہوں نے پروفیسر کی مدد کے لیے خود کو پیش کر دیا اور اس عفریت کو گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ ان کی وجہ سے یہ کام آسان ہو گیا تھا۔ وہ سب مل کر اسے گھسیٹتے ہوئے اسی میدان کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں مقامی ہندو حضرات اپنی رسومات ادا کرتے تھے۔ وہاں پہنچ کر پروفیسر کو معلوم ہوا کہ راجندر روشی نے اجلاس بلایا تھا۔ شاید اسے اپنی کامیابی کا سو فیصد یقین تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ پروفیسر اس کے پالتو عفریت سے شکست کھا چکے ہوں گے مگر وہ بھول گیا تھا کہ:

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

اللہ تعالیٰ حق کو فتح کا تحفہ دیتا ہے، پروفیسر بھی حق پر تھے اسی لیے عمر کے اس حصے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں جب قوی جواب دینے لگتے ہیں انہیں زمانے کی نظروں میں قوی تر بنا دیا تھا۔

پروفیسر، حسن کے ساتھیوں کے ساتھ میدان میں پہنچے تو وہاں پہلے ہی کافی لوگ جمع تھے۔ ان میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ دو چار مسلمان بھی نظر آئے مگر یہ وہ لوگ تھے جو اپنی حمیت کو بیچ چکے تھے۔ شیخ عبداللہ کی نام نہاد پارٹی کے کارکن تھے جن کا دین مذہب پیسہ ہوتا ہے۔ انہیں تو اس سے بھی مطلب نہیں تھا کہ جن لڑکیوں کو فوجی پامال کر رہے ہیں وہ انہی کی بہنیں ہیں۔ اپنے عیش و آرام کے لیے وہ اپنے ہی بھائیوں کے گلے پیش کر رہے تھے۔

پروفیسر عثمان آہستہ آہستہ اس چبوترے کی طرف بڑھنے لگے جس پر راجندر ونشی کھڑا تھا۔ اس نے بھی پروفیسر کو دیکھ لیا تھا۔

"راجندر ونشی! تم شکست کھا چکے ہو۔" پروفیسر نے کہا۔

"میں نے شکست کھانا سیکھا ہی نہیں ہے۔ شاید تم نے گرو گوبند سنگھ جی کی کہانی نہیں سنی ہے۔ جب وہ گرفتار ہو کر بہ حیثیت قیدی شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے سامنے آئے تو انہوں نے کہا کہ میرے پاس ایک ایسا منتر ہے جسے لکھ کر مٹھی میں پکڑ لوں تو تلوار کا وار کارگر نہیں ہوتا۔

اورنگزیب نے سچائی جاننے کے لیے انہیں ایک سپاہی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ گرو جی نے جیب سے کاغذ نکالا اور قلم سے اس پر کچھ لکھا پھر کہا، اب اپنے سپاہی سے کہو میری گردن پر وار کرے۔ اس کی تلوار بے کار ہو جائے گی۔

سپاہی کو اشارہ کیا گیا۔ اس نے تلوار ماری تو گرو جی کی گردن کٹ کر دور جا گری۔ گرو جی کی مٹھی کھول کر کاغذ نکالا گیا۔ اس پر لکھا تھا۔ "سر دیا سرے نہ دیا۔" یعنی جان دے دی عزت نہ دی۔ ہم بھی اپنی حمیت کی خاطر جان دینے والوں میں سے ہیں مگر تمہارے مقابلہ پر میں جان دینے کا نہیں، لینے کا قائل ثابت ہوں گا۔" کہہ کر اس نے پستول نکال لیا۔

پستول نکلتے ہی بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ پروفیسر نے پستول کی پروا کیے بغیر اس کی جانب دوڑ لگا دی۔ وہ اس چبوترے پر چڑھ گئے تھے۔ تبھی راجندر ونشی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "پروفیسر! تم نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے جو اس پوتر چبوترے پر چڑھ آئے۔ اب اس کا مزہ بھی چکھ لو۔"

پروفیسر سمجھا تھا کہ وہ گولی چلائے گا اسی لیے وہ ٹریگر پر رکھی انگلی کو دیکھ رہے تھے۔

ادھر وہ انگلی ہلتی اور ادھر وہ چھلانگ لگا کر گولی کی زد سے بچ جاتے۔ ان کی پوری توجہ پستول پر مرکوز تھی اسی لیے انہیں احساس نہ ہوا اور ان کے پیروں کے نیچے کا فرش کھسک گیا۔ وہ دھم سے کسی کھڈ میں گرے تھے۔ اوپر سے راجندر ونشی کی آواز آئی تھی۔ "الوداع پروفیسر یہی تمہارا انجام ہے۔"

راجندر ونشی کی آواز کی گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ پروفیسر عثمان بری طرح چونک گئے۔ انہیں پھنکار کی آواز صاف سنائی دی تھی۔ انہوں نے آواز کی سمت دیکھا تو انہیں اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ گڑھا سانپوں کی بانبی پر تھا۔ ایک دو نہیں دسیوں سانپ بانبی سے اچھل اچھل کر باہر نکل رہے تھے۔ پروفیسر کے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے۔

"پروفیسر!" انہوں نے اوپر سے آواز سنی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو حسن کا ایک ساتھی محمد عمر پاؤں لٹکائے چھلانگ لگانے والا تھا۔ وہ اسے منع کرتے کہ محمد عمران کے برابر میں آ کودا۔ سانپ پھنکارتے، سرسراتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"پروفیسر! میرے کندھے پر چڑھ کر فوراً باہر نکل جائیں۔" وہ ہانپتے ہوئے چلایا۔

انہوں نے اپنی زندگی میں اتنا بہادر شخص پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کیا جذبہ تھا جو خود کو ان پر قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔ ایک لمحہ کے لیے ان کا دل اس کے لیے بری طرح تڑپا۔

"کیا سوچ رہے ہیں، جلدی کریں۔" وہ چلایا۔

"نہیں عمر یہ نہیں ہو سکتا۔" پروفیسر بولے۔

"بحث فضول ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ میرے پاس سانپ سے بچنے کی جڑی ہے۔ آپ باہر نکلیں میں بھی باہر نکل آؤں گا۔" عمر بولا۔

اس پر عجیب وحشت طاری تھی۔ اسی وحشت کو دیکھ کر پروفیسر نے اندازہ لگا لیا کہ یہ کسی کی بھی سننے والا نہیں اس لیے وہ اس کے کندھے پر پاؤں رکھ کر اوپر ہوتے چلے گئے۔

اوپر پہنچ کر انہوں نے نیچے جھانکا تو ان کا دل بھر آیا۔ عمر واقعی مجاہد تھا۔ اس نے پروفیسر کو بچانے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔ اس کے پاس کوئی جڑی وڑی نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو یہ حالت نہ ہوتی۔ اس وقت اس کے پیروں سے ایک دو نہیں بارہ پندرہ سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ ان کے نوکیلے دانت اس کے پیروں میں پیوست تھے مگر شاباش ہے کہ اس کے منہ سے اف تک نہ نکلی۔ مجاہدین ساتھیوں کو بچانے کے لیے خود کو قربان کر دیتے ہیں،

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ انہوں نے سنا تھا آج نظروں سے بھی دیکھ لیا۔

اذیت بھرے انداز میں وہ جھوم رہا تھا لیکن اس کی نظریں انہی پر ٹکی تھیں۔ تکلیف کے باوجود اس کے لب مطمئن انداز میں دھیرے سے مسکرائے اور پھر وہ چکرا کر گر پڑا اور ساکت ہو گیا۔ وہ تکلیف سے چیخا نہ چلایا نہ تڑپا بس اس کی کھلی آنکھیں ایک ہی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ گویا وہ بہ زبان خموشی دنیا والوں سے سوال کر رہا تھا، میری ان آنکھوں میں آزادی کے جو سپنے ہیں کیا انہیں دیکھنے کی آس میں ہم اسی طرح آنکھیں کھلی رکھیں گے؟ اس وقت پروفیسر کو یہی لگ رہا تھا کہ وہ سوالیہ انداز میں انہیں ہی تک رہا تھا۔ بے اختیار ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ زندگی میں ایسے بہت کم لمحے آئے تھے جب وہ اس طرح بلک بلک کر روئے تھے۔

اس مرد مجاہد نے ان پر جان نثار کر کے ثابت کر دیا تھا کہ مجاہدین کشمیر نے شہید ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔ انہیں شیطان صفت راجندر ونشی پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ اسے کسی طور بھی معاف کرنے پر تیار نہ تھے جس نے ایسے خطرناک گڑھے بنا رکھے تھے۔

انہوں نے اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھا اور اطراف میں نظر ڈالی۔ میدان خالی پڑا تھا صرف حسن کے ساتھی وہاں موجود تھے جو گڑھے میں جھانک رہے تھے۔ پہلے احمد پھر عمر نے جان دے کر انہیں بتا دیا تھا کہ کشمیر کا بچہ بچہ مرنے کے لیے تیار ہے۔

''راجندر ونشی کہاں ملے گا؟'' پروفیسر کے منہ سے غراہٹ بھری آواز نکلی۔

''ہم بتاتے ہیں میرے ساتھ چلیں۔'' درخت کے عقب سے کسی نے کہا۔ آواز جانی پہچانی تھی۔ پروفیسر نے ادھر دیکھا۔ کمانڈر علی اور حسن تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔

نزدیک پہنچ کر حسن نے کہا۔ ''جب ہم آ رہے تھے تو وہ اپنے مکان میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کی تیز رفتاری بتا رہی تھی کہ وہ علاقہ چھوڑنے والا ہے اور پناہ کے لیے اپنے آقاؤں کے پاس دہلی یا سری نگر جا سکتا ہے۔''

''میں...... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' پروفیسر نے حسن کو کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں تقریباً دوڑتے ہوئے بستی کے اس عالی شان مکان کے پاس پہنچے تھے جو راجندر ونشی کی ملکیت تھا۔ راجندر ونشی کے باپ دادا ڈوگرا راج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے۔ جس طرح ڈوگرا پھر دلی کی حکومت یہاں کے مسلمانوں کو غلام بنائے ہوئے تھی اسی طرح راجندر ونشی بھی انہیں سازش کے ذریعہ اپنا غلام بنانا چاہتا تھا مگر اب وہ دور

لد چکا تھا۔ علاقے کے مسلمانوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ راجندر ونشی اور اس کے آقاؤں سے چھٹکارا حاصل کر کے ہی رہیں گے۔ اسی لیے تو اس نے پینترا بدل لیا تھا۔ اب وہ سازشیوں کو ناکام ہوتے دیکھ کر فرار ہو رہا تھا۔

پروفیسر نے اندر گھستے ہی پہلے کمرے میں دیکھا۔ وہ کمرہ خالی تھا۔ اس کے بعد وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ راجندر ونشی وہاں موجود تھا۔ پروفیسر نے علی کی کمر میں بندھے خنجر کو کھینچا اور چیخ کر بولے۔ ''راجندر!''

وہ جھٹکے سے مڑا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے بغیر کچھ بولے فائر کر دیا۔ کمرہ اذیت بھری چیخ سے گونج اٹھا۔

☆======☆======☆

شانو نے غلام رسول کو بستر پر گرا دیا تھا۔ وہ اس سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور غلام رسول کو اپنی رگوں میں لاوا سا دوڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب صبر نے حدوں کو چھوڑنا شروع کر دیا تو اس نے آخری حربہ استعمال کیا۔ پوری قوت سے اس کے گال پر طمانچہ مارا۔ چٹاخ کی آواز اور شانو کی چیخ بند دروازے کو پار کرتی ہوئی باہر نکلتی چلی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ دروازے پر تھپ تھپ شروع ہو گئی۔ شاید حسن میر وغیرہ وہیں کھڑے تھے۔ یہ کوئی عجوبہ بات نہ تھی۔ کچھ بھی ہو غلام رسول ایک انجان شخص تھا جبکہ شانو ان کی بہو تھی، گھر کی عزت تھی، پھر وہ اپنے حواسوں میں بھی نہیں تھی۔ اسے وہ لوگ یونہی تو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اسی لیے شاید باہر کھڑے تھے۔ حسن میر کی آواز آئی تھی۔ ''کیا ہوا بھئی؟''

غلام رسول نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ سب اندر آ گئے۔

''کیا ہوا تھا جناب؟'' جاوید نے پوچھا۔

''جب تمام علاج ناکام ہو جاتے ہیں تو داناؤں کا کہنا ہے کہ تشدد کا استعمال کرو وہی میں نے کیا ہے۔ یہ اس کے دماغ پر ایک زبردست جھٹکا ہے۔ وہ کچھ حد تک اپنے آپ میں آ گئی ہوگی۔'' غلام رسول بولا۔

''ہوا کیا تھا؟''

''نادانستگی میں وہ شرعی حدود کو پار کرنے لگی تھی۔ یہ میری چھوٹی بہن کی طرح ہے۔ میں ایسا کیسے برداشت کر لیتا۔ اسی لیے چانٹے کا استعمال کیا۔''

اس کی بات پر حسن کا چہرہ کھل اٹھا۔ انہوں نے معنی خیز نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ دیکھو شرافت اسے کہتے ہیں۔ پھر انہوں نے غلام رسول

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے کہا۔ ”بھائی اس کی بیماری کا کوئی علاج بھی ہے؟“

”اللہ تعالیٰ پہلے دوا پیدا کرتا ہے پھر بیماری۔ ایسی کوئی بیماری ہے ہی نہیں جس کا علاج نہ ہو۔“ غلام رسول ہنس کر بولا۔ ”مگر خدا نے عقل بھی دی ہے کہ دوا کو تلاش کرو۔“

”لیکن ہم کوئی ڈاکٹر تو ہیں نہیں کہ دوا تلاش کرتے پھریں۔“

”آپ فکر نہ کریں اس مسئلے میں بھی میں آپ کی مدد کروں گا۔ شاید آپ نے سنا ہو گا کہ نگار میں ایک بڑے صاحب آکر ٹھہرے ہیں جن کے ساتھ ایک انگریز ڈاکٹرنی بھی ہے۔“

”ہاں ہاں میں نے بھی سنا ہے۔“ جاوید نے کہا۔

”کل میں اسی ڈاکٹرنی کو لے کر آؤں گا۔ میں بھی انہی بڑے صاحب کا ساتھی ہوں نا۔“

”ارے یہ تو آپ نے بہت بڑی خوشخبری سنائی ہے۔ بڑے صاحب تو ہمارے لیے رحمت بن کر آئے ہیں۔ دراصل وہ ہمارے محسن اعظم اسدالکبیر کا دوسرا جنم ہیں۔“

”محترم! آپ مسلمان ہو کر دوسرے جنم کی بات کر رہے ہیں۔ اگر دوسرا جنم ہوتا تو قرآن میں ذکر ضرور آتا۔“

”پھر ان کی شکل اسدالکبیر سے کیوں مل رہی ہے۔ جب سے وہ اس علاقے میں آئے ہیں فصل بہت اچھی ہو رہی ہے۔“

”فصل تو خدا پیدا کرتا ہے اور سورہ واقعہ میں کہتا ہے ”بھلا دیکھو کہ جو کچھ تم لوگ زراعت کرتے ہو کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔“ یعنی زراعت میں کمی بیشی اللہ کی مرضی پر ہے۔ وہ خوش ہوگا تو زیادہ دے گا۔ گناہگار بندوں کو کم دیتا ہے اور شکل، تو جناب اس بارے میں بھی قرآن میں صاف صاف کہا گیا ہے اور سائنس کا بھی یہی کہنا ہے۔ سائنس کی زبان میں اسے یوں کہہ لیں کہ DNA کا یہ کمال ہے۔ DNA کیسے شکل وصحت بناتے ہیں اسے سمجھنا ضروری ہے۔ انسانی جسم خود میں ایک عجوبہ ہے۔ کسی بھی عضو کو دیکھ لیں، آپ حیران رہ جائیں گے کہ اتنا کام اور ایسا ننھا عضو۔“ غلام رسول نے ہنس کر کہا۔

حسن میر اور جاوید اس کی طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی بہت دلچسپ کہانی سنا رہا ہو۔ اس نے انہیں متوجہ دیکھ کر کہنا شروع کیا۔ ”اب معدے کی مثال ہی لے لو۔ کتنا گنجلک نظام ہے مگر کس مربوط طریقہ پر اپنا کام انجام دیتا ہے۔ یہ چھوٹا سا عضو جسے

معدہ کہتے ہیں اندر سے تولیے کے مانند ہے۔ اس کی سطح میں پچاس کروڑ ننھے منے غدود ہوتے ہیں۔ یہ نظام ہضم کو تیز کرنے کے لیے ہر روز پون گیلن رطوبت تیار کرتا ہے جو ”ہائیڈروکلورک ایسڈ“ کہلاتی ہے پھر ہائیڈروکلورک ایسڈ اپنے اندر ”این زائم“ نامی رطوبت پیدا کرتی ہے۔ یہ گوشت کو ہضم کرتا ہے۔ اسی طرح ہر قسم کی چیز کے لیے الگ رطوبت پیدا ہوتی ہے۔“ غلام رسول بولتے بولتے سانس لینے کے لیے رکا۔

”صاحب جی! آپ کا کہنا ہے کہ چاول کے لیے الگ، دال کے لیے الگ، گوشت کے لیے الگ، آلو کے لیے الگ رطوبت پیدا ہوتی ہے۔“ جاوید کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں! معدہ ہر چیز کو گلانے کے لیے الگ الگ رطوبت پیدا کرتا ہے۔ اس گلے ہوئے پیسٹ کو آگے دھکیلنے کے لیے معدے کی تولیہ جیسی اندرونی سطح بل کھانے سکڑنے پھیلنے لگتی ہے۔ اس طرح ساری غذا رطوبتوں کے ساتھ مکس (MIX) ہو جاتی ہے۔ دھیرے دھیرے معدے سے یہ پیسٹ پائی لورک والو (Pyloric Valve) کی طرف جاتا ہے جس کا ایک سرا چھوٹی آنت میں کھلتا ہے۔ چھوٹی آنت کے پہلے حصے کو Duodenum کہتے ہیں۔ چھوٹی آنت غذا میں شامل تیزاب کو Alkalines کے ذریعے بے ضرر بنا دیتی ہے۔ ورنہ السر کی شکایت عام ہوتی ہے۔“ غلام رسول بولا۔

”اب آپ خود سوچیں ایسے پیچیدہ اعضاء کو خلق کرنے والا وہ خالق کیا اتنا مجبور ہوگا کہ وہ بار بار ایک ہی شخص کو پیدا کرے۔ وہ قادر مطلق تو ہر بار نئے انداز کا انسان خلق کرتا ہے مگر اس انداز میں کہ اس کے اندر کی تمام مشینری خود کار ہو۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ دوسرا جنم فراڈ ہے۔“

”آپ پڑھے لکھے بندے ہیں۔ اتنی باریک باتیں ہم جیسے لوگ کہاں جانتے ہیں۔ آپ ہی بہتر سمجھتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔“

”شانو کی بیماری بھی اسی قبیل کی ہے۔ جس کا علاج مس کیتھی کریں گی۔“ کہہ کر غلام رسول اٹھ کھڑا ہوا اور اجازت لے کر نہایت خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اس نے پوری کوشش کی تھی کہ شانو کو اس کے فرار کا پتا نہ چلے۔

سڑک بالکل سنسان تھی مگر وہ اس جنجال سے نکل آنے کے لیے گاڑی کو بھگائے لیے جا رہا تھا کہ اسے پوری قوت سے بریک لگانا پڑا۔

☆======☆======☆

گولی پروفیسر کے بالوں کو چھوتی ہوئی حسن کے سر میں دھنس گئی تھی۔ اس کی لاش کو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھلانگتے ہوئے کمانڈر علی راجندر رونشی پر جھپٹا مگر وہ کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ پروفیسر نے علی کا دو دھاری خنجر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور وہ بھی کسی بھوکے چیتے کی طرح بے حد چوکنے انداز میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ان کی متلاشی نگاہیں چپے چپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ایک کمرے کے بعد دوسرے کمرے کو چھان رہے تھے۔ اب وہ ایک ایسے کمرے میں تھے جہاں چاروں طرف خشک گھاس کے گٹھے بکھرے ہوئے تھے۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ راجندر رونشی انہی گٹھوں میں چھپا بیٹھا ہو۔ اسی لیے وہ جھکے جھکے چوکنا انداز میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

کسی بھی وقت کسی بھی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا لہٰذا ان کے اعصاب ہوشیار اور پٹھے کچھ دکھانے کے لیے بے تاب تھے۔ دفعتاً ایک فائر ہوا اور وہ ایک گٹھے کے پیچھے چھپ گئے۔

گولی پروفیسر کے سر کے اوپر سے گزری تھی۔ اس کمرے میں ایک دو چھتی بھی تھی اور فائر اسی طرف سے ہوا تھا۔ وہ گٹھوں کی آڑ لیتے ہوئے اسی طرف بڑھنے لگے۔

پروفیسر گر بہ پا دو چھتی کی طرف بڑھے۔ ہر طرف سوکھی گھاس تھی۔ وہ اسی پر پیر رکھتے ہوئے بڑھ رہے تھے کہ ان کا پیر کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا، پتا نہیں کس جذبے کے تحت یا عادتاً وہ ٹھوکر لگتے ہی بولے "یا اللہ مدد" اور پھرتی سے پیچھے ہٹ گئے۔ ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں اضطراری طور پر اٹھایا گیا قدم ان کی زندگی کے لیے ضمانت بن گیا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ لوہے کا شکنجہ ابھر آیا تھا۔ یہ شکنجہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا بڑے سائز کے چوہوں کو پھنسانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مگر اس شکنجے کا سائز بہت بڑا تھا۔ اس کے دانت بھی تیز اور بڑے تھے۔ اگر اس میں پیر پڑ جاتا تو شکنجہ پنڈلی کے گوشت کو کاٹ کر ہڈیوں کو پکڑ لیتا۔ اسی لمحے پروفیسر کے ذہن میں چال آ گئی اور وہ اذیت بھرے انداز میں چیخے۔

ابھی ان کی چیخ رکی بھی نہ تھی کہ راجندر رونشی کا قہقہہ گونجا وہ قہقہہ لگا کر بولا تھا۔

"پروفیسر! میں اگر چاہتا تو تمہیں گولی سے بھی مار سکتا تھا مگر میں تمہیں اذیت بھری موت کا تحفہ دینا چاہتا تھا۔"

پروفیسر نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور زور سے کراہنے کی اداکاری کرتے رہے۔ ان کی اداکاری سے اس نے یہی سمجھا کہ وہ تکلیف کی وجہ سے بول نہیں پا رہے ہیں۔

وہ خود ہی بولتا رہا۔ "تم مسلمانوں کی سب سے بری عادت یہی ہے کہ دنیا کے کسی کونے میں مسلمانوں پر کوئی آفت آتی ہے تو سب کے سب چیخنے لگتے ہو۔ تم بھی اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے آئے تھے ناں۔ اب موت کا مزہ چکھو۔ میں تمہیں تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ گولی مار کر تمہاری لاش دلی بھیج دوں تاکہ وہ لوگ تمہاری لاش کی نمائش کر سکیں۔ دنیا بھر کے پترکاروں (صحافیوں) کو دکھا کر کہیں کہ یہ پاکستان سے آیا تھا۔ وہاں کی حکومت نے بھیجا تھا تاکہ انٹرنیشنل طور پر پاکستان بدنام ہو جائے۔"

پھر اس کی آواز آنا بند ہو گئی۔

پروفیسر دبے قدموں اسی طرف بڑھے جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ ادھر ہی وہ کمرہ تھا جہاں سے وہ اس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ پروفیسر نے اس کمرے کی کھڑکی پر پہنچ کر اندر جھانکا۔ راجندر رونشی دروازے کی طرف پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ دیوار کی طرف تھا اور دیوار میں ایک بہت بڑی الماری تھی۔ شاید اس الماری کا پٹ خفیہ تھا کیونکہ آتے وقت انہوں نے دیوار کو سپاٹ دیکھا تھا۔ اس الماری کے اندر کا منظر دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ اندر بڑے بڑے نوٹوں کی بے شمار گڈیاں رکھی تھیں۔ یقیناً بیس پچیس لاکھ روپے ہوں گے۔ وہ ان روپوں کو جلدی جلدی ایک بڑے سے بورے میں بھر رہا تھا۔ تبھی انہیں کسی کے دبے قدموں چلنے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ کمانڈر علی شکار پر جھپٹنے والے شیر کے انداز میں جھکا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی مگر وہ فوراً چونک اٹھے اور زور زور سے سانس لینے لگے۔ ان کے نتھنوں سے عجیب سی بو ٹکرائی تھی۔ انہوں نے نسبتاً زور سے سانس کھینچی اور بری طرح چونک گئے۔ راجندر رونشی نے حرامی پن کی انتہا کر دی تھی۔ سوکھی گھاس کے گٹھوں میں آگ لگا دی تھی۔

پروفیسر نے مڑ کر دیکھا تو ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ دروازہ شعلوں سے گھرا ہوا تھا۔ سوکھی گھاس کتنی جلدی جلتی ہے اس کا اندازہ انہیں اب ہوا تھا۔ انہیں یہ سوچ کر ہول آنے لگا کہ اگر واقعی ان کا پیر شکنجے میں پھنس جاتا تو وہ بہ آسانی اس آگ کا شکار ہو جاتے۔ انہوں نے باہر کی جانب چھلانگ لگا دی۔ آگ کے سمندر کو پھلانگنا آسان نہ تھا۔ ان کے کپڑوں نے آگ پکڑ لی۔ سامنے کے بال بھی جھلس گئے۔

کمرے سے باہر آتے ہی انہوں نے لوٹ لگائی جس کی وجہ سے کپڑوں کی آگ بجھ گئی مگر جو حصہ جل گیا تھا وہاں سوزش شروع ہو گئی تھی۔ وہ لمبا چکر کاٹ کر راجندر رونشی والے کمرے میں پہنچے مگر اب وہ کمرہ خالی پڑا تھا۔ وہ باہر نکل چکا تھا۔ سامنے ہی ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیپ کھڑی تھی۔ وہ اس میں بیٹھ رہا تھا۔ جیپ پر لدا بورا بھی انہیں نظر آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ راجندر روشی نوٹوں کی گڈیاں لے کر فرار ہو رہا ہے۔ انہیں اس کا بھی اندازہ تھا کہ اگر وہ فرار ہوا تو سیدھا بریگیڈیئر رام پال کے کیمپ میں جائے گا۔ وہی اس کے لیے جائے پناہ تھی۔ وہ اس جیپ کی طرف دوڑے تھے مگر اس تک وہ پہنچ نہ سکے۔ جیپ اسٹارٹ ہو کر دوڑ گئی تھی۔

پروفیسر نے لاچاری سے ادھر اُدھر دیکھا۔ انہیں ایسی کوئی سواری نظر نہیں آئی تھی جس کے ذریعے وہ اس کا پیچھا کرتے۔ پھر یوں بھی ان کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ وہ جوش میں جوانوں جیسا کام تو کر جاتے تھے لیکن عمر کا تقاضہ انہیں پھر سے یاد دلانے لگتا تھا کہ جسم اب اتنی محنت کا عادی نہیں رہا ہے۔ قویٰ جواب دینے لگے ہیں۔ وہ مجبوری میں ایک پتھر پر بیٹھنے لگے تھے کہ ان کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ یکایک ہی وہ بائیک اچھل کر سڑک پر آئی تھی۔ نشیب سے سڑک پر آنے والی اس بائیک پر کمانڈر علی بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر انہوں نے زور سے کہا۔ ”علی اسے چھوڑنا نہیں کھیل ختم کرنا ہے۔“ علی نے سنا یا نہیں مگر اس نے سر کا اشارہ ضرور کیا تھا۔ وہ اس جیپ کے تعاقب میں لگ گیا تھا۔

کمانڈر علی نے جیپ کا پیچھا شروع کیا تو راجندر روشی نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی۔ وہ ان کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ شاید اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ علی پروفیسر عثمان سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ دونوں آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کمانڈر علی بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بریگیڈیئر رام پال کے کیمپ کی طرف جائے گا مگر بستی کے نزدیک پہنچ کر راجندر روشی جنوب کی طرف مڑ گیا۔ کمانڈر علی اس طرف صرف ایک بار گیا تھا۔ ادھر ایک کارخانہ تھا جسے مقامی لوگ ”ہڈی کل“ کہتے تھے۔ وہاں ہڈیوں کو صاف کیا جاتا تھا پھر ان ہڈیوں کو مقامی کاریگروں تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ کاریگر اپنے فن میں ماہر تھے۔ اپنے اپنے گھروں میں خراد پر ان ہڈیوں سے ڈیکوریشن پیس بناتے تھے۔ یہ اس علاقے کی دستکاری سمجھی جاتی تھی۔ یہاں سے سستے داموں خرید کر اسے سرینگر کے بازاروں میں مہنگے داموں بیچا جاتا تھا۔ شاید وہ اسی کارخانے کی طرف جا رہا ہے، علی نے سوچا اور اپنی بائیک کی رفتار مزید تیز کر دی۔

کچھ دور جاتے ہی وہ کارخانہ نظر آنے لگا۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔ راجندر روشی اسی کارخانے میں داخل ہوا تھا۔ کمانڈر علی بھی اس کا پیچھا کرتا ہوا اس کارخانے میں داخل ہو

گیا۔ کارخانہ بند ہو چکا تھا ایک بھی مزدور نظر نہیں آ رہا تھا۔ یوں بھی اس کارخانے میں گنتی کے لوگ کام کرتے تھے۔

کمانڈر علی نے بائیک باہر کھڑی کی اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی پیشانی پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ راجندر روشی اس کے استقبال کے لیے دروازے کی آڑ میں کھڑا تھا۔ جیسے ہی کمانڈر علی اندر داخل ہوا اس نے پوری قوت سے اس کی پیشانی پر گھونسا مارا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو گر کر تڑپنے لگتا مگر وہ صرف بیٹھتا چلا گیا تھا۔ بیٹھتے بیٹھتے ہی اس نے خود پر قابو پا لیا تھا اور پھر سامنے والے کی دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر گھسیٹ لیا تھا۔ راجندر روشی گرا ضرور تھا مگر پیچھے کی طرف گرنے کی بجائے وہ سیدھا اسی پر آ گرا تھا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے مگر فوراً ہی سنبھل گئے تھے پھر علی نے پھرتی سے اسے اچھال دیا تھا مگر ٹھیک اسی وقت کسی نے عقب سے اس کے سر کو فٹ بال سمجھ کر کک لگائی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے گردش کرنے لگے تھے۔ نیلے پیلے اور سرخ ستارے۔ وہ رنگ برنگے تارے سیاہ رنگ میں تبدیل ہوتے چلے گئے تھے۔ پھر اس کے ذہن پر سیاہ دھند کی چادر تن گئی تھی۔ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو گیا تھا۔

پھر وہ کتنی دیر تک بے ہوش رہا اسے خود پتا نہ تھا۔ بس اسے صرف اتنا احساس تھا کہ وہ زندہ ہے اور یہ احساس ہی اسے توانائی بہم پہنچا رہا تھا۔ اس کے جسم و جاں میں ایک نئی آگ سی بھڑ گئی تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد اس نے فوراً آنکھ نہ کھولی۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ابھی اسے ہوش نہیں آیا ہے پھر اسے احساس ہوا کہ اسے زمین پر گھسیٹا جا رہا ہے۔ زمین بے حد چکنی اور ہموار تھی۔ اس لیے اسے اس عمل سے کوئی اذیت نہیں پہنچ رہی تھی۔

وہ آدمی جو اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا اس نے دفعتہً اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ ”بس یہ کچھ ہی دیر کا مہمان ہے پھر یہ ایک دم اس دنیا سے غائب ہو جائے گا۔“

دائیں جانب چوڑی سی ایک بیلٹ چل رہی تھی جس میں ہڈیاں لدی ہوئی تھیں۔ وہ ہڈیاں ایک دم سے جا کر ایک حوض میں گر رہی تھیں۔ جس میں شاید کیمیکل بھرا ہوا تھا جو ہڈیوں سے چپٹے گوشت کے ریشوں کو گلاتا ہے۔

علی نے سن رکھا تھا کہ یہ کارخانہ نیم آٹو میٹک ہے۔ آدھے کام خود کار مشینوں کے ذریعہ ہوتے ہیں۔ علی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ لوگ اسے غائب کرنے کا دعویٰ اس لیے کر رہے ہیں کہ اسے کیمیکل سے بھرے حوض میں پھینکنا چاہتے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''اسے اٹھاؤ'' یہ آواز راجندر ونشی کی تھی۔ قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ نزدیک آنے لگی۔ پھر کسی نے اسے گڈے کی طرح اٹھا کر اس بیلٹ پر رکھ دیا جو حوض کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چھوٹی بڑی ہڈیوں کا ڈھیر اس بیلٹ پر پڑا تھا جو سیدھا جا کر حوض میں گر رہا تھا۔

ان ہڈیوں پر گرنے کی وجہ سے علی کے جسم میں جگہ جگہ چبھن کا احساس ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ کئی جگہ گوشت میں ہڈیوں کے نوکیلے سرے گھس گئے ہیں مگر اس نے اف بھی نہ کی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان کا پلان کیا ہے اور یہاں کتنے لوگ ہیں۔ اسی لیے وہ مُردوں کی طرح بے حس وحرکت پڑا ہوا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی تھوڑی سی بھی حرکت انہیں متوجہ کرسکتی ہے۔

جیسے جیسے بیلٹ آگے کی طرف کھسک رہی تھی اس کے نتھنوں میں کیمیکل کی بو تیز سے تیز تر محسوس ہو رہی تھی۔ حوض حالانکہ کافی دور تھا پھر بھی اس کی بو نا قابل برداشت محسوس ہو رہی تھی اور یہ سوچ سوچ کر اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں کہ اگر وہ اس حوض میں گر گیا تو اس کا جسم پلک جھپکتے ہی گل جائے گا۔ اس نے پلکوں کی خفیف سی درز سے جھانکا۔ وہاں صرف دو آدمی تھے اور دونوں ہی اس کی ہٹ لسٹ پر تھے۔ ان میں سے ایک راجندر ونشی تھا اور دوسرا بریگیڈیئر رام پال۔ مجاہدین کشمیر کے دونوں دشمن کمر پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ وہ اس کا انجام دیکھنا چاہتے تھے۔

''بہت بہادر بنتا تھا سالا! کچھ ہی دیر میں اس کا تیل نکل جائے گا۔'' بریگیڈیئر رام پال نے کہا۔

علی حوض کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ موت اور حیات کے درمیان صرف ایک فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ چھ انچ آگے بڑھنے کی دیر تھی کہ اس کا جسم پٹے پر سے پھسل کر حوض میں گر جاتا۔ اس حوض میں بھرا ہوا کیمیکل لمحہ بھر میں اس کے جسم کے ہر ریشے کو گلا دیتا۔ اس نے پلکوں میں درز پیدا کر کے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

☆======☆======☆

غلام رسول بروقت بریک نہ لگاتا تو حادثہ یقینی تھا۔ وہ عورت سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔

''مرنا چاہتی ہو؟'' غلام رسول نے کار کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر کہا۔

''ننگار پہنچا دیں گے؟'' عورت نے کہا۔ وہ سرتاپا سیاہ برقع میں ملبوس تھی۔

غلام رسول نے اسے تیز نظروں سے دیکھا پھر یہ سوچا کہ ایسے وقت میں کوئی عورت کسی انتہائی ضروری کام ہی سے باہر نکل سکتی ہے اس لیے وہ بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

عورت نے پچھلا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔ غلام رسول نے کار اسٹارٹ کی اور خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ ننگار قریب آتا جا رہا تھا۔ ایک دن پہلے جب وہ ضروری سامان کی خریداری کے لیے نکلا تھا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک اجنبی خاندان میں جا کر وہ اس خاندان کا حصہ بن جائے گا۔ پاکستان آنے سے پہلے اس کی زندگی ایک لگے بندھے اصول پر چل رہی تھی مگر اب ایسا لگنے لگا تھا کہ اس کی زندگی حادثات کا مجموعہ ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے بدلتے ہوئے رخ پر غور کر رہا تھا کہ اس عورت نے پوچھا۔ ''بھائی صاحب ایک بات پوچھوں؟''

''بولو!'' غلام رسول نے کہا۔

''آپ کے ساتھ ایک بڑے صاحب ہوا کرتے تھے آج کل وہ دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔''

غلام رسول سمجھ گیا کہ وہ پروفیسر کے بارے میں پوچھ رہی ہے پھر بھی اس نے کہا۔

''کن صاحب کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔''

''ارے وہی صاحب جنہیں لوگ اسد الکبیر کا دوسرا جنم کہہ رہے ہیں۔''

''ان سے تمہیں کیا کام ہے؟'' غلام رسول نے کہا۔

''بس یونہی پوچھ لیا۔ کیا وہ ننگار میں نہیں ہیں؟''

غلام رسول کو اس کا لہجہ اجنبی اجنبی سا لگا۔ اس علاقے کی عورت اتنی صاف اردو نہیں بولتی۔ پھر وہ ایسے بول رہی تھی جیسے اردو اس کی مادری زبان نہ ہو۔ اس علاقے کی اصل زبان شینے ہے۔ لوگ شینے کے بعد دوسری علاقائی زبان بولتے ہیں۔ اردو متبادل زبان کے طور پر استعمال ہوتی ہے لیکن اردو بولنے پر ان کا لہجہ الگ ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس عورت کا لہجہ ان جیسا نہیں تھا اس لیے غلام رسول بولا۔ ''بی بی آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟''

''جی میں گلگت کی ہوں مگر میرا سسرال ننگار میں ہے۔''

''آپ غلط بول رہی ہیں۔ آپ کا تعلق گلگت سے بھی نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا میں آسمان سے آئی ہوں۔'' عورت برا مان گئی۔

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے۔" غلام رسول جلدی سے بولا۔

"پھر کیا مطلب ہے؟" عورت کے لہجے میں تیزی آ گئی تھی۔ "میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ پروفیسر عثمان کہاں گئے ہیں اور آپ غلط سلط بول کر میری بات کو کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

غلام رسول کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی سی بج اٹھی۔ اس نے پھرتی سے بریک دبایا اور سخت لہجے میں بولا۔ "اے تم کون ہو؟ اس علاقے کے عام لوگوں کو بالکل پتا نہیں ہے کہ پروفیسر کا نام کیا ہے۔ تم پہلی عورت ہو جس نے ان کا نام لیا۔"

"میں تمہارے لیے انجان نہیں ہوں لو دیکھ لو۔" کہہ کر اس نے نقاب الٹ دیا۔

غلام رسول نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ واقعی یہ عورت انجان نہ تھی۔ اس سے وہ پہلے بھی مل چکا تھا۔ پہلی بار اس وقت ملا تھا جب یہ عورت اس کے سامنے نہایت پُراسرار حالات میں آئی تھی۔ اس کے کمرے میں چاند کی روشنی کھڑکی کے راستے آ رہی تھی اور اس روشنی میں ایک مکروہ چہرہ نظر آنے لگا تھا۔ اس چہرے سے ڈر کر وہ کمرے سے باہر آیا تھا کہ یہ عورت نظر آ گئی تھی۔ پھر وہ اسے تب ملی تھی جب وہ بازار میں خریداری کرنے گیا تھا کہ راستے میں اس کی کار گرم ہو کر رک گئی تھی۔ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کے لیے غلام رسول نے اسی کے گھر سے پانی لیا تھا مگر جب پانی ڈال کر وہ مڑا تھا تو نہ یہ عورت تھی اور نہ اس کا گھر۔ دونوں ہی غائب ہو گئے تھے۔ تیسری بار یہ عورت اسی انداز میں اسے سڑک پر ملی تھی اور بنگار پہنچ کر غائب ہو گئی تھی۔ اس عورت پر اسے بھوت کا گمان ہونے لگا تھا۔

"تم......تم کیا چاہتی ہو؟" غلام رسول نے پوچھا۔

"مجھے پروفیسر کا پتا چاہیے۔"

"اور اگر میں نہ بتاؤں تو؟"

"تو مجھے انگلی ٹیڑھی کرنا بھی آتی ہے۔" عورت نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آج میں تمہیں آخری موقع دے رہی ہوں۔ کل پھر ملوں گی۔ اتنی دیر میں تم اچھی طرح غور کر لینا۔ اگر پروفیسر کا پتا نہیں بتایا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" عورت نے اتنا کہا ہی تھا کہ غلام رسول کو اپنا سر گھومتا ہوا لگا اور اس کے ذہن پر دھند کی چادر چھا گئی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

اسے ہوش آیا تو وہ اسٹیئرنگ پر سر رکھے سویا ہوا تھا۔ اس نے چونک کر ادھر اُدھر

دیکھا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور حویلی پہنچ گیا۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی اس نے کار کو پورچ میں کھڑا کیا اور خود نماز پڑھنے کے لیے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

اس نے نماز تمام کی تھی کہ کیتھی آ گئی۔

"کیا بات ہے جناب! کل سے آپ کہاں تھے؟ یہ اس طرح غائب ہو جانا اچھی بات تو نہیں ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے جہاں جانا تھا بتا کر تو جاتے۔"

"بس ایک جھنجٹ میں پھنس گیا تھا۔"

"میں کتنی پریشان تھی تمہیں کیا پتا۔ اس سے سمجھ لو کہ اتنی صبح بھی میں جاگ رہی ہوں اور تمہیں کوئی پروا ہی نہیں۔ آتے ہی نماز میں لگ گئے۔"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم سے تو بعد میں بھی بات کر سکتا تھا مگر نماز کا وقت نکل جاتا پھر کیا ہوتا؟"

"کیوں تم لوگوں میں تو قضا نمازیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔"

"قضا نمازیں تب پڑھی جاتی ہیں جب مجبوری ہو۔ نماز فرض تو ہے مگر اس کا فائدہ خود انسان کے لیے مختص ہے اور ہر نماز کے لیے وقت مقرر ہے۔ جانتی ہو کیوں؟"

"کیوں؟" کیتھی نے پوچھا۔

"ہماری زمین آٹھ سو کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اپنے مرکز پر گھوم رہی ہے۔ اسی ہزار کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے وہ سورج کے گرد بھی چکر لگا رہی ہے۔ یہ گردش ہماری اس دنیا کو مخصوص وقت پر ایک ایسے زاویے پر لے آتی ہے جہاں مختلف سیاروں کی شعاعیں ایک الگ زاویے سے زمین پر پڑتی ہیں۔ یہ شعاعیں انسانی جسم کے لیے بہت ضروری ہیں۔ کون سی شعاع جسم کے کس حصے میں کتنی مقدار میں پڑنی چاہیے اور کب پڑنی چاہیے یہ ہم سے بہتر ہمارا خالق جانتا ہے کیونکہ وہی ان شعاعوں کا بھی خالق ہے اور اس جسم کا بھی۔ اسی لیے اس نے نماز کا حکم دیا اور وقت مقرر کر دیا۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ خالق کا حکم مان کر ان شعاعوں کو جسم میں جذب ہونے کا موقع دے۔ خود کو صحت مند بنائے۔ جب وہ سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہوئے جھک کر "اسپائنل کورڈ" میں شعاعیں جذب کراتا ہے تو اس کا فائدہ کتنا ہے۔ اس کا خود اسے اندازہ نہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ دماغ سے پیر کے انگوٹھے کے ناخنوں تک پھیلے ہوئے انتہائی نازک مواصلاتی نظام کا مین کیبل ہی Spinal Cord ہے۔"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مسٹر غلام رسول! اس وقت میں وعظ سننے کے موڈ میں نہیں ہوں اس لیے یہ بحث ادھار رہی۔ سنورات میں ایک آدمی آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ آج کل میں پروفیسر آنے والے ہیں۔ تم نے تو یہ بات مجھے نہیں بتائی تھی کہ وہ انڈیا گئے ہوئے ہیں مگر اس نے بتا دیا۔"

"پروفیسر انڈیا نہیں مقبوضہ کشمیر گئے ہیں اور مقبوضہ حصہ اس کشمیر کا اٹوٹ انگ ہے وہ انڈیا میں تو نہیں ہے۔ کسی علاقے پر زبردستی اپنی فوج بٹھا لینے سے وہ حصہ اس کا تو نہیں ہو گیا۔"

"بات کچھ بھی ہو، پروفیسر آنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہوئی کہ کل کچھ لوگوں نے زبردستی حویلی میں گھسنے کی کوشش کی۔ چوکیدار کی فائرنگ اور گاؤں والوں کے شور نے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔"

غلام رسول سوچ میں پڑ گیا۔ اس سے پہلے بھی ایک روز ایک جیپ پر سوار ہو کر کچھ لوگ آئے تھے اور انہوں نے فائرنگ کی تھی پھر اس پُراسرار عورت کا پروفیسر کے بارے میں پوچھنا یہ سب کیا ہے؟ کہیں پروفیسر کی جان کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟

غلام رسول سوچ کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وسوسے دہلا رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا اور دہل رہا تھا کفر اور اسلام کا ٹکراؤ اب سڑکوں پر آ گیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں پتھر ہے اور کفر سٹینگر میزائل سے لیس ہے۔ سٹینگر میزائل دوڑا دوڑا کر مارتا ہے۔ فلسطین و کشمیر میں بھی مسلمانوں کو دوڑا دوڑا کر گھروں سے کھینچ کھینچ کر مارا جا رہا ہے۔ ان کا جرم صرف اتنا ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ پروفیسر نے بھی جرم کیا ہے۔ وہ مسلمان ہو کر بھی سائنس کے میدان میں آگے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ نامور سائنسدان بن گئے ہیں۔ خلیوں (Cells) کی تھیوری پیش کر کے دنیا میں ہلچل مچا بیٹھے ہیں۔ سب کو حیران کر دیا ہے۔

کمزور جب حیران ہوتا ہے تو تعجب کا اظہار کرتا ہے اور طاقتور خجالت کا۔ کمزور کو آگے بڑھتے دیکھ کر وہ جھلا اٹھتا ہے اور طاقت کا استعمال شروع کر دیتا ہے۔ اہل یورپ بھی اسلام کے مقابل ایک ہو چکے ہیں۔ کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ کھلم کھلا مسلمانوں کو دہشت گرد کہہ رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اب پروفیسر کو بھی سبق سکھانے کے لیے یہاں تک آ گئے ہوں۔ ابھی وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ باہر سے عجیب سی تیز آواز آئی۔ وہ بری طرح چونک گیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر کی جانب بھاگا۔ کیتھی بھی گھبرا

اٹھی تھی۔ اس نے بھی اس کی تقلید کی۔ گھر سے باہر نکلتے ہی انہوں نے ہیلی کاپٹر کو دیکھا۔ یہ ایک تعجب خیز بات تھی۔ اس علاقے میں اس سے پہلے ہیلی کاپٹر کبھی نہیں آیا تھا اسی لیے انہیں عجب سا لگا تھا۔ گاؤں والے بھی حیرت سے باہر نکل آئے تھے۔ ہر روز آسمان پر چیلوں کو دیکھتے تھے، آج پہلی بار ہیلی کاپٹر دیکھ رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر پر پاک فوج کا نشان تھا۔ سرحد یہاں سے بہت زیادہ دور نہیں تھی مگر گہری گہری کھائیوں اور اونچے اونچے پہاڑوں کی وجہ سے یہ علاقہ فوجی نقطہ نظر سے محفوظ تھا اس لیے یہاں پر دور و نزدیک کوئی فوجی کیمپ نہیں تھا پھر یہ ہیلی کاپٹر کہاں سے اور کیوں آیا ہے۔ یہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس لیے کیتھی اور غلام رسول لوٹ آئے۔

کمرے میں پہنچ کر کیتھی نے کہا۔ "ہیلی کاپٹر کیوں آیا؟ یہاں تو کوئی کیمپ بھی نہیں ہے۔"

"تم نے غور نہیں کیا، وہ سیاچن کی طرف گیا ہے۔ وہ علاقہ روزِ اول سے مخدوش رہا ہے۔ پھر وہاں رسد پہنچانے کے لیے بھی ہوائی جہاز کی مدد لی جاتی ہے۔"

"میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔" کیتھی بولی۔

"کیا؟" غلام رسول نے پوچھا۔

کیتھی نے غلام رسول کی طرف گہری نظروں سے دیکھا جو اپنے بیڈ پر تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گیا تھا۔ پھر وہ اس کی پائنتی میں بیٹھ گئی۔ "میرا خیال ہے یہ ہیلی کاپٹر ہمارے لیے آیا ہوگا۔ تم خود سوچو نا۔ ادھر نزدیک میں کہیں کوئی فوجی کیمپ نہیں ہے پھر یہ کیوں آیا؟ ضرور کسی خاص کام سے آیا ہو گا، اور وہ خاص کام کیا ہو سکتا ہے؟ یقیناً ہمارے یعنی وہ لوگ ہماری تلاش میں آئے ہوں گے۔" کیتھی کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"ضرور تم نے کسی کی مرغی چرائی ہوگی اسی لیے وہ پیچھا کر رہا ہوگا۔" غلام رسول ہنس کر بولا۔ وہ اس کے خیال سے متفق تھا لیکن اظہار کرنے سے گریزاں تھا کیونکہ وہ کیتھی کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا تھا۔

"مذاق نہیں، میں سیریس ہوں۔ تم خود سوچو، اتنی نیچی پرواز کرنے کی انہیں کیا ضرورت تھی جبکہ یہ علاقہ اونچے نیچے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ بھٹک کر آنے والا ہیلی کاپٹر اونچی پرواز کر کے نکل جاتا ہے۔"

"نہ ہم پائلٹ ہیں اور نہ اس ہیلی کاپٹر میں بیٹھے تھے اس لیے نیچی پرواز کی وجہ بتانے سے قاصر ہیں۔"

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''اب اس رخ پر غور کرو، پروفیسر کی شخصیت معمولی نہیں ہے۔ وہ عالمی شہرت کے حامل ہیں۔ انہوں نے امریکہ جیسی سپر پاور کی پیشکش کو ٹھکرایا ہے۔''

''مرد وہی ہوتا ہے جو ٹھکرانا جانتا ہو، تم بولو کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''ایک پُراسرار لڑکی کا مسلسل تمہارے تعاقب میں رہنا، جیپ پر سوار ہو کر کچھ لوگوں کا یہاں آنا، حویلی کے باہر فائرنگ کرنا۔ یکایک پروفیسر صاحب کا روپوش ہو جانا۔ یہ سب کچھ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ کچھ لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ہم پاکستان میں رہیں۔''

''پاکستان سے باہر بھی تو پروفیسر کی وہی شخصیت رہے گی۔''

''مگر اس وقت وہ پاکستانی شہری نہیں کہلائیں گے اور ان کی شہرت کسی دوسرے ملک کی جھولی میں گرے گی۔ وہ ملک ان کی محنت کا فائدہ اٹھائے گا۔'' کیتھی نے تلخ حقیقت سے آگاہ کیا جس کا اندازہ غلام رسول کو پہلے سے تھا۔

''لیکن یہ فائرنگ کرنے والے مقامی لوگ تھے۔'' غلام رسول نے اوپری دل سے توجیہہ پیش کی۔

''تمہی نے تو بتایا تھا کہ مسلمانوں کو جب بھی زک پہنچی تو مسلمانوں ہی کے ہاتھوں پہنچی۔ بغداد جیسا ترقی یافتہ شہر جو علم وفن کا مرکز تھا، اسے ہلاکو نے تباہ کیا اور ہلاکو کو بلایا کس نے؟ آستین کے سانپوں نے۔ ہسپانیہ جو یورپ کیا، پوری دنیا میں اپنی مثال آپ تھا اسے تباہ کیا شیر دل رچرڈ نے، رچرڈ کو شیر دل کا خطاب دے کر بلایا کس نے؟ آستین کے سانپوں نے۔ نواب سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان جیسے بہادروں کی شکست کا باعث بنے کون؟ انہی آستین کے سانپوں نے۔ آج بھی فلسطین و کشمیر میں یہی کھیل ہو رہا ہے۔ ایسے ہی آستین کے سانپ یہود و ہنود کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ جب کنٹرول لائن کے ادھر سازشی ذہن والے موجود ہیں تو کیا یہاں نہیں ہوں گے؟''

''تمہاری بات غلط نہیں ہے مگر ہیلی کاپٹر فوجی تھا اور سیاچن کی چوٹیوں کی طرف گیا ہے۔ وہ علاقہ ہمیشہ سے غیر محفوظ رہا ہے۔ ہمارے محافظوں کی ذرا سی چوک سے دشمن فائدہ اٹھا لینے کی پوری کوشش کرتا ہے اس لیے حفاظت بھی اسی انداز میں کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے نیچی پرواز کے پیچھے بھی کوئی راز ہو۔''

''تم کچھ بھی کہو، مجھے سو فیصد یقین ہے کہ خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔''

☆======☆======☆

کمانڈر علی کا جسم ہڈیوں کے ڈھیر پر پڑا تھا اور پٹا چل رہا تھا، آگے بڑھ رہا تھا۔ ہڈیوں کے ڈھیر کے ساتھ اس کے جسم کو بھی آگے بڑھا رہا تھا۔ کیمیکل سے بھرا ہوا دس بائی دس فٹ کا حوض اب زیادہ دور نہیں تھا۔ اس حوض میں لبالب بھرے کیمیکل میں گرنے والی ہڈیوں سے چمٹے گوشت کے ریشے فوراً گل جاتے۔ اگر اس کا جسم گرتا تو ایک پل میں گل جاتا۔ پانی بن کر بہہ جاتا۔ اس نازک وقت میں ایک ایک پل قیمتی تھا۔ اس نے پلکوں میں درز پیدا کر کے اطراف کا جائزہ لیا۔ بالکل سامنے راجندر ونشی کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے بریگیڈیئر رام پال تھا۔ دونوں کے ہاتھ میں پستول تھے۔ کمانڈر علی نے لیٹے لیٹے قلابازی کھائی، کسی ماہر کی طرح جمناسٹک کا مظاہرہ کیا اور سیدھا راجندر ونشی پر جا پڑا۔ راجندر ونشی اس حملے سے بچاؤ کے لیے تیار نہ تھا۔ پیٹھ کے بل گر پڑا۔ کمانڈر علی بجلی کی سی پھرتی سے کھڑا ہوا اور بریگیڈیئر رام پال کے منہ پر زوردار پنچ مارا۔ وہ پیچھے کی جانب الٹ گیا۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے علی بجلی کی طرح کوند رہا ہو۔ وہ اچھل کر دوبارہ راجندر ونشی کے پاس پہنچا اور اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر سر سے بلند کیا پھر حوض کی جانب اچھال دیا۔ چھپاک کی آواز کے ساتھ راجندر کی چیخ بلند ہوئی پھر گہری خاموشی ہو گئی۔ اس خاموشی کو فائر کی آواز نے توڑا۔ رام پال نے لیٹے لیٹے فائر کیا تھا۔ علی کا ستارہ اس وقت واقعی عروج پر تھا۔ قسمت نے اسے بچا لیا۔ وہ گولی اس کے بالوں کو جھلساتی ہوئی آگے نکل گئی۔ علی نے زقند بھری اور گویا ہوا میں اڑتے ہوئے لات چلائی۔ رام پال کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر دور جا گرا۔

پستول سے محروم ہوتے ہی رام پال، علی سے لپٹ گیا زور آزمائی ہونے لگی۔ علی اگر کمانڈو رہ چکا تھا تو رام پال بھی فوجی تھا، بریگیڈیئر تھا۔ دونوں ہی دست بہ دست جنگ کے ماہر تھے۔ ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ رام پال نے علی کی گردن میں بازو ڈال کر پھنسا رکھا تھا۔ وہ تقریباً بے بس ہو چکا تھا۔ رام پال ترچھا ہو کر اسے زمین سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا تبھی علی کو موقع مل گیا۔ اس نے بیک وقت کہنی اور ایڑی کا وار کیا۔ کہنی سینے کے جوڑ پر اور پاؤں کی ایڑی ناف کے نیچے لگی۔ رام پال کی گرفت لمحے بھر کو ڈھیلی ہوئی تھی کہ علی نے جھٹکا مارا۔ رام پال کے بازو کا حلقہ کھل گیا۔ گردن آزاد ہوتے ہی علی نے اچھل کر فلائنگ کک ماری۔ سینے پر پڑنے والی لات نے رام پال کو پیٹھ کے بل گرا دیا۔ علی نے موقع ضائع نہ کیا اور ایک مرتبہ پھر اچھل کر اس کے سینے پر بوٹ کی بھرپور ٹھوکر ماری۔ اس نے ''اوق'' کی آواز نکالی اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لوٹنے لگا۔ علی کی ٹھوکر اسی مقام پر لگی تھی جہاں کہنی کی ضرب لگی تھی۔ چوٹ پر چوٹ اپنا اثر دکھا گئی۔ وہ مثل ماہی بے آب تڑپنے لگا۔ علی کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اگر وہ ڈھیل دیتا، رحم سے کام لیتا تو وہ اسے مار دیتا۔ اس لیے اس کے سارے حواس یکلخت بیدار ہو گئے اور اس نے اچھل کر لات ماری۔ اگر کوئی فلموں کا شوقین ہوتا تو بے ساختہ کہتا کہ علی اس وقت ''انٹر دا ڈریگون'' کا ''بروس لی'' بنا ہوا ہے۔ وہ ہوا میں اڑ اڑ کر قلابازیاں کھا کھا کر کک مار رہا تھا۔ جمناسٹک کی پریکٹس مددگار بن رہی تھی۔ اس نے لیفٹ کک پوری قوت سے رام پال کے گھٹنے پر دے ماری۔ ضرب اس قدر شدید تھی کہ لوہے کے سریے پر پڑتی تو وہ ٹیڑھا ہو جاتا۔ اس وار سے اس کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ علی نے مار مار کر رام پال کا حقیقت میں کچومر نکال دیا تھا۔ وہ لہولہان ہو کر زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔

علی نے اس کے ہاتھ پیر باندھے اور دوبارہ حوض کے پاس آ گیا۔

حوض میں تیرتی لاش پر نظر پڑتے ہی اس کے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ سلفیورک ایسڈ، سوڈا ایش اور نوشادر کے محلول میں ڈوبی ہوئی راجندر رونشی کی لاش مسخ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ، ہاتھ پیر گلتے، سڑتے جا رہے تھے۔ اس کے جسم سے گوشت گل گل کر الگ ہو رہا تھا۔ ہڈیوں سے ریشہ ریشہ الگ ہو رہا تھا اور آخر میں صرف ہڈیاں ہی رہ گئیں۔ جسم کا سرا گوشت گل کر ختم ہو گیا۔ ہڈیاں صرف ہڈیاں!

علی نے سر جھٹکا اور مڑ گیا۔ بریگیڈیئر رام پال ابھی تک زمین پر بندھا پڑا تھا۔ علی نے اسے بستر بند کی طرح اٹھا کر کندھے پر رکھا اور چل پڑا۔ ایک کے بعد ایک سیڑھیاں طے کر کے باہر آیا پھر قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔

قصبے کی سڑکیں آباد تھیں۔ موٹر گاڑیاں رکشا، تانگا، پیدل چلنے والے سب اپنی اپنی منزل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا، سب اپنے اپنے خیالوں میں مست تھے مگر جیسے ہی علی کے کندھے پر بریگیڈیئر کو دیکھا گیا۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ گاڑیاں راستہ بدلنے لگیں۔ پیدل چلنے والے سڑک چھوڑ کر گلیوں میں مڑ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک ویران ہو گئی۔ یہ بات حد سے زیادہ خطرناک تھی۔ وہ کسی ویران جنگل میں نہیں اتنے بڑے قصبے کی سڑک پر چل رہا تھا۔ بھاگنے والوں سے پولیس کو خبر ہو گئی ہو گی اور وہ اسے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ اس بات کا بھی اسے احساس نہ تھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں بڑھا چلا جا رہا تھا کہ ایک واکس ویگن مائیکرو بس اس کے نزدیک آ کر رکی۔ اس کا دروازہ کھلا اور اسے مع بریگیڈیئر کے اندر کھینچ لیا گیا۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے

میں ہوا اور واکس ویگن آگے کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ علی جھٹکے کی وجہ سے سیٹوں پر گرا تھا مگر فوراً ہی سنبھل گیا تھا اور اس نے گاڑی میں سوار لوگوں کی طرف دیکھا تھا کہ وہ دوست تھا یا دشمن، پہچاننے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اگلی سیٹوں پر سے آواز آئی۔ ''برادر علی! یہ تم نے کیسی بے وقوفی کی۔ پولیس ہوشیار ہو چکی ہے۔''

ویگن ذیلی سڑک پر مڑ گئی تھی اور چھوٹی سڑکوں کے ذریعے نامعلوم منزل کی طرف دوڑ رہی تھی کہ ان کے کانوں میں سائرن کی آواز آئی۔ پولیس کی جیپ سائرن بجاتی ہوئی بڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

''آواز سن رہے ہیں ناں! آپ کی تلاش شروع ہو چکی ہے۔'' اگلی سیٹ سے آواز آئی تھی۔

اب علی کو بھی حالات کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھا تھا کہ ویگن ایک بڑے سے گیٹ پر جا کر رکی۔ ہارن بجتے ہی گیٹ کھل گیا۔ ویگن اندر داخل ہوئی اور ایک گیراج میں جا کر کھڑی ہو گئی۔

''اتر آئیں۔'' اگلی سیٹ والے نے کہا تو علی نیچے آ گیا۔ نیچے آ کر اس نے بولنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ حسن کے ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ انہوں نے بروقت مدد کی تھی۔

''چلیے اندر چل کر باتیں کرتے ہیں آپ کا شکار ہمارے لیے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اسے بہ حفاظت اندر پہنچا دیا جائے گا۔''

علی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اس نے پوچھا۔ ''پروفیسر صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ ہیڈ کوارٹر میں آرام کر رہے ہیں۔'' ان لوگوں نے علی اور پروفیسر کو جس گھر میں ٹھہرایا تھا، اسی کو وہ لوگ ہیڈ کوارٹر کہتے تھے۔

''آپ کو آج ہی یہاں سے نکل جانا ہو گا۔ بریگیڈیئر کی تلاش کے لیے گھر گھر تلاشی ہو گی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ کنٹرول لائن کی کیا پوزیشن ہے؟''

''اگر آپ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو یہ موقع مناسب ہے۔ آج ہی کچھ لوگ جانے والے ہیں۔ آپ دونوں بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔''

''میں نہیں صرف پروفیسر کو پاکستان جانا ہے۔''

''ہم بہ حفاظت پاکستان پہنچا دیں گے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"تو پھر وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جتنی جلدی ہو سکے انہیں یہاں سے نکال دیں۔"

ویگن کا رنگ بدلا جا رہا ہے۔ کیونکہ ویگن کی تلاش شروع ہو گئی ہو گی۔ ماروتی کار منگوائی ہے تاکہ آپ آرام سے کنٹرول لائن پار کر سکیں۔"

ماروتی سوزوکی مہران کی نقل تھی۔ علی اور پروفیسر اس میں سوار ہو گئے۔ پہاڑی راستوں، خوشنما وادیوں سے ہوتے ہوئے وہ سب ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ ماروتی کے ڈرائیور نے انہیں ایک پختہ مکان میں پہنچا کر کہا۔ "یہاں سے آگے لے جانے کی ڈیوٹی علی جان کی ہے۔ وہ آپ کو کنٹرول لائن پار کرائے گا۔"

علی جان نے انہیں خوش آمدید کہا پھر چائے کا پیالہ پیش کرتے ہوئے بولا۔ "صاحب جی ہمیں برادر عزیز نے پیغام دیا ہے کہ بزرگوار کو بہ حفاظت کنٹرول لائن پار کرائی جائے۔ یقیناً آپ اہم شخصیت ہیں۔ ہم آپ سے تعارف تو نہیں پوچھ رہے ہیں۔ مگر یہ ضرور پوچھیں گے کہ آپ سے پھر ملاقات ہو گی؟"

"ضرور ہو گی۔" پروفیسر کی بجائے علی نے کہا۔

پروفیسر ان لوگوں کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ ان کی نظریں ان لوگوں پر جمی ہوئی تھیں جو ایک کونے میں سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ سب کے چہروں پر اداسی کی تہیں تھیں۔ وہ سب بالکل خالی ہاتھ تھے۔ ان میں بچے بھی شامل تھے۔ یقیناً یہ بھارتی سپاہیوں کے ظلم وستم کا شکار تھے جو اب امن کی تلاش میں، عزت و آبرو بچانے کے لیے آزاد کشمیر کی طرف جا رہے تھے۔

آتے وقت انہیں امید نہ تھی کہ وہ اتنے دنوں تک مقبوضہ علاقے میں پھنسے رہ جائیں گے اور اتنا کچھ اپنی نظروں سے دیکھ لیں گے۔ انٹرنیشنل میڈیا کی آنکھیں ان بے چاروں کی طرف سے تو بند ہیں، مسلم پریس بھی صحیح انداز میں یہاں کی تصویر کشی نہیں کر رہا ہے۔

وہ اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آ کر کہا۔ "کتنے لوگ بلتستان کی طرف جائیں گے اور کتنے آزاد کشمیر کی طرف؟ جو بلتستان جانا چاہتے ہیں میرے ساتھ چل دیں اور آزاد کشمیر جانے والے بیٹھے رہیں۔"

☆======☆======☆

"ہیلی کاپٹر کو مارو گولی، ایسا کرو کہ میرے ساتھ اپر نگار چلو۔ ایک دلچسپ کیس دکھاؤں گا۔"

"دلچسپی کے اور کتنے رخ دکھاؤ گے؟ یہاں کا تو ہر لمحہ ہی دلچسپی کا مرقع ہے۔" کیتھی نے ہنس کر کہا۔

"دراصل میں تمہاری ملاقات ایک ایسی عورت سے کراؤں گا جو اپنی مثال آپ ہے۔"

"کیا اس کے سر پر سینگ ہیں؟" کیتھی خوشگوار موڈ میں تھی، ہر بات کو ہنسی میں اڑا رہی تھی۔

"اس کا دعویٰ ہے کہ وہ میری محبوبہ ہے۔"

"پاگل کہاں نہیں ملتے۔ اسے فوراً مینٹل ہاسپٹل پہنچاؤ۔"

"مذاق نہیں، واقعی اس عورت کا یہی دعویٰ ہے۔ وہ اپنے شوہر کے سامنے مجھ سے اظہارِ عشق کر رہی ہے۔"

"کیا واقعی پاگل ہے؟"

"وہ پاگل ہے یا نہیں مگر مجھے پاگل بنانے میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بڑی مشکل سے رہائی ملی ہے۔"

"پھر واپس کیوں جا رہے ہو؟"

"دراصل میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ تم اس کی اسٹڈی کرو۔ اس کے DNA کوڈ کو پڑھو کہ ایسی کیا بات ہے جس کی وجہ سے وہ اس قسم کی حرکت کر رہی ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ اس کے لاشعور میں تم جیسے کسی احمق کی شکل محفوظ ہو اور وہ تمہیں اسی گدھے کا نعم البدل سمجھ رہی ہو؟"

"حقیقت کا پتا لگانا تمہارا کام ہے۔ خلیوں پر ریسرچ تم کر رہی ہو میں نہیں۔ میں ستاروں کی چال، اس کے اثرات وغیرہ پر تو رپورٹ دے سکتا ہوں مگر خلیے کی خرابی پر نہیں کیونکہ سائنس میرا موضوع نہیں ہے۔"

"لیکچر بند کرو۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" کہہ کر وہ اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

گاڑی کے ذریعہ وہ دونوں اپر نگار پہنچے۔ اس نے حسن اور جاوید سے کیتھی کی ملاقات کرائی، پھر وہ اسے لے کر شانو کے کمرے میں پہنچ گیا۔ شانو سے دو چار سوالات کیے پھر اس نے سیفٹی پن نکال کر اپنا سر کھجانا شروع کیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بے خیالی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں ایسا کر رہی ہے پھر اس نے شانو سے باتیں کرتے کرتے ہنس کر اس کے ہاتھ پر سیفٹی پن چبھو دیا۔ وہ سی کر کے پیچھے ہٹ گئی۔

''معاف کرنا بہن بے خیالی میں ایسا ہو گیا۔'' کیتھی شرمندہ لہجے میں بولی اور اٹھ کر باہر آ گئی۔ باہر غلام رسول، حسن میر سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے پاس پہنچ کر کیتھی نے سیفٹی پن دکھا کر کہا۔ ''میں نے اس کا خلیہ لے لیا ہے۔''

''آں لیکن دکھائی کہاں دے رہا ہے۔'' حسن میر بولا۔

''انکل، ایک سوئی کی نوک پر کئی ہزار خلیے آ جاتے ہیں۔ اس کی نوک پر بھی دس بارہ خلیے ضرور آ گئے ہوں گے۔ شام تک رپورٹ بھی لکھ دوں گی۔'' کیتھی نے کہا۔ اور پھر دوسرے کمرے میں چلی گئی جہاں اسے ٹھہرایا گیا تھا۔

☆======☆======☆

غلام رسول دن بھر حسن میر سے دماغ لڑاتا رہا۔ شام میں وہ کیتھی والے کمرے میں داخل ہوا۔

''تمہارے خیال میں یہ کیسا چکر ہے، کچھ سمجھ میں آ رہا ہے؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''اب تو اس کہانی نے بالکل نیا موڑ لے لیا ہے۔ یوسف کی آمد نے بالکل نیا رخ دے دیا ہے۔'' کیتھی نے ٹیبل پر بکھرے کاغذات کو یکجا کر کے کہا۔ ''حویلی پہنچ کر میں ٹشوز ٹیسٹ کرنا چاہتی ہوں کب تک چلو گے۔''

''حسن میر سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ تم خود سوچو کل تک شانو مجھے اپنا محبوب کہہ رہی تھی۔ آج اس شانو کا ایک شوہر پیدا ہو گیا۔ پہلے تو میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کے DNA میں میرے خلیے کے کسی شخص کی یاد محفوظ رہ گئی ہے مگر یوسف کی آمد نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے اس سے پہلے کبھی بلتستان کی شکل نہ دیکھی ہو، امریکہ میں زندگی گزاری ہو۔ وہ ایک دور افتادہ گاؤں کی ایک عورت کے لیے دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ اس کی بیوی ہے۔''

''چلو ایسا کرتے ہیں کہ یوسف سے کراس کوئسچنگ کرتے ہیں۔ شاید کوئی کلیو ہاتھ آ جائے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں ابھی اسے بلاتا ہوں۔ واپسی سے پہلے اس سے دو چار باتیں کر لینا چاہئیں۔'' غلام رسول کمرے سے باہر نکل گیا، لوٹا تو اس کے ساتھ یوسف بھی

تھا۔ اس نے اندر آتے ہی کیتھی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جی فرمائیں؟''

''مسٹر اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات پوچھوں؟'' کیتھی نے نہایت شائستہ لہجے میں کہا۔

''جی فرمائیں۔'' یوسف ہمہ تن گوش بن چکا تھا۔

''آپ امریکہ میں رہتے ہیں ناں؟''

''جی ہاں!''

''آپ کے علم میں یہ بات بھی آ چکی ہو گی کہ میں بھی امریکن ہوں، بائی برتھ امریکن۔''

''جی ہاں۔'' یوسف نے سر ہلا کر کہا۔

''امریکن ہونے کے ناطے میں کھلے دل سے آپ کی مدد کرنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھ سے آپ کو تعاون کرنا ہو گا۔''

''کس قسم کا تعاون؟''

''کھل کر مجھے بتائیں کہ آخر یہ چکر کیا ہے؟''

''سیدھی سی بات ہے، مجھ پر جو گزری وہ میں بتا چکا ہوں۔ اب تمہیں نیا کیا بتاؤں؟''

''نہیں، میں نے پوری بات نہیں سنی ہے۔ تم پھر سے ایک ایک بات کھل کر بتاؤ۔''

''میں ہوسٹن میں رہتا ہوں۔ آٹھ سال پہلے ایک پاکستانی خاندان میں شادی ہوئی۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ میری بیوی کسی اور لڑکے سے محبت کرتی تھی جو پاکستان میں رہتا ہے۔ امریکن معاشرے کا پروُردہ تھا اس لیے میں نے اس چھوٹی سی بات پر توجہ نہیں دی پھر میں اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔ اسی دوران میں ایک حادثہ ہو گیا۔ یہ بات آج سے چھ سال پہلے کی ہے۔ ہماری شادی کی دوسری سالگرہ تھی۔ میں اسے ''بالی'' لے کر آ گیا تھا۔ ایک ہفتے کے لیے میں نے ''بالی بیچ'' پر ایک ہٹ ریزرو کرایا تھا۔ وہ یہاں آنا نہیں چاہتی تھی مگر میری منت سماجت پر آئی تھی۔ ہماری پہلی رات گزر رہی تھی کہ رات کے پچھلے پہر یکا یک دھماکے شروع ہو گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کسی میدانِ جنگ میں آ گئے ہوں۔ عجیب عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو پارٹیاں ٹکرا گئی ہوں اور دونوں ہی کے پاس جدید اسلحے کا اچھا خاصا اسٹاک ہے۔ کیونکہ گولیوں کے علاوہ گولوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شاید دو بڑے جرائم پیشہ گروہ ٹکرا گئے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس علاقے میں مافیا اور سینو جیسے بدنام زمانہ ڈرگ اسمگلرز کے افراد بہ کثرت تھے جن کا ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔ ہم دم سادھے ہٹ میں بیٹھے تھے کہ ایک گولہ آ کر سیدھا ہماری ہٹ پر گرا اور لکڑی کی چھت کو چھیدتا ہوا میری بیوی کے سر پر لگا پھر خود مجھے ہوش نہ رہا۔

ہوش آیا تو میں ہسپتال میں تھا۔ میرا جسم پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ مجھے اطلاع ملی کہ میری بیوی کو دفنایا جا چکا ہے۔ میں اپنی بیوی سے جنون کی حد تک محبت کرتا تھا اس لیے مجھے اس کی موت نے توڑ کر رکھ دیا۔ میں ادھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ کاروبار کے بارے میں بھی فکر کرنا چھوڑ دی تھی۔ اسی دوران میں میری ملاقات لندن تھیوسوفیکل سوسائٹی کی ایک رکن سے ہوگئی۔ آپ کو تو علم ہی ہوگا کہ وہ لوگ روحوں پر ریسرچ کرتے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے اپنی ایک میٹنگ میں بلایا۔ میرے بارے میں خوب غور فکر کیا گیا۔ سب نے اپنے اپنے فن کو آزمایا تب مجھے بتایا کہ تمہاری بیوی کا جسم تو چیتھڑوں میں بدل گیا ہے مگر اس کی روح ابھی تک زندہ ہے۔ وہ اس وقت ایشیا کے ملک پاکستان کے ایک گاؤں کی عورت کے جسم میں ہے کیونکہ اس کی روح اپنے محبوب کی تلاش میں بے کل تھی اور میں اس عورت کی تلاش میں یہاں آ گیا۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ ان لوگوں نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔ تمہاری بیوی یورپ میں مری پھر اس کی روح یہاں اتنی دور کیسے آ گئی؟" کیتھی نے پوچھا۔

"روحوں کو پاسپورٹ، ہوائی جہاز کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ دنیا کے اس کونے سے اُس کونے تک آ جا سکتی ہیں۔ یہی سوال میں نے ان سے کیا تھا تو مسٹر ایڈورڈ بولے تھے کہ تمہاری بیوی کی روح بھٹک رہی تھی۔ بھٹکتے بھٹکتے وہ بلتستان کے اس علاقے میں آ گئی۔ یہ عورت شانو جو اس وقت کنواری تھی، اسے دل کا مرض تھا جس کی خبر خود اسے نہیں تھی۔ اس روز اس نے دال بھری روٹیاں، گوبھی کے سالن سے کھائی تھیں۔ ان دونوں کی وجہ سے زبردست قسم کی گیس پیدا ہونے لگی۔ اس گیس نے اپنا اثر دکھایا اور حرکت قلب بند ہوگئی۔ یہ لیٹے لیٹے مرگئی تھی۔ اسی وقت میری بیوی کی روح ادھر سے گزری، جسم گرم تھا، اسے وہ جسم پسند آ گیا اور اس نے اسے ہتھیا لیا۔"

"ان لوگوں نے کہا اور تم دوڑے چلے آئے، یہ عقل مندی تو نہیں ہوئی۔" کیتھی بولی۔

"میں کوئی بے وقوف نظر آتا ہوں۔ کئی ملکوں میں میرا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ میں

نے ان کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کیا ہے بلکہ اچھی طرح غور و فکر کے بعد یہاں آیا ہوں۔ انہوں نے پلانچٹ کے ذریعہ روح کو بلایا تھا، ان کے بلانے پر وہ آ تو گئی تھی مگر سخت بے چین تھی اور تب اس نے مجبوری بتائی تھی کہ اس نے ایک زندہ جسم پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر وہ زیادہ دیر باہر رہی تو وہ جسم اس کے لیے ناقابل استعمال ہو جائے گا۔ مجبوراً اسے واپس کر دیا گیا لیکن اتنی دیر میں انہوں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ میری بیوی کی روح نے کہاں بسیرا کر رکھا ہے۔ وہ کس کا جسم استعمال کر رہی ہے۔ میرے سوال پر انہوں نے مجھے شانو کا چہرہ دکھا دیا تھا۔"

"کیا وہ لوگ تمہارے ساتھ آئے تھے۔"

"نہیں، انہوں نے لندن کے چائنا ٹاؤن میں جہاں ان کا مرکز ہے، اسی گھر میں ایک چوکور تختے پر مجھے بٹھا کر آنکھیں بند کر لینے کے لیے کہا تھا۔ جب میں نے آنکھیں بند کی تھیں تو مجھے ایک ایک چیز تفصیل سے نظر آئی تھی۔ اسلام آباد کا ایئر پورٹ پھر وہاں سے گلگت کی پرواز پھر وہاں سے سڑک کا سفر، خچروں کا قافلہ، اپرنگار کا یہ گاؤں اور اس گاؤں میں شانو کا گھر۔ سب کچھ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے دیکھا تھا۔ اچھی طرح دیکھنے کے بعد پاکستان ٹورزم سے معلومات حاصل کی تھیں جب علاقے کے بارے میں تمام حقیقت معلوم ہوگئی تب میں یہاں آیا ہوں۔"

"آپ مطمئن ہیں کہ شانو ہی آپ کی بیوی ہے؟"

"شانو نہیں شانو کے اندر موجود روح میری بیوی کی ہے اس لیے میں اسے لینے آیا ہوں۔"

"آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ جرم ہے۔"

"جرم کیسے ہوگیا میں کسی کو ستا نہیں رہا صرف اپنی بیوی مانگ رہا ہوں۔"

"کیا آپ کی بیوی ایسی تھی؟"

"جی نہیں اس کا چہرہ کتابی اور آنکھیں بھوری تھیں دیکھیے۔" کہہ کر اس نے اپنے پرس سے ایک نوجوان لڑکی کی تصویر نکال کر دکھائی۔

غلام رسول نے تصویر دیکھ کر اس آدمی پر نظر ڈالی۔ وہ خلا میں دیکھتا ہوا سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگا رہا تھا۔ اسے اس بدنصیب آدمی پر رحم آ رہا تھا۔

اس شخص نے کش لینا موقوف کر کے کہا۔ "اب اصل بات سنیے۔ مجھے معلوم ہے آپ اس پر یقین نہیں کریں گے لیکن حقیقت بہر حال حقیقت ہے۔ حادثاتی موت کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بعد روحیں برزخ میں نہیں جاتیں۔ کسی دوسرے وجود میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں روحانیت پر یقین رکھنے والے حلقوں میں اس بات پر ریسرچ ہو رہی ہے اور اس اعتقاد کو پھیلایا جا رہا ہے کہ ایک روح کسی جسم سے نکلنے کے بعد دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ لندن کی ایک ایسی ہی تنظیم کی میٹنگ میں مَیں بھی شریک تھا۔ انہوں نے ہی بتایا کہ جس وقت شانو کی روح نے اس کے جسم سے رشتہ توڑا تو میری بیوی کی روح قریب ہی کہیں موجود تھی۔ اس نے شانو کے خالی قالب کو دیکھا تو وہ اس میں داخل ہو گئی۔“

”کہانی دلچسپ ہے، کیا آپ پروفیشنل رائٹر ہیں؟ کسی ٹی وی چینل کے لیے لکھتے ہیں یا کسی پرچے کے لیے؟“ غلام رسول نے ہنس کر کہا۔

”میری بات پر ہنس لیں کیونکہ آپ میری طرح زخم خوردہ نہیں ہیں۔“

”مسٹر زخمی آپ کو میں ایک گھنٹے کا وقت دے رہا ہوں۔ آپ ابر نگار سے نکل جائیں۔“ جاوید نے غصے سے کہا۔

”محترم غصہ حرام ہے۔ یہ گاؤں بھی پاکستان کا حصہ ہے اور میرے پاس پاکستانی شہریت بھی ہے۔ آپ قانونی طور پر مجھے یہاں سے بھگا نہیں سکتے۔“

”کیوں کیا آپ وزیراعظم ہیں؟ سیدھی طرح مان جائیں ورنہ میں دوسرا راستہ بھی جانتا ہوں۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ میں یہاں سے جانے والا نہیں ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ مجھے بھی کمزور نہیں پائیں گے۔“ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ ”آپ عدالت میں مقابلہ کر لیں، میں وہاں بھی اپنی بات کو ثابت کر دوں گا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا۔

”یعنی اس بات کو کہ ایک انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح دوسرے انسان کے جسم میں داخل ہو سکتی ہے۔“ غلام رسول نے طنز سے کہا۔

”ہاں کم سے کم میری بیوی کے معاملے میں تو یہی ہوا ہے۔“

”عدالت کہیں کی بھی ہو، ملکی قوانین اور آئینی ضابطوں پر چلتی ہے۔ وہ روحانی اور غیر مرئی قوتوں کو نہیں مانتی۔ یہاں بھی عدالت ایک مفروضے کو کس طرح تسلیم کرے گی؟“

”جب شانو مجھے اپنا شوہر تسلیم کر لے گی تو عدالت کو میرا دعویٰ تسلیم کرنا ہی ہوگا۔“

”یوسف صاحب! آپ خواہ مخواہ ہم سب کا وقت برباد کر رہے ہیں۔ یہی بات

عدالت کہے گی بلکہ عدالت تو آپ کو سیدھا پاگل خانے بھجوانے کی سفارش کر دے گی۔“

”محترم غلام رسول صاحب! کوئی عدالت ایک کروڑ پتی ہوش مند کو سند یافتہ ڈاکٹروں کے معائنے اور سفارش کے بغیر پاگل قرار نہیں دے سکتی۔ پھر میں ایک ملٹی نیشنل بزنس مین تاجر ہوں، دنیا بھر میں بڑے بڑے بزنس مین میری طرف سے گواہی دیں گے کہ میں ایک کامیاب بزنس مین ہوں۔ میرے لیے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ پھر میں اپنا کیس عالمی عدالت میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ برٹش سٹیزن ہونے کی وجہ سے میں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس تک با آسانی پہنچ سکتا ہوں۔“

”مسٹر یوسف آپ غیر اسلامی خیال پر زور دے رہے ہیں۔ اسلام نے دوسرے تیسرے جنم کی بات نہیں کہی ہے۔ یہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے۔ وہی آواگون پر یقین رکھتے ہیں۔“

”کس نے کہا ہے کہ میں آواگون پر یقین رکھتا ہوں۔ پھر یہ آواگون کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ عقیدہ آواگون کے مطابق جب ایک انسان مرتا ہے تو وہ کسی دوسرے روپ میں کسی دوسری جگہ پیدا ہو جاتا ہے۔ شانو میری بیوی کے مرنے کے بعد پیدا نہیں ہوئی۔ وہ پہلے سے موجود تھی۔ صرف اتنا ہوا کہ شانو کی روح پرواز کر گئی اور اس کی جگہ میری بیوی کی روح نے لے لی۔ انسان کا وجود چونکہ روح کی بنیاد پر ہوتا ہے اس لحاظ سے شانو اب شانو نہیں رہی۔ روبی بن چکی ہے۔“

”آپ کی یہ عجیب و غریب باتیں اس سائنٹفک دور میں کون مانے گا، کس کی عقل قبول کرے گی۔ یہ دور سائنس کا ہے اور سائنس کا مطلب ہے عقل کی توجیہہ۔ خیالوں میں ڈوبے رہنے کا زمانہ گزر گیا۔“

”نہیں جناب یہی وہ وقت ہے جب انسان خود کو پہچاننے لگا ہے۔ انسان جو اپنے آپ میں عجوبہ ہے۔ خود میں ایک جہان ہے اور اس جہان کی حاکم روح ہے۔ روح وہ قوت ہے جس کا ادراک آسان نہیں ہے۔ یورپ اور امریکہ میں سینکڑوں سوسائٹیاں بن چکی ہیں جو روح کی قوت پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ اگر آپ خود کو پہچاننا چاہتے ہیں تو روح میں جھانکیں۔“

”روح کی حقیقت کے بارے میں ہمیں ہمارے مذہب نے بتا دیا ہے اس لیے ہمیں ریسرچ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت ہم آپ پر ریسرچ کر رہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ آپ اپنی حقیقت بتائیں اور اس پورے ڈرامے کا مقصد سمجھائیں۔''

''اسے آپ ڈرامہ کہہ رہے ہیں؟ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ میں سچ بول رہا ہوں۔''

''آپ سچ کے علاوہ سب کچھ بول رہے ہیں۔'' جاوید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''جاوید صاحب! یقین کریں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ شانو آپ کی نہیں میری بیوی ہے۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ جاوید نے ہاتھ گھما دیا۔ چٹاخ کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا۔

☆======☆======☆

دشوار گزار گھاٹیوں، برفیلے میدانوں کو پار کرتے ہوئے واچ ٹاور پر بیٹھے بی ایس ایف والوں کی نظروں سے بچتے ہوئے پورے چھ گھنٹے کا سفر طے کر کے بالآخر وہ اس نام نہاد کنٹرول لائن کو پار کر گئے۔ 1947ء میں انگریزوں کی مکاری اور ہندوؤں کی عیاری نے کشمیروں کے درمیان جو لکیر کھینچی ہے، اسے پار کر کے وہ آزاد علاقے میں پہنچ گئے۔ سبز ہلالی پرچم پر نظر پڑی تو ان کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس سے پہلے انہوں نے اس پرچم کے لیے اپنے دل میں وہ درد محسوس نہیں کیا تھا جو اس وقت کر رہے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کھویا ہوا خزانہ پا لیا ہو۔ زندگی برطانیہ اور امریکہ میں گزاری مگر وطن کی محبت دل میں جڑ پکڑے رہی۔ اسی محبت کی ڈور میں بندھ کر وہ پاکستان آئے تھے۔ یہاں تجربہ گاہ بنا کر تجربے کرنا چاہتے تھے مگر حالات نے انہیں کنٹرول لائن پر ڈھائے جانے والے مظالم دکھا دیے۔ ان حالات میں انہیں جو کرنا چاہیے تھا انہوں نے وہی کیا اور آج واپسی ہوئی تو رو پڑے۔ انہیں آزاد فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے فخر محسوس ہوا۔ اگر قائداعظم اس خطے کو آزاد نہ کراتے تو آج وہ بھی غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ دیگر لوگوں کے ساتھ اس قصبے کی طرف بڑھتے جا رہے تھے جہاں سے انہیں بس میں سوار ہونا تھا۔ انہیں علی یاد آ رہا تھا جو اپنے مشن کی تکمیل کے لیے کوشاں تھا۔ حسن اور احمد یاد آ رہے تھے۔

وہ مسلسل پیدل چل رہے تھے۔ چھ گھنٹے کی دوڑ نے انہیں تھکا دیا تھا مگر وہ خود پر تھکن طاری کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اعصاب سے نبرد آزما تھے کہ کسی بھی طرح وہ خود کو کمزور پڑتا دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

بالآخر بس سٹاپ آ گیا۔ یہاں سے ایک بس کے ذریعے انہیں راولاکوٹ جانا تھا پھر وہاں سے دوسری بس کے ذریعہ وہ ننگار پہنچے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آپ سب یہاں بیٹھیں میں بس کا پتا کرتا ہوں۔" انہیں ساتھ لانے والے نے تمام لوگوں کو مخاطب کیا۔

وہ سب بیٹھے اسی جانب دیکھ رہے تھے جدھر سے وہ گیا تھا۔ اسی وقت مؤذن نے دور سے پکارا۔

اذان کی مسحور کن آواز سنتے ہی پروفیسر عثمان بے چین ہو گئے۔

"آپ کچھ تلاش کر رہے ہیں؟" ان کے ساتھ آنے والے ایک نوجوان نے پوچھا۔

"میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں مگر یہ بھی خدشہ ہے کہ کہیں اس دوران بس نہ آ جائے۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"آپ نماز بھی پڑھتے ہیں؟ مگر میں نے تو سنا ہے کہ آپ سائنسدان ہیں۔ دنیا میں آپ کا بڑا نام ہے۔" نوجوان نے حیرت سے کہا۔

"پہلے میں بھی نماز نہیں پڑھتا تھا مگر اب حقیقت کا ادراک ہو چکا ہے۔ جس نے مجھے عزت وشہرت بخشی، چلنے پھرنے، کام کرنے کی قوت بخشی، سوچنے سمجھنے کے لیے دماغ دیا۔ اس مالک کا بھی تو شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس نے اتنی نعمتیں عطا کرنے کے بعد ایک چھوٹی سی بات کہی اور ہم اسے پورا نہ کریں تو یہ کفرانِ نعمت ہے۔"

"میں تو آپ سے بہت کچھ سیکھنا چاہتا تھا سوچ رہا تھا کہ آپ کے رابطے میں رہوں مگر آپ تو مولویوں کی طرح نیرو مائنڈڈ نکلے۔"

"نیرو مائنڈڈ سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں سمجھ نہیں پایا۔ اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ مولوی نیرو مائنڈڈ ہوتا ہے تو غلط ہے۔ جس کے پاس قرآن کا علم ہوگا، اس کا ذہن بھی قرآن کی طرح وسیع ہوگا کیونکہ قرآن میں ہر وہ علم ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔"

"پروفیسر صاحب! آپ سائنٹسٹ ہو کر یہ بات کہہ رہے ہیں، کیا اس میں ٹی وی اور کمپیوٹر کی بات ہے؟"

"سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ آئن اسٹائن جیسے بڑے سائنسدان نے یہ بات کہی تھی کہ Religion without science & science without religion is blind. یعنی دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ سائنس انسان کے دماغ کو وسعت عطا کرتی ہے۔ اگر تم نے سائنس احکامِ خداوندی کے نظریے کو

ـانے رکھ کر پڑھی تو علم کا سمندر حاصل کر لو گے۔ تم عقل کے اندھوں کی طرح اسلام کو دیکھو۔ قرآن کی روشنی میں سائنس پڑھو۔ وہ علم نہیں بہت کچھ دے گا۔ تمہارے کہنے ـمطلب یہ ہے کہ قرآن میں اتنا علم کیسے سما سکتا ہے، تو میرے دوست Compact Knowledge کا زمانہ اب آیا ہے۔ ہر چیز کو مختصر کر کے استعمال میں لانے کا چلن شروع ہوا ہے جبکہ قرآن اس کا کلام ہے جس نے Compact Knowledge علم دیا۔ واشنگٹن کی Library of Congress دنیا کی سب سے بڑی لائبریری ـکئی کروڑ کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کا عکس تقریباً دو سو ڈسک میں کرایا گیا ہے۔ جس ـاب کا جو صفحہ آپ دیکھنا چاہتے ہیں، کلک کیجیے ایک سیکنڈ میں سامنے آ جائے گا۔ جب ـان کئی کروڑ کتابوں کو چند ڈسک میں منتقل کر سکتا ہے تو وہ خالق کائنات پوری کائنات کا ـالف لام میم کے ایک الف میں نہیں لا سکتا؟ بسم اللہ کے "ب" کا نقطہ علم کا مخزن نہیں ـسکتا۔ انسان کے جسم کو دیکھو نا کمپیوٹر آج بنا ہے۔ انسانی جسم کا DNA بھی تو وہی ـام کرتا ہے۔ رہا ٹی وی، تو میرے دوست! سورہ جاثیہ آیت 29 میں ارشاد رب العزت ـہے "تم جو کچھ دنیا میں کرتے رہے تھے کیے جا رہے تھے ہم سب کا استنساخ کرتے جا ـہے تھے۔" استنساخ کو فوٹو کاپی یعنی جمع شدہ عکس کے معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ یعنی تم ـکچھ یہاں کر رہے ہو، یہ کہیں اور سے بھی دیکھا جا رہا ہے۔ یہ بھی سوچو کیا خدا نے یہ ـنہیں کہا کہ روزِ محشر ہم تمہارا نامہ اعمال تمہاری گردنوں میں ڈال دیں گے۔ یعنی تم جو کچھ ـرتے رہے ہو اس کی ویڈیو کاپی تمہاری گردنوں میں ہوگی جسے دیکھ کر لوگ افسوس ـریں گے کہ کاش ہم ایسا نہ کرتے۔"

پروفیسر کی تقریر ابھی اور لمبی ہوتی کہ بس آ گئی۔ وہ سب اس میں سوار ہو گئے۔ ـیسر کو جو سیٹ ملی تھی اسی سیٹ پر وہ نوجوان بھی آ گیا تھا۔

بس چلی تو پروفیسر نے پوچھا۔ "میاں تم خدا سے اتنے برگشتہ کیوں ہو؟"

"خدا نے میرے ساتھ انصاف کب کیا ہے جو میں اس کا شکر ادا کروں۔" نوجوان ـمنہ بنا کر کہا۔

"بھائی پہلے یہ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی میرا نام علی شیر ہے، آپ شاید کراچی سے آئے ہیں؟"

"نہیں، میں یورپ سے آیا ہوں مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس بلتستان میں ـآدمی کا نام علی ہوتا ہے؟ ابھی تک جتنے بھی لوگ ملے ان کا نام یا تو علی تھا یا حسن اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حسین۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ یہاں پڑھے لکھے لوگ تو ہیں نہیں، جو نام وہ سنتے ہیں وہی نام وہ اپنے بچوں کو دے دیتے ہیں۔ ایک ہی نام کے پچاسوں ملیں گے۔"

"اچھا تو علی میاں، یہ بتاؤ تمہارے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا ناانصافی کی؟"

"یہ بس جس قصبے میں جا کر رکے گی یعنی جہاں سے آپ کو ننکار کی بس ملے گی، میں اسی قصبے میں پیدا ہوا، پلا بڑھا۔ وہاں ہماری پشتینی جاگیر تھی جس پر ہمارے تایا نے قبضہ کر رکھا ہے۔ ابا نے تو نہیں مگر میں نے جب اپنا حق مانگا تو تایا میری جان کا دشمن بن گیا۔ اس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ بھی کرایا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں اس حالت میں میں کیسے اللہ کا شکر ادا کروں جبکہ میرا حق مجھے نہیں مل رہا ہے۔"

"اللہ کے پاس عدل ہے۔ اس سے بڑا عادل کوئی ہے ہی نہیں۔ ظالم اگر ظلم کرتا ہے تو انصاف وہی دلاتا ہے۔ تمہارے تایا کو بھی اس کی سزا ملے گی۔ تمہارا حق واپس مل کر رہے گا۔ ویسے ابھی جا کہاں رہے ہو؟"

"چھ سات مہینے میں ایک بار پاکستان آ کر اپنے ماں باپ سے مل لیتا ہوں۔"

"اللہ تمہیں کامیاب کرے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نہ جانے آغائے کمانڈر علی نے آپ کو سائنسدان کیسے کہا تھا؟ آپ تو مکمل طور پر مولوی لگتے ہیں۔ بات بات پر دعا دینا وغیرہ وغیرہ۔"

"میں نے بتایا ناں کہ کبھی میں بھی تمہاری طرح نعوذ باللہ خدا کا منکر تھا مگر جب غور وفکر کیا تو ادراک ہوا کہ میری سوچ غلط تھی۔ میرا مشورہ ہے تم بھی غور کرو۔ ایک نہ ایک دن تم بھی خدا کی رحمت کے قائل ہو جاؤ گے۔"

"میں تو خدا کی رحمت کا قائل اس وقت ہوں گا جب مجھے میرا حق ملے گا۔" علی شیر نے کہا۔

"بھائی علی شیر! اگر کبھی میری ضرورت پڑے تو بتانا۔ ان دنوں میں ننکار میں رہ رہا ہوں۔"

"اگر ممکن ہو تو آپ مجھے یورپ یا امریکہ بھجوا دیں تاکہ میں زیادہ سے زیادہ روپیہ کما کر خود کو تایا سے لڑنے کے قابل بنا سکوں۔ اس کی طرح پولیس، تھانہ خرید سکوں۔"

"اگر تم امریکہ جانا چاہتے ہو تو میں بھجوا دوں گا۔ وہاں میرے چند احباب ہیں جو تمہاری بھرپور مدد کریں گے۔"

"آپ ایسا کریں کہ آج کی رات ہمارے قصبے میں رک جائیں کل میں آپ کے ساتھ چل دوں گا۔"

"ٹھیک ہے میں ٹھہر جاؤں گا مگر میں تمہارے ہاں نہیں ٹھہروں گا۔ اگر یہاں کوئی ہوٹل ہے تو تم وہاں مجھے کمرہ دلوا دو۔"

"قصبے میں ہوٹل تو نہیں مگر سرائے ضرور ہے۔ آپ وہاں ٹھہر سکتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ یوں بھی مجھے فائیو اسٹار ہوٹل سے بہتر معمولی مسافر خانہ لگتا ہے۔"

باتوں میں راستہ کٹنے کا احساس ہی نہ ہوا اور بس ایک بڑے قصبے میں پہنچ کر رک گئی۔ ایک ایک کر کے مسافر اترنے لگے۔ اترنے والوں میں پروفیسر اور علی شیر بھی تھے۔ علی شیر نے پروفیسر کو سرائے تک پہنچا کر کہا۔ "سر! میں صبح آؤں گا۔"

اس کا وعدہ، وعدہ ہی رہا۔ اگلی صبح جب پروفیسر سرائے سے نکلے تو ان کی ملاقات عادل سے ہو گئی۔ مقبوضہ علاقے میں اس کی بہت دہشت تھی۔ وہ کمانڈر علی کے ان ساتھیوں میں سے تھا جن سے سرینگر میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ پروفیسر کو یہاں دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ ادھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد اس نے کہا "مقبوضہ علاقے میں ہم مسلمانوں کے لیے لڑ رہے ہیں اور یہاں مسلمان ہی مسلمان کی گردن کاٹ رہے ہیں۔"

"خیریت کس نے کس کو مار دیا؟"

"ایک بے چارہ تھا۔ اکثر ہمارے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔ کل اسے کسی نے قتل کر دیا۔"

"کیا نام تھا اس کا؟"

"علی شیر!" عادل نے کہا تو پروفیسر چونک پڑے۔

"کیا وہ کل رات آیا تھا؟" پروفیسر نے عثمان سے پوچھا۔

"ہاں! بے چارہ ماں باپ سے ملنے پہنچا ہی تھا کہ کسی نے اس پر فائرنگ کر دی۔"

"بے چارہ میرے ساتھ آیا تھا۔" پروفیسر نے افسوس ظاہر کیا۔

"سب سے بڑا ظلم تو یہ ہے کہ یہاں کے جاگیردار نے ہوائی چھوڑ دی ہے کہ وہ غدار تھا۔ مقبوضہ علاقے میں مسلمانوں کے خلاف کام کرتا تھا اس لیے اس کے جنازے میں کوئی شریک نہ ہو۔ بوڑھے ماں باپ ہیں۔ جوان بیٹے کی لاش لیے بیٹھے ہیں۔"

"یہ تو بہت بڑا ظلم ہے۔ کچھ بھی ہو وہ ایک مسلمان بچہ ہے۔ چلو ہم اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جنازے میں شریک ہوں گے۔" پروفیسر نے ایک عزم سے کہا۔

"چلیے۔" عادل بولا۔

وہ دونوں اس نوجوان کے گھر پہنچے تو پتا چلا کہ مسجد کے مولوی صاحب نے اکیلے ہی جنازہ پڑھ کر اسے دفن کر دیا ہے۔

پروفیسر لوٹنا چاہتے تھے کہ دو تین شخص گھوڑے پر سوار آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی نہایت ہتک آمیز لہجے میں علی شیر کے بوڑھے باپ کو مخاطب کیا۔ "اے بڈھے! تیرا بیٹا غدار تھا۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ ملک جی کا حکم ہے کہ تم لوگ ان کے علاقوں سے نکل جاؤ گھر خالی کر دو۔"

بوڑھے نے ان کے کہنے پر بیوی سے کہا۔ "چلو ہم کسی اور طرف چلتے ہیں۔"

"مگر ہم کہاں جائیں گے؟" بیوی نے پوچھا۔

"یہ خدا کی زمین بڑی وسیع ہے۔ خدا بننے والے اپنا انجام بھول کر خدا کی زمین کو محدود کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر کر نہیں پاتے۔ چلو ہم کسی ایسی جگہ چلتے ہیں جہاں انصاف کا دور اب تک قائم ہو۔"

پروفیسر اور عادل خاموش کھڑے ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کا دل رو رہا تھا مگر وہ کیا کر سکتے تھے اس لیے ہی خاموش تھے۔

"اچھا بیٹا چلتے ہیں۔" علی شیر کے باپ نواز علی نے کہا۔

"چلیے ہم بھی ساتھ چلتے ہیں۔" کہہ کر انہوں نے نواز کے ہاتھ سے اس کی پوٹلی لے لی۔

"بیٹا تم کہاں تک ساتھ دو گے اور تمہارے یہ چچا بھی کیا ساتھ چلیں گے۔" اس نے پروفیسر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہم لوگ ننگار جا رہے تھے کہ علی شیر کے بارے میں سن کر آ گئے۔ آخر کو وہ میرا دوست تھا ناں؟" عادل بولا۔

"لیکن بیٹا! تم دوستی میں اپنی جان پر کھیل رہے ہو۔ میرا بھائی بڑا ظالم ہے۔ وہ تم لوگوں کا بھی دشمن بن جائے گا۔"

"ہر فرعون را موسیٰ است۔ جب ظلم حد سے بڑھتا ہے، فرعونیت جاگتی ہے تو کوئی نہ کوئی موسیٰ ضرور آتا ہے۔ آپ کے بھائی کو بھی سبق سکھانے کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔" پروفیسر نے کہا۔ دراصل انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ ننگار جانے سے پہلے جاگیردار کو سبق

ضرور سکھائیں گے۔

وہ سب آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ دور جانے کے بعد بڑے میاں بولے۔ "برابر والے گاؤں میں میری بہن ہے۔ ہم اسی کے گھر چلتے ہیں۔ وہ ہمیں ضرور آسرا دے گی۔"

پروفیسر عثمان نے کوئی جواب نہ دیا، وہ ساتھ چلتے رہے۔ ایک کے بعد ایک گاؤں آتے رہے لیکن وہ کہیں بھی رکے نہیں۔ پہاڑیوں، گھاٹیوں، میدانوں کو پار کرتے ہوئے آخر وہ ایک گاؤں میں پہنچے۔ اس گاؤں کے آخری سرے پر ایک بڑی سی حویلی تھی۔ حویلی کی شان بتا رہی تھی کہ مکین جاگیردار ہیں۔ وہ سب اس حویلی کے دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ نواز علی نے باہر کھڑے ایک نوکر سے کہا۔ "اندر جا کر بتاؤ نواز علی آئے ہیں۔"

نوکر اندر چلا گیا۔ وہ سب دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اندر سے ایک شخص مونچھوں کو مروڑتے ہوئے باہر آیا۔ وہ دوہرے بدن کا آدمی تھا۔ اس نے نواز علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے نوازے! تم یہاں کیسے آ گئے، کیا یہ سمجھتے ہو ہم بھائی سے دشمنی مول لیں گے۔ نہیں نہیں۔ تمہارا بیٹا غدار تھا۔ اسے تو سزا مل گئی، اب باقی سزا تمہیں بھگتنا پڑے گی۔ جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہم تمہیں اپنی حویلی میں ٹھہرا کر حویلی کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے۔"

اس کے ہتک آمیز لہجے پر عادل کا دماغ گھوم گیا۔ وہ کوئی سخت جواب دیتا کہ پروفیسر نے اس کے ہاتھ کو دبا دیا۔

اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر ہی پروفیسر نے سمجھ لیا تھا کہ وہ غصے میں بھر اٹھا ہے۔ غصہ عقل کو خبط کرتا ہے اور عقل خبط ہو جائے تو عزت و آبرو اور جان سب کچھ داؤ پر لگ جاتا ہے صحیح چال بھی الٹی پڑنے لگتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے بروقت مداخلت کی تھی۔

"چلیے جناب! ایسا کرتے ہیں یہاں سے سیدھے ننگار چلتے ہیں۔" پروفیسر نے کہا۔

نواز علی تھکے تھکے قدموں سے مڑ گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد بولا۔ "ہم سڑک سے دور آ گئے ہیں کہ بس سٹاپ تک پہنچتے پہنچتے صبح ہو جائے گی۔"

"مجھ سے تو اب چلا بھی نہیں جاتا۔" نواز کی بیوی نے کہا۔ "پیروں نے جواب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دے دیا ہے۔ اب ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہے۔''

''کسی طرح یہ پہاڑی پار کرلو۔ اس کے پار ''شاہدرہ'' ہے۔ وہاں کا جاگیردار بہت رحم دل اور خدا ترس بندہ ہے۔''

''کیا آپ اسے جانتے ہیں؟'' بیوی نے پوچھا۔

''نہیں مگر شہرت ضرور سنی ہے۔'' کہتے ہوئے انہوں نے پہاڑیوں کے پار ایک اونچی عمارت کی طرف دیکھا۔ اب وہ گاؤں بھی نظر آنے لگا تھا۔ بس کچھ فرلانگ کا فاصلہ رہ گیا تھا پھر وہ اس گاؤں میں داخل ہو جاتے۔

''بس تھوڑی سی ہمت اور کرلو۔'' شوہر نے بیوی سے کہا اور بیوی نے قدم تیز کر دیے۔ پروفیسر اور عادل خاموشی سے نواز علی کی تقلید کر رہے تھے۔

اب وہ گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ پھر چھوٹی سی سڑک اور اس کے بعد وسیع میدان سے گزرتے ہوئے وہ سب اس شاندار عمارت تک جا پہنچے۔ عمارت کے سامنے والے رُخ پر ایک بڑا سا پھاٹک تھا جو کھلا ہوا تھا۔ پھاٹک کے اندر ڈیوڑھی تھی جس میں کئی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بہت بڑی ڈیوڑھی تھی اور چارپائیوں کی جگہ نکال کر بھی اتنی جگہ بچتی تھی کہ پورا ٹرک بڑی آسانی سے اندر جا سکتا تھا لیکن چارپائیوں کو اس طرح ڈالا گیا تھا کہ گاڑی کے اندر آنے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ چارپائیوں کو ہٹانے کے بعد ہی اندر جانے کا راستہ مل سکتا تھا۔ وہ چاروں اندر کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔

کچھ آگے بڑھے تو انہیں کئی آدمی بیٹھے نظر آئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ ایک مسلح شخص ڈیوڑھی کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ وہ گیٹ بند تھا۔ انہیں اندر آتے دیکھ کر وہ سب چونک گئے تھے۔ عادل نے ایک اجتماعی سلام کیا۔ ان سب نے ایک ساتھ وعلیکم السلام کہا اور سوالیہ انداز میں دیکھنے لگے پھر ان میں سے ایک نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''کوئی مسافر ہو؟ ٹھہرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں مسافر ہی سمجھ لیں، ایک دو دن ٹھہرنا ہے جگہ مل جائے گی؟''

''ضرور مل جائے گی۔''

''کھانا وانا بھی ملے گا؟'' عادل نے پوچھا۔

''ہاں بھائی مل جائے گا۔ جب رہنے کے لیے جگہ ملے گی تو کھانا بھی ملے گا۔ یہاں تین دن تک کوئی بھی ٹھہر سکتا ہے اور اس کی تمام ضروریات ملک سرفراز چوہان جی کی طرف سے پوری کی جاتی ہیں۔''

''اور اگر کوئی تین دن سے زیادہ ٹھہرے تو؟'' پروفیسر عثمان نے پوچھا۔

''اسے ملک جی سے اجازت لینا ہوتی ہے۔ یہ بڑے ملک جی کا حکم ہے۔''

''یہ بڑے ملک جی کون ہیں؟''

''بڑے ملک جی ملک سرفراز چوہان کے والد ہیں۔ پچاس سال پہلے وہ پنجاب سے یہاں آئے تھے۔ پوری جاگیر انہوں نے خود خریدی ہے۔'' پھر اس نے چونک کر پوچھا۔ ''تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو، اسلحہ وغیرہ تو نہیں ہے؟''

''نہیں جناب آپ تلاشی لے سکتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ شکل ہی سے تم لوگ شریف لگتے ہو پھر ساتھ میں عورت بھی ہے۔ آؤ میں خود تمہیں زنانہ حصے تک چھوڑ آؤں۔'' کہہ کر وہ ان کے ساتھ ہولیا۔ پروفیسر سب کے پیچھے تھے اسی لیے انہوں نے اس شخص کی وہ حرکت دیکھ لی تھی جبکہ وہ شخص انجان بنا ہوا تھا مگر پروفیسر نے سوچ لیا تھا کہ کچھ نہ کچھ اس کا ''علاج'' کرنا ہوگا۔

☆======☆======☆

انہیں سرائے میں ٹھہرے ہوئے دو دن ہو چکے تھے۔ ان کے ہاتھ میں صرف ایک دن تھا اور اسی ایک دن میں انہیں رئیس کا اعتماد حاصل کرنا تھا۔ پروفیسر نے سوچ لیا تھا کہ لوہے سے لوہے کو کاٹنا ہے۔ یہاں کے رئیس کو ملک جی سے ٹکرا دینا ہے۔ سرفراز چوہان بہت زیادہ امن پسند تھے لیکن قوت میں ملک جی سے کئی گناہ زیادہ قوی تھے۔ یہ جب چاہتے ملک جی کو پیس کر رکھ دیتے۔ پروفیسر عثمان سائنسدان تھے مگر انسان بھی تو تھے۔ ہر انسان کے اندر بھی ایک انسان ہوتا ہے جو دوسروں کے دکھ درد میں تڑپ اٹھتا ہے۔ ان دونوں میاں بیوی کی لاچاری پر ان کا دل بھی تڑپ اٹھا تھا۔ اسی لیے تو وہ ان کی مدد پر آمادہ تھے۔

ان لوگوں کو مسافر خانے میں دو کوٹھڑیاں مل گئی تھیں۔ ایک میں وہ دونوں میاں بیوی اور دوسرے میں پروفیسر عثمان اور عادل ٹھہر گئے تھے۔

''پروفیسر صاحب! آپ نے یہ خواہ مخواہ کا سر درد پال لیا ہے؟'' عادل نے کہا۔

''بنگلہ زبان میں ایک کہاوت ہے۔'' شونو بولی شونو مانوش بھائی۔ شوبار اوپرے مانوش شتو تہار اوپرے نائی'' یعنی سنو بول رہا ہوں سنو انسانو۔ سب سے اوپر انسان ہے جس کے اوپر کچھ نہیں۔ تم بے فکر رہو میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔ تم دیکھتے رہو میں کس طرح انتقام لیتا ہوں۔ انسانیت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ میں انسانیت کے ناطے

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان مظلوموں کو ان کا حق دلا کر رہوں گا۔ آخر کو علی شیر جہادی تھا۔ مجاہد کی مدد کرنا ہمارے فریضہ میں شامل ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔

عادل سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''جانتے ہیں علی شیر پر کیا الزام تھا۔ وہ کس وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کر مقبوضہ علاقے میں چلا گیا تھا۔''

''اس کا حق غصب ہوا تھا، اس نے اپنے حق کے لیے آواز اٹھائی تھی۔ اسی لیے اس کے چچا اس کے دشمن ہو گئے تھے۔'' پروفیسر نے کہا۔

''نہیں یہ آدھی خبر ہے، پوری بات میں بتاتا ہوں۔'' کہہ کر وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ جیسے اس دوران باتوں کو یکجا کر رہا ہو پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ ''اس کے چچا وغیرہ نے نہ صرف جائیداد ہتھیا لی بلکہ ایک بار جب علی شیر کے ابا نے بھائیوں سے حق کی بات کی تو بات اتنی بڑھی کہ تو تکار تک پہنچ گئی۔ پھر جانتے ہو کیا ہوا؟''

''کیا ہوا تھا؟''

''اپنے بڑے بھائی کو ملک جی نے نوکر سے پٹوا دیا تھا۔ اس وقت علی شیر میدان میں کھیل رہا تھا۔ جب اسے خبر ملی کہ اس کے ابا پر چاچا کے منشی نے ہاتھ اٹھایا ہے تو وہ دوڑتا ہوا پہنچا مگر اتنی دیر میں معاملہ رفع دفع ہو چکا تھا۔ بے عزتی کا احساس اس نے اپنے بوڑھے باپ کے چہرے پر جھلکتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اس نے اسی وقت اپنے چچا کے ڈیرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ منشی فخر سے اپنا کارنامہ اس کے چچا کو سنا رہا تھا کہ علی شیر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے جاتے ہی منشی کو آواز دی۔ اس سے پہلے کہ منشی کچھ کہتا، چچا نے اپنے دھاڑیلوں سے کہا۔ ''یہ سنپولیا یہاں کیوں نظر آ رہا ہے۔''

''میں تم سے بات کرنے نہیں آیا۔'' علی شیر تلخ لہجے میں بولا۔

''اس سنپولیے کی ایسی خبر لو کہ یہ پھر سر نہ اٹھا سکے۔'' ملک نے اپنے دھاڑیلوں کو حکم دیا۔ حکم کی دیر تھی سب کے سب ایک ساتھ اس پر ٹوٹ پڑے۔ لمحے بھر میں اسے لہولہان کر دیا۔ وہ ہوش سے بے گانہ ہو گیا تو اسے حویلی کے باہر پھنکوا دیا گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ کراہتا ہوا اٹھا اور اپنے گھر جا پہنچا۔ وہاں اس کی ماں اس کے باپ کی مرہم پٹی کر رہی تھی۔ بیٹے کو لہولہان دیکھ کر باپ اپنے زخموں کو بھول گیا اور بیٹے کی تیمارداری میں لگ گیا۔

دو تین دن میں علی شیر صحت یاب ہو گیا۔ زخم مندمل ہوتے ہی وہ منشی کی ٹوہ میں لگ گیا۔ ایک دن اسے موقع مل گیا۔ اس دن وہ درانتی ہاتھ میں لیے ہوئے کھیت سے نکل کر

گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے راستہ بدل لیا تھا کیونکہ اسے اس طرف جانا تھا جہاں ایک گہری کھائی تھی۔ اس کھائی کے کنارے اگناس نامی پودا بکثرت پیدا ہوتا تھا۔ اسے بابا نے آتے وقت وہ پودا لے کر آنے کے لیے کہا تھا۔ اس کی تلاش میں وہ آگے بڑھ رہا تھا کہ اسے کھائی کے نزدیک منشی دکھائی دیا۔ وہ بیٹھا کوئی پودا اکھاڑ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی علی شیر کی رگوں میں لاوا سا ابلنے لگا۔ وہ دبے قدموں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ پھر پتا نہیں وہ کون سا جذبہ تھا، کون سی کیفیت تھی جس کے تحت اس نے وہ اضطراری فعل سرانجام دے دیا۔ بس ذہن میں ایک شعلہ سا لپکا ایک چنگاری سی بھڑکی اور اس نے لپک کر زمین پر بیٹھے ہوئے منشی کے پیچھے جا کر اس کی گردن میں درانتی پھنسا دی اور زور سے اس طرح جھٹکا دیا کہ پتلے درخت کے تنے کو کاٹتے ہیں۔

ایک دلدوز چیخ فضا میں ابھری۔ یہ چیخ اس قدر بھیانک تھی کہ آس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی گھبرا کر فضاء میں اڑنے لگے اور شور مچانے لگے۔

منشی چت حالت میں زمین پر گر گیا اور اس کی گردن سے خون کا فوارہ ابلنے لگا۔ گردن کا کافی بڑا حصہ تیز دھار اور دندانوں والی درانتی نے کاٹ دیا تھا۔ منشی تڑپ رہا تھا۔ اپنے ہی خون میں لوٹ رہا تھا۔

علی شیر وہاں رکا نہیں بھاگتا ہی چلا گیا۔ اس نے درانتی وہیں کھائی میں پھینک دی تھی۔

اگلے دن گاؤں میں ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔ وہ جاگیردار کا خاص کارندہ تھا اور گاؤں میں یا گاؤں کے باہر کسی کی مجال نہ تھی جو ان کی طرف ٹیڑھی نظروں سے بھی دیکھ سکے۔ اس کے نام سے لوگ کانپتے تھے۔ ایسے رعب داب والے شخص کا قتل کس نے کیا۔ یہ ایک معمہ بن گیا تھا کیونکہ گھر آتے ہی علی شیر نے اپنے داہنے پیر پر ہلدی چونے کا لیپ لگا لیا تھا اور ہر ملنے والے سے وہ یہی بتا رہا تھا کہ رات کو وہ آنگن میں پھسل کر گر پڑا تھا جس کی وجہ سے پیر میں سخت تکلیف ہے۔ پیر کی تکلیف کی خبر رئیس تک پہنچی تو وہ بہت حد تک نرم پڑ گیا۔ ابتدا میں اسے قاتل ہونے کا شبہ علی شیر پر ہوا تھا مگر پیر کی چوٹ کا سن کر اسے خیال بدلنا پڑا۔

منشی کے قتل کے ایک ہفتہ بعد وہ گاؤں سے نکل آیا۔ شہر جانے کے لیے جس بس میں سوار ہوا تھا اسی بس میں اس کے برابر میں بیٹھا شخص ایک ایسا مجاہد تھا جو مقبوضہ کشمیر کے محاذ پر برسرپیکار تھا۔ پتا نہیں کس جذبے کے تحت اس نے علی شیر سے اس کے چہرے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر چھائی پریشانی کا سبب پوچھا۔ علی شیر پہلے ہی نروس تھا، پھر وہ اس مجاہد کی شخصیت سے نادانستگی میں متاثر بھی تھا اس لیے وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔ ایک ایک بات بتا دی۔

سب کچھ سننے کے بعد اس مجاہد نے کہا، اگر مناسب سمجھو تو اپنے انتقام کے جذبے کو ختم کر دو۔ کسی مسلمان کو نقصان پہنچانا گناہ ہے، اگر کوئی تمہارے ساتھ برا کرتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں سونپ کر خاموش ہو جاؤ۔ وہ اگر چاہے گا تو تمہیں موقع ضرور دے گا۔ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔''

''اچھا! تو ہم کیا کریں؟''

''اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک طریقہ جہاد بھی ہے۔ تم جہاد میں شمولیت حاصل کرلو۔''

''مگر میں تو لڑنے کا طریقہ بھی نہیں جانتا۔ جہاد کیسے کروں گا۔''

''جو لوگ پہلے سے کفار کو للکار رہے ہیں وہ تمہاری مدد کریں گے۔ تم ہاں تو کرو۔''

اور اس طرح علی شیر اپنے انتقام کو بھول کر مجاہدین کا ساتھی بن گیا۔ اس دوران میں وہ کئی بار گھر آیا مگر اس کی ذہنی حالت اب وہ نہ تھی کہ وہ ذاتی دشمنی نبھانے بیٹھ جاتا۔ اس کی خاموشی کو رئیس نے اس کی کمزوری سمجھا اور وہ اسے زک پہنچانے کے لیے تاک میں رہا، اس بار جیسے ہی اسے موقع ملا اس نے وار کر دیا۔ غدار کہہ کر اپنا انتقام لے لیا۔''

''اور اب انتقام کی اگلی قسط ہم وصول کریں گے۔ علی شیر کا انتقام لیں گے اور اس کے باپ کو اس کا حق دلائیں گے۔'' پروفیسر عثمان نے کہا۔

''مگر کیسے؟''

''بس تم دیکھتے رہو۔ یہاں کے ملک کو اپنے ساتھ شامل کرنا ہے پھر انتقام کا راستہ کھلتا چلا جائے گا۔'' کہہ کر پروفیسر نے کروٹ بدل لی۔

اگلے روز انہوں نے ملک سرفراز چوہان سے ملاقات کی۔ کچھ پروفیسر کی شخصیت کا اثر، کچھ ان کی فریاد کا انداز ملک سرفراز نے ان کی باتوں پر یقین کرلیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میرے ساتھ جو ضعیف شخص ہے اس کا اکلوتا بیٹا اس کی زندگی کا سہارا قصبہ کے ملک کی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اسے ناحق قتل کر دیا گیا۔''

''اب تم کیا چاہتے ہو؟'' ملک سرفراز چوہان نے پوچھا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ اسے حق دلا دیں مگر مجبور ہیں۔ آپ کے پاس وسائل ہیں آپ مدد کریں۔''

''مگر میں تمہاری مدد کیوں کروں؟'' چوہان نے کہا۔

''دیکھیے! جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ آپ مظلوموں کی مدد کرتے ہیں۔ اپنے علاقے میں ظلم کو پنپنے نہیں دیتے۔ ایک ضعیف ماں آپ سے فریاد کرنے آئی ہے۔ ایک ضعیف باپ اپنے جوان بیٹے کی موت کا بدلہ چاہتا ہے۔ اس کے پاس اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ ان ظالموں سے حساب لے سکے۔ اسی لیے وہ آپ کے پاس مدد کے لیے آیا ہے۔ بولیے! جواب دیجیے کیا آپ اس کی مدد کے لیے کچھ نہیں کریں گے؟''

''میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کچھ آدمیوں کو کر دیتا ہوں لیکن یاد رکھو اس میں میرا نام نہیں آنا چاہیے۔'' ملک چوہان نے کہا۔

''میں کسی بھی حالت میں بھی آپ کا نام آنے نہیں دوں گا۔'' پروفیسر نے کہا۔

اگلے ہی دن ملک چوہان نے اپنے کچھ آدمی ساتھ کر دیے۔ پروفیسر اور عادل انہیں ساتھ لے کر قصبہ کی جانب چل پڑے۔ ان کے ساتھ علی شیر کے والد بھی تھے۔ وہ سب دھیرے دھیرے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ابھی قصبہ کی آبادی شروع نہیں ہوئی تھی کہ علی شیر کے والد نے انہیں رکنے کے لیے کہا۔

''خیریت جناب!'' عادل نے پوچھا۔

''ہاں خیریت ہی ہے۔ وہ دیکھو ادھر!'' علی شیر کے والد نے اشارے سے بتایا۔

عادل اور پروفیسر نے ایک ساتھ ادھر دیکھا۔ دو آدمی کھیتوں کے درمیان چل رہے تھے۔ ''یہ دونوں میرے بھائی کے خاص آدمی ہیں۔ میرے بیٹے کے قتل میں ان کا پورا پورا ہاتھ ہے۔ انہوں نے ہی اسے غدار مشہور کیا تھا۔ مجھے شبہ نہیں یقین ہے کہ اس دن میرے بیٹے پر انہی دونوں نے گولیاں چلائی تھیں۔''

تمام لوگ سینے کے بل لیٹ گئے اور سانپ کی طرح رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اب کھیت کی منڈیر بالکل قریب آ چکی تھی۔ منڈیر کے پار دوسری جانب سے آنے والے وہ دونوں بھی منڈیر کے قریب آ چکے تھے۔ تبھی عادل جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ ٹھٹکنے کی ایک بڑی وجہ عادل کے ہاتھ میں تھا۔ کلاشنکوف کی اٹھی ہوئی نال دیکھ کر وہ چونکے تھے۔

''کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟'' آگے والے نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ وہ خوفزدہ لگ رہا تھا۔

''مجھے نہیں پہچانو گے سُور کہیں گے۔'' عادل نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں تمہاری

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موت ہوں۔"

"مگر دشمنی کی وجہ بھی تو ہوگی۔ آج سے پہلے تو تم کبھی نظر نہیں آئے؟"

"میں زندگی میں پہلی بار ادھر آیا ہوں، صرف انتقام لینے۔" عادل نے کہا۔

"انتقام! مگر کس کا انتقام؟"

"تمہیں علی شیر یاد ہے، وہی علی شیر جسے تم نے غدار مشہور کیا تھا۔ جسے بیلچے سے مار کر جوانی میں ہی ختم کر دیا تھا۔" عادل نے چیخ کر کہا۔

"نہیں بیلچے سے تو نہیں اسے کلاشنکوف سے مارا تھا۔" وہ گھبرا کر بولا۔ نفسیاتی طور پر وہ اتنا ڈسٹرب ہو چکا تھا کہ اس نے خود ہی قتل کا اقرار کر لیا۔

"بس میں یہی سننا چاہتا تھا۔ میں اسی علی شیر کا کزن ہوں۔ اب تم دونوں کو کتے کی موت ماروں گا......"

وہ دونوں حد سے زیادہ سراسیمہ ہو گئے تھے اور بھاگنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن بھاگ نہ سکے۔ ان کے پیچھے بھی کلاشنکوف بردار کھڑے تھے۔

"جانے دو بھائی! ہمیں جانے دو۔" دوسرے نے ہاتھ جوڑ کر رو دینے والے لہجے میں کہا۔ "جو ہو گیا اسے بھول جاؤ۔ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے۔ پھر ہمیں کچھ ہو گیا تو تم بھی بچ نہ پاؤ گے۔ پکڑے جاؤ گے۔"

"تم نے علی شیر جیسے معصوم بندے کو مار دیا تم پکڑے گئے؟" عادل نے اسے نفرت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم میں سے کوئی بھی پکڑا گیا؟ تمہارا وہ باپ، تمہارا ملک پکڑا گیا؟ تم پکڑے گئے؟ تمہارا یہ ساتھی پکڑا گیا؟ جب تم لوگ ایک معصوم نوجوان کو قتل کر کے پکڑے نہیں گئے تو میں کیسے پکڑا جاؤں گا؟"

ان دونوں میں سے ایک باضابطہ رونے لگا اور ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ "ہمیں معاف کر دو ہم تمہیں دعائیں دیں گے۔ نقد رقم بھی دیں گے۔ ہمیں جانے دو۔"

"تمہارے پاس بہت روپیہ پیسہ ہے ناں؟ اسی روپے کے لیے ہی تم نے ملک کا کہا مانا تھا، اپنے روپوں سے تم اپنی زندگی خرید لینا۔" اس کے ساتھ اس نے کلاشنکوف کا ٹریگر دبا دیا۔ دھماکہ ہوا اور ایک کا بھیجہ اڑ گیا۔ دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی تھی کہ پروفیسر کے ساتھ آئے ہوئے ایک شخص نے گولی داغ دی۔ گولی اس کی پشت کو چھید کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئی تھی۔ خون کا فوارہ سا اچھلا تھا اور وہ گر کر تڑپنے لگا تھا۔

ان دونوں سے حساب بے باق کر کے وہ آگے بڑھے۔ اب قصبہ کی آبادی نزدیک

آ چکی تھی۔ گولیوں کی آواز سن کر بہت سے لوگ گھروں سے نکل آئے تھے۔ پروفیسر اور ان کے ساتھی کلاشنکوف بلند کیے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں اس عالم میں نزدیک آتے دیکھ کر آبادی کے کنارے کھڑے لوگ کھسکنے لگے۔

وہ لوگ شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے گاؤں میں داخل ہو گئے تھے۔ انہیں روکنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ تھوڑی سی مدافعت ہوئی بھی تو ملک کی حویلی پر ہوئی لیکن طوفان پر بھی کبھی کوئی روک لگا سکا ہے؟ وہ بے دھڑک حویلی میں داخل ہو گئے تھے۔ ملک کے وہ جاں نثار جو اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرنے کا دعویٰ کرتے تھے وہ بھی بھاگ اٹھے تھے۔

ان لوگوں نے اندر داخل ہوتے ہی باہر جانے کے تمام راستے بند کر دیے تھے اور پھر حویلی کے مسلح افراد کو غیر مسلح کرنا شروع کر دیا جس نے بھی مزاحمت کی اسے فوراً ہی گولی مار دی گئی۔ کئی لاشیں گر گئیں۔ خوفزدہ محافظوں نے مقابلے کی کوشش ترک کر دی اور ہتھیار ڈالنے لگے۔ ان لوگوں نے تمام ہتھیار سمیٹ لیے اور حویلی میں موجود سارے مردوں کو اکٹھا کر کے ایک کمرے میں بند کر دیا۔

ان لوگوں کا ہر کام پہلے سے طے شدہ تھا، منصوبے کے مطابق تھا۔ بالکل ٹھیک انداز میں ہو رہا تھا۔ انہیں کہیں بھی کوئی بڑی مشکل درپیش نہ آئی۔

تین مردوں کو باقی سارے مردوں سے الگ کر کے ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ اس کمرے میں ان تین مردوں کے علاوہ صرف عادل، پروفیسر اور علی شیر کے والد تھے۔ ایک شخص دروازے پر کلاشنکوف لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"کیوں میرے بھائی مجھے پہچانا؟ میں وہی ہوں جسے تُو نے اس گاؤں سے نکال باہر کیا تھا۔ میرے مجاہد بیٹے کو غدار کہہ کر مروا دیا تھا۔" علی شیر کے والد نے گرج کر کہا۔

"بھائی...... بھائی جان...... رحم کریں...... گزری باتوں کو بھلا دیں۔" مجھلے بھائی نے گڑگڑا کر کہا۔ "گڑے مُردے اکھیڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ...... آپ کو جتنی مربع زمین، جتنی رقم چاہیے ہم دیں گے۔"

"کیا میں اس زمین پر اپنے جوان بیٹے کی فصل لگاؤں گا؟ یا رقم سے گبھرو جوان بیٹا خرید لوں گا؟ میں یہاں زمین کا حساب لینے نہیں آیا۔ میں آیا ہوں اپنے بیٹے کے خون کا حساب لینے تم دونوں کو حساب دینا ہوگا۔"

"خدا کے لیے رحم کرو۔ ہماری جان بخش دو۔" چھوٹے بھائی نے منت کی۔

"تُو نے میرے بیٹے کی جان بخشی تھی۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔ "اس کا تو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صرف اتنا قصور تھا کہ اس نے اپنا حق مانگنے کی غلطی کی تھی۔ تُو نے اس کے بدلے میں اس کی جان لے لی تھی۔ اس وقت میرے پاس طاقت نہیں تھی۔ میں کمزور تھا۔ اب میں کمزور نہیں ہوں اب میں تم سے پورا پورا حساب چکاؤں گا۔ تمہارے سامنے تمہارے ان دونوں بیٹوں کو گولی ماروں گا تاکہ تمہیں بھی احساس ہو کہ بیٹے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ مجھلے بھائی نے گھبرا کر کہا۔ ”میرے بیٹوں کو کچھ نہ کہنا۔ مجھے گولی مار دو لیکن میرے بیٹوں کو کچھ نہ کہنا......“

اس کی بات ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ علی شیر کے باپ کی کلاشنکوف گرجی۔ گولیاں برسیں مگر اس کے دونوں بیٹوں کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ وہ دونوں خوف سے زمین پر گر گئے تھے اور اب سوکھے پتے کی طرح کانپ رہے تھے۔

”اوہ...... اوہ ظالم......تُو بھائی ہے یا قسائی یہ تُو کیا کر رہا ہے۔ مجھ کو مار دے مگر میرے بیٹوں کو چھوڑ دے۔ وہ بے قصور ہیں۔ تیرا مجرم میں ہوں۔ انہوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔“ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

”تجھے یوں بچوں کی طرح روتے دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے میں بتا نہیں سکتا۔ تُو بھی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ مجھے وہ وقت یاد آ رہا ہے جب میں بڑا بھائی ہو کر بھی تیرے سامنے رو رہا تھا۔ گڑگڑا رہا تھا اور تُو......تُو مجھے دھتکار رہا تھا۔“

”وہ ہماری غلطی تھی بھیا!“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”تُو کس کس غلطی کی معافی مانگے گا۔ اس روز میں رو رو کر التجا کر رہا تھا کہ میرے بیٹے کو مت مارو۔ روک لو اپنے آدمیوں کو لیکن تُو نے مجھے انسان ہی کب سمجھا تھا اور اب دیکھ لے قدرت نے تجھے کیسے دن دکھائے ہیں۔“

”ہاں یہی ہمارا انجام ہونا تھا۔ باپ جیسے بھائی کو ہم نے دکھ دیے، بھتیجے کا خون کیا تو ہمارا انجام یہی ہونا تھا۔ مار دو ہمیں ہمارا سینہ چھلنی کر دو۔“ دونوں بھائی ایک آواز میں رو رہے تھے۔ چیخ رہے تھے پاگلوں کی طرح اپنے ہی بال نوچ رہے تھے۔ شاید ان پر حد سے زیادہ دہشت طاری ہو گئی تھی۔

”قصہ ختم کریں۔“ عادل بولا۔ ”زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔“ اس نے سیفٹی کیچ ہٹا کر پستول بلند کر لیا تھا۔

☆======☆======☆

”دیکھیے جناب! میں کوئی سڑک چھاپ مجنوں نہیں ہوں اور نہ آپ کی بیوی ایسا

حسینہ عالم ہے کہ میں اپنا اتنا بڑا کاروبار چھوڑ کر اس دور افتادہ علاقے میں آ جاؤں۔ دماغ پر زور ڈالیں۔ سوچیں میں اتنی دور سے آ کر ایسا دعویٰ کیوں کر رہا ہوں کہ یہ میری بیوی ہے۔“ اپنے گال پر پڑنے والے طمانچے کو نظر انداز کر کے یوسف بولا۔

کیتھی نے حالات کی نزاکت بھانپ لی تھی۔ اس نے جاوید کو سمجھانے کے لیے کہا۔ ”بھائی میرے! میں ٹھہری سائنس کی طالبہ اس لیے سائنس کے مطابق سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ شاید تم میری بات کو سمجھ سکو۔ دیکھو! یہ انسانی جسم کیا ہے؟ یہ ایک شہکار (Marvel) ہے۔ وہ یوں کہ ہر انسانی جسم کی ابتدا صرف ایک خلیہ (Cell) سے ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ نشو و نما پا کر ایک جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے جو ستر ٹریلین خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے اور حیران کر دینے والے طبعی (فزیکل) اور ذہنی (مینٹل) افعال یا کارکردگی کی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس راز کو سمجھنے کے لیے جسم انسانی کی تشریح دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کو متعدد نظام جسمانی کا مرکب بنایا ہے جو انتہائی پیچیدہ (Complex) ہے 17 نظاموں پر مشتمل ہے یہ جسم۔ ڈھانچہ (Skeleton)، عضلہ (Muscles)، دل اور دوران خون اور لمف، پھیپھڑے اور تنفس، غذا اور ہاضمہ، بول و براز کا نظام تحول (Metabolism) عصبی نظام (Nervous System) دماغ، چشم، کان، مشام اور مزہ، جلد، دروں افرازی (Endocrine) صنف اور تولید، حمل اور بچے کی پیدائش۔

یہ سترہ نظام ہائے جسم ایک دوسرے سے بالواسطہ منسلک ہیں۔ جسم کا ہر نظام تفاعلی تخصیص (Functional Specification) رکھتا ہے۔ اس عجوبے یعنی جسم انسانی میں جینیات کا رول بہت اہم ہے۔ انسانی جینیات ہمیں بہتر طور پر وراثتی خصوصیات کی میکانیت (میکانزم) کی سمجھ بوجھ دیتی ہے۔ پُر امید والدین جن کے خاندانی پس منظر میں کوئی جینیاتی بے ترتیبی یا بدترتیبی ہوتی ہے اس کا اثر اولاد پر پڑنا ضروری ہے۔“

”اور ہاں!“ غلام رسول نے کہا۔ ”انسانی نظام جسمانی دراصل درس احکام خدا بھی ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے افعال پر نظر ڈالیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ہر کام ایک اصول کے تحت ہو رہا ہے۔ اللہ نے جو صراط یعنی راستہ مقرر کر دیا ہے وہ اسی پر چل رہے ہیں حالانکہ ہر خلیہ میں بہت ساری قوت ہوتی ہے مگر وہ صرف اسی قوت کو استعمال کرتے ہیں جس کا حکم ہے۔ یہ تو ہم انسان ہیں جن کا وتیرہ ہی بدعہدی ہے۔ زبان سے کہتے ہیں۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین“ مگر مدد مانگتے ہیں اپنے افسر سے، منسٹر سے کسی دولت مند یا

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قوت والے سے۔ زبان سے اقرار کرتے ہیں۔ ''اہدنا الصراط المستقیم'' اور بھاگتے ہیں گناہوں کی طرف۔ نتیجتاً مغضوب ٹھہرتے ہیں۔ سزا کے حقدار بنتے ہیں۔ خلیے بھی کبھی کبھی ''صراط مستقیم'' سے بھٹکتے ہیں اور جیسے ہی وہ بھٹکتے ہیں، سائنس کے مطابق ان کی شکل مسخ ہو جاتی ہے اور وہ مغضوب ٹھہرتے ہیں۔ غضب کا شکار ہو جاتے ہیں (Anti bodies cell) انہیں کھا جاتے ہیں۔ وہ فنا ہو جاتے ہیں۔''

غلام رسول کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کیتھی بولی۔ ''آپ کی بیوی کا خاندانی پس منظر دیکھیں۔ اس کے DNA میں کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور ہے۔''

''چلیے! آپ کی بات کو مان لیتے ہیں مگر یہ بات کہاں ثابت ہے کہ ان کی بیوی کی روح اس میں داخل ہوگئی ہے۔'' یوسف نے کہا۔

''اس پر بھی غور کرنا ہوگا لیکن دماغ ٹھنڈا رکھ کر کریں۔ گرم دماغ سے مسئلہ حل نہیں ہوتا مزید الجھ جاتا ہے۔ کچھ وقت دیں۔ غلام رسول صاحب اور میں اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یقیناً ایک نہ ایک راستہ نکل ہی آئے گا۔''

''سارے مسئلے اپنی جگہ مگر یہ صاحب میری حمیت کو کیوں للکار رہے ہیں۔ میری بیوی کو اپنی بیوی کیوں کہہ رہے ہیں۔'' جاوید بولا۔

''ہر بات کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے۔ میں روح وغیرہ پر یقین نہیں کرتی پھر بھی مجھے لگ رہا ہے کہ یوسف صاحب سچ بول رہے ہیں۔'' کیتھی نے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ جب روح وغیرہ پر آپ کو یقین نہیں تو پھر کیسے کہہ سکتی ہیں کہ یہ سچ بول رہے ہیں؟''

''بھئی سیدھی سی بات ہے یہ عالمی پیمانے کے بزنس مین ہیں۔ زر، زن، زمین ان کے لیے مسئلہ نہیں ہے پھر یہ ایک عام سی عورت کے لیے اتنی بڑی بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ ان کے پاس دولت ہے اور یہ دولت سے ملکہ حسن کو بھی خرید سکتے ہیں پھر اتنی دور کیوں آئے۔ اس لیے جوش و جذبات کی بجائے ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خلیہ جو آپ کی بیوی میں کام کر رہا ہے ایسا ہی کوئی خلیہ جس کے DNA پر ویسا ہی کچھ لکھا ہوا ہو جس کی وجہ سے یہ مسئلہ الجھا ہے۔'' کیتھی نے کہا اور سانس لینے کے لیے رکی پھر بولی۔ ''اور ہاں یہ بات یاد رکھیں سائنس میں صرف عقلی دلائل کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں وہ عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد۔ سنی سنائی باتوں پر مجھے ذرا بھی یقین نہیں آتا۔''

''میں آپ کی باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ بس ایک التجا ہے کہ یہ صاحب میری ی کو بار بار اپنی بیوی نہ کہیں۔'' جاوید بولا۔

''صحیح ہے، اب یہ ایسا نہیں کہیں گے۔'' کہہ کر کیتھی نے غلام رسول کو اشارہ کیا۔ وہ ونوں اٹھ کر باہر آ گئے۔ دونوں ٹہلنے کے انداز میں انگور کے باغیچے میں چل رہے تھے اتھ ہی ساتھ ان کے درمیان بحث بھی جاری تھی۔ کیتھی کا کہنا تھا کہ لڑکی اور وہ شخص کے DN مشترک ہیں جبکہ غلام رسول کا فیصلہ تھا کہ یہ دونوں ہی نہیں پورا گھرانہ جھوٹا ہے ر کسی قسم کی سازش ہو رہی ہے اور اس سازش کے تانے بانے یقیناً ہمارے گرد بُنے جا ہے ہیں اور اس کی حقیقت کیا ہے یہ بتانا مشکل ہے۔

''تو تمہارا خیال ہے کہ یہ لوگ دراصل ہمیں گھیرنے کے لیے ڈراما کر رہے ہیں؟'' یتھی بولی۔

''جی ہاں! مجھے صد فیصد یقین ہے کہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ وہ لوگ دراصل ہمیں بے وف بنا رہے ہیں۔''

☆======☆======☆

علی شیر کے والد نے کلاشنکوف جھکا لی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''عادل! جوش سے کام لو۔'' پھر بھائی سے بولا۔ ''زندگی دینا اور لینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جا میں نے تجھے بخش دیا۔ اگر چاہتا تو ابھی تجھے خاک و خون میں لوٹنے پر مجبور کر دیتا لیکن میں تیری رح کمین فطرت کا نہیں ہوں۔ جا رہا ہوں۔'' کہہ کر وہ مڑا تھا کہ چھوٹا بھائی آگے آ گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''ہمیں معاف کر دو۔ ہم آپ کا حق مارنا چاہتے تھے مگر آپ نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ بھابی کو واپس لے آیئے۔''

''تمہاری بھابی تم لوگوں سے اتنی خوش ہے کہ اب شاید ہی کبھی وہ یہاں آئے۔'' کہہ کر وہ مڑ گیا۔ اس کے ساتھ عادل اور پروفیسر بھی باہر آ گئے۔ گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ وہ سب گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' عادل نے پروفیسر سے کہا۔

''میں تو ننگر جاؤں گا۔ انہیں ان کا حق دلوانے کے لیے رک گیا تھا۔ اب یہاں ٹھہرنا بے کار ہے۔'' پروفیسر بولے۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ رات زیادہ ہوئی نہیں ہے۔ گھوڑے ہمارے پاس ہیں تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیوں نہ ہم یہیں سے ننگار کے لیے نکل لیں۔“

”اور علی شیر کے والد؟“

”ملک چوہان کے آدمی ساتھ ہیں انہی کے ساتھ وہ لوٹ جائیں گے۔“

”تو چلو اجازت لے لیتے ہیں۔“ کہہ کر پروفیسر عثمان مڑے۔

”ہم نے آپ کی باتیں سن لی ہیں اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو جا سکتے ہیں۔“ علی شیر کے والد نے کہا۔

”شکریہ!“ پروفیسر نے گھوڑے کا رخ موڑا۔

”شکریہ تو مجھے آپ لوگوں کا ادا کرنا چاہیے۔ آپ دونوں نے مجھے جوانی یاد دلا دی ورنہ میں تو خود کو لبِ گور سمجھ رہا تھا۔ کبھی اتنی ہمت نہیں کر سکتا تھا کہ اپنے ظالم بھائیوں سے ٹکرا جاتا۔ یہ تو آپ دونوں کا کرم تھا کہ مجھے حوصلہ ملا۔“

دونوں نے گھوڑوں کو ایڑ دی اور ننگار جانے والے راستے کی طرف بڑھ گئے۔ کافی دور آنے کے بعد پروفیسر نے مڑ کر دیکھا۔ قصبہ بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔

وہ دونوں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ پُراسرار ہواؤں کی سرسراہٹیں بدروحوں کی مانند گردش کر رہی تھیں۔ ہر سمت سے ہوا کے قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی۔ جگہ جگہ چیڑ کے ننگے درخت لنگوٹی باندھے سادھوؤں کی طرح کھڑے ماحول کو گھور رہے تھے۔ جگہ جگہ سفید دھبے سے ابھرے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے بہت سے لوگ سفید چادر اوڑھے سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ وہ اس حسین ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک انہیں کچھ متحرک دھبے نظر آئے جو نگاہ کی حد کے آخری سرے پر تھے۔ پھر بھیڑیوں کے غرانے کے شور سے فضا گونج اٹھی لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں کچھ انسانی چیخوں کی آواز سنائی دی تھی جو صاف طور پر واضح تھی۔ ایسے موقعوں پر سوچ سے زیادہ اعصاب کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔ ان کے اندر ایک وحشت سی ابھری اور پھر وہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے ادھر بڑھے۔

اندھیرے میں بغیر سمجھے بوجھے آگے بڑھنا خطرناک ہوتا ہے۔ اندھا کہیں بھی ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ اندھیرے میں ہر انسان اندھا بن جاتا ہے۔ وہ بھی اندھے بن گئے تھے۔ تبھی تو انہیں پیڑوں پر بیٹھے ٹیپ ریکارڈ بجانے والے وہ لوگ نظر نہیں آئے تھے۔ یکایک ہی ان پر پھندا آ گرا تھا اور وہ دونوں رسیوں میں جکڑ گئے تھے۔ پھندا اتنا مضبوط تھا کہ وہ ہل نہیں پا رہے تھے۔ اچانک آئی اس افتاد پر وہ دونوں حیران تھے۔ ان کا خیال قصبہ کے

ملک کی طرف گیا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ملک نے دھوکہ کیا ہے۔ اس نے شکست تسلیم نہیں کی ہے بلکہ موقع سے فائدہ اٹھایا ہے۔

انہیں جکڑنے والے ان دونوں کو دھکیلتے ہوئے ایک طرف لے چلے۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک بڑی سی جھونپڑی کا ہیولہ نظر آیا۔ وہ انہیں ساتھ لے کر اسی طرح بڑھ رہے تھے۔

اس جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر پیٹرومیکس روشن تھا۔ پیٹرومیکس کی تیز روشنی میں انہیں چار آدمی نظر آئے۔ وہ چاروں ہی مسلح تھے۔ جھونپڑی کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ وہ چاروں مسلح افراد گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے جو انہیں دیکھ کر چونکے تھے۔

عادل بھی ان چاروں کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا تھا۔ ”سر! یہ جو ان کے درمیان سفید وسرخ شخص بیٹھا ہوا ہے یہ گل خان ہے۔ افغانستانی اسمگلر، ہیروئن اور اسلحے کا تاجر۔ بین الاقوامی اسمگلر ہے۔ بہت خطرناک ہے۔“

”خان! ہم دونوں کو لے آئے ہیں۔“ انہیں لانے والے نے پہلے سے موجود افراد میں سے ایک کو مخاطب کیا۔

”سر! یہ بالکل درندہ ہے۔ شقی القلبی کے لیے مشہور ہے۔“ عادل نے پھر سرگوشی کی۔

بیٹھے ہوئے مسلح افراد میں سے دو اس کی طرف بڑھے۔ ”تم شیر خان ہو ناں!“

عادل اور پروفیسر اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ وہ ذرا برابر بھی خوف محسوس نہیں کر رہے تھے۔

گل خان انہیں گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ماحول پر یکلخت گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔

”تم ہی شیر خان ہو؟“ گل خان نے پروفیسر کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں!“ پروفیسر عثمان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ اس کا جواب سنتے ہی گل خان کے سرخ وسفید چہرے پر سرخی مزید بڑھ گئی۔ اس نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”تم شیر خان نہیں ہو؟“

”جی نہیں، کہیے تو اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دے دوں۔“ پروفیسر کے چہرے پر کسی بھی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قسم کی پریشانی کی جھلک نہیں تھی۔ وہ بے خوف وخطر بول رہے تھے۔

"پھر تم جو شکل ہی سے کسی دوسرے علاقے کے لگتے ہو اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو؟"

"محترم! ننگار میں میری حویلی ہے۔ کافی عرصے سے وہاں رہ رہا ہوں۔"

"یہاں کیا کرنے آئے تھے؟"

"ایک ضروری کام سے قصبہ گیا تھا وہاں سے لوٹ رہا تھا۔"

"ننگار یہاں سے کتنی دور ہے معلوم ہے؟ گھوڑے پر کتنے دن میں پہنچو گے یہ سوچا ہے؟"

"گھوڑے پر نہیں لاری پر ننگار جائیں گے۔ تم نے کیا ہمیں بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ یہ گھوڑے لاری اڈے پر چھوڑ دوں گا مگر یہ تو بتا دو کہ شیر خان کون ہے۔" پروفیسر نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ انہوں نے گل خان کے آدمیوں کی تعداد گن لی تھی۔ وہ تعداد میں کل چار تھے۔ دو پہلے سے موجود تھے اور دو انہیں لے کر آئے تھے جبکہ پانچواں وہ خود تھا۔

"تو سنو شیر خان کون ہے، وہ ایک کمین فطرت کا آدمی ہے۔ اس نے ہم سے اس علاقے کو چھیننے کی سازش کی ہے جبکہ یہ علاقہ ہماری راہداری ہے۔ یہاں سے ہمارا مال گزرتا ہے۔ چین اور بھارت میں مال بھیجنے کا یہ محفوظ ترین راستہ ہے۔"

"تو یوں کہو کہ تم ہیروئن کے تاجر ہو۔"

"نہ صرف ہیروئن بلکہ اسلحہ اور خوبصورت لڑکیوں کی تجارت بھی یہ کمینہ کرتا ہے۔" دروازے کے باہر سے کسی نے کہا۔ اس آواز کو سنتے ہی وہاں موجود سب نے پھرتی سے اسلحہ نکال لیا۔

"ایسی بے وقوفی کوئی نہ کرے۔ ذرا سر گھما گھما کر اوپر کی طرف دیکھو۔ ہر طرف کلاشنکوف کی نالیں نظر آئیں گی۔" وہی آواز سنائی دی۔ "عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ تم سب اپنے اپنے ہتھیار نیچے پھینک دو۔"

حکم ملتے ہی گل خان اور اس کے ساتھیوں نے اپنے اپنے ہتھیار نیچے پھینک دیے پھر گل خان نے کہا۔ "تم کون ہو؟"

"لو دیکھ لو۔" آواز کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا جوان اندر آیا۔ وہ بھی کوئی سرحدی پٹھان یا افغانی تھا۔

"شیر خان؟" گل خان کے ایک ساتھی نے کہا۔

"ہاں! میں ہی شیر خان ہوں آج میری قسمت کا ستارہ عروج پر ہے۔ نفع کے ساتھ تمہاری جان بھی لے کر جاؤں گا۔ میں ان دونوں کے پیچھے قصبہ سے چلا ہوں اور یہاں آیا تو تم نظر آ گئے۔" شیر خان بولا۔

"یہ ہیں کون؟" گل خان نے پوچھا۔

"کوئی بھی ہیں تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ میں انہیں لے کر جاؤں گا۔"

تبھی باہر سے سیٹیوں کی آواز آئی اور جھونپڑی کی دیواروں سے جھانکتی نالیں غائب ہو گئیں۔ گل خان چہکارتی آواز میں بولا۔ "لو تمہارے آدمی میرے نرغے میں آ گئے۔ اب بولو ان دونوں کی حقیقت بتاؤ گے یا تم میری پستول کا نشانہ بنو گے؟"

"حقیقت یہ ہے۔" کہہ کر آنے والے نے گل خان پر چھلانگ لگائی۔

گل خان کسی بھی طرح نووارد کے مقابلے میں بودا نہیں تھا۔ اس لیے وہ نیچے گرنے کے باوجود نووارد کے چہرے اور پسلیوں پر چند ضربات لگانے میں کامیاب ہو گیا اور وہی اس کی شامت کا نقطہ آغاز بن گیا۔ شیر خان پر مار کھاتے ہی جنون سوار ہو گیا اور اس نے باضابطہ مقابلے کی بجائے اچانک اسے ٹھوکروں اور مکوں پر رکھ لیا۔ ہاتھ پیروں کے ساتھ ہی اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔

ذرا سی دیر میں اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا اور وہ کسی تھکے ہوئے سانڈ کی طرح ہانپنے لگا۔ نووارد نے اس کے بدن پر موجود لباس کے چیتھڑے اڑا دیے تھے اور وہ کسی خون آشام درندے کی طرح بار بار رک کر حملہ آور ہو رہا تھا۔ دونوں کے ساتھی اسلحہ تانے ادھر اُدھر خاموش مگر پریشان کھڑے تھے۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ نووارد کو قالین پر گرے ہوئے اپنے پستول کی طرف جھپٹنے کا موقع مل گیا۔ وہ صورتِ حال بہت نازک تھی۔ اگر اسے غلبہ حاصل ہو جاتا تو شیر خان کے ساتھ پروفیسر اور عادل بھی گردش میں آ سکتے تھے لہٰذا وہ بھی میدان میں آ گئے۔

نووارد کا ہاتھ پستول پر پڑا ہی تھا کہ عادل کے وزنی جوتے نے اس کی کلائی بری طرح روند ڈالی اور پھر بائیں ہاتھ سے اس کے بال تھام کر عادل نے اسے فرش سے سیدھا کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا وہ اس سے لپٹ پڑنا چاہ رہا تھا کہ عادل نے پیچھے ہٹ کر اپنے اور اس کے درمیان جگہ بناتے ہوئے اس کے چہرے، پیشانی اور کنپٹیوں پر پے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

در پے ایسے زوردار رائٹ اور لیفٹ ہک برسائے کہ وہ کسی اندھے کی طرح اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا جہاں گل خان اس کے استقبال کے لیے تیار تھا۔

اس وقت گل خان پر خون سوار ہو چکا تھا۔ وہ نووارد کو نیچے گرا کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اس کے گھونسوں نے نووارد کی شاید بصارت چھین لی تھی۔ کیونکہ وہ کسی اندھے کی طرح ہوا میں ہاتھ لہرا رہا تھا۔ اس کے تمام ساتھی دم بخود تھے۔ اگر ان کے پیچھے گل خان کے لوگ رائفلیں تانے کھڑے نہ ہوتے تو وہ سب اب تک اس جنگ میں شریک ہو چکے ہوتے۔ ان دو موذیوں کی جنگ پروفیسر کے لیے فائدہ مند تھی۔ دونوں ہی ان کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ان میں سے جسے بھی شکست ہوتی وہ پروفیسر کے حق میں بہتر ہوتی۔ اس طرح اسے ایک کے ساتھ لڑنا زیادہ آسان تھا۔

نووارد، گل خان کی گرفت سے نکلنے کے لیے ناکام کوشش کر رہا تھا اور گل خان نے اس کے دونوں بازو بے رحمی کے ساتھ اپنے گھٹنوں کے نیچے دبا کر اس کے نرخرے پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

وہاں جو کچھ ہو رہا تھا یہ پروفیسر و عادل کے لیے خوشی کا باعث تھا اس لیے وہ لوگ خاموش کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ گل خان نے پوری قوت سے نووارد کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا تھا۔

اس وقت عادل کو اندازہ ہوا کہ کسی مقابلے میں بہ ذات خود شریک ہو کر جوش اور اشتعال میں دس پانچ حریفوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا بہت آسان کام تھا لیکن دور کھڑے ہو کر کسی دشمن کی موت کا تماشہ دیکھنا زہرگداز کام تھا جو کم از کم کمزور دل کے کسی آدمی کے بس میں نہیں تھا۔

گل خان کی فولادی انگلیوں نے نووارد کے جسم میں تازہ ہوا پہنچنے کا ہر راستہ بند کیا ہوا تھا اور نووارد تڑپ تڑپ کر سانس لینے کے لیے مچل رہا تھا۔ جسمانی مشقت کی وجہ سے اس کی تازہ ہوا کی طلب بڑھی ہوئی تھی جب کہ حلق پر گل خان کا شکنجہ لگا ہوا تھا لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے نووارد کی آنکھیں اپنے حلقوں سے ابلنے لگیں اور پھر اس کی زبان بھی رفتہ رفتہ دہانے سے باہر لٹکنے لگی تبھی دھائیں دھائیں کی آواز سے جھونپڑی گونج اٹھی۔ پروفیسر اور عادل نے دھماکے کے ساتھ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا تھا اور پروفیسر کے چہرے پر کرب کے آثار پھیل گئے تھے۔

☆======☆======☆

پروفیسر اور عادل نے ایک ساتھ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ دروازے سے ب ساتھ چار آدمی داخل ہوئے تھے ان سب کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں۔ انہوں نے اندر آتے ہی مورچہ سنبھال لیا تھا اور انہیں مطلوبہ ٹارگٹ درکار تھا۔ خان ان کی ۔کھوں میں اجنبیت، حیرت اور استعجاب دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے پہلی ان پڑوسیوں کو دیکھا ہے تبھی ان میں سے ایک بولا ''کون ہو تم لوگ؟''

''اگر یہی سوال میں تم سے کروں تو؟'' خان نے کہا۔

''سیدھی سی بات ہے سوال کرنے والے کو جواب دینا ضروری ہے۔'' اپنا تعارف راؤ یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ نووارد نے کڑک کر کہا۔

''گل خان ہوں، میرا نام سنا ہے۔'' گل خان نے گردن اکڑا کر کہا۔

''اور یہ کون ہے؟'' اس نے شیر خان کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''یہ شیر خان ہے۔''

''یعنی اس علاقے کے دونوں دہشت گرد یہاں موجود ہیں۔ اچھا ہے تم دونوں ایک ۔ھ مل گئے۔''

''مگر تم ہو کون اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتاؤ۔''

''ہم اس علاقے کے محافظ ہیں۔ پولیس جہاں ناکام ہو جاتی ہے، وہاں ہم آگے ۔تے ہیں۔ تم نے شیر باز خان کا نام سنا ہوگا ہم اس کے ساتھی ہیں جرم کے دشمن وطن و ۔دلت کے محافظ۔ یہاں سے بھارت تک ہمارے جانباز لڑ رہے ہیں ظلم و جبر کے ۔ف۔''

''اچھا ہی ہوا۔ میں نے یہاں آتے وقت سوچ لیا تھا کہ تم لوگوں سے بھی نمٹنا ۔ے۔''

''تم جرائم پیشہ افراد کی وقعت ہی کیا ہے۔ جب بھارت جیسی ظالم حکومت ہمارا کچھ ۔یں سکی تو تم اور تمہاری اوقات کیا ہے۔''

''یہ ۔ت بھولو کہ ہمارے آدمی چاروں طرف موجود ہیں۔''

''ٹھیک تمہارے آدمی باہر موجود ہیں مگر بندھے ہوئے اب ذرا حساب لگا لو ۔ے چوبیس آدمی باہر موجود تھے۔ انہیں قابو کرنے کے لیے ان سے زیادہ لوگ ہوں ۔ب اس وقت بھی موجود ہیں۔ کہو تو اندر بلا لوں۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟ کتنی رقم چاہیے؟''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''اگر ہمیں رقم کی ضرورت ہوتی تو ہم بھارت سے سودا کرتے۔ ہم تو شہادت کے تمنائی ہیں۔ ملک و ملت کی سر بلندی ہمارا نصب العین ہے۔ اب تم لوگ باہر نکلو، ہری اپ!''

کھڑکیوں اور روشندانوں سے رائفلوں کی نالیں نکل رہی تھیں اس لیے وہ آگے بڑھنے پر مجبور تھے۔

نووارد کے ساتھ آنے والے تمام لوگوں کو ہانک کر لے گئے۔ انہوں نے پروفیسر کو بھی چلنے کا اشارہ دیا تھا مگر نووارد نے منع کر دیا۔

جب سب لوگ باہر نکل رہے تھے وہ بولا۔ ''پروفیسر عثمان! ہم آپ کی حفاظت کے لیے آئے ہیں درمیان میں ہمارے آدمیوں کی وجہ سے آپ نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ خان پر نظر رکھنے والوں نے آپ کو دیکھ لیا۔''

''لیکن میں نے آپ لوگوں کو اس سے پہلے دیکھا نہیں۔''

''دیکھنے والوں کی آنکھوں پر پردے ڈالنا ہمارا کام ہے۔ ہم نے آج تک یہی کیا ہے اور اسی لیے کامیابی ہمارے در کی باندی ہے۔'' نووارد نے مسکرا کر کہا، کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''ویسے آپ ننگار جائیں گے ناں؟''

''بالکل اور کہاں جاؤں گا۔''

''تو چلیے میں آپ کو پہنچا آتا ہوں۔ ہمارے پاس گاڑی ہے بس کی بجائے اس چلیں گے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، میں تم پر اعتماد کر لوں؟ ہمیں بس سے جانا ہے اسی سے کروں گا۔'' پروفیسر عثمان نے دوٹوک الفاظ میں فیصلہ سنا دیا۔

''یقین و اعتماد پر ہی کاروباری زندگی چلتی ہے۔'' نووارد نے کہا۔

''یہ میں بھی جانتا ہوں لیکن ایسا تب ہوتا ہے جب مقابل قابل اعتماد ہو، ابھی آپ نے اپنا تعارف بھی نہیں کرایا ہے اور نہ ایسا کوئی ثبوت دیا ہے جس کی روشنی میں اعتماد کر سکوں۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''ثبوت کے لیے میں حزب المسلمین یا کسی بھی جہادی تنظیم کے امیر سے گواہی سکتا ہوں کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کی دہشت سے جرائم پیشہ، ملک دشمن اور ملت فروش خوفزدہ رہتے ہیں۔ ملک و ملت کے لیے کام کرنے کی وجہ سے ہی میں نے آپ کو پہچانا۔'' نووارد نے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''مجھے سلمان کہتے ہیں۔ دراصل ہم کبھی بھی کسی کو اپنا اصل نام نہیں بتاتے آپ بھی مجھے عمران ہی کہہ کر بلائیں۔''

''بس بس مجھے تمہاری باتوں پر یقین آ گیا ہے، چلو ہم تمہاری گاڑی پر ننگار تک جائیں گے۔''

اجازت ملتے ہی اس نے سب کو باہر چلنے کے لیے کہا آخر میں پروفیسر عثمان، سلمان کے ساتھ باہر نکلا۔ سامنے ہی دو جیپ کھڑی تھیں ان میں سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے سلمان نے کہا، آپ اس میں بیٹھ جائیں ڈرائیور آپ کو پہنچا دے گا۔

پروفیسر عثمان اس میں سوار ہو گئے۔

سلمان نے اپنی جیپ اسٹارٹ کر کے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ پروفیسر والی جیپ سڑک پر آگے بڑھنے لگی۔ وہ اس جیپ میں بیٹھ تو گئے تھے مگر آگے جانے کا راستہ انہیں معلوم نہ تھا۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ واقعی عمران کا تعلق جہادی تنظیم سے ہے یا وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ یوں بھی قدم قدم پر ان کے دشمنوں نے جال پھیلا رکھا تھا۔ انہوں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے بھائی؟''

''عمران گردیزی!'' کہہ کر اس نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

☆======☆======☆

''کیا واقعی یہ عورت اور مرد ہمیں دھوکہ دے رہے ہیں؟'' کیتھی نے پوچھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ یہ لوگ ہمیں گھیرنے کے لیے ڈرامہ کر رہے ہیں؟''

''جی ہاں! مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ لوگ ایسا ہی کر رہے ہیں۔'' غلام رسول نے جواب دیا۔

''مگر کیوں؟ اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔''

بچھی ہوئی بساط پر رکھے ہوئے مہرے کبھی بتاتے نہیں ہیں کہ انہیں کون چلا رہا ہے۔ چال چلنے والے کو ڈھونڈنا ہوگا۔ یہ سب کس گروہ کے ہیں اس کا اندازہ لگانا ہوگا۔''

غلام رسول کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

''تمہارے خیال سے یہ لوگ کس کے ٹاؤٹ ہوں گے؟ کن لوگوں کے لیے کام کر رہے ہوں گے؟''

''یہ لوگ امریکی سی آئی اے یا موساد اسرائیلی کے تھرڈ ایجنٹ بھی ہو سکتے ہیں اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انڈین ''را'' کے جی بی افغانی ''خاد'' یا مافیا کے نمائندے بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ پروفیسر ماہر خلیات ہیں، جینٹک انجینئرنگ میں ان کے جوڑ کا کوئی اور نہیں ہے۔ ہر ملک اپنے ہاں انہیں رکھنا چاہے گا۔ پروفیسر صاحب کو حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ جال بچھا سکتے ہیں امریکی اس غصے میں ہوں گے کہ بندہ ہاتھ سے نکل گیا اسرائیلی اس فکر میں ہوں گے مسلمانوں کو کوئی قوت نہ مل جائے۔ ''را'' اور کے جی بی اور خاد والے اس لیے پریشان ہوں کہ پاکستان قوی نہ ہو جائے۔ انہی وجوہات کی بنا پر تمام ایجنسیاں پروفیسر کو پھانسنے کی کوشش میں لگی ہوں گی۔''

''یعنی ہم سب کے نشانے پر ہیں۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ وہ سب پروفیسر تک پہنچنے کے لیے ہمیں بطور چارہ استعمال کریں گے۔''

''تم نے مجھے ڈرا ہی دیا۔'' کیتھی نے آنکھیں نچا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر غلام رسول! یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ دنیا گلوبل ولیج بن چکی ہے۔ اب روایتی جنگ کے ایام گزر چکے ہیں اور دو ملکوں کی جنگ اب گولے بارود یا افواج سے لڑی نہیں جائے گی بلکہ یہ جنگیں سیکرٹ ایجنٹ، کمانڈوز اور اسپیشل فورس لڑے گی۔ سائبر وار ہو گا یعنی کمپیوٹر جنگی چالیں مرتب کرے گا اور وہ لڑے گا۔ دشمن پر گولے بارود کی جگہ جرثومے برسائے جائیں گے اس تناظر میں دیکھو تو تمہیں بہت کچھ نظر آئے گا۔ ہماری اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے تو ذہن پر زور دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مستقبل میں سائنسدان ہی جنگ لڑیں گے۔''

''بات تمہاری سچ ہے، ایسا ممکن ہے۔''

''اب اس تناظر میں غور کرو تو تمہیں بہت سے نکتے نظر آئیں گے۔ ایسے نکتے جو تمہارے دل اور دماغ میں ہلچل مچا دیں گے۔ سوچنے پر مجبور کر دیں گے۔ ایک ایسی عورت جو سات سمندر پار مری اس کی روح اتنی دور کیسے آ گئی؟ سنتے ہیں کہ بدروحیں سمندر پار نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ نالے کو بھی پار نہیں کر سکتیں پھر اس عورت کی روح یہاں، بلتستان کے اس دور افتادہ حصے میں کیسے پہنچی؟ نہ صرف پہنچی بلکہ ایک عورت کے جسم میں حلول بھی کر گئی۔ یہ عجیب بات نہیں ہے؟''

''ہاں کیوں نہیں ہے، واقعی یہ تو عجیب بات ہی نہیں عجیب العجائب بات ہے۔'' کیتھی نے سر کو جھٹکا۔ ''میرا تو دماغ ہی ماؤف ہو رہا ہے۔''

''اس کو کہتے ہیں جال بُنتا۔ یہ لوگ ہمارے گرد جال بُن رہے ہیں۔ اس لیے عقلمندی کا تقاضہ ہے کہ جب بھی راہ نظر آ جائے اس پر آگے بڑھ جانا چاہیے۔''

''تو پھر دیر کیوں کر رہے ہیں۔ فوراً نگار کے لیے نکل لیں۔'' کیتھی نے گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بغیر کسی کو کچھ بتائے گاڑی میں سوار ہو گئے ان کی گاڑی اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتی اوبڑ کھابڑ سڑک پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک گاؤں پیچھے چھوڑتے جا رہے تھے۔ پھر نگار نظر آنے لگا۔ وہ قصبہ اپنی منفرد حیثیت کی وجہ سے علاقے بھر میں اہم مقام تھا پھر بھی یہی قصبہ ریاست کا صدر مقام بھی تھا۔ یہاں کے راجا کی حویلی اس قصبے میں تھی اور اسی حویلی میں پروفیسر عثمان نے لیبارٹری قائم کی تھی۔ وہ حویلی کافی دور سے نظر آتی تھی۔ اس وقت بھی وہ انہیں نظر آ رہی تھی۔

غلام رسول اس حویلی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ بری طرح چونک گیا۔ حویلی سے کچھ فاصلے پر دو آدمی کھڑے تھے۔ ان کے کپڑوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ لوگ مقامی نہیں ہیں۔ گاڑی کو دیکھ کر انہوں نے ہاتھ اٹھا دیا۔ وہ انہیں رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔

غلام رسول نے گاڑی روک دی۔ جیسے ہی کار رکی ان دونوں نے دونوں طرف کی کھڑکیوں سے غلام رسول اور کیتھی کے سر سے پستول کی نال لگا دی۔

☆======☆======☆

''پروفیسر صاحب آپ نے بہت دیر کر دی۔ یہاں قیامت آ کر گزر گئی ہے۔'' باورچی نے روہانسی آواز میں کہا۔

''کھل کر بتاؤ یہاں ایسا کیا ہو گیا؟'' پروفیسر کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔

''بس یوں سمجھ لیں کہ آپ کے بعد یہاں ڈرامے پر ڈرامے ہو رہے ہیں۔ غلام رسول کو حویلی میں چڑیلیں دکھائی دینے لگیں۔ پھر ان سے کوئی خواب میں آ کر ملنے لگا، پھر ایک پُراسرار لڑکی انہیں نظر آنے لگی۔ کیتھی بی بی بہت پریشان تھیں۔''

''اس پریشانی کی کوئی وجہ؟''

''یوں تو کوئی خاص وجہ نظر نہیں آ رہی تھی مگر میں نے ایک دن ناشتے کی میز پر کیتھی بی بی کو کہتے سنا تھا کہ کچھ لوگ آپ کی تلاش میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔''

''اچھا! تو وہ کہاں ٹھہرے ہیں اس کا علم ہے؟''

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''یہاں سے سات میل دور اسکردو روڈ پر ایک قصبہ ہے۔ اسے علاقے بھر میں مرکزیت حاصل ہے۔ وہاں سکول اور کالج بھی ہے۔ تھانہ اور پوسٹ آفس بھی ہے۔ وہاں ایک حویلی بھی ہے۔ اسی حویلی میں وہ لوگ رہ رہے ہیں۔''

''وہ حویلی ہے کس کی؟''

''کسی راجا نے بنوائی تھی۔''

''اچھا تم جاؤ۔'' کہہ کر پروفیسر نے اپنے ساتھی عادل سے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کا مقصد کیا ہے، کس لیے انہوں نے غلام رسول اور کیتھی کو اپنے قبضے میں کیا ہے۔''

''سیدھی سی بات ہے کہ وہ آپ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔'' ان میں سے عادل نے کہا۔ ''ابھی تو اس نے بتایا کہ اغوا کے ایک روز پہلے کوئی شخص آیا تھا جس نے ایک ایک کے بارے میں پوچھا تھا۔''

پروفیسر عثمان سوچ میں ڈوب گئے۔ کافی دیر تک غور کرتے رہے پھر بولے۔

''عمران تم دو آدمی لا سکتے ہو، ایسے آدمی جو مرنا جانتے ہوں؟''

''بالکل! میں ایسا کر سکتا ہوں۔''

''کتنی دیر میں لاؤ گے۔''

''ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔''

''تو ایسا کرو کہ ابھی چلے جاؤ۔'' پروفیسر بولے۔

''جی اچھا!'' کہہ کر وہ باہر نکلا۔ پورچ میں جیپ کھڑی تھی وہ اس میں بیٹھ گیا۔

وہ بات کا دھنی تھا۔ صرف آدھے گھنٹے میں لوٹ آیا۔ اس کے ساتھ چار جوان بیٹھے تھے۔ وہ انہیں ساتھ لے کر پروفیسر عثمان کے پاس پہنچا۔

''سر! یہ ہمارے بہترین مجاہدین میں سے انتخاب ہیں۔ آپ حکم کریں۔''

پروفیسر نے انہیں سرتاپا دیکھا پھر بولے۔

''آپ یقیناً بہادر ہوں گے۔ حوصلہ و ہمت کے پہاڑ ہوں گے مگر میرے کام کے ہیں بھی یا نہیں یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔''

پروفیسر عثمان کے ریمارکس پر عمران کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ آپ نے اندازہ لگانے میں جلدی کی ہو۔ یہ ساتھی اب تک کئی معرکے سر کر چکے ہیں۔ ہر آپریشن میں باز کی طرح جھپٹتے اور شکار کو لے اڑتے ہیں۔ ان کی بہادری

کے قصے لوگ ذوق وشوق سے کہتے اور سنتے ہیں۔''

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، نہ گھوڑا دور نہ میدان دور، ابھی پتا لگ جائے گا کہ کس میں کتنا ہے دم۔''

کہہ کر پروفیسر جیپ میں بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''انور سے سمجھ لو کہ وہ حویلی ہے کہاں؟''

انور تو گویا بتانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ فوراً آگے بڑھ آیا اور اس نے راستے کی صحیح نشاندہی کی پھر بولا۔ ''اگر کہیں تو میں بھی ساتھ چلوں؟''

''نہیں تمہارا یہاں موجود رہنا ضروری ہے۔'' کہہ کر انہوں نے عمران کو گاڑی اسٹارٹ کرنے کا اشارہ دیا۔

جیپ اسٹارٹ ہوئی اور انتہائی تیز رفتاری سے منزل کی طرف بھاگنے لگی۔ گھماؤ دار سڑک پر جہاں ہر آٹھ دس فرلانگ پر ایک اندھا موڑ آ رہا تھا۔ ایسا موڑ کہ سامنے سے آنے والی گاڑی نظر نہ آئے۔ ایسے خطرناک راستے پر عمران جیپ کو ایسے دوڑا رہا تھا جیسے ریس کا میدان ہو۔ اس کی ڈرائیونگ سے بھی پروفیسر نے اندازہ لگا لیا کہ کسی بھی آپریشن پر جانے کے لیے یہ ڈرائیور سب سے زیادہ بہتر ہے۔

جس وقت یہ لوگ حویلی کے پاس پہنچے رات کے دو بج چکے تھے۔ ہر طرف سناٹے کی حکمرانی تھی۔ اتنی رات گئے کسی کا گھر سے باہر آنا ناممکن سی بات تھی۔ رہ رہ کر صرف کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

قصبے کے مکین میٹھی نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مکانوں کی کھڑکیاں بھی تاریک تھیں۔ ان لوگوں نے آس پاس کا گہری نظروں سے جائزہ لے لیا تھا اور اب حویلی کا جائزہ لے رہے تھے۔ آس پاس کیا دور دور تک کسی ذی روح کا پتا نہ تھا۔ وہ ماحول ان کے لیے بہت موزوں اور سازگار تھا۔

ان کی نفری پانچ افراد پر مشتمل تھی۔ پروفیسر، عمران اور اس کے دو ساتھی۔ ان کے پاس بھرے ہوئے پستول اور فاضل میگزین موجود تھے۔ پروفیسر کے پاس ایک طاقتور ٹارچ بھی تھی۔

جیپ سے نیچے اترتے ہی عمران باقی سب سے کئی قدم آگے ہو گیا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ حویلی کے پھاٹک پر پہنچا تو باقی سب اس سے کچھ دور محفوظ فاصلے پر احاطے کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کا مدعا صرف اتنا تھا کہ گیٹ کھولنے والے کی فوری

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طور پر نظر نہ پڑے اور نہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس کے سامنے کئی افراد ہیں۔

ایک اور کئی کا تناسب دیکھتے ہی گیٹ یا اس کی ذیلی کھڑکی فوری طور پر بند ہو سکتی تھی اور یوں ان کی مہم ابتدا ہی سے تشدد کا شکار ہو جاتی، جبکہ وہ پُرسکون انداز میں احاطہ عبور کرتے خاموشی کے ساتھ اصل عمارت تک پہنچنے کا منصوبہ لے کر آئے تھے۔

پہلے چکر میں عمران نے دیکھ لیا تھا کہ اس پھاٹک کے سنگین ستون پر کال بیل کا بٹن نصب تھا لیکن عمران نے وہ بٹن دبانے کی بجائے آہنی پھاٹک پر ہولے سے دستک دی۔

چوکیدار غالباً اپنے کیبن میں یا پھاٹک کے نزدیک ہی سویا ہوا تھا لیکن اپنے فرض سے غافل نہیں تھا۔ دستک کے جواب میں اندر سے فوراً ہی ایک بھاری اور خوابناک آواز ابھری، بولنے والے کا لہجہ اس کے پٹھان ہونے کا غماز تھا۔

عمران نے فوراً پشتو میں کچھ کہا اور لمحہ بھر میں ہی آہنی پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھل گئی۔ شاید اتنی جلدی اس لیے کھڑکی کھلی تھی کہ اس علاقے میں مقامی زبان بولی جاتی تھی۔ اردو بھی لوگ سمجھ لیتے تھے مگر پشتو یہاں کے لیے اجنبی زبان تھی۔

کھڑکی کھلتے ہی گیٹ لیمپس کی روشنی میں پروفیسر نے عمران کو کھلی کھڑکی کی طرف جھکتے ہوئے دیکھا اس کے ساتھ ہی خاموش فضا میں اوغ کی ایک گھٹی گھٹی سی آواز ابھری اور عمران فوراً ہی کھلی ہوئی کھڑکی کے خلا میں معدوم ہو گیا۔

اس آواز کا معاملہ بالکل واضح تھا۔ عمران نے نیند سے اٹھتے ہوئے چوکیدار کو کوئی مہلت دیئے بغیر اس کا نرخرا دبوچ لیا تھا تاکہ وہ کوئی اونچی آواز نکال کر اپنے مالکان کو ہوشیار نہ کر سکے۔

لمحہ بھر بعد ہی ہلکی سیٹی کی آواز سنائی دی اور پروفیسر اپنے ساتھی کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ کر تیزی کے ساتھ کھلی ہوئی ذیلی کھڑکی سے حویلی کے احاطے میں داخل ہو گئے۔

وہ پوری مدت چند ثانیوں سے زیادہ نہیں تھی لیکن جب پروفیسر اندر داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ عمران اس قلیل سی مدت میں اپنی پہلی ذمہ داری سے بخوبی سبکدوش ہو چکا تھا۔ چوکیدار کا تنومند اور دراز قامت جسم اس کے قدموں میں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

پھاٹک کے قریب دیوار سے ملحق پختہ کیبن پر بستر خالی پڑا ہوا تھا اور عملاً میدان صاف تھا۔ عمران نے آہستگی کے ساتھ ذیلی کھڑکی بند کر کے بولٹ لگا دیا۔

پھاٹک سے تاریک عمارت تک پختہ روش بنی ہوئی تھی جس کے دونوں جانب وسیع

اور عریض سرسبز لان پھیلا ہوا تھا۔ لان کو روشن رکھنے کے لیے کھمبوں پر جابجا آرائشی روشنیاں لگی ہوئی تھیں جو اس وقت گل تھیں۔ پوری حویلی میں گیٹ لیمپس کے علاوہ صرف برآمدے میں روشنی نظر آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ رات کے ان لمحات میں اس مکان کے مکین بے خبری کی نیند سو رہے تھے۔

ان لوگوں نے لمحہ بھر کے لیے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر بیک وقت پنجوں کے بل برآمدے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہاں بید کی بنی ہوئی خوبصورت اور ہلکی میز کے ساتھ ہی متعدد کرسیاں بھی پڑی تھیں جس کا مطلب تھا کہ حویلی کے مکین بند کمروں سے نکل کر کھلی فضا سے بھی لطف اندوز ہونے کے عادی تھے۔ ان کے لیے اس نکتے کی خاصی اہمیت تھی کیونکہ بند دیواروں کے حصار میں قیدیوں کی طرح زندگی بسر کرنے والے صاحب حیثیت لوگ اَن جانے اوہام اور اَن دیکھے خطرات سے خوفزدہ پائے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ لاشعوری طور پر اپنی خواب گاہوں کو قلعہ بند کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے کمروں کی کھڑکیاں بند کر دی جاتی ہیں یا صرف شیشوں کے آر پار دیکھنے کے کام آتی ہیں۔ تازہ ہوا کا گزر صرف اور صرف ایئر کنڈیشنرز تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے جس کے نتیجے میں اجنبیوں کو ان تک رسائی میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ علاقہ ابھی اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ ایئر کنڈیشنز کی ضرورت پڑتی اس لیے پروفیسر کو امید تھی کہ کوئی نہ کوئی کھڑکی کھلی ہو گی۔ تازہ ہوا کے لیے کھولی گئی کھڑکی ان کے کام آ سکتی تھی۔ اس امید پر وہ سب حویلی کے نزدیک پہنچے تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ انہیں ایک کھڑکی کھلی مل گئی تھی اور اس کھڑکی میں سلاخیں بھی نہیں تھیں۔ ہلکی سی گرل تھی اور اس پر فلائی پروف جالیاں تھیں۔ انہیں ایسی ہی کھڑکی کی ضرورت تھی۔ اسے فرنچ انداز میں بنایا گیا تھا۔ چند ثانیوں تک انہوں نے اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن پھیلے ہوئے گھپ اندھیرے میں زندگی کی رمق دریافت نہ ہو سکی۔ عمران نے جیب سے کوئی تیز دھار اوزار نکالا اور جالی کاٹ دی۔ کٹی ہوئی جالی میں ہاتھ ڈال کر گرل پر زور آزمائی کرنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ گرل الگ ہو گئی اور وہ سب باری باری اندر آ گئے۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ دروازے سے برآمدے میں پہنچے پھر برابر والے کمرے میں۔ اس کمرے میں کوئی سو رہا تھا۔ انہوں نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے بھی برابر والے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ایک کے بعد ایک کئی کمرے دیکھ ڈالے۔ صرف دو کمروں میں لوگ تھے۔ ایک میں دو آدمی اور دوسرے میں ایک۔ پوری حویلی میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہی تین نفوس تھے۔ اکیلے سوئے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کر کے پروفیسر عثمان نے سرگوشی میں کہا۔

''پہلے اسی سے سوال جواب کرتے ہیں۔''

پروفیسر کی منشا پا کر وہ سب اس اکیلے آدمی کے کمرے میں آ گئے۔ عمران اپنے ساتھیوں کے ساتھ دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں چھت پر لگا ہوا پنکھا دھیمی رفتار سے اور آواز سے چل رہا تھا اور وہ شخص ڈبل بیڈ پر نیند کے مزے لے رہا تھا۔ عمران نے پھرتی سے اس کے سرہانے پوزیشن لے لی۔ پروفیسر اس کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ان کا پیر زمین پر رکھی کسی چیز سے ٹکرایا تھا۔ ہلکی سی آواز ابھری تھی۔ پھر بھی وہ شخص جو بے خبر سو رہا تھا اٹھ بیٹھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کچھ استفسار کرنا چاہا لیکن عمران پوری تیاری کے ساتھ اس کے سر پر سوار تھا۔ اس شخص کے حلق سے پہلا لفظ بھی پوری طرح ادا نہیں ہونے پایا اور عمران نے شاید پوری قوت سے اس کا منہ دبوچ لیا۔

''خاموشی کے ساتھ تعاون کرو گے تو ہم تمہارے دوست ثابت ہوں گے۔'' اندھیرے کمرے میں عمران کی آواز ابھری۔ ''ورنہ تمہارا گلا کاٹ کر یہ سر شوکیس میں سجا دیا جائے گا۔''

پروفیسر نے بند دروازے کے قریب سوئچ بورڈ ٹٹول کر کمرا روشن کر دیا۔

فربہی مائل جسم والا پستہ قامت اور ادھیڑ عمر شخص اپنے بستر پر دہشت کے عالم میں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ خوف کے باعث اس کی خمار آلود آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں اور اس کے دہانے پر عمران کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔

پروفیسر نے پھرتی سے اپنا بھرا ہوا پستول نکال کر اس کا دہانہ فربہی مائل شخص کی کھوپڑی کی طرف کر دیا اور عمران کو ہدایت کی۔ ''اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لو۔ اس نے کوئی اونچی آواز نکالی تو اس کی کھوپڑی میں روشندان بنا دوں گا۔''

عمران کے آہنی ہاتھوں کی گرفت سے آزادی ملتے ہی اس نے پے در پے اس طرح منہ چلایا جیسے کچھ نگلنے کی کوشش کر رہا ہو پھر باری باری سے اس نے تمام لوگوں کا جائزہ لیا اور خوفزدہ آواز میں بولا۔ ''تم لوگ کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس کی آواز قریب المرگ مریض کی سرگوشی جیسی تھی۔

''ہم لوگ چور یا ڈاکو نہیں ہیں۔ ہم ایک عورت اور مرد کی تلاش میں آئے ہیں۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''اگر تم نے سچ نہ بولا تو تمہیں مار دیں گے۔''

شاید اتنی دیر میں اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ بولا۔ ''تم لوگوں نے اپنی موت کو آواز دی ہے۔ میں اپنے تمام دشمنوں پر زمین تنگ کر دیتا ہوں۔''

''تم اپنے قد سے اونچی باتیں کر رہے ہو۔'' پروفیسر نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''بہادر اس طرح غول باندھ کر حملہ نہیں کرتے۔ حوصلہ ہے تو اکیلے میدان میں آؤ۔'' اس نے پروفیسر کو کمزور سمجھ کر دھمکی دی۔

''تمہاری دھمکی کا جواب میں دیتا ہوں۔'' کہہ کر علی نے اس کے بال پکڑ لیے پھر جھٹکا دے کر بولا۔ ''اب تم بتاؤ گے ہر سوال کا جواب دو گے۔''

اس شخص کے چہرے پر اذیت کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی مگر اس نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔

''یہ ایسے نہیں بولے گا، طور خان اسے دوا دو۔'' علی نے عمران کے ساتھی سے کہا۔

اس کا وہ ساتھی گویا اسی انتظار میں تھا۔ وہ جھٹکے سے مڑا اور پوری قوت سے ریوالور کا دستہ اس کی گردن پر مارا، ضرب پڑتے ہی وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح چیخا۔ کہیں اس کی آواز کسی کو متوجہ نہ کر لے اس ڈر سے عمران بھاگتا ہوا آیا اور اپنے ریوالور کی نال اس کے منہ میں ٹھونس کر بولا۔ ''اب اگر آواز نکالی تو گولی حلق سے ہوتی ہوئی سیدھی معدے میں دھنسے گی۔''

عمران ہی کا وہ ساتھی تھا جس نے فربہ مائل شخص کو پشت سے اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ اس کے بازو جکڑنے والے کی گرفت میں رہے۔ اس کا نام طور خان تھا۔ اس نے ریوالور کا دستہ اس کے چہرے پر مارا۔ ضرب رخسار پر لگی تھی۔ وہ چیخ پڑا چہرے کی کھال پھٹ گئی تھی اور خون بہہ نکلا تھا۔ دوسری ضرب اس کی پیشانی پر لگی۔ پیشانی سے بھی خون بہہ نکلا۔ اس کا چہرہ خون سے تر ہو رہا تھا۔ داڑھی کے بال بھی خون میں تر ہو گئے تھے۔ وہ بری طرح مچل رہا تھا لیکن پشت سے عمران کے ساتھی نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

طور خان نے آگے جھک کر ایک بار پھر پوچھا۔ ''اب بھی وقت ہے جو پوچھا جا رہا ہے بتا دو۔''

فربہ مائل شخص نے جواب دینے کی بجائے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ طور خان ایک

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دم بھڑک اٹھا۔ اس نے قیدی پر لاتوں اور گھونسوں کی برسات کر دی۔ قیدی بری طرح مچل رہا تھا۔ اسے سنبھالنا مشکل پڑ رہا تھا۔ قیدی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا رہا تھا۔ تبھی پروفیسر آگے بڑھے اور انہوں نے ریوالور کی نال سے اس کی پیشانی کی ایک مخصوص رگ پر ضرب لگائی۔ پتا نہیں اس رگ میں ایسی کیا بات تھی کہ قیدی کا جسم جھٹکے کھانے لگا۔ چند لمحے اسی حالت میں گزرے پھر وہ اذیت بھری آواز میں بولا۔

''پوچھو...... پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''ننگار سے تم لوگوں نے غلام رسول اور ایک انگریز لڑکی کو اغوا کیا ہے اسے کہاں رکھا ہے؟''

''وہ دونوں تہہ خانے میں ہیں۔'' اس نے چہرے کے خون کو آستین سے پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

''انہیں کیوں اغوا کیا ہے؟''

''ہمیں اصل بات کا علم نہیں ہے ارباز کو پتا ہوگا وہی بڑوں کی خبر ہم تک پہنچاتا ہے۔''

''یہ بڑے کون ہیں اور گل باز کہاں ملے گا؟''

''بڑے کسی اور جگہ رہتے ہیں۔ انگریز ہیں مگر پشتو، شینے اور اردو روانی سے بولتے ہیں۔ گل باز بھی نیچے تہہ خانے میں آرام کر رہا ہے۔''

''تہہ خانے کا راستہ کدھر سے ہے؟''

''بڑے کمرے میں بچھی ہوئی ڈائننگ ٹیبل کو داہنی جانب دھکیلنے سے راستہ کھل جائے گا۔''

''اسے یہیں باندھ کر ڈال دو اور میرے ساتھ آؤ۔'' پروفیسر نے کہا۔

قیدی کی مشکیں کسنے کے بعد اسے وہیں ایک جانب بٹھا دیا گیا اور وہ سب دوسرے کمرے میں آ گئے۔ اس کمرے میں ڈائننگ ٹیبل اور اس کے گرد کرسیاں رکھی تھیں۔ ڈائننگ ٹیبل کو داہنی جانب دھکیلا تو فرش پر ایک خلا نمودار ہو گیا۔ وہ سب دبے پاؤں اس خلا میں اترتے چلے گئے۔ نیچے کافی وسیع تہہ خانہ تھا۔ ایک لائن سے کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ پرانے وقتوں میں ایسے تہہ خانے خصوصی طور پر بنائے جاتے تھے تاکہ گرمی میں ٹھنڈک رہے۔ ہوا کی نکاسی کا بھی بہتر نظام تھا کیونکہ سیلن کی بو بالکل نہیں تھی اور نہ گھٹن کا احساس تھا۔

آگے آگے پروفیسر پیچھے باقی لوگ، سب کے سب دبے پاؤں بڑھتے جا رہے تھے۔ تبھی ان میں سے ایک کمرے کے جالی دار دروازے سے انہوں نے غلام رسول کو دیکھ لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے۔ وہ ایک پلنگ پر پڑا تھا۔ پروفیسر نے آگے بڑھ کر اس کمرے کے دروازے کی کنڈی کھولی اور اندر داخل ہو گئے۔ پروفیسر کو دیکھتے ہی غلام رسول کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ کچھ بولتا کہ اس کے پہلے ہی پروفیسر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

غلام رسول کو رسیوں سے آزاد کرانے کے بعد پروفیسر نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''کیتھی کہاں ہے؟''

''شاید برابر والے کمرے میں ہو کیونکہ تھوڑی دیر پہلے اس کی آواز سنی تھی۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھے۔ برابر والے کمرے میں بھی کیتھی نہ ملی۔ اس کمرے میں ایک بھاری تن و توش کا آدمی بے خبر سو رہا تھا۔ تمام لوگ ریوالور تھامے اس کی چارپائی کے گرد کھڑے ہو گئے۔ پروفیسر نے اس کے بال پکڑ کر کھینچا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ گہری نیند سے اٹھا تھا اس لیے پہلے تو وہ کچھ سمجھ ہی نہ پایا مگر جب اتنے سارے ملک الموت کو کھڑے دیکھا تو اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''کون...... کون ہو تم لوگ؟''

''ہم تمہاری موت ہیں، سیدھے سیدھے میرے سوالوں کا جواب دو اگر نہیں دو گے تو پھر انگلی ٹیڑھی کرنا پڑے گی۔''

''پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

''یہ بڑے لوگ کون ہیں اور تم کن لوگوں کے لیے کام کرتے ہو؟'' پروفیسر نے پوچھا۔ اس شخص نے گہری نظروں سے پروفیسر کو دیکھا پھر بولا۔

''تم...... تم پروفیسر عثمان ہو ناں؟''

''ہاں! صحیح پہچانا۔'' پروفیسر نے کہا۔

''میرا نام ارباز ہے۔ تمہارے فرشتے بھی مجھ سے کوئی بات اگلوا نہیں سکیں گے اور نہ تم لوگ یہاں سے بچ کر جا سکتے ہو۔''

''بچ کر میں جاؤں گا اور ساتھ میں تمہیں بھی لے جاؤں گا۔ پھر تمہیں ایسی اذیت ناک موت دوں گا کہ تمہاری آنے والی نسل بھی کانپیں گی۔'' پروفیسر کا لہجہ حد درجہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوفناک تھا۔

''بھگوڑے تُو میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔ ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ تیرے جیسے دسیوں سائنسدانوں کو اپنے تلوے چٹواتا ہوں۔''

''اس کا مطلب یہی ہے کہ تم سیدھی طرح سے جواب نہیں دو گے۔'' کہہ کر پروفیسر نے اس کی پیشانی پر بھی اسی نس پر ضرب لگائی۔ ارباز کا جسم کانپا اور پھر وہ اینٹھنے لگا جیسے اس پر تشنج کا دورہ پڑا ہو۔

''اگر پھر ہیکڑی دکھائی تو اسی طرح مارتا رہوں گا پھر ایک وقت وہ آئے گا کہ تم اذیت سہہ نہ پانے کی وجہ سے مر چکے ہو گے۔'' پروفیسر نے کہا۔

ارباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رہ رہ کر اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ پروفیسر نے اسی نس پر دوبارہ چوٹ لگائی۔ اس بار وہ اتنی زور سے چیخا تھا جیسے اس کے نرخرے پر چھری پھیر دی گئی ہو۔

''بولو، بتاؤ گے یا نہیں یا پھر ایک چوٹ اور لگاؤں؟'' پروفیسر نے اس کی پیشانی سے ذرا سا ہٹ کر ابھر آئی پھولی ہوئی نس کا جائزہ لے کر کہا۔

''بتاتا ہوں۔'' وہ شکستہ لہجہ میں بولا۔ ''مسٹر الفرڈ اور ڈیوڈ یہاں کے بڑے ہیں۔''

''وہ کہاں ملیں گے؟''

''اس کا علم نہیں ہے کیونکہ میں صرف اس علاقے کا انچارج ہوں۔ آپ کے آتے ہی میری ڈیوٹی بڑھ گئی اور تب میری مدد کے لیے دو شخص کو بھیجا گیا۔''

''ان دونوں کی ڈیوٹی کیا تھی؟''

''ان کے ذمے صرف اتنا کام تھا کہ وہ آپ کو ہپناٹائز کر کے یہاں سے نکال لے جائیں مگر درمیان ہی آپ غائب ہو گئے تب اسی پروسیس کو غلام رسول پر آزمایا گیا۔''

''یعنی کہ میں جو خواب دیکھ رہا تھا یہ ہپناٹزم کے ذریعہ دکھایا جا رہا تھا۔''

''جی ہاں۔''

''اور وہ بچہ یعنی علی مدد شاہ؟''

''وہ بھی ہمارے لیے کام کر رہا تھا۔ اس کے لیے اسے موٹی رقم دی گئی تھی۔ بچے کے دادا کو ہم نے رقم دی تھی مگر درمیان میں اس نے غداری کر دی یعنی آپ کو مقبوضہ کشمیر بھجوا دیا یہاں کے لوگ بہت زیادہ توہم پرست ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسد الکبیر کی جو تصویر یہاں ملتی ہے اس تصویر میں آپ کی جھلک ہے اس نے سوچا کہ کہیں واقعی آپ

اسد الکبیر تو نہیں ہیں۔ اس لیے اس نے بطور کفارہ آپ کے جانے کی بات چھپا لی۔ لڑکے پر بھی ہپناٹزم کرنے نہیں دے رہا تھا۔ ادھر ہمارا بندہ ہپناٹزم کی ریز بھیجتا اور ادھر وہ ڈھول بجانا شروع کر دیتا۔ جس کی وجہ سے ہپناٹزم کا اثر خاک میں مل جاتا ہے۔''

''اب آگے کیا پروگرام ہے؟''

''آپ کے یہاں آنے سے پہلے ہم ایک خاص مشن پر کام کر رہے تھے۔ اگر آپ نہیں آتے تو اب تک ہم بہت کچھ کر چکے ہوتے۔''

''وہ مشن کیا ہے؟''

''ہمیں حکم ملا تھا کہ ایران سے آنے والی مشینوں کو تباہ کر دیں۔''

''تمہیں پتا ہے وہ مشینیں کیسی ہیں؟''

''وہ ایٹمی پلانٹ کے فاضل پرزے ہیں۔''

پروفیسر عتاج سوچ میں پڑ گئے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ اس خطے میں امریکہ کے طویل المدت مفادات وابستہ ہیں۔ جب تک ایران میں رضا شاہ پہلوی کا اقتدار مستحکم تھا تو امریکی مطمئن تھے۔ انہیں بے فکری تھی کہ اس علاقے میں ہمارا چوکیدار موجود ہے۔ لیکن شاہ کے عبرت ناک زوال کے بعد سو سالہ مستحکم بادشاہت کا خاتمہ ہوتے ہی ان لوگوں نے ایران سے منہ موڑ لیا۔ ان کا خیال تھا کہ آزادی اور مغربی بے راہ روی کی دلدادہ قوم جن کی راتیں نائٹ کلبوں، شراب خانوں اور قحبہ خانوں میں کٹتی ہیں وہ مذہبی قیادت کو، ان کے پیش کردہ اصولوں کو، اسلامی انقلاب کو قبول نہیں کرے گی لیکن اسلامی انقلاب کا ایک سال پورا ہونے کے بعد بھی جب عوامی جوش میں کمی نہ آئی اور نہ عوامی حمایت کم ہوئی تو امریکی قیادت نے ایران کا مشاہدہ کرنے کی پالیسی ترک کر کے کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اسلام کے نام پر کسی بھی شکل میں کوئی انقلاب کامیاب ہو۔ اس پر طرہ یہ کہ مرے پر سو درے ایرانی رہنما آیت اللہ خمینی نے اور جما دیے۔ انقلاب کی پہلی سالگرہ کے موقع پر بیان دے دیا کہ اب ہماری منزل فلسطین ہے جہاں خداوند کریم کی ٹھکرائی ہوئی قوم یہودی خدا کی پسندیدہ قوم مسلمان پر ظلم ستم کی انتہا کیے ہوئے ہے اس ظلم کا سد باب ضروری ہے، دنیا کے تمام مسلمانوں کے نام میرا پیغام ہے کہ ہر مسلمان اپنے اپنے گھر سے صرف پتھر لے کر نکلے اور میرے ساتھ چلے۔ اگر ہر مسلمان نے ایک ایک پتھر اس ملک پر پھینکا تو وہ کوہ اسرائیل بن جائے گا۔ ایک ایک بالٹی پانی پھینکا تو وہاں بحرِ اسرائیل بن جائے گا۔ امریکی اسرائیلیوں کے خلاف

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کب کچھ سننا پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے سازشوں کا جال بننا شروع کر دیا۔ ایک طرف عربوں میں چھپے ہوئے اپنے ایجنٹوں کو ایران کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے پر مقابلہ کرنے پر اکسانے لگے تو دوسری طرف ایران کے مغربی صوبے جہاں کردوں کی اکثریت ہے انہیں بغاوت پر آمادہ کرنے لگے۔ تیسری طرف پاکستان سے تعلقات بگاڑنے کا جواز پیدا کر لیا۔ انہیں سب سے بڑا ڈر یہی ہے کہ ایران پاکستان سے پینگیں نہ بڑھالے کیونکہ پاکستان اس خطے کی ایک بڑی قوت ہے ایٹمی قوت بن بھی سکتا ہے۔

سیاسی میدان میں ایسی منافقانہ چال کی کامیابی کے امکانات صفر تھے کہ دونوں حکومتوں کو ایک دوسرے سے بدظن کرا دیا جائے جبکہ خفیہ چالیں زیادہ کامیاب ثابت ہوتیں۔

ان لوگوں کو شاید معلوم ہو چکا تھا کہ ایرانی بندرگاہ کے راستے آٹھ سوٹن وزنی حساس ایٹمی آلات اور سازوسامان پاکستان آ رہا ہے۔ پاکستان جس نے بیرونی امداد کے بغیر ہی ایٹمی استعداد حاصل کر لی ہے، اگر اسے یہ آلات مل گئے تو وہ یقینی طور پر ایٹمی قوت بھی بن جائے گا۔ شاید اسی خوف سے یہ سازش رچائی گئی ہے کہ آلات کو راستے میں تباہ کر دیا جائے۔

''یہ کام تم لوگ کیسے کرو گے؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''بہت آسانی سے۔ اس آٹھ سوٹن وزنی کھیپ میں ایک ایٹمی ہیٹ ایکس چینجر بھی ہے جس کے بیرونی آہنی خول کے اندر ایک خوفناک قوت کا ڈائنا مائٹ چھپا ہوا ہے۔ عام حالات میں یہ ڈائنا مائٹ بالکل بے ضرر ہے ایران میں ان آلات کی تنصیب ہو جاتی تو ڈائنا مائٹ کی موجودگی سے پلانٹ کی کارکردگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس ڈائنا مائٹ کو اڑانے والے برقی سرکٹ کے لیے ایک کیڈمیم کی بیٹری لگی ہوئی ہے۔ بیٹری کو تاروں سے منسلک کرنے کے لیے اندرونی حصے میں ایک لیور ہے جسے دبا کر اٹھا دینے سے بیٹری سے سوئچ تک برقی رو دوڑ جائے گی اور وہ کام کرنے کی پوزیشن میں آ جائے گا۔ وہ حساس سوئچ خلا میں موجود سیارے کے سگنل سے بہ آسانی حرکت میں آ جائے گا۔ ہمیں اس لیور کے بارے میں اچھی طرح بریفنگ دی گئی ہے۔ میرا کام صرف اتنا ہو گا کہ اس لیور کو دبا کر اوپر اٹھا دوں، اس کے بعد کا کام ان کا ہو گا۔ ایک میل کے رقبے میں ہر چیز تباہ ہو جائے گی۔

پروفیسر کانپ اٹھے کہ آلات تو تباہ ہوں گے ہی، تباہی کی وسعت کا فائدہ اٹھا کر

وطن عزیز کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ بھی شروع ہو جائے گا کہ یہ ایٹمی دھماکہ ہے اور غلطی سے ہو گیا ہے۔

''اچھا یہ بتاؤ کیتھی کہاں ہے؟''

''وہ برابر والے کمرے میں ہے۔''

پروفیسر نے عمران سے کہا کہ وہ اس کی مشکیں کس دے اور خود برابر والے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اس کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر کیتھی سوئی ہوئی تھی۔ وہ بالکل آزاد تھی اور اطمینان سے سو رہی تھی جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو۔ پروفیسر کے آواز دینے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''سر آپ؟''

''تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' پروفیسر نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔

''نہیں تکلیف کیسی۔'' پھر سنبھل کر بولی۔ ''قید میں تکلیف بھی آرام کہلاتی ہے۔ میں ایک قیدی ہوں، قیدی ہو کر زیادہ کچھ سوچ نہیں سکتی۔ قسمت کا لکھا سمجھ کر سب جھیل لیتی ہوں۔''

''چلو غلام رسول کے کمرے میں چلتے ہیں وہیں آرام سے باتیں ہوں گی۔''

''وقت کم ہے۔ یہاں اچھے خاصے لوگ ہیں میرا اندازہ ہے سات آٹھ بندے ہیں۔ سامنے صرف دو آئے تھے۔ باقی کی میں آواز سنتی تھی۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''یہی کہنا چاہتی ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے نکل چلیں۔''

''پہلے غلام رسول کے پاس تو چلو۔''

جب وہ لوگ وہاں پہنچے تو قیدی بندھا پڑا تھا۔ باقی سب لوگ مستعد کھڑے تھے۔ کیتھی کو دیکھ کر غلام رسول نے کہا۔ ''ارے تم اب تک کہاں تھیں۔''

''میرے کیا پنکھ تھے جو میں اڑ جاتی، برابر والے کمرے میں بندھی پڑی تھی۔''

''ان لوگوں کے ساتھ ایک سفید چمڑی والا بھی تو تھا میں نے سمجھا کہ اس نے تمہیں آزاد کر دیا ہو گا۔'' غلام رسول بولا صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ کیتھی پر طنز کر رہا ہے۔

''یہ لڑنے جھگڑنے کا وقت نہیں ہے۔ چلو پہلے باہر نکلتے ہیں پھر جتنا جی میں آئے لڑ لینا۔'' پروفیسر نے سمجھایا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عمران نے عادل کے ساتھ مل کر قیدی کو اٹھایا اور باہر نکلنے والی سیڑھی پر چڑھتا چلا گیا۔ ایک کے بعد ایک سیڑھیاں طے کر کے وہ سب اوپر آئے۔ تہہ خانے سے نکلنے کے بعد انہوں نے بے ہوش پڑے شخص کی طرف دیکھا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ قیدی کو چاول کی بوری کی طرح اندر پھینکا اور سیٹوں پر بیٹھ گئے۔

گاڑی نگار کی طرف چل پڑی۔

راکا پوشی کے پیچھے سے سورج اپنا چہرہ ابھار رہا تھا جب وہ لوگ نگار پہنچے۔ نگار پہنچتے ہی قیدی کو حویلی کے تہہ خانے میں پھینکا اور دروازہ بند کر کے سب اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔

دن سوتے جاگتے گزر گیا۔ شام کو ایک ایک کر کے سب اپنے کمرے سے باہر لان میں نکلے۔ انور نے کرسیاں ڈال دی تھیں وہ سب اس پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''اگر ارباز خان کی بات صحیح ہے تو ہم بری طرح بے وقوف بنے۔'' غلام رسول نے کہا۔

''کیا؟ کس نے بے وقوف بنایا ہے؟'' عمران نے چائے کا سپ لے کر پوچھا۔

''ابتداء سے تمہیں بتاتا ہوں بغور سنو۔'' کہہ کر غلام رسول نے چائے کی پیالی کو ٹیبل پر رکھا پھر منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے سونف کھا کر بولا۔ ''ہم یہاں آئے تھے ایک خاص مقصد سے۔ پروفیسر صاحب کا ارادہ ہے کہ یہاں ایک بڑی لیبارٹری بنائیں گے اور وہ تجربات جو انہوں نے امریکہ میں شروع کیے تھے اسے پورا کریں گے۔ لیبارٹری ابھی زیر تکمیل تھی کہ یہ پھڈے شروع ہو گئے۔ ہمیں ایک ایسا بچہ ملا جو فرفر انگلش بولتا تھا جبکہ اس علاقے کے لوگ صحیح طور پر اردو بھی نہیں بول سکتے۔ اس کی انگریزی پر ہم حیران ہی ہو رہے تھے کہ پروفیسر کو بتایا گیا کہ ان کی شکل یہاں کے ایک مقدس شخص اسد الکبیر سے ملتی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دوبارہ جنم لے گا پھر پروفیسر نے ایک قسط وار خواب دیکھنا شروع کر دیا جس میں وہ اسد الکبیر کی شکل میں ہوتے۔''

''کہانی تو بڑی دلچسپ ہے کسی ڈائجسٹ میں ضرور چھپ جائے گی۔'' عمران نے ہنستے ہوئے کہا۔

''واقعی یہ سچ ہے۔ جن دنوں پروفیسر صاحب نگار سے باہر تھے بالکل ویسا ہی قسط وار خواب مجھے بھی نظر آنے لگا تھا۔ جانتے ہو اس کی وجہ کیا تھی؟''

''کیا؟''

''ارباز نے بتایا کہ وہ لوگ ہمیں ہپناٹائز کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ہمارے ذہن پر قبضہ کرتے جا رہے تھے۔ انہیں حتمی قدم اٹھانے کے لیے اپنے آقاؤں کے حکم کا انتظار تھا۔'' غلام رسول بولا۔ ''حکم ملتے ہی وہ ہمارے دماغ کو الٹ دیتے۔ ایسا زبردست کرنٹ دیتے کہ ہم پاگل ہو جاتے یا ان کے حکم پر غلام بن جاتے۔''

''تو اب کیا ارادہ ہے؟ تم بھی انہیں پاگل کرنا چاہتے ہو؟''

''نہیں! ہم انہیں تلاش کر کے سبق سکھانا چاہتے ہیں۔ شیر اتنا خطرناک نہیں ہوتا کیونکہ وہ سیدھے سیدھے حملہ کرتا ہے۔ دیمک زیادہ خطرناک شے ہے۔ وہ اندر ہی اندر چاٹ جاتی ہے۔ ایسے دشمن دیمک جیسے ہیں، اپنے پیارے وطن کی بقا کے لیے ایسے دیمک کا سدِ باب زیادہ ضروری ہے۔''

''انہیں کہاں ڈھونڈو گے جب کہ ارباز کو بھی پتا نہیں ہے کہ وہ کہاں ملیں گے۔''

''پشاور سے کراچی تک ہم ایک ایک گلی میں انہیں ڈھونڈیں گے۔ انشاء اللہ کامیابی ہمارا مقدر ٹھہرے گی کیونکہ ہم حق پر ہیں۔ یہ مملکت خداداد بے والی وارث نہیں ہے اس کے وارث موجود ہیں اور وہ ہیں صوفیہ کرام، صحابہ اجمعین، رسول و آل رسول ان سب کی ہمیں مدد حاصل ہے اس لیے مجھے پختہ یقین ہے کہ دشمنان پاکستان کو ہم کیفر کردار تک پہنچا کر رہیں گے۔''

''تو پھر دیر کیسی تیاری شروع کر دینا چاہیے۔'' کیتھی نے کہا۔

☆======☆======☆

پروفیسر عثمان کی جیپ دوڑ رہی تھی۔ اس کا رخ اسکردو کی طرف تھا۔ ان کے ساتھ غلام رسول، کیتھی اور عمران تھے۔ انہوں نے ٹھان لیا تھا کہ وطن دشمنوں کو پاتال سے بھی کھینچ لائیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ دیمک لکڑیوں کو کھاتی ہے اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ یہ غیر ملکی دشمن بھی دیمک کی طرح ہیں۔ وطن عزیز کو کھوکھلا کرنے آئے ہیں۔ انہیں ختم کرنا ضروری ہے۔ لیبارٹری سلامت ہے۔ تجربہ ہوتا رہے گا۔ خلیہ پر نئی تھیوری کبھی بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ نئی تھیوری پیش کرنے کے لیے اور نئے تجربے کرنے کے لیے ذہن کا پرسکون ہونا ضروری ہے اور ذہن تبھی پرسکون ہو سکتا ہے جب وطن کی سلامتی پر خطرہ یا سالمیت پر آنچ محسوس نہ ہو، یہ وطن دشمن آنچ تیز کرنے آئے ہیں انہیں کھدیڑنا بہت ضروری ہے اور وہ انہیں کھدیڑنے کے لیے ہی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نکلے تھے۔ انور اسکردو تک ان کے ساتھ تھی پھر وہاں سے وہ بذریعہ ہوائی جہاز اسلام آباد پہنچے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قیدی نے بتایا کہ ''بڑے لوگ'' اسلام آباد میں روپوش ہیں ان کے چہروں سے نقاب نوچنے کے لیے ہی وہ اسلام آباد جا رہے تھے۔ اسلام آباد میں عمران کے ایک ساتھی کا خالی بنگلہ تھا وہ اسی بنگلے میں ٹھہرتے۔

ابھی انہوں نے آدھا راستہ طے کیا تھا۔ جس سڑک پر وہ چل رہے تھے وہ کسی بیوہ کی مانگ جیسی سونی تھی۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ دور دور تک آبادی کا نشان نہ تھا۔ ایک طرف فلک بوس پہاڑ تھے تو دوسری طرف گہری گہری کھائیاں۔ کھائیاں بھی ایسی کہ راستہ دکھائی نہ دے، اوپر سے لڑھکنے والی گاڑیاں پرزوں میں تبدیل ہو جائیں۔ اسی لیے عمران نہایت محتاط انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کی ذرا سی چوک موت کا سامان بن سکتی تھی۔ اس نے پجیرو کی اسپیڈ ساٹھ میل فی گھنٹے سے بھی کم رکھی تھی۔ یہی ہلکی رفتار اس کے کام آ گئی۔ وہ ایک اندھا موڑ تھا۔ موڑ سے مڑتے ہی وہ چونک اٹھا تھا۔ سڑک کے بیچوں بیچ ایک وین کھڑی تھی۔ وہ اس طرح ترچھی کھڑی تھی کہ اسے کراس کرنا ممکن نہیں تھا۔ عمران نے بریک پر دباؤ بڑھا دیا۔ پجیرو رک گئی۔ ابھی وہ لوگ اترے بھی نہیں تھے کہ ان کی گردنوں سے کلاشنکوف کی ٹھنڈی نالیاں آ لگیں۔

سب کے سب حیران تھے۔ یہ کون لوگ ہیں۔ کیا ڈاکو ہیں۔ لوٹنا چاہتے ہیں مگر یہ تجسس قائم نہ رہ سکا۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''پروفیسر عثمان تمہارے لیے پیغام ہے۔'' پھر اس نے وائرلیس کا ہیڈ فون بڑھا دیا۔ وہ لانگ رینج کا وائرلیس سسٹم تھا۔ اس میں سے آواز آ رہی تھی۔ ''کیسے ہو پروفیسر؟ تم ہماری نظروں سے چھپ نہیں سکتے۔ پچھلے دنوں ہم دیگر معاملات میں الجھے ہوئے تھے، اسی کا تم نے فائدہ اٹھایا تھا اور مقبوضہ علاقے کی طرف نکل گئے تھے۔ اب ہم پوری طرح ہوشیار ہیں۔''

''تم میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔ میں خود تم لوگوں کو سزا دینے آ رہا ہوں۔''

''بلی صرف خواب دیکھ سکتی ہے ہر وقت اسے چھیچھڑے نہیں ملتے۔ خوش ہو لو کیونکہ کچھ دیر بعد تم سب ہماری قید میں ہو گے۔''

ابھی وہ لوگ باتوں میں ہی مشغول تھے کہ عمران اور غلام رسول نے ہاتھ دکھا دیا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ جھٹکے سے دروازہ کھول دیا تھا۔ کلاشنکوف بردار دروازوں سے ٹکرا کر لڑکھڑا گئے تھے۔ ان کے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ دونوں نے برق رفتاری دکھائی تھی اور اب کلاشنکوف ان کے ہاتھوں میں تھیں۔

''لو بھئی تمہارے گرگے ہمیں گرفتار کیا کریں گے خود گرفتار ہو گئے ہیں۔'' پروفیسر

عثمان نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔

''آگے تو بڑھو پھر دیکھنا تمہاری کس طرح پذیرائی ہوتی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

''اب کیا کیا جائے؟'' کیتھی نے تفکر بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اس وین کو دیکھو بلکہ اسے دھکا دے کر کھائی میں لڑھکا دو۔'' پروفیسر نے کہا۔

غلام رسول اور عمران نے جا کر اس کا معائنہ کیا۔ وہ الٹے رخ پر کھڑی تھی۔ عمران نے اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا اور اسٹیئرنگ موڑ کر نیچے کود گیا۔ وین گیئر فری ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی کھائی میں جا گری۔

''خس کم جہاں پاک، چلو اندر بیٹھو!'' پروفیسر نے کہا۔

''ان قیدیوں کا کیا کرنا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''سانپ کو زندہ چھوڑنا عقلمندی نہیں ہے۔'' غلام رسول بولا۔

عمران نے برسٹ چلایا اور اس اطمینان سے گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس نے رفتار زیادہ تیز نہیں رکھی تھی پھر بھی جتنی رفتار سے گاڑی آگے بھاگ رہی تھی اتنی ہی تیزی سے ان سب کا ذہن بھی دوڑ رہا تھا۔ سب اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ ہر ایک کی اپنی سوچ تھی مگر خیال سب کا ایک ہی تھا۔ ایک ہی نکتے کو وہ سب اپنی اپنی سوچ میں پرو رہے تھے۔ خیالوں کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔

دوڑتے گھوڑے اور اڑتے خیالوں کو یکایک روکا نہیں جا سکتا مگر ان کے خیالات یکایک بکھر گئے تھے۔ پہاڑی سڑک پر کچھ ایسے موڑ ہوتے ہیں۔ جنہیں اندھا موڑ کہتے ہیں۔ اس بل کھاتی سڑک پر بھی جگہ جگہ اندھے موڑ تھے، ایسے موڑ کہ آگے سے آنے والی گاڑی نظر نہ آئے اور نہ ادھر سے جانے والی گاڑی کو اُدھر کی سڑک نظر آئے۔ پہاڑی کی اوٹ پردہ بنی ہوتی ہے اسی لیے ان سڑکوں پر محتاط ڈرائیونگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمران بھی بڑی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اس نے اپنی سپیڈ بھی کم کر لی تھی اسی لیے ایک اندھے موڑ پر مڑتے ہی ایک دھماکہ ہوا تھا۔ دھماکے نے سب کو چونکا دیا تھا۔ پجیرو لہرانے لگی تھی۔ عمران نے پھرتی سے گاڑی روک لی تھی۔ ایک کے بعد ایک سب نیچے اتر آئے تھے۔ پچھلا ٹائر پھٹ چکا تھا۔

''لگتا ہے کوئی نوکیلا پتھر آ گیا تھا۔'' عمران نے خیال ظاہر کیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نہیں!" پروفیسر نے ٹائر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "دشمن یہیں کہیں گھات میں ہے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"صاف سیدھی بات ہے، غور سے دیکھو، سوراخ والی جگہ پر جلنے کا نشان ہے پتھر سوراخ کرتا ہے، جلاتا نہیں ہے۔" پروفیسر کے کہنے سے سب ہوشیار ہو گئے۔

"اس کا مطلب ہے کچھ لوگ ان پہاڑوں میں موجود ہیں۔" کیتھی نے کہا اور اپنا ننھا سا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ عمران شکاریوں کی طرح چاق و چوبند ہو کر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ایک پہاڑی چٹان کے عقب میں اسے کسی قدر نرم زمین نظر آئی۔ اس زمین پر ٹائروں کے نشانات دیکھ کر وہ مزید ہوشیار ہو گیا۔ گاڑی یہاں تک پہنچی کیسے؟ یہ سوچتے ہوئے وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا پھر تھوڑے فاصلے پر اسے دو چٹانوں کے درمیان وہ درہ نظر آ گیا جہاں سے گاڑی یہاں تک آ سکتی تھی۔ باقی لوگ سڑک پر تھے۔ اس نے انہیں بلانے کی ضرورت نہ سمجھی اور اکیلا ہی آگے بڑھنے لگا۔ آگے جا کر وہ ڈھلان میں اتر گیا تھا۔ بڑی عجیب جگہ تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے ایک شاندار گاڑی کو دیکھا۔ غالباً پرانی قسم کی لینڈ کروزر تھی مگر چمچما رہی تھی جیسے بالکل نئی ہو۔ وہ اس طرح کھڑی ہوئی تھی جیسے آس پاس کوئی موجود نہ ہو۔

وہ بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ پستول اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور عقابی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کے کان آہٹ پر لگے ہوئے تھے لیکن اس نے اس آہٹ کو محسوس نہیں کیا جو اچانک ہی عقب میں ابھری تھی البتہ جب ایک پتھر کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی تو وہ پلٹ کر ادھر دیکھنے لگا اور دوسرے ہی لمحے چونک اٹھا۔ اس نے چار افراد کو دیکھا تھا، تین مرد تھے اور ایک عورت۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف نظر آ رہی تھی۔ اس کا رخ اسی کی جانب تھا۔ فوراً ہی ان میں سے ایک مرد کی خوفناک آواز ابھری۔

"یقینی طور پر تم سمجھدار آدمی ہو اور ہماری ہدایت پر عمل کرو گے۔ سب سے پہلے یہ پستول اس طرف پھینک دو لیکن اس طرح کہ نشانہ بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔"

کلاشنکوف کی موجودگی میں ایک پستول کس قدر بے وقعت تھا وہ اس بارے میں بخوبی جانتا تھا۔

دوسرا آدمی پھر غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش تمہارے

حق میں بہتر نہیں ہوگی، پستول پھینک کر ہاتھ اوپر کر لو۔"

دوسرے آدمی کی آواز بے پناہ سخت تھی۔ یہ لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا اور خاصا خطرناک معلوم ہوتا تھا جب کہ لڑکی کافی خوبصورت تھی اور اس نے جینز پہن رکھی تھی۔

وہ ایک لمحے تک سوچتا رہا کیا کیا جائے۔ ابھی وہ لوگ پوری طرح ہوشیار تھے۔ اس کی ہلکی سی لغزش خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لیے ابھی مناسب موقع کا انتظار کیا جائے۔ یہی سوچ کر اس نے پستول ان کی طرف زور سے اچھال دیا۔ اب صورتِ حال سے سمجھوتہ کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس پستول کو لڑکی نے آگے بڑھ کر اٹھا لیا۔ اسے چہرے کے قریب کر کے دیکھا پھر اس کی نال پر پھونک مار کر اسے اپنے ہاتھ میں ہی دبا رہنے دیا۔ پھر وہ لوگ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ چند لمحوں بعد وہ اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔

قریب پہنچنے پر عمران کو اندازہ ہوا کہ یہ لوگ مقامی نہیں ہیں بلکہ وہ سب سفید فام ہیں۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں دیکھنے لگا تو ان میں سے ایک نے کہا۔ "اچھے بچے ہو، اب یوں کرو کہ لینڈ کروزر کی جانب مڑو اور چلتے رہو لیکن خبردار ابھی ہم نے تمہاری تلاشی نہیں لی ہے۔ اگر تمہاری جیب میں کوئی ہتھیار ہے تو اسے نکالنے کی کوشش نہ کرنا۔"

عمران نے کوئی جواب نہیں دیا اور دونوں ہاتھ بلند کیے لینڈ کروزر کی جانب بڑھنے لگا لیکن یہ لمحات اس کے لیے سوچنے کے لمحات تھے کہ خود کو ان کی تحویل میں دے دے یا پھر ان کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کرے۔ دونوں میں سے کیا بہتر رہے گا وہ سوچ رہا تھا۔

وہ لوگ اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے اور شاید اس دوران میں اس کے بارے میں یہ اندازہ لگانے لگے تھے کہ وہ ایک بزدل آدمی ہے جو خاموشی سے ان کے احکامات پر عمل کر رہا ہے۔ یہی بہتر موقع تھا کہ وہ انہیں ڈاج دے دے۔ چنانچہ عمران نے کنکھیوں سے پیچھے کی طرف دیکھا پھر اس نے ایک لمحہ کے لیے حالات کا تجزیہ کیا۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ فاصلہ کم کر رہے تھے اور اب اس سے اتنے پیچھے تھے کہ اگر وہ ایک الٹی چھلانگ لگاتا تو ان تک پہنچ جاتا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں دبے ہوئے ہتھیار بھی اب لاپرواہی کے انداز میں پکڑے ہوئے تھے اور وہ باآسانی مار کھا سکتے تھے۔ پھر تھوڑے فاصلے پر ایک ہلکا سا نشیب آیا۔ اس کے فوراً بعد وہ لینڈ کروزر تک پہنچ جاتے لیکن نشیب میں اترنے کی بجائے اس نے نشیب کے کنارے ہی سے اچانک اپنے بدن کو تولا اور الٹی چھلانگ لگا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دی۔ عمران اس شخص پر جا پڑا تھا جس نے کلاشنکوف سنبھال رکھی تھی اس کے دونوں ساتھی اور وہ لڑکی ذرا پیچھے تھے کیونکہ یہی اپنی دانست میں عمران کو کور کیے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے عمران اس کے شانوں پر رکا اور دوسرے ہی لمحے اس نے ایک زوردار لات اس کی کلاشنکوف پر رسید کردی۔ چونکہ عمران کا یہ عمل غیر متوقع اور انتہائی سخت تھا اس لیے وہ کچھ نہ سمجھ سکے اور جو شخص کلاشنکوف سنبھالے ہوئے تھا صرف اس لات بلکہ بقیہ وزن کو بھی برداشت نہ کر سکا اور پتھریلی زمین پر بری طرح گرا۔ عمران کے پورے بدن کا بوجھ اس وقت اس کی گردن پر تھا چنانچہ اس کا سر اس قوت سے زمین سے ٹکرایا کہ خاصی زوردار آواز سنائی دی۔ پیچھے موجود لوگ جو صورتِ حال کو سمجھ نہیں پائے تھے ہوشیار ہوئے اور عمران کی طرف لپکے اور ان میں سے دو افراد نے ایک دم چھلانگیں لگائیں۔ عمران تو کروٹ بدل کر ایک طرف ہٹ گیا لیکن اس بدبخت کی شامت ہی آ گئی تھی جو اب عمران کی بجائے ان دونوں کے نیچے دب گیا تھا اور چونکہ نیچے چٹان تھی جس میں نوکیلے پتھر بھی تھے۔ یہ پتھر دو افراد کی قوت کے ساتھ نیچے سے اس کے سینے میں چبھے اور اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ دوسری چیخ اس لڑکی کی تھی جو ان کے ساتھ تھی اور بدحواسی میں اپنے گرے ہوئے ساتھیوں کو دیکھ رہی تھی اس سے پہلے کہ وہ کوئی عمل کرتی عمران نے پھرتی سے ایک بار پھر چھلانگ لگائی اور لڑکی کے بال اس کی مٹھی میں آ گئے۔ وہ اسے رگڑتا ہوا زمین پر لے گیا اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔

اسی دوران میں وہ دونوں افراد موقع پا کر اس کے قریب آ گئے تھے اور اس بار عمران لڑکی کو چھوڑ کر ان دونوں کو ڈاج دینے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ ان کی گرفت میں آ گیا تھا لیکن اچانک ہی اس نے ان کی گرفت میں ہی ایک کو زوردار لات ماری وہ کراہتا ہوا نیچے گرا لیکن اس نے عمران کو پکڑ ہی لیا تھا۔ جس طرف وہ دونوں گرے تھے وہاں بھی ایک نشیب تھا۔ وہ دونوں نشیب میں لڑھکنے لگے۔ وہ شخص جو پہلا شکار تھا نہ جانے کس عالم میں تھا اور دوسرا لڑکی کو سنبھال رہا تھا اور تیسرا آدمی عمران کے ساتھ نشیب میں گتھم گتھا تھا۔ نیچے لڑھکتے ہوئے عمران کے بدن میں نوکیلے پتھر چبھ رہے تھے۔ اس کا سر بھی کئی بار پتھروں سے ٹکرایا تھا۔ اسے خاصی تکلیف محسوس ہو رہی تھی پھر بھی وہ اپنے حواس کو سنبھالے ہوئے تھا اور مسلسل اسی کوشش میں تھا کہ زیادہ تر چوٹ اس کے مقابل کو پہنچے اور اس کا جسم اوپر ہی رہے۔ اسے اس عمل میں مکمل کامیابی تو حاصل نہیں ہو سکی تھی لیکن خاصی حد تک اس نے کامیابی حاصل کر لی تھی اور اپنے حواس کو بچانے کی کوشش میں

کامیاب ہو گیا تھا۔ پھر وہ ڈھلان پر رکے ہی تھے کہ عمران کا ہاتھ اپنے بدن سے لپٹے ہوئے شخص کی پیٹی سے ٹکرایا جس میں ریوالور موجود تھا چنانچہ دوسرے ہی لمحے اس نے ریوالور کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور اس کے بعد پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈھلان پر اوپر سے وہ لوگ نظر آ رہے تھے۔ غالباً وہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے بس ہکا بکا کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے کہ عمران نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے فائر کر دیا۔ لڑکی کے داہنی جانب کھڑا شخص تیورا کر گرا۔ لڑکی زور زور سے چیخنے لگی۔ فائر، پھر لڑکی کی چیخ شاید یہی آوازیں پروفیسر اور غلام رسول کو ادھر کھینچ لائی تھیں۔ وہ دونوں آگے بڑھ ہی رہے تھے کہ دوسرا فائر ہوا اور لڑکی بھی کسی گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی نیچے آ گئی۔ تیسرا شخص اوپر بے ہوش تھا۔ عمران نے اس پر بھی فائر کر دیا۔

''عمران...... عمران...... خیریت تو ہے؟'' پروفیسر نے جھانک کر پوچھا۔

''جی ہاں! اوپر ابھی بھی ایک زندہ ہو گا۔ ہوشیار رہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔

''غلام رسول نے اس کی مشکیں کس دی ہیں تم بے فکر رہو اور اوپر آ جاؤ۔'' پروفیسر نے کہا۔

''میں پہلے دیکھ لوں ان میں کوئی زندہ تو نہیں رہ گیا۔'' کہہ کر عمران نے ایک ایک کر کے تینوں کے جسموں کو ٹٹول کر دیکھا۔ اس کا نشانہ بے خطا تھا۔ تینوں کی پیشانی پر روشن دان کھلے تھے۔ ایسی حالت میں کسی کا زندہ بچنا ناممکن سی بات تھی۔ وہ تینوں بھی مر چکے تھے اس لیے عمران نے انہیں چیل کوؤں کی ضیافت کے لیے چھوڑ دیا۔

اوپر پہنچ کر اس نے کہا۔ ''پروفیسر صاحب! یہ تو پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔''

''لگتا ہے ان کا نیٹ ورک بہت مضبوط ہے مگر فکر نہ کرو جس کا حامی ہو خدا اس کو مٹا سکتا ہے کون۔''

''یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ ہمیں ایک کلیو مل گیا۔ بے ہوش شخص سے ہم با آسانی معلوم کر لیں گے کہ ان کا نیٹ ورک کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔''

''ہاں یہ سب گورے ہیں یعنی کہ اوپر کے لوگ ہوں گے یا پھر یہی لوگ سربراہ ہوں گے۔''

عمران نے بے ہوش شخص کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا اور واپس سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے زخمی کو پجیرو میں پٹخا اور خود سیٹ پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اس کے جسم پر جھولتے ہوئے کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ قمیض کئی جگہ سے پھٹ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چکی تھی۔

پروفیسر عثمان نے غلام رسول سے کہا کہ وہ عمران کے زخموں کو دیکھ لے کہ کہیں کوئی گہرا زخم نہ ہو اور خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ اسٹپنی لگانے کو تو غلام رسول نے لگا دی تھی مگر اس پر بھروسہ نہیں تھا کہ کب وہ داغِ مفارقت دے جائے اس لیے پروفیسر نے رفتار کم کر رکھی تھی۔ پھر انہیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں کوئی تیسری پارٹی بھی کسی موڑ کے عقب میں بیٹھی نہ ہو۔

کچھ دور جاتے ہی زخمی کی کراہ گونجی تو پروفیسر نے کہا۔ ''ان صاحب کا نام پتا تو پوچھ لو پھر موقع نہیں ملے گا۔''

عمران تو گویا اسی انتظار میں تھا۔ اس نے پستول کا دستا اس کے ٹخنے پر مارا پھر بولا۔ ''ہاں میاں سفید طوطے شروع ہو جاؤ۔''

''تم...... تم لوگ بہت پچھتاؤ گے۔'' زخمی نے کراہتی ہوئی آواز میں دھمکی دی۔

''پچھتانا تو ہمارا مقدر ہے۔ ہم تو پچاس سال سے پچھتا رہے ہیں۔ ورلڈ بینک سے قرضہ لینے پر پچھتا رہے ہیں، پتا نہیں کس کس بات پر پچھتا رہے ہیں اس لیے ہماری فکر چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ یہاں تمہارے کتنے گرگے ہیں اور وہ کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔''

''تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری بات مان لوں گا اگر میری زبان کھلوا سکتے ہو تو کھلوا لو۔'' سفید فام نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اندرونی تکلیف کی وجہ سے اس کی مسکراہٹ مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

''یہ ایسے نہیں مانے گا۔'' غلام رسول نے کہا۔ ''اسے مولا بخش کی زیارت کراؤ یا میں مدد کے لیے آ جاؤں۔''

''آپ فرنٹ سیٹ پر ہی بیٹھے رہیں میں ابھی اس کی زبان کھلواتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے پستول کے دستے کو زخمی کے ٹخنے پر دوبارہ مارا، زخمی کراہ اٹھا۔ اذیت اس کے چہرے سے عیاں تھی مگر وہ زبان کھولنے پر تیار نہ تھا۔ عمران نے اپنی پنڈلی پر بندھے شکاری چاقو کو نکالا اور اس کی نوک کو زخمی کی پیشانی پر چھو کر بولا۔ ''ٹھیک ہے تم کچھ نہ بولو بس مجھے اپنا کام کرنے دو۔ کافی عرصے سے میں نے کسی زندہ انسان کی کھال نہیں اتاری۔ پیشانی سے کھال اتارنا زیادہ آسان ہے تجربہ کر لیتا ہوں۔'' پھر اس نے ایک لمبی لکیر کھینچ دی۔ خون کے قطرے پیشانی پر نمایاں ہو گئے جو آہستہ آہستہ ایک سرخ لکیر کی

صورت اختیار کر رہے تھے۔

''یار مجھے بھی موقع دو۔ میں نے آج تک کسی انسان کی کھال نہیں اتاری۔'' غلام رسول نے گردن موڑ کر کہا۔

''آپ کو بھی موقع دوں گا۔ دونوں ٹانگوں اور ہاتھوں کی کھال آپ اتار لینا۔'' عمران نے سفاک لہجے میں کہا۔ اس کی آواز کی سفاکیت نے کیبن کو بھی لرزہ دیا۔ عمران مجاہد تھا۔ کافروں سے لڑنا، انہیں بھرپور سزا دینا۔ مقبوضہ کشمیر میں نہتے لوگوں پر وردی پوشوں کے مظالم کا بدلہ لینا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ گویا وہ موت کی وادی کا مسافر تھا۔ زندگی اور موت کا کھیل اس کے لیے نیا نہیں تھا اسی لیے وہ اس سفاکی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''تو بھئی جلدی کرو، مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا۔'' غلام رسول بولا۔

''ہاں تو سفید چوہے جلدی بولو کیا خیال ہے، مجھ سے اپنی کھال اتروانا چاہتے ہو یا غلام رسول سے ہڈیاں تڑوانا پسند کرو گے؟''

''تم لوگ بچ نہیں سکتے ہمارے ڈیتھ اسکواڈ تم لوگوں کو گھیرنے کے لیے نکل پڑے ہیں کسی نہ کسی جگہ گھیر کر ختم کر ہی دیں گے۔''

''اچھا یہ بتا دو کہ یہ ڈیتھ اسکواڈ کیا بلا ہے؟''

''ہاہاہا یہ تمہارے وہ آدمی ہیں جنہیں ہم نے خرید رکھا ہے۔ انہیں ہم اشارہ کرتے ہیں اور یہ کمال دکھا دیتے ہیں۔ کبھی مسجدوں میں جا کر فائرنگ کرتے ہیں تو کبھی امام بارگاہوں میں۔ کبھی مندروں میں بم بلاسٹ کرتے ہیں تو کبھی چرچ میں اور ہمارا دوسرا ونگ شور مچانا شروع کر دیتا ہے کہ یہ فائرنگ وہابیوں نے کی ہے، یہ قتلِ عام شیعوں نے کیا ہے، یہ بم طالبان نے بلاسٹ کیا ہے، یہ حملہ سنی تحریک نے کرایا ہے اس طرح آپس میں نفرت کی خلیج مزید وسیع ہو جاتی ہے۔'' زخمی نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔

''1757 میں نواب سراج الدولہ کے وقت سے تم لوگوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو کی جو پالیسی اپنائی تھی اب وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مسلمان جاگ چکے ہیں۔ تم لوگ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لو۔ اب نفرت کی آبیاری مشکل ہے۔ ہم ایک تھے ایک رہیں گے۔'' عمران نے پُرزور لہجے میں کہا۔

''تم لوگ زبان کے شہسوار ضرور ہو مگر عمل میں صفر ہو اسی کا ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دیکھ لینا اسی طرح لڑا لڑا کر ہم تم مسلمانوں کو خاک میں ملا دیں گے۔ غرناطہ کو مت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھولو۔ وہاں تم لوگوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی تھی مگر ہم نے کتنی آسانی سے نفرت پھیلا کر پہلے تفرقہ ڈالا پھر پورے ہسپانیہ سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیا۔" زخمی نے جوش میں تقریر شروع کر دی تھی۔

"وہ دور کچھ اور تھا۔ اب ہم ہوشیار ہو چکے ہیں۔ ان باتوں کو چھوڑو اور فٹافٹ بتا کہ تمہارا سربراہ کون ہے؟"

"میں نہیں بتاؤں گا۔"

اس کا اتنا کہنا تھا کہ عمران نے چھری کی نوک کو دوبارہ پیشانی کی کھال میں پیوست کر دیا اور اس زور سے آگے کی طرف کھینچا کہ گہرا اور لمبا زخم بن گیا۔ قیدی کی چیخ سے بجیرو گونج گئی۔

"بولو سیدھے بتاؤ گے یا اسی طرح میں تمہارے چہرے سے کھال کھرچتا رہوں؟ عمران نے کہا۔

قیدی نے جواب نہیں۔ اس کی خاموشی نے عمران کے غصے کو سوا کر دیا۔ وہ چاقو کی نوک سے پے در پے چرکے لگانے لگا۔ قیدی رہ رہ کر ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح ڈکرا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا حوصلہ ٹوٹتا گیا پھر وہ چیخا۔ "بتاتا ہوں میرے...... ہمارے گروپ کا انچارج الفرڈ ہے۔ الفرڈ کے اوپر ڈیوڈ ہے لیکن ہم سب کی انچارج ایک عورت ہے۔ وہ کون ہے اس بارے میں ہم جیسے نیچے کے کارکن لاعلم ہیں۔ اس سے صرف ڈیوڈ کا رابطہ ہے وہی عورت پورے پاکستان میں مہم کی انچارج ہے۔"

"الفرڈ اور ڈیوڈ کہاں رہتے ہیں؟" پروفیسر عثمان نے پوچھا۔

"وہ اسلام آباد میں رہتے ہیں، ہمارے ملک کے سفارتخانے کا ایک اتاشی ان کو چھوٹے بھائی کے طور پر انہیں اپنے ہاں رکھے ہوئے ہے۔"

"اسے خاموش کر دو، سانپ کو زندہ رکھنا عقل مندی نہیں ہے۔" غلام رسول نے عمران سے کہا۔

"یہ لو" کہہ کر عمران نے پستول کے ٹریگر کو دبا دیا۔ ایک دھماکہ ہوا اور تیز گونجی۔ عمران نے تڑپتے ہوئے جسم کو نیچے دھکیل دیا۔

بجیرو اپنے سفر پر رواں دواں رہی۔ اسکردو شہر نزدیک سے نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں سے انہیں ہوائی جہاز پر سوار ہونا تھا۔ اسلام آباد پہنچنے کے لیے سب سے راستہ یہی تھا۔ اسی لیے انہوں نے اسے منتخب کیا۔

☆======☆======☆

اسلام آباد میں انہیں ٹھہرنے کے لیے مکان مل گیا تھا۔ یہ ایک بنگلہ نما مکان تھا۔ عمران کے کسی ساتھی کا وہ بنگلہ تھا۔ ان کے لیے دو کاروں کا انتظام بھی ہو گیا تھا جو عمران کے ایک رشتے دار نے دلوائی تھیں۔

عمران اور پروفیسر کسی کام سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ غلام رسول اور کیتھی گھر میں رہ گئے تھے۔ کچھ دیر تک تو وہ کیتھی سے الجھتا رہا پھر گاڑی لے کر نکل گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ بھوربن میں کچھ وقت گزارے گا۔

بنگلے سے نکلا تو اسے یاد آ گیا کہ رات گزارنے کے لیے اس کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے۔ وہ کسی کتب فروش کی دکان تلاش کرتا ہوا بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اسے ایک بڑی سی کتابوں کی دکان نظر آ گئی۔ اسے کسی ایسی ہی دکان کی تلاش تھی۔ یہاں اسے اپنے مطلب کی کتاب مل سکتی تھی۔ اس نے کار فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی کی اور اسے لاک کر کے وہ اس دکان میں داخل ہو گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں تین چار مجلد کتابیں تھیں۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور ڈیش بورڈ پر کتابیں رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار اسٹارٹ کر کے وہ ایک کالونی کی طرف مڑ گیا۔ اس سیکٹر میں بنگلے ہی بنگلے تھے۔ عالی شان اور بڑے بڑے بنگلے۔ ہر بنگلے کی دیواریں اور گیٹ خاصے اونچے تھے۔ بعض بنگلوں کی دیواروں پر تو اونچی خاردار تاروں کی باڑھ بھی لگی ہوئی تھی۔ اکثر بنگلوں پر دو دو گن مین بھی نظر آ رہے تھے۔

اس علاقے میں گلیاں بھی کافی کشادہ تھیں لیکن شام آٹھ بجے کے بعد گلیوں میں کسی قدر سناٹا چھا جاتا تھا البتہ شاپنگ ایریا میں رات کو دیر تک رونق رہتی تھی۔

غلام رسول اس وقت شاپنگ ایریا سے گزر رہا تھا۔ اس علاقے میں باربی کیو کی کئی دکانیں تھیں جن کے نیون سائن جگمگ کر رہے تھے۔ ہر دکان کے باہر بچھی کرسیوں پر متعدد گاہک موجود تھے۔ ان گاہکوں کی زیادہ تعداد نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل تھی۔ وہ سب مغربی لباس میں ملبوس تھے۔ بیشتر لڑکیاں جینز اور ٹی شرٹس پہنے ہوئے تھیں۔ دو تین لڑکیاں اسکرٹ اور بلاؤز میں بھی نظر آئی تھیں۔

فضا تکے کباب اور چرغے کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی۔ غلام رسول وہاں رکا نہیں اور

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آگے بڑھتا چلا گیا۔ شاپنگ ایریا سے ہوتا ہوا ایک دوسری سڑک پر آ گیا۔ اس وقت وہ سڑک تقریباً سنسان پڑی تھی۔

غلام رسول نے اس سڑک پر گاڑی موڑی ہی تھی کہ اس کی گردن سے پستول کی ٹھنڈی نال آ لگی۔ غلام رسول نے نظریں اٹھا کر عقبی آئینے میں دیکھا۔ ایک نوجوان لڑکا سیٹوں کے درمیان فٹ میٹ سے اٹھ کر سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔ غلام رسول نے ایکسیلیٹر پر پیر اٹھا کر بریک پر دباؤ ڈالا ہی تھا کہ عقب سے للکار ابھری۔

''گاڑی روکنا مت۔'' پھر غراہٹ سنائی دی۔ ''گاڑی اگلی چورنگی سے سیدھے ہاتھ پر موڑ لینا اور کوئی ایسی ویسی حرکت مت کرنا کہ مجھے انگلی کو زحمت دینا پڑے۔''

اس سڑک پر اس وقت کوئی گاڑی نہیں تھی اسٹریٹ لائٹس کی روشنیاں بھی بند تھیں البتہ کار کے اندر بتی جل رہی تھی۔ غلام رسول کے منہ سے بے اختیار گہری سانس نکل گئی۔ اس نے پیر بریک سے ہٹا کر ایکسیلیٹر پر رکھ دیا اور گیئر بدلتے ہوئے ایک بار پھر سامنے لگے آئینے میں دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ آئینے میں صاف نظر آ رہا تھا۔ غلام رسول کے اندازے کے مطابق اس کی عمر اٹھائیس، تیس سال رہی ہوگی۔

''یہ لائٹ آف کر دو۔ اس وقت یہ روشنی مجھے اچھی نہیں لگ رہی ہے۔'' پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

غلام رسول نے لائٹ بجھا دی، گاڑی چلتی رہی۔ ایک کے بعد ایک چورنگی آتی رہی۔

تقریباً ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے بعد سگنل دکھائی دیا۔ سگنل سرخ ہو رہا تھا۔ غلام رسول نے رفتار کم کر دی اس سے آگے دو گاڑیاں کھڑی تھیں دو تین گاڑیاں پیچھے آ رہی تھیں۔

''میں پستول ہٹا رہا ہوں تم کوئی گڑبڑ نہیں کرو گے۔'' پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ ''اگر گڑبڑ کی تو گولی مار دوں گا۔'' اس شخص نے پستول ہٹا لیا مگر اگلی سیٹ پر اس طرح بیٹھا رہا جیسے بے تکلفی سے باتیں کر رہا ہو۔ غلام رسول نے آئینے میں دیکھا۔ وہ بہت زیادہ محتاط نظر آ رہا تھا۔

سگنل کھلتے ہی غلام رسول نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''تمہیں کار چاہیے یار تم؟''

''تم اگر ساتھ رہو گے تو گاڑی ہمارے قبضے میں رہے گی۔''

غلام رسول نے سمجھ لیا کہ اس شخص کا تعلق کسی ایسے گروہ سے ہے جو تاوان کے لیے

اغوا کرتے ہیں پھر بھی اس نے اندازہ کو تقویت دینے کے لیے کہا۔ ''اگر تمہیں رقم کی ضرورت ہے تو میری جیب میں اس وقت دس ہزار روپے موجود ہیں، وہ لے لو اور کار سے اتر جاؤ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ میرا وقت ضائع نہ کرو۔''

''رقم تمہارے گھر والوں سے وصول کر لوں گا۔ کار چلاتے رہو ضروری کام کو بھول جاؤ۔'' اس شخص نے درشت لہجے میں کہا۔

غلام رسول نے مزید کوئی بات نہیں کی، وہ ہلکی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے اس شخص کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ نوجوان اسے تاوان حاصل کرنے کے لیے اغوا کرنا چاہتا ہے۔ کار دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا ہوگا کہ بدلے میں اچھی خاصی رقم مل جائے گی۔ اخبارات میں وہ برابر پڑھا کرتا تھا کہ کچھ لوگ لالچ میں آ کر راتوں رات امیر بننے کے لیے جرائم کی دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔ ڈکیتی، اغوا برائے تاوان اور ملک دشمن سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگے ہیں۔ اسلحہ کھلے عام مل رہا ہے اسی لیے جرائم کے بڑھنے کی رفتار بھی کافی تیز ہے۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے رفتار بہت زیادہ تیز کر دی۔

''ارے گاڑی کی رفتار کم کرو، ٹریفک سارجنٹ روک سکتا ہے۔''

غلام رسول نے یکایک پوری قوت سے بریک دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ جھک گیا تھا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھا نوجوان جھٹکا لگتے ہی اچھلا اور اس کا سر سیٹ سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پستول کا ٹرائیگر دبا دیا تھا۔ گولی ونڈ اسکرین توڑتی ہوئی نکل گئی۔ غلام رسول نے اسے دوسرا فائرنگ کرنے کا موقع نہیں دیا اور بڑی پھرتی سے پلٹ کر اس شخص کی کلائی پکڑ لی۔ زور آزمائی ہونے لگی، اس نے کلائی بڑی سختی سے گرفت میں لے رکھی تھی۔ ایک فائر اور ہوا۔ یہ گولی بھی ونڈ اسکرین میں لگی تھی۔ غلام رسول اب اسٹیئرنگ کے پیچھے سے نکل آیا تھا۔ وہ شخص خاصا طاقتور تھا۔ اس کی کلائی کو گرفت میں رکھنے کے لیے غلام رسول کو دانتوں پسینے آ رہے تھے۔ اس نے موقع پا کر بائیں ہاتھ سے غلام رسول کی ناک پر گھونسہ رسید کر دیا۔ غلام رسول کا دماغ جھنجنا اٹھا لیکن اس نے کلائی پر گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دی بلکہ اب وہ بھی پچھلی سیٹ پر آ گیا تھا اور ان دونوں میں قوت آزمائی ہو رہی تھی۔

اس وقت سٹاپ پر چند لوگ کھڑے تھے ان میں دو خواتین اور تین بچے بھی تھے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کار میں فائرنگ سے وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ عورتیں اور بچے چیختے چلاتے ہوئے سٹاپ سے دور بھاگے۔ سامنے ہی ایک گلی تھی وہ سب اسی میں گھس گئے۔ سٹاپ سے چند گز آگے ٹریفک پولیس کا ایک سارجنٹ اور ایک کانسٹیبل کھڑے تھے۔ ان کی نظریں آنے جانے والے ٹرکوں پر لگی ہوئی تھیں کہ ان میں کسے روک کر خواہ مخواہ کا چالان تھمایا جائے اور ان سے بھتہ وصول کیا جائے لیکن جیسے ہی گولیوں کے دھماکے گونجے وہ چونک گئے۔ انہوں نے کار کی طرف دیکھا۔ سارجنٹ نے کار میں دو آدمیوں کو دھینگا مشتی کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کک لگائی۔ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور موٹر سائیکل تیزی سے آگے روانہ ہوگئی۔

غلام رسول اور اس شخص میں اب ہاتھا پائی ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں نوجوان کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر لگا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا باہر آ گرے۔

پستول ابھی تک اس شخص کے ہاتھ میں تھا۔ ٹریفک کی آمدورفت جاری تھی۔ عین اسی وقت ایک سکول بس نزدیک سے گزری۔ اس شخص نے ہاتھ جھٹکنے کی کوشش کی اس کوشش میں ٹریگر دب گیا۔ گولی فائر ہوئی اور سیدھی جا کر سکول بس کے ٹائر سے ٹکرائی۔ زوردار دھماکہ ہوا۔ بس لہرانے لگی اندر بیٹھے ہوئے بچوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

بچوں کی چیخ و پکار اور دھماکے نے مزید ہراس پھیلا دیا۔ پیچھے سے آنے والی گاڑیاں رکیں، مڑیں اور بھگدڑ مچ گئی۔ ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ جس نے شور وغوغا میں مزید اضافہ کر دیا۔

اس شخص نے زوردار جھٹکا دیا۔ غلام رسول کی گرفت کمزور پڑ گئی اور وہ آزاد ہو گیا۔ پستول اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہوائی فائر کرتا ہوا ایک طرف بھاگا۔

غلام رسول بھی اٹھ گیا۔ اس نے پتلون کی جیب سے اپنا پستول نکالا وہ فائر کرنا چاہتا تھا کہ اسے سائرن بجاتی ہوئی پولیس وین نظر آئی۔ اس نے پھرتی سے پستول کو کار میں اچھال دیا۔

سامنے سے آتی وین میں سوار پولیس والوں نے اس شخص کے ہاتھ میں پستول دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے اس کے پیر پر فائر کیا اور وہ پنڈلی پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وین اس کے نزدیک آ کر رک گئی۔ اس میں سے پانچ چھ پولیس والے کود کر نیچے اترے۔ انہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ ایک اے ایس آئی نے غلام رسول کو بھی کور کیا تھا۔

''اے تم بھی ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ'' اے ایس آئی نے غلام رسول کو حکم دیا۔

''دہشت گرد ہے اس نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔'' غلام رسول بولا۔

''دہشت گرد کون ہے یہ تھانے چل کر بتانا'' کہہ کر اس نے دو سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اسے بھی کھینچ کر وین میں بٹھا لیا۔

اب لوگ آس پاس جمع ہونے لگے تھے۔ سڑک پر ٹریفک بھی جام ہو گیا تھا۔ جس سکول بس کے ٹائر میں گولی لگی تھی اس میں سوار بچے رو رو کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ ایک کانسٹیبل ٹریفک کلیئر کرنے میں لگ گیا تھا۔

وین ان دونوں کو لے کر تھانے پہنچی۔ تھانے میں خوب گہما گہمی تھی۔ شاید کوئی خاص معاملہ تھا۔ ان دونوں کو ایک طرف بٹھا دیا گیا۔

وقت کا کام ہے گزرنا وہ گزرتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹہ گزر چکا تھا کہ ایک اے ایس آئی نے ان کے پاس آ کر کہا۔ ''چلو صاحب بلا رہے ہیں۔''

وہ دونوں ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچے۔

''معاملہ کیا ہے؟'' ایس ایچ او نے رعب دار لہجے میں پوچھا۔

''یہ ایک دہشت گرد ہے اس نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔'' غلام رسول نے کہا۔

''نہیں جناب یہ غلط کہتا ہے۔ میں اس کی گاڑی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اس نے مجھے دبوچ لیا اور دہشت گرد، دہشت گرد کی پکار کر کے مجمع جمع کر لیا۔'' اس شخص نے کہا۔

''میں امریکی شہریت رکھتا ہوں اور ایک سائنس دان کے ساتھ خصوصی کام سے آیا ہوں، میں کوئی پاگل نہیں ہوں کہ ایسی حرکت کروں۔'' غلام رسول نے احتجاجی انداز میں کہا پھر اپنی جیب سے پرس نکال کر بولا۔ ''یہ رہا میرا ڈرائیونگ لائسنس، امریکہ میں شناختی کارڈ کی طرح یہ کارآمد سمجھا جاتا ہے۔''

لائسنس دیکھ کر ایس ایچ او مرعوب ہو گیا۔ اس نے تیز نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا پھر بولا۔ ''کیوں کس گینگ سے تعلق ہے؟''

''میں نے کہا نا کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ آپ مجھے ایک فون کرنے کی اجازت دے دیں۔''

''آپ دونوں فون کر کے اپنے اپنے آدمیوں کو بلا لیں۔ میں بغیر شخصی ضمانت کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دونوں میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔"

غلام رسول نے عمران کو فون کر دیا۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے عمران کے رشتے دار کا فون نمبر لے لیا تھا کہ اگر راستہ بھٹک گئے تو لوٹنے میں آسانی ہو گی۔ وہی احتیاط اس وقت کام آ گئی تھی۔

غلام رسول کے بعد اس شخص نے بھی کسی کو فون کیا تھا اور اب وہ دونوں اپنے اپنے بہی خواہوں کی آمد کے منتظر تھے۔ تھانے کا معائنہ کرنے آنے والے ایس پی صاحب جا چکے تھے۔ اس لیے اب پہلے جیسی چہل پہل نہ تھی۔ ایس ایچ او روزنامچہ میں کچھ لکھ رہا تھا اور وہ دونوں بیٹھے انتظار کا عذاب جھیل رہے تھے کہ دو شخص ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوئے انہیں دیکھتے ہی زخمی شخص کا چہرہ کھل اٹھا۔ ان نوواردوں نے ایس ایچ او کو اپنے کارڈ دکھا کر کہا۔ "یہ ایک شریف آدمی ہے براہِ کرم اسے چھوڑ دیں۔ اگر ضمانت کی ضرورت ہے تو میں دینے پر تیار ہوں۔"

ایس ایچ او جواب میں کچھ کہتا کہ پروفیسر عثمان اور عمران کے ساتھ دو رعب دار شخص اندر آئے۔ انہوں نے ایس ایچ او سے پوچھا۔ "کیوں جناب انہیں آپ نے کیوں بٹھا رکھا ہے؟"

"یہ دونوں بیچ سڑک پر مار پیٹ کر رہے تھے اس لیے ہم انہیں لائے ہیں۔ بقول ان کے یہ غیر ملکی ہیں اس لیے میں نے رپورٹ درج کرنے کی بجائے شخصی ضمانت پر اکتفا کرنا چاہا ہے۔ کیا آپ ضمانت دیں گے؟" انسپکٹر نے کہا۔

"بالکل جناب! کیوں نہیں۔ ہم ساتھ میں وکیل کو بھی لائے ہیں۔" کہہ کر عمران کا ایک ساتھی باہر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ساتھ ایک کالے کوٹ میں ملبوس شخص داخل ہوا۔ اس نے کاغذات پہلے سے ہی تیار کر لیے تھے۔ ایس ایچ او کو وہ کاغذ دے کر بولا۔ "میرے کلائنٹ کو آپ فوراً جانے کی اجازت دے دیں۔"

"ہاں ہاں ضرور!" ایس ایچ او نے کہا۔

غلام رسول ان سب کے ساتھ باہر نکل گیا۔ باہر آتے ہی عمران کے ایک ساتھی نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ انہیں کسی پارٹی کے کہنے پر اغوا کیا گیا تھا کیونکہ اس شخص کی ضمانت کے لیے جو شخص آیا ہے وہ ہماری ہٹ لسٹ پر ہے۔ وہ مشتبہ ہے۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس کا تعلق پاکستان دشمن سرگرمیوں سے ہے۔"

"ان کا تعاقب کر کے ہر ایک کا ٹھکانا معلوم کرنا ضروری ہے۔" پروفیسر عثمان نے کہا۔

وہ سب تھانے کے سامنے ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ ان کی نظریں تھانے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ تب ہی انہوں نے دیکھا کہ غلام رسول کے ہاتھوں پٹنے والا اپنے ساتھیوں کے ساتھ لنگڑاتا ہوا باہر آ رہا ہے۔

"اگر وہ لوگ ایک ہی گاڑی میں جاتے ہیں تو بہتر ہے اس طرح ہم ایک ساتھ ان کا تعاقب کریں گے اور اگر وہ لوگ علیحدہ علیحدہ جائیں گے تو ہمیں بھی الگ الگ تعاقب کرنا ہو گا۔" پروفیسر نے کہا۔

وہ سب تھانے سے نکل کر سامنے کھڑی ایک وین میں داخل ہو گئے۔

"چلو یہ اچھا ہے۔" کہہ کر پروفیسر وغیرہ باہر آئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ عمران نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور ایکسلیٹر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ اب آگے آگے مشتبہ وین تھی اور پیچھے پیچھے یہ لوگ۔ وین شہر سے باہر جانے والی سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی ان کے پیچھے ان لوگوں نے اپنی نیلی کرولا لگا رکھی تھی۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان خاصہ فاصلہ تھا۔ عمران کی کوشش تھی کہ مقابل کو یہ خبر نہ ہو کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اسی لیے اس نے درمیان میں فاصلہ رکھا تھا۔ ان لوگوں کی رفتار دیکھ کر پروفیسر نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ لوگ شہر سے باہر جا رہے ہیں۔ کیونکہ ان کی وین مضافاتی سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ عمران نے ڈیش بورڈ پر رکھے موبائل فون کو اٹھا لیا پھر کسی کا نمبر ملا کر کہا۔ "ہم اس وقت مغربی سمت والی بڑی سڑک پر ہیں۔ مضافات ہی سمجھ لو۔ فوراً کم سے کم چار افراد کو بھیجو۔ پوری تیاری کے ساتھ۔"

اس نے اشارے میں بتا دیا تھا کہ آنے والے مسلح ہوں گے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگلی گاڑی کو گھیر کر انہیں ہیڈ کوارٹر لے جائے گا، وہیں ان سے تفتیش کر لے گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یکا یک ہی ذیلی سڑک سے ایک ٹرالر باہر آ گیا تھا اور اب وہ ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اگلی گاڑی ٹرالر کے آگے تھی اس لیے اس کی صحیح پوزیشن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ عمران نے کئی بار ہارن دیا۔ آگے نکلنے کی کوشش کی مگر ٹرالر ڈرائیور نے گویا انہیں راستہ نہ دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ٹرالر بھی انہی لوگوں کا ہو اور انہوں نے اسے اسی لیے بلایا ہو کہ وین کو فرار کا موقع مل جائے۔" پروفیسر نے خدشہ ظاہر کیا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہ ممکن ہے۔" عمران نے کہا۔ ٹھیک اسی وقت ٹرالر رک گیا۔ مجبوراً عمران کو بھی بریک پر دباؤ بڑھانا پڑا۔ جیسے ہی گاڑی رکی سڑک کے کنارے کھڑے چار افراد جو حلیے سے دیہاتی لگ رہے تھے تیز قدموں سے گاڑی کے قریب آ گئے۔ ان میں سے دو گھوم کر دوسری طرف چلے گئے اور دو اسی طرف کی کھڑکیوں سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔

"صاحب! کچھ لیں گے؟" ان میں سے ایک آدمی نے کہا اور کھڑکی پر جھک گیا۔

"کیا بیچ رہے ہو؟" غلام رسول نے پوچھا۔

"جی! موت بیچ رہا ہوں۔" کہہ کر اس نے پستول کا رخ ان کی طرف کر دیا۔

عمران اور پروفیسر نے ایک ساتھ دونوں طرف کی کھڑکیوں پر نظر ڈالی۔ چاروں کے ہاتھ میں پستول تھے اور نشانہ ان سب کا سر تھا۔

"شرافت کے ساتھ گاڑی آگے بڑھاؤ اور ٹرالر میں داخل ہو جاؤ۔" ان میں سے ایک نے کہا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

عمران نے ٹرالر کی طرف دیکھا۔ اس کا پچھلا شٹر کھلا ہوا تھا اور پلیٹ فارم جیسا تختہ باہر کی سمت نکل کر سڑک پر بچھ گیا تھا۔

"چلو گاڑی آگے بڑھاؤ۔" اس نے عمران کی کنپٹی پر پستول کی نال رکھ کر حکم دیا۔

اسلحہ عمران کے پاس بھی تھا مگر ابھی موقع نہیں تھا اس لیے اس نے ان کا حکم ماننے میں ہی عافیت سمجھی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی اچھلتی ہوئی ٹرالر میں داخل ہوئی اور اس کا شٹر بند ہو گیا۔ ٹرالر چل پڑا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ٹرالر رکا اور شٹر اوپر اٹھ گیا۔ عمران نے باہر کی طرف نظر ڈالی۔ وہ کوئی گودام تھا جس کے درمیان ٹرالر کھڑا تھا۔ اتنی دیر میں تین چار آدمی ٹرالر پر چڑھ آئے تھے۔ ان سب کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھیں اور نالیں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"چلیں! سب نیچے اتریں۔" عمران کے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ وہ لوگ سر جھکائے ہوئے نیچے اتر آئے۔ کلاشنکوف بردار انہیں نشانے پر لے کر آگے بڑھنے لگے۔ گودام کے اندرونی دروازے سے وہ لوگ ایک ہال نما کمرے میں داخل ہو گئے۔

ہال میں داخل ہوتے ہی ان لوگوں کی نظر ایک لمبے شخص پر پڑی۔ وہ یورپ کے کسی ملک کا باشندہ تھا اور ان کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر دو قدم آگے بڑھ

اور پروفیسر کر دیکھ کر بولا۔ "تم نے کیا سمجھا تھا کہ ہمیں دھوکہ دے دو گے؟ دیکھو میں نے تمہیں کسی خارش زدہ چوہے کی طرح پکڑ لیا ہے۔ اب تمہاری سزا یہی ہے کہ تم واپس امریکہ جا کر اپنی اسی لیبارٹری میں بطور اسسٹنٹ کام کرو گے۔"

"تمہارا یہ خواب، کبھی پورا نہیں ہوگا۔ میں نے قسم کھا لی ہے کہ اب میں صرف پاکستان کے نام پر اپنی تحقیق پیش کروں گا۔"

"اس کے بدلے تمہیں کیا ملے گا؟ یہاں تمہاری لیبارٹری کا خرچ تک کوئی نہیں دے گا۔"

"میں پھر بھی مطمئن رہوں گا۔ اتنے دنوں کے کام کا تم لوگوں نے کیا بدلہ دیا؟ یہی کہ میری تحقیق کو ایک دوسرے شخص کے نام کر دیا۔"

"تمہیں لاکھوں ڈالر کی امداد دی گئی۔ کیا وہ کم تھا۔ اتنی بڑی لیبارٹری بنا کر دی گئی، اسے کیوں بھول رہے ہو۔"

"تمہاری لیبارٹری وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ یہاں میں نے اپنے خرچ پر لیبارٹری بنائی ہے اور اس کا فائدہ صرف مسلمانوں کو پہنچے گا۔ اب میری تحقیق کا سہرا مسلمانوں کے سر جائے گا۔ میں اب صرف مسلمانوں کے لیے کام کروں گا۔"

"تمہارا یہ خواب خواب ہی رہ جائے گا۔ اسے تعبیر نہیں ملے گی۔" اس شخص نے حقارت سے کہا۔

"بے وقوف آدمی تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔" پروفیسر نے کہا۔

"میرا نام ڈیوڈ ہے۔ میں اور الفرڈ جوڑی میں کام کیا کرتے تھے۔ تم نے میری جوڑی کو توڑ دیا۔ میرے یار کو دو دن پہلے پہاڑی دروں میں گھیر کر مار دیا اگر مجھ پر اوپر والوں کا دباؤ نہ ہوتا تو اب تک میں تمہاری بوٹی بوٹی الگ کر کے اپنا انتقام لے چکا ہوتا۔ اب میرا یہی انتقام ہے کہ تمہیں ہر حال میں تمہاری لیبارٹری تک پہنچایا جائے۔"

"اچھا تو تم وہ بڑے ہو جس کا حکم چلتا ہے؟"

"ہاں وہ میں ہی ہوں۔"

"اچھا تمہارے اوپر جو عورت ہے وہ کون ہے؟ اس کا نام نہیں بتاؤ گے؟"

"جب اپنی منزل پر پہنچو گے تو تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔"

"یعنی تم مجھے بتانا نہیں چاہتے؟"

"یہی سمجھ لو۔ بہت باتیں ہو گئیں اب اپنے ساتھیوں کی موت کا تماشہ دیکھو۔" اس

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے پہلے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو کوئی اشارہ دیتا کہ ہال نما کمرے میں آواز گونجی۔

"خبردار سب اپنے اپنے ہتھیار پھینک دو اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

یہ آواز گودام والے دروازے کی طرف سے آئی تھی۔ کلاشنکوف برداروں میں سے ایک نے ادھر مڑنے کی کوشش کی تھی کہ روشن دان سے گولی چلی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ ڈیوڈ نے ایک بڑی سی ٹیبل کی آڑ لے لی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ تمام روشن دان اور دروازوں پر نوواردوں کا قبضہ ہے۔ کلاشنکوف بردار پھر بھی باز نہیں آئے تھے اور جوابی فائر کر دیا تھا اور اب وہ کمرا میدان جنگ بن گیا تھا۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ نوواردوں میں سے ایک بھی سامنے نہیں آیا تھا جبکہ یہ سب ان کے نشانے پر تھے اس لیے یکے بعد دیگرے گرتے جا رہے تھے۔ پروفیسر اپنے ساتھیوں کے ساتھ زمین پر لیٹ چکے تھے اس لیے کہ انہیں علم تھا کہ گولی دوست دشمن کو نہیں دیکھتی جو بھی سامنے آئے، اس کے جسم میں سوراخ بنا دیتی ہے۔

یہ مقابلہ بہ مشکل دس منٹ چلا تھا۔ کلاشنکوف برداروں میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔ ڈیتھ اسکواڈ ڈیتھ کے چنگل میں چلا گیا۔

جب باہر والوں نے اندر خاموشی دیکھی تو آواز دی۔ "عمران اندر کوئی زندہ ہے؟"

"نہیں۔" عمران نے جواب دیا۔

"پھر بھی چیک کر لو ہو سکتا ہے کوئی زندہ ہے۔" باہر سے کہا گیا۔

عمران نے ہر لاش کو ہلا جلا کر دیکھا مگر کسی میں بھی زندگی کی رمق نظر نہ آئی۔ عمران نے گودام کے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اچھی طرح دیکھ لیا ہے کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔"

"تو پھر تمام لوگ گودام میں چلے آئیں۔ ہم اوپر سے پٹرول کا کین پھینکنے والے ہیں۔" باہر سے کہا گیا۔

پروفیسر وغیرہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر وہ باہر کی طرف نکلتے چلے گئے۔ باہر پہنچنے کے بعد عمران نے کہا۔ "پروفیسر صاحب! لاشوں کو میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ ان میں ڈیوڈ نہیں ہے۔ یقیناً اس نے افراتفری کا فائدہ اٹھا لیا ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا اس نے ہمارے تمام ساتھیوں کو پہچان لیا ہے۔"

"سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ نکلا کیسے؟"

"وہ تنظیم کے بڑوں میں سے ہے ایک ہے۔ اس کی عیاری دیکھ کر ہی اسے یہ مقام دیا گیا ہے اس نے حیرت کا اظہار نہ کرو، آگے بڑھو۔ جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔"

گودام میں دو شخص کلاشنکوف سے لیس کھڑے تھے۔ عمران کو دیکھتے ہی وہ دونوں آگے بڑھے اور اس سے معانقہ کرنے لگے۔ ان کے الگ ہوتے ہی عمران نے پروفیسر سے کہا۔ "یہ ساجد ہیں اور یہ ظفر اللہ۔ یہ دونوں ہماری کمانڈ کے بہترین مجاہدوں میں سے ہیں۔"

غلام رسول نے انہیں تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"باتوں کا وقت نہیں ہے۔ برادر فیض الاسلام باہر سے پیٹرول گرا رہا ہوگا۔ اس پوری عمارت کو آگ لگانا ضروری ہے۔" کہہ کر ساجد باہر کی طرف بڑھنے لگا۔ پروفیسر اور دیگر افراد بھی ادھر ہی بڑھتے چلے گئے۔ باہر نکلتے وقت غلام رسول کی نظر اس شخص پر پڑی جس نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور اپنی ٹانگ پر گولی کھائی تھی وہ بھی ایک طرف مردہ حالت میں پڑا تھا۔ باہر نکلے تو واکس ویگن وین کھڑی تھی۔ پروفیسر وغیرہ کو سفید رنگ کی اس وین میں بیٹھنے کے لیے کہا گیا تو غلام رسول بولا۔ "بھائی! اندر میری کار کھڑی ہے۔ تم لوگ عمارت میں آگ لگاؤ گے تو وہ بھی جل جائے گی اور اس کے مالک کو ہرجانہ ہمیں دینا ہوگا۔"

"آپ فکر نہ کریں ظفر اللہ اسے نکال کر لا رہا ہوگا۔ ہم نے اندر جاتے ہی دیکھ لیا تھا کہ اس کی چابی اگنیشن میں لٹک رہی ہے۔" ساجد نے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

گاڑی چلنے کے لیے تیار تھی کہ بھاگتے ہوئے چھ سات بندے نکلے وہ سب بھی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ آخر میں ساجد ان کی کار لے کر نکلا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے سڑک پر نکل آئیں۔

سڑک پر آنے کے بعد پروفیسر نے مڑ کر عمارت کی طرف دیکھا۔ وہ شاید رائس مل تھی۔ اس کی بناوٹ یہی بتا رہی تھی۔ ابھی وہ لوگ بہ مشکل ڈیڑھ کلومیٹر ہی پہنچے تھے کہ اس عمارت سے شعلے اٹھنے لگے۔

"تم لوگ سیدھے اس مقام پر کیسے پہنچ گئے۔" عمران نے ساجد سے پوچھا۔

"جیسے ہی آپ کی کال آئی۔ میں ساتھیوں کے ساتھ آندھی طوفان کی طرح چل پڑا۔ آپ کی کار سے ہم تقریباً دو ڈھائی کلومیٹر پیچھے تھے کہ اس ٹرالر کو نکلتے دیکھا۔ ہم ہوشیار ہو گئے کچھ آگے بڑھتے ہی اسے رکتے اور آپ کی کار کو اس کے اندر جاتے دیکھا تو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پوری طرح تیار ہو گئے۔ اسے راستے میں گھیرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ ہم ان کا اڈا دیکھنا چاہتے تھے اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔''

''ایسی ویسی کامیابی! برادر عزیز تم نے ایک بہت خطرناک ایجنٹوں کے پورے گروہ کا صفایا کر دیا ہے، وہاں کتنے آدمی تھے؟''

''تقریباً بیس! سب کے سب جہنم واصل ہو گئے مع اس انگریز چوہے کے۔'' ساجد نے کہا۔

''میاں! اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ وہ پورا گروہ ختم ہو گیا ہے۔ یاد کرو اس قیدی نے کہا تھا ناں کہ ان سب پر ایک عورت ہے وہی یہاں کی انچارج ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔

''ہاں یاد آ گیا مگر ہم اسے کہاں ڈھونڈیں گے؟''

''جیسے انہیں ڈھونڈا۔ ویسے ہی انہیں بھی ڈھونڈ لیں گے۔''

''ویسے مجھے یقین ہے کہ وہ خود ہمیں ڈھونڈ لے گی۔'' پروفیسر نے کہا۔

وہ سب واپس اسی بنگلے پر پہنچے جہاں پر وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر غلام رسول نے خود کو صوفے پر گرا دیا اور پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''پتا نہیں وہ عورت کون ہے؟'' کب اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملے گا۔''

''شرم کرو تم عورت سے دو دو ہاتھ کرو گے؟'' کیتھی نے کافی پاٹ سے پیالی بھرتے ہوئے طنز کیا۔ ''ویسے بھی تم مردوں سے لڑنے بھڑنے کے تو قابل ہی نہیں رہے۔''

''خالہ اماں! یہ معرکہ میری وجہ سے ہی سر ہوا ہے۔ اگر میں اس شخص کے ذریعے اغوا نہ ہوتا تو وہ لوگ نظروں میں کبھی نہ آتے۔''

''ہاں ہاں تم تو چارے کے لیے ہی استعمال ہو سکتے ہو۔'' کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ اس کا رخ اندرونی حصے کی طرف تھا۔

''سر! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آج میڈم بار بار باتھ روم میں کیوں جا رہی ہیں۔ صبح سے تقریباً دس بارہ بار انہیں جاتے ہوئے دیکھ چکا ہوں اور چہرے سے بھی بیمار نہیں لگتیں۔'' ارشاد جو مجاہد تھا اور بنگلے کی حفاظت کے لیے یہاں موجود تھا وہ بولا۔

ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ باہر سے چیخ کی آواز ابھری۔ غلام رسول اور ارشاد باہر کی طرف دوڑے۔ جیسے ہی ارشاد دروازے سے باہر نکلا چیخ کر گر پڑا۔ غلام

رسول نے گھبرا کر اسے دیکھا اس کے سر میں سوراخ ہو چکا تھا اور سرخ خون کا تالاب اس کے اردگرد جمع ہو رہا تھا۔

غلام رسول نے سمجھ لیا کہ باہر سے سائلنسر لگے ریوالور سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ دم سادھ کر کھڑا ہو گیا۔ تبھی اسے عمران کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو...... فوراً پہنچو۔ بنگلہ گھیرے میں ......آ......''

شاید وہ کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا کہ......

☆======☆======☆

سائلنسر لگے پستول کی گولیاں چل رہی تھیں۔ ٹھک ٹھک کی آواز کے ساتھ دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ارشاد کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ پڑا تھا۔ اس کے سر کے گرد خون کا تالاب سا بن گیا تھا۔ غلام رسول ایک ٹک اس مجاہد کی لاش کو گھور رہا تھا جبکہ برابر والے کمرے سے عمران کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔

دشمن اپنا کام دکھا رہے تھے۔ خاموش گولیاں چلا رہے تھے۔ غلام رسول نے چاہا تھا کہ ان کا مقابلہ کرے لیکن عمران نے منع کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ فائر کی آواز سے پولیس آ سکتی ہے۔ جب وہ اندر آنے کی کوشش کریں تبھی فائر کرنا۔ اسی لیے غلام رسول دروازے کے پیچھے خاموش کھڑا تھا۔ ''حملہ ہوا ہے۔ ہری اپ جلدی پہنچو...... نہیں، نہیں تعداد کا علم نہیں ہے۔''

غلام رسول نے سمجھ لیا تھا کہ وہ مجاہدین سے رابطہ کر رہا ہے۔ یہ خوش آئند بات تھی۔ یہاں، جہاں کوئی پُرسانِ حال نہ تھا، انہی مجاہدین کا سہارا تھا۔ وہی مدد کر سکتے تھے۔ پولیس سے رابطہ کیا بھی جائے تو وہ قانونی پیچیدگیوں میں الجھی رہے گی اور دشمن اپنا کام دکھا جائیں گے۔

باہر اب خاموشی تھی۔ خاموش گولیوں کی ٹھک ٹھک بھی بند ہو چکی تھی۔ ایسی خاموشی چھا گئی تھی کہ سانسوں کی بازگشت بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ غلام رسول کے دل میں آیا کہ وہ باہر جھانکے، دیکھے کہ اب کیا ہو رہا ہے مگر ارشاد کا انجام نظروں کے سامنے تھا۔ وہ چاہ کر بھی دروازے کے قریب نہ گیا۔ تبھی باہر سے آواز آئی۔ ''برادر عمران!''

''کون؟'' عمران نے پوچھا۔

''خادم قوم!'' باہر سے آواز آئی۔

''باہر کی پوزیشن کیا ہے؟'' عمران بولا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔" وہی آواز پھر آئی۔

غلام رسول نے باہر جھانکا۔ برآمدے میں چار جوان کھڑے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں کلاشنکوف تھی۔ چاروں کے چہرے چار سمت اور پیٹھ ملی ہوئی تھی۔ ان کی ہر حرکت سے عیاں تھا کہ وہ پوری طرح مستعد ہیں۔

دشمن جا چکے ہیں اس بات کا احساس ہوتے ہی غلام رسول نے جو باہر والے کمرے میں کھڑا تھا دھیرے دھیرے دروازہ کھول دیا۔ وہ چاروں اندر آ گئے۔

"کیا ہوا تھا؟" اندر آنے والوں میں سے ایک نے غلام رسول سے پوچھا۔

"پتا نہیں کون تھے۔" عمران نے باہر والے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "سائیلنسر والے ریوالور سے فائر ہوا تھا۔ دروازے پر سات آٹھ گولیاں لگی تھیں یقیناً نشانات باقی ہوں گے۔ ہمارے ایک بندے کو بھی مار گئے۔"

"کون تھے؟" نووارد نے پوچھا۔

"پتا نہیں کون تھے؟ لیکن جو بھی تھے ٹرینڈ تھے۔ جتنی خاموشی سے آئے تھے اتنی ہی خاموشی سے لوٹ گئے۔"

"فکر نہ کرو ہم اس شہید کا بدلہ ضرور لیں گے ورنہ میرا نام ثاقب نہیں مگر یہ سوچو کہ اس کی لاش کو کس طرح دفنائیں؟" اس نوجوان نے کہا۔

"بھئی یہ تمہارا علاقہ ہے۔ یہاں کے انچارج تم ہو، کوئی نہ کوئی راستہ نکالو۔ سوچو کہ یہاں سے کس طرح اسے لے جاؤ گے۔"

"لاش کو لے جانا اتنا مشکل نہیں ہے لیکن کفن دفن کرنا مشکل ہے۔"

"آخر پریشانی کی بات کیا ہے، اتنی سوچ فکر کیسی؟"

"لاش لے کر نکلیں گے پھر اسے دفنائیں گے۔ اس درمیان اگر پولیس والوں کو بھنک پڑ گئی تو صفائی دینا مشکل ہوگا۔ ہم مجاہدین ہیں مقبوضہ علاقے میں سرگرم ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم یہاں قانون شکنی کرنے لگیں اور قانون کے محافظ بھی ہمیں کچھ نہ کہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ ہمیں میٹنگ وغیرہ کرنے کی آزادی ہے۔"

"ان باتوں پر مٹی ڈالو چلو پہلے اس لاش کو قبرستان پہنچا آئیں۔" عمران بولا۔

"اس سے کیا ہوگا؟ کیا اس کی تجہیز و تدفین ہو جائے گی؟" غلام رسول نے کہا۔

"یہ ایک مسلمان کی لاش ہے ہم اسے یونہی پھینکنے سے تو رہے قبرستان پہنچا کر گورکن کو فون کر دیں گے، وہ ہمارے مہربانوں میں سے ہے پھر لاش کے پاس پانچ ہزار

روپے ہوں گے اسے دیکھ کر وہ خود ہی دفن کر دے گا۔"

"پلان تو اچھا ہے چلو لاش لے کر نکل چلو۔" غلام رسول نے کہا۔

ثاقب اور عمران نے ارشاد کی لاش اٹھائی اور کار کی ڈکی میں بوری بچھا کر رکھ دی پھر ڈکی کو بند کر دیا۔ ان دونوں کے ساتھ غلام رسول بیٹھ گیا۔

ثاقب نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اپنے ساتھ آنے والوں سے اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ دروازے پر خون وغیرہ صاف کر دیں۔ وہ لوگ اس کام میں جٹ گئے تھے اور ثاقب کار کو سڑک پر لے آیا تھا۔ ٹویوٹا اینٹی گیرا کی اسپیڈ نسبتاً بہتر ہوتی ہے پھر وہ تو بالکل نئی تھی۔ ہوا کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ جب سے ملک میں دہشت گردی شروع ہوئی تھی پولیس والوں کے راؤنڈ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب تک تین موبائلیں برابر سے گزر چکی تھیں مگر کسی نے انہیں روکا نہیں تھا۔ ان کا رخ شہر سے باہر قبرستان کی طرف تھا۔ ابھی وہ شہر سے باہر جانے والے راستے کی طرف مڑے ہی تھے کہ غلام رسول کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس راستے پر پولیس والوں نے عارضی طور پر چیک پوسٹ بنا رکھی تھی۔ آدھے راستے کو ترچھی موبائل کھڑی کر کے بند کر دیا گیا تھا۔ یقیناً وہ لوگ گاڑیوں کو روک کر تلاشی لے رہے ہوں گے۔ سڑک بالکل سیدھی تھی اگر وہ لوگ مڑتے تو پولیس والوں کو شک ہو جاتا اور پھر گاڑی کے ایک ایک انچ کی تلاشی لی جاتی، گاڑی کی ڈکی کھلتی تو بہت بھاری پریشانی کھڑی ہو جاتی۔ اتنا بڑا خطرہ سامنے ہوتے ہوئے بھی ثاقب کی پیشانی پر بل نہیں تھا۔ اس کا چہرہ پُرسکون تھا۔ انہیں دیکھتے ہی پولیس والے مستعد ہو گئے تھے اور انہوں نے رکنے کا اشارہ دیا۔ اب روکے بغیر چارہ نہیں تھا غلام رسول کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا مگر عمران اور ثاقب کے لیے ایک عام سی بات تھی۔ اس لیے ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

غلام رسول نے جھک کر اپنی پنڈلی پر بندھے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ عمران نے سرگوشی میں کہا۔ "ایسی غلطی نہ کرنا وہ لوگ بھون کر رکھ دیں گے، بس دیکھتے رہو کہ ہم کیسے نمٹتے ہیں۔" پھر اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر کہا۔ "تم لوگوں نے راستہ کیوں بند کیا ہے؟" جملہ کنونیٹ اسٹائل میں ادا ہوا تھا۔

انگریزی تو یوں بھی ہم سب کی کمزوری ہے۔ مقابل کچھ دیر کے لیے رعب میں آ جاتا ہے۔ سپاہی بھی دب گیا۔ اس نے منمناتے ہوئے کہا۔

"سر ہم ڈیوٹی پر ہیں۔ اپنی شناخت کرائیں۔"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ہم امریکہ کے سن ٹی وی سے آئے ہیں۔ یہ رہے کاغذات۔''

افسر خود بھی بڑھ آیا تھا۔ اس نے کاغذات پر سرسری نظر ڈالی اور سرخ و سپید کشمیری کو امریکن سمجھ کر ادب سے بولا۔ ''آپ جا سکتے ہیں سر!''

''یہ ہے ہمارے محافظوں کی حالت، گوری چمڑی دیکھتے ہی رعب میں آ جاتے ہیں خواہ گوری چمڑی والا نشے کا بیوپاری یا قاتل ہی کیوں نہ ہو۔'' ثاقب نے منہ بنا کر کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

''پتا نہیں ہم کب اس سحر سے نکلیں گے۔ انگریز یا امریکی ہمارے مائی باپ نہیں ہیں جو ہم ان سے اتنا دبتے ہیں۔'' غلام رسول بھی چڑ گیا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''قبرستان اب کتنی دور ہے؟''

''بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔'' اتنا کہہ کر اس نے دائیں جانب کار موڑ دی۔ وہاں سے ایک راستہ قبرستان کے گیٹ تک جاتا تھا۔

''یار غلطی ہو گئی، مجھے خیال ہی نہیں تھا کہ گیٹ پر پھول والوں اور سنگِ مرمر کی تختی بنانے والوں کی دکانیں ہیں۔ اگر ہم نے لاش نکالی تو یہ لوگ دیکھ سکتے ہیں۔''

''تم ایسا کرو کہ گورکن کو بلا لاؤ۔'' غلام رسول نے کہا۔

''وہ لوگ خواہ مخواہ شک کریں گے۔''

''تم ایسا کرو کہ کسی فرضی نام کے شخص کا پتا پوچھنا کہنا، انہوں نے کہا تھا کہ وہ قبرستان کے گیٹ کے قریب رہتے ہیں پھر گورکن سے ملنے اندر چلے جانا۔''

''ہاں یہ مناسب ہے۔'' کہہ کر ثاقب نیچے اتر گیا دکان تک گیا پھر اس نے دکاندار سے کچھ پوچھا اور لوٹ آیا۔

''گورکن موجود نہیں ہے اب کیا کرنا ہے؟'' ثاقب نے کار کو ریورس کرتے ہوئے پوچھا۔

''میرے خیال سے قبرستان کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ ہم آگے بڑھتے ہیں۔ کہیں تو ایسی جگہ نظر آئے گی جہاں ہم اس لاش کو عزت و احترام کے ساتھ اتار سکیں۔'' عمران نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ صحیح ہے۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ کافی آگے جانے کے بعد قبرستان ہی کی چار دیواری کے ساتھ سڑک مڑ رہی تھی۔ وہ بھی ادھر ہی مڑ گیا۔ ادھر ویرانی ہی ویرانی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد ثاقب نے کار روکی اور پھر نہایت پھرتی سے لاش کو

قبرستان کی دیوار کے ساتھ رکھ کر واپس مڑ گیا۔ گاڑی گھما کر وہ واپس مرکزی سڑک پر آ گیا اور موبائل پر کسی کا نمبر ڈائل کیا اور اسے لاش کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک شہید کی لاش ہے اسے عزت و احترام کے ساتھ دفن کیا جائے۔ اس کی جیب میں رقم موجود ہے۔''

موبائل بند کر کے اس نے غلام رسول سے کہا کہ میں نے ایک دوسرے گورکن کو جو پہلے والے کی جگہ کام سنبھال رہا ہے فون کر دیا ہے۔ پھر اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

''یہ کام تو ہو گیا اب بتاؤ حملہ آور کون تھے۔ میرے خیال میں وہ بھارتی ایجنٹ تھے اور تم لوگ ان کی نظروں میں آ چکے ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ بھارتی ایجنٹ نہیں تھے۔ ہم شاید ہی کبھی ان کی نظروں سے چھپے ہوں۔ وہ ہمہ وقت ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے کیونکہ وہ لوگ کوئی معمولی چور اچکے نہیں ہیں۔ شاید کسی مغربی ملک کے ایجنٹ ہیں جو پروفیسر کو اغوا کرنا چاہتے ہیں۔'' عمران بولا۔

''حیرت ہے، کسی مغربی ملک کو ہم سے کیا لینا دینا بھارتی ایجنٹ ہوتے تو بات دیگر تھی۔''

''یہی تو سمجھنے کی بات ہے۔ کشمیر اب بین الاقوامی سیاست کی بساط ہے۔ بھارت نے اپنے پیر مضبوط کرنے کے لیے موساد کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ اسرائیلی درندے فلسطین کے ظلم کو چھپانے کے لیے پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف کارروائی کر رہے ہیں، یہاں بھی پوری وادی میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ سب بھارت کی ایماء پر ہو رہا ہے۔ بھارت مسلمانوں کو اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتا ہے۔ جانتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک کا مسلمان بھارتی مسلمانوں پر مظالم برداشت نہیں کر سکتا اسی لیے وہ تمام اسلام دشمن طاقتوں سے ساز باز کر رہا ہے۔ اسرائیل مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ایسا دشمن جو دنیا کے نقشے پر کسی بھی مسلمان ملک کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ جبکہ پروفیسر عثمان نے ٹھان لیا ہے کہ وہ اپنی پوری توانائی مسلمان ممالک کو اوپر لانے میں خرچ کریں گے۔''

''کہیں یہ وہی پروفیسر عثمان تو نہیں ہیں جو امریکہ کے کسی ادارے میں ریسرچ کر رہے تھے اور اب پاکستان کے لیے کچھ کرنے کا سوچ کر وہاں سے فرار ہوئے ہیں؟''

''ہاں یہ وہی ہیں۔''

''تب تو انہیں میرا سلام ہے۔ واقعی انہوں نے مسلمانوں کی خاطر بہت بڑی قربانی کی ہے۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"آؤ تمہیں پروفیسر صاحب سے ملواتا ہوں۔" کہہ کر اس نے گاڑی کو واپس بنگلے پر لے جانے کے لیے کہا۔

☆======☆======☆

"کیا؟" پروفیسر عثمان ایک دم سے سناٹے میں آ گئے تھے۔ اپنی جگہ سن سے ہو گئے تھے۔ انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا انہوں نے ثاقب وغیرہ کی طرف دیکھا پھر غلام رسول کی طرف، وہ بھی دم بخود تھا جیسے اس کے سامنے آتش گیر مادہ رکھا ہو۔ جو کسی بھی لمحے پھٹنے والا ہو۔ کمرے میں ایک گہرا سناٹا طاری تھا۔ سب نے تحیر زدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر اپنی نگاہیں ثاقب کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ وہ کسی فاتح جرنیل کے انداز میں کھڑا تھا، مسکراتا ہوا ان سب کی حیرت سے جیسے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہونٹوں کی مسکراہٹ پھیل گئی تھی اور آنکھوں میں ایک سفاک چمک ابھر آئی تھی۔ وہ اپنے اس کارنامے پر نازاں لگ رہا تھا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" غلام رسول نے چند لمحوں کے بعد گہرے سناٹے کو توڑتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ بربریت کس لیے کی؟ یہ وحشیانہ اور انسانیت سوز حرکت ہے۔"

"جناب من! وہ انسان کب تھے جو ان کے ساتھ انسانیت کا سلوک کیا جاتا۔ ذرا عمران سے پوچھیں کیا وہ انسان تھے؟ نہیں وہ لوگ ہرگز انسان نہیں ہو سکتے۔"

عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "وہ انسانیت کے ماتھے پر نہ مٹنے والا بدنما داغ تھے اس ملک میں رہتے ہیں یہاں کی زمین کا پیدا کردہ اناج کھاتے ہیں، یہاں کی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور گن گاتے ہیں اپنے آقا کے، ایسے غداروں کو تو ایک لمحے کے لیے بھی اس سرزمین پر زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ ان کے آقا کا ملک ترقی یافتہ ہے تو ہوا کرے مگر وہ خدا تو نہیں ہے کہ ہم ان کے آگے سربسجود ہو جائیں۔"

"مجھے پوری تفصیل بتاؤ۔" پروفیسر نے عمران سے کہا۔

"ہمیں اطلاع ملی تھی کہ ہمارے بنگلے پر جن لوگوں نے حملہ کیا ہے وہ چوک بازار کے ایک گھر میں جمع ہیں۔"

"تمہیں کس نے بتایا کہ وہی لوگ تھے؟"

"کل رات میں جب ایک پجیرو ہمارے بنگلے کے سامنے رکی تھی تو اس میں تین آدمی تھے۔ اسی وقت ہمارا ایک بندہ ہم سے ملنے آ رہا تھا اس نے اجنبی چہرہ دیکھا تو وہ مڑ گیا کیونکہ اسے خبر تھی کہ کچھ ایسے لوگ اس بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں جو تحریکی نہیں ہیں،

اس نے سمجھا کہ وہ لوگ بھی ہم سے ملنے آئے ہیں اسی لیے وہ لوٹ گیا۔ اتنی دیر میں اس نے سب کا جائزہ لے لیا تھا۔ آج جب ان میں سے ایک کو اس گھر میں دیکھا تو ہمیں خبر دینے آ گیا کیونکہ اس نے سن لیا تھا کہ ہمارے ہاں فائرنگ ہوئی ہے۔ ہم اسی کے مشورے پر اس گھر میں گئے تھے۔"

"پھر بھی ان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہونا چاہیے تھا۔" غلام رسول نے کہا۔

"کیوں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ خون آشام، سفاک اور بے رحم درندے تھے۔" ثاقب بولا۔

"آپ نے انہیں نہیں دیکھا، آپ انہیں نہیں جانتے اور آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ انسان بھی اتنے شقی القلب ہوتے ہیں۔ ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جس کے ہاتھ اس طرح کے معصوم مسلمانوں کے خون سے رنگے نہ ہوں۔ وہ اپنے آقا کے اشارے پر ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے، ملک کو کمزور بنانے کے لیے مسجدوں، امام بارگاہوں، گرجوں اور مندروں میں فائرنگ کرتے تھے۔ ان کے دل کے کسی کونے میں بھی خوف خدا، رحم اور انسانیت کی رمق تک نہ تھی۔ ان کا کوئی مذہب نہ تھا وہ صرف اور صرف درندے تھے۔"

"ثاقب میاں!" پروفیسر نے کہا۔ "میں تمہاری اس بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ وہ جو بھی تھے مگر تمہارا فرض تھا کہ تم قانون کو ہاتھ میں نہ لیتے۔ قانون کے پاس جاتے۔"

"میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ قانون اس بنگلے پر انہیں گرفتار کرنے نہیں جائے گا اور مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں کرے گا کیونکہ قانون کے ہاتھ بندھے دیے ہیں اسی لیے میں نے قانون ہاتھ میں لیا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ رہے ہو؟ کس بنا پر کہہ رہے ہو کہ قانون ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتا۔ آخر محکمہ پولیس بنا کس لیے ہے۔"

"محکمہ پولیس بھی مجبور ہے، اس کے ہاتھ پاؤں کو قانون نے باندھ رکھا ہے۔ پھر ہمارے مقابلے میں ظالموں کے زرخرید ایجنٹ ہیں۔ اگر ان سے ہمدردی کی جائے تو وہ یہی سمجھیں گے کہ ہم ان کے مقابلے میں کمزور ہیں۔" پھر وہ عمران کی طرف مڑ کر بولا۔ "مولانا کو سمجھاؤ۔"

"ارے بھائی میں مولانا نہیں ہوں۔" وہ جلدی سے بولے۔

"بھئی میں تو یونہی کہہ رہا ہوں، عزت دے رہا ہوں...... تو جناب! کفار مقبوضہ کشمیر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں ہمارے نہتے بھائیوں کو گولیوں سے اڑا رہے ہیں، ہماری بہنوں کے سروں سے ردائیں کھینچ رہے ہیں کیونکہ وہ کافر ہیں اور کافر کسی کا دوست نہیں ہوتا، لیکن یہ...... یہ ان سے بھی بدتر ہیں کیونکہ یہ ہمارے بھائی ہوتے ہوئے بھی ان کافروں کے دوست بنے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہ دیمک ہیں دیمک جو ہمارے اتحاد کی عمارت کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اسی لیے میں نے انہیں موت کی نیند سلا دیا۔''

''مگر یہ تو سوچو کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ دشمن تو ہماری تاک میں ہے ہی اب پولیس بھی ہمارے پیچھے لگ جائے گی۔''

''بھارتی پولیس سے تو آنکھ مچولی کھیلتے ہی ہیں اب یہاں بھی کھیلیں گے۔'' ثاقب نے ہنس کر کہا۔ ''ویسے ایک بات بتا دوں میں اس آپریشن پر صرف اس لیے گیا تھا کہ آپ کے دشمنوں کا پتا لگاؤں سو میں نے پتا لگا لیا۔''

''کیا...... اتنی بڑی خبر چھپائے بیٹھے ہو، جلدی سے بتاؤ وہ لوگ کہاں چھپے ہیں؟''

''آپ جنہیں معمولی سمجھ رہے ہیں وہ بہت اونچے لوگ ہیں۔ یہاں ایک سفارت خانے میں چھپے بیٹھے ہیں۔''

''یہ تو ہمیں بھی پتا ہے انہیں کسی طرح باہر لاؤ۔'' پروفیسر نے کہا۔

''ہم انہیں باہر کیا لائیں گے وہ خود ہمیں باہر نکالنے کی سازش میں لگے ہوئے ہیں، پولیس کو بھی ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔ وہ بھی آپ کی تلاش میں ہے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ ہمیں اس مکان میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔ اگر میں آپریشن پر نہ جاتا تو اب تک یہاں ریڈ ہو چکا ہوتا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو یہ جگہ چھوڑ دیں۔''

''یہ جگہ چھوڑ کر ہم کہاں جائیں گے۔ آنے دو۔ دو دو ہاتھ کر لیں گے۔'' غلام رسول بولا۔

''دشمن سے کھلے میں جنگ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ تاکہ پولیس کی مداخلت نہ ہو۔ عقلمندی کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ یہاں سے نکل جایا جائے۔''

''یہاں سے نکل کر فائدہ؟ وہ اگر حملہ کرتے ہیں تو ہماری منشاء بھی یہی ہے۔ ہم تو خود ان سے دو دو ہاتھ کرنے آئے ہیں۔''

''آپ نے شاید سنا نہیں، انہوں نے آپ لوگوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرائی ہے اور انٹرپول کے ذریعے سے یہ رپورٹ بھجوائی ہے کہ پروفیسر عالمی دہشت گرد ہیں اور کسی عالمی دہشت گرد کو گرفتار کرنے کا خواب ہر پولیس افسر دیکھتا ہے۔ نہ

جانے کتنے افسران آپ لوگوں کی تاک میں ہیں۔ اب دو طرفہ مقابلہ کرنا ہے۔''

''کوئی دوسری جگہ ہے؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''تلاش کرنا پڑے گی کیونکہ ہم آپ کو اپنے ہیڈ کوارٹر میں رکھ نہیں سکتے کیونکہ ہمیں اپنے تحفظ کی بھی ضرورت ہے۔''

''آپ کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں۔ بلکہ ابھی چلے جائیں۔''

''آؤ غلام رسول۔'' کہہ کر پروفیسر عثمان کھڑے ہو گئے۔

''اس بیگ کو بھی رکھ لیں، اس میں داڑھی مونچھیں میک اپ کا دیگر سامان بھی ہے، اگر ضرورت پڑی تو کام آئے گا۔''

عمران، پروفیسر عثمان اور غلام رسول اس گھر سے باہر آئے۔ اب ان کے تصرف میں بھی کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اس شہر میں وہ پھر سے تنہا ہو گئے تھے۔ اب انہیں اپنی لڑائی خود لڑنا تھی۔ اس لیے باہر آ کر وہ ٹیکسی کی تلاش میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کافی دور جانے کے بعد انہیں ایک ٹیکسی نظر آئی۔ وہ تینوں اس میں بیٹھ گئے۔ بیٹھتے وقت عمران نے کہا۔ ''کسی اچھے ہوٹل میں چلنا ہے، جہاں کی سروس فائیو اسٹار جیسی ہو۔''

ہوٹل کے دروازے پر اتر کر پروفیسر نے کہا۔ ''ایک ساتھ داخل ہونا عقلمندی نہیں ہے۔ سب کو الگ الگ کمرے حاصل کرنا ہیں۔'' پھر وہ آگے بڑھتے چلے گئے کاؤنٹر پر پہنچ کر انہوں نے کمرا حاصل کرنے کے لیے شناختی کارڈ آگے بڑھا دیا۔ انہیں پہلی منزل کا کمرا نمبر 103 ملا تھا۔ وہ چابی لے کر بیرے کے ساتھ اوپر چلے گئے۔ ان کے بعد غلام رسول نے کمرا حاصل کیا۔ پھر عمران پہنچا۔ اس نے ابھی کمرے کے بارے میں پوچھا بھی نہیں تھا کہ ایک کھلی ہوئی رنگت والا شخص کاؤنٹر پر آیا اور بولا۔ ''ابھی جو صاحب آئے ہیں انہیں کون سا کمرا دیا ہے؟''

''کیوں؟'' کاؤنٹر کلرک نے پوچھا۔

''جو پوچھا جائے وہی بتاؤ سمجھے!'' اس شخص نے درشت لہجے میں کہا۔

''پہلے آپ اپنا تعارف تو کرائیں۔''

''میرا تعارف یہ ہے۔'' کہہ کر اس نے اپنا کارڈ نکال کر کاؤنٹر کلرک کے سامنے کر دیا۔ کلرک نے کارڈ دیکھتے ہی رجسٹر ان کے سامنے پھیلا دیا۔ اس شخص نے موبائل فون پر کمرے کا نمبر اور نام نوٹ کیا پھر بولا۔ ''میں انہیں چیک کر کے آتا ہوں۔''

جیسے ہی وہ سیڑھیوں کی طرف گیا کلرک نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ ''ہر ایک کو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمارے ہی گاہک مشتبہ لگتے ہیں۔ رقم بھی پہنچا آتا ہوں پھر بھی ہمارے کسٹمرز کو تنگ کرنے آ جاتے ہیں۔''

عمران نے حالات کی نزاکت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پورے شہر کی پولیس پروفیسر کی تلاش میں نکل پڑی ہے۔ انہیں ہوشیار کرنا ضروری تھا۔ یہ سوچ کر وہ مڑا ہی تھا کہ کلرک نے پوچھا۔ ''فرمایئے۔''

''شاید آپ غصے میں تھے اسی لیے میں نے زیادہ کچھ نہیں پوچھا۔ دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مسٹر ہمفرے نامی کوئی شخص یہاں ٹھہرا ہے۔ وہ کل امریکن فلائٹ سے آیا ہے۔'' عمران نے کلرک سے پوچھا۔

''جی نہیں اس نام کا کوئی شخص یہاں نہیں آیا ہے۔''

''شکریہ! میں کانٹی نینٹل میں دیکھ لیتا ہوں۔'' کہہ کر وہ باہر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف پہنچا اور موبائل نکال کر پروفیسر کا نمبر دبایا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔

اس کی کال کو پروفیسر ریسیو کرتے تو کیسے۔ ان کے سامنے کسی جن کی طرح وہی شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور ریوالور کی نال پروفیسر کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

''آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟'' پروفیسر نے نووارد سے پوچھا۔

''صرف اتنا بتا دو کہ اس شہر میں تمہارے کتنے ایجنٹ ہیں اور پاکستان میں تم کیا کرنے آئے ہو؟''

''بھئی یہ میرا ملک ہے، میں جب چاہوں یہاں آ سکتا ہوں۔'' پروفیسر نے کہا۔

''مگر اب تم کسی دوسری طاقت کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے ہو، بس یہ بتا دو کہ وہ کون ہے تم کس کے لیے کام کر رہے ہو؟''

''میں نے کہا ناں کہ میں کسی کے لیے کام نہیں کر رہا ہوں۔ اب میں بحیثیت ایک پاکستانی ری سرچ ورک کروں گا۔''

''پھر جھوٹ بولے، تم کسی خاص مقصد سے یہاں آئے ہو، تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے۔ سیدھے سادے بتا دو ورنہ ہمارے دفتر میں لے جا کر جب تھرڈ ڈگری آزمائی تو...... تم خود عقلمند ہو سمجھ جاؤ تمہارا کیا حشر ہوگا۔'' نووارد کا رخ پروفیسر کی طرف تھا اور پیٹھ دروازے کی طرف اسی لیے اس نے یہ نہیں دیکھا کہ دروازہ دھیرے دھیرے کھل رہا

ہے۔ باہر جو کوئی بھی تھا نہایت چالاک تھا، وہ چیونٹی کی رفتار سے دروازہ دھکیل رہا تھا تاکہ آواز نہ ہونے پائے۔ دروازہ اتنا کھل چکا تھا کہ اس میں سے ایک آدمی با آسانی اندر آ جائے۔ اس کھلے ہوئے دروازے سے غلام رسول اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ وہ گربہ پا چلتا ہوا نووارد کے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ نووارد سوالات کرنے میں منہمک تھا کہ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ آنکھوں کے آگے کھوپڑی کے عقب سے نیلے پیلے سورج طلوع ہو کر آنے لگے۔ وہ چکرا کر فرش پر گرا تھا کہ غلام رسول بولا۔

''جتنی جلدی ممکن ہو نکل چلیں۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کتنے آدمی اور ہوں گے۔''

پروفیسر عثمان نے کٹ بیگ بغل میں دبایا اور باہر نکل آیا۔ کمرے کو لاک کر کے وہ دونوں نیچے کی جانب بڑھنے لگے۔

''ٹھہریں۔'' غلام رسول بولا۔ ''آپ میرے کمرے میں چلیں۔''

وہ دونوں غلام رسول کے کمرے میں آئے۔

''شاید آپ پہچان لیے گئے ہیں۔'' غلام رسول بولا۔

''ہاں وہ یہی کہہ رہا تھا۔''

''اگر آپ اس حلیے میں نیچے اتریں گے تو......'' تبھی پروفیسر کی جیب میں پڑا موبائل فون وبریٹنگ کرنے لگا۔ اس کی تھرتھراہٹ سے اندازہ ہو گیا تھا کوئی کال کر رہا ہے۔ پروفیسر موبائل فون نکالتے ہوئے بولے۔ ''پتا نہیں کون بار بار کال کر رہا ہے۔'' پھر نمبر دیکھ کر وہ بولے۔ ''شاید عمران ہے۔'' انہوں نے موبائل فون آن کر لیا۔ دوسری طرف واقعی عمران تھا۔ پروفیسر جلدی سے بولے۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں نیچے ہوں۔ کئی بار کال کر چکا ہوں۔ اپنی اس عادت کو بدلیں۔ پلیز رنگ ٹون کھلا رکھا کریں۔''

''تم ٹیکسی اسٹینڈ سے ٹیکسی لو ہم لوگ نیچے اتر رہے ہیں۔'' اتنا کہہ کر پروفیسر نے آف کا بٹن دبا دیا۔

''آپ فٹافٹ چہرے پر داڑھی چپکائیں اور سندھی ٹوپی اوڑھ کر شلوار سوٹ پہن لیں تاکہ ایک نظر میں کوئی آپ کو پہچان نہ سکے۔ نیچے دوسرے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔''

پروفیسر نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور کٹ بیگ میں سے داڑھی نکال کر اپنے گالوں پر چپکا لی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ کسی سندھی وڈیرے کی کاپی بن چکے تھے۔ غلام رسول نے بھی ٹوپی اور اجرک اوڑھ لی تھی اور اب وہ دونوں کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرف بڑھ رہے تھے۔

جب وقت وہ دونوں نیچے اتر رہے تھے اسی وقت دو نوجوان نہایت تیزی سے اوپر کی طرف بڑھتے چلے آئے۔ وہ اتنی تیزی میں تھے کہ پروفیسر سے ٹکراتے ٹکراتے بچے تھے۔

''کمرے کا نمبر یاد ہے نا۔'' ایک نے دوسرے سے پوچھا تھا۔

''ہاں! سر نے موبائل پر یہی بتایا تھا۔''

شاید اسی کو چھٹی حس کہتے ہیں۔ پروفیسر کو ایسا لگا تھا جیسے وہ دونوں انہی کے کمرے کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے قدم تیز کر دیے۔ وہ دونوں نیچے اترے اور ٹہلنے کے انداز میں ریسپشن کے سامنے سے گزرتے ہوئے باہر آ گئے۔ انہوں نے ابھی گیٹ پار ہی کیا تھا کہ سائرن بجاتی ہوئی پولیس کی جیپ آ گئی۔ دو جیپوں میں سوار پولیس والے کود کود کر نیچے اتر رہے تھے۔ پروفیسر عثمان نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''ہری اپ جلدی نکل چلو۔''

وہ دونوں تیز تیز قدموں سے پارکنگ لاٹ میں پہنچے۔ عمران ٹیکسی میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں اسی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ٹیکسی چل پڑی۔

اب ان کی ٹیکسی بازار میں پہنچ چکی تھی۔ عمران نے ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی رکتے ہی وہ نیچے اترا اور کرایہ ادا کر کے پروفیسر اور غلام رسول کے ساتھ ایک پارک کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ پارک میں پہنچ کر ایک خالی بینچ پر بیٹھتے ہوئے وہ بولا۔ ''پروفیسر صاحب آپ نے اندازہ لگایا۔''

''کس بات کا؟''

''آپ کی تلاش زور و شور سے ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ ہر ہوٹل میں سادہ لباس والے تعینات کیے گئے ہیں کیونکہ جیسے ہی آپ نے کمرا ریزرو کرایا تھا ایک سادہ لباس والا وہاں رجسٹر چیک کرنے پہنچ گیا تھا اور آپ کا نام دیکھتے ہی اس کے چہرے پر کامیابی کی جھلک آ گئی تھی۔ میں نے خود دیکھا تھا۔''

''ہاں تمہارا اندازہ درست ہے۔'' پروفیسر صاحب بولے۔

''تو کیوں نا کچھ دنوں کے لیے گلگت شفٹ ہو جائیں۔'' غلام رسول نے مشورہ دیا۔

''گلگت کیا پاکستان سے باہر ہے؟ وہ بھی تو اسلام آباد ہی کی عمل داری کا ایک حصہ ہے۔ جب یہاں کی پولیس ہماری کھوج میں لگ گئی ہے تو کیا وہاں کی پولیس ہمیں تلاش

نہیں کرے گی، ارے بے وقوف! ہم جس کام کے لیے آئے ہیں وہ کام ہر حال میں کرنا ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔

''لیکن کیسے کریں گے؟''

''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ ہمارا ٹکراؤ معمولی مجرموں سے نہیں ہے۔ دنیا کی بڑی طاقتوں سے ہے۔ ان کے ایک ایجنٹ کو تو ختم کر ہی دیا۔ باقی دو کو کر دیں گے تو ان کا نیٹ ورک ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔'' عمران نے پہلی بار لب کشائی کی۔

''بات سو فیصد درست ہے۔'' پروفیسر عثمان نے کہا۔ ''اب ہمیں سیدھے ان لوگوں پر وار کرنا ہے۔ وہ لوگ سفارت خانے میں چھپے ہوئے ہیں ناں ہم انہیں وہیں گھیریں گے۔''

''مگر کیسے؟''

''تم لوگ دیکھتے جاؤ۔''

''ان لوگوں سے کیسے نمٹا جائے یہ تو بعد کی بات ہے مگر ابھی جو مسئلہ ہے اس کا کوئی حل سوچا ہے؟'' غلام رسول نے کہا۔

''کیا؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''وہ یہ کہ رات کہاں گزاری جائے گی۔ اتنا بڑا شہر ہے مگر اسے ہمارے لیے تنگ کر دیا گیا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو اس کا حل بھی میرے پاس ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔'' یہ کہہ کر پروفیسر پارک سے نکلنے کے لیے باہر کی طرف بڑھے۔

''ہم کہاں جائیں گے یہ تو بتاؤ۔''

وہ تینوں پارک سے نکلے۔ باہر ٹیکسی اور رکشاؤں کی قطار سی لگی ہوئی تھی۔ پروفیسر نے ایک ٹیکسی والے سے کہا۔ ''زیرو پوائنٹ میں کچھ دیر کے لیے ٹھہروں گا پھر چوک بازار میں اتار دینا۔''

وہ لوگ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ''زیرو پوائنٹ کیوں جا رہے ہیں؟''

''شہر میں ہر طرف خطرہ ہے اس لیے وہاں کسی چارپائی والے ہوٹل میں بیٹھ کر پلاننگ کرنا ہے۔'' پروفیسر نے بھی فرنچ ہی میں جواب دیا۔

''نہیں میرا خیال ہے کہ ہمیں رات تک انتظار کر لینا چاہیے اور رات کے وقت

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سفارتخانے پر دھاوا بول دینا چاہیے۔'' اس بار غلام رسول نے انگلش میں کہا کیونکہ عمران فرنچ سمجھ نہ پانے کی وجہ سے حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

غلام رسول کی بات سنتے ہی عمران نے کہا۔''تازہ اطلاع کے مطابق وہ دونوں سفارتخانے میں نہیں ایک سفارت کار کے نجی بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ بنگلہ کسی قلعے سے کم نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں اس قلعہ میں سرنگ میں لگاؤں گا۔'' پروفیسر نے کسی عادی لڑاکا کی طرح جواب دیا۔

زیرو پوائنٹ آ چکا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف میں بنے ہوٹلوں میں چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کچھ پر لوگ بیٹھے تھے تو کچھ پر لیٹے تھے۔ وہ تینوں بھی ایک ہوٹل کے باہر بچھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ عمران نے ٹیکسی والے کو دو سو روپے دے کر کہا۔''بھائی ہمیں ایک صاحب کا انتظار کرنا ہے۔ زیادہ دیر بھی ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی سواری ملے تو چلے جانا۔''

ڈرائیور کے ہٹتے ہی عمران نے اونچی آواز میں پوچھا۔''تو اب کھل کر بتائیں کیا کرنا ہے؟''

''کرنا کیا ہے؟ ہمیں ان دونوں کو ختم کر دینا ہے تا کہ یہاں کا نیٹ ورک ٹوٹ جائے۔ نیا نیٹ ورک اتنی آسانی سے بن نہیں پائے گا۔ جتنے دنوں میں یہ لوگ نیٹ ورک بنائیں گے۔ اتنے دنوں میں کوئی نیا محبِ وطن ان کی بیخ کنی کے لیے پیدا ہو جائے گا۔ وطن دشمن ایک دو ہوتے ہیں وطن پرست لاکھوں، کروڑوں۔'' پروفیسر کے لہجے میں عزم تھا، حب الوطنی کا جذبہ تھا۔

اسی طرح کی باتوں میں وقت گزرتا رہا۔ نئے نئے طریقوں پر بحث ہوتی رہی اور شام کا اندھیرا گھر آیا۔

''چلو واپس چلتے ہیں۔'' کہتے ہوئے پروفیسر کھڑے ہو گئے۔

ان لوگوں نے اس بار بس سے سفر کیا اور لوٹ کر شہر آ گئے۔ پروفیسر نے داڑھی لگا رکھی تھی۔ غلام رسول نے بھی اپنے حلیے میں ہلکی پھلکی تبدیلی کر لی تھی پھر بھی وہ تینوں ہوشیار تھے۔ انہیں احساس تھا کہ یہاں چپے چپے پر ان کی تلاش جاری ہے۔

تقریباً گیارہ بجے تک انہوں نے بازاروں میں آوارہ گردی کی پھر وہ عمران کے ساتھ اس کے مرکز پر گئے۔ عمران نے وہاں کے سرکردہ افراد سے ہاتھ پیر جوڑ کر مزید

پستول حاصل کیے۔ اسلحہ حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اللہ کا نام لیا اور عمران کی رہبری میں اس بنگلے کی طرف چل پڑے جہاں ڈیوڈ کے ہونے کی اطلاع تھی۔ الفرڈ مارا جا چکا تھا اس لیے اب بڑوں میں وہی ایک بچا تھا یا پھر وہ پُراسرار عورت جو پروفیسر کے خلاف چلائی جانے والی مہم کی انچارج تھی۔

عورت کا تو پتا نہیں تھا صرف ڈیوڈ کے بارے میں علم ہوا تھا جو اس بنگلے میں چھپا ہوا تھا۔ وہ بنگلہ ایک پوش علاقے میں تھا۔ ایسے علاقوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں پڑوس میں کون رہتا ہے یہ پڑوسی کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ چوڑی چوڑی بڑی سڑکیں ہوتی ہیں مگر وہاں رہنے والوں کے دل کشادہ نہیں ہوتے۔

سڑکوں پر ویرانی تھی مگر بنگلے کا گیٹ جگمگا رہا تھا۔ بندوق تھامے اونگھتے ہوئے چوکیدار بھی نظر آ رہے تھے۔ ان تینوں نے بنگلے کا اطراف سے جائزہ لیا اور عقبی حصے کو حسب خواہش پایا۔ ادھر نسبتاً اندھیرا بھی تھا اور دیوار بھی اتنی اونچی نہ تھی کہ اسے پھلانگا نہ جا سکے، وہ تینوں دیوار کے نیچے جا کر کھڑے ہو گئے۔

''میں گھوڑا بنتا ہوں تم میری پیٹھ پر چڑھ کر دیوار پھلانگ جاؤ'' غلام رسول نے کہا۔

''نہیں میں گھوڑا بنتا ہوں۔ آپ میری پیٹھ پر سوار ہو کر دیوار پر چڑھ جائیں۔'' عمران نے کہا۔

''اسی طرح پہلے آپ، پہلے آپ کرتے رہے تو صبح ہو جائے گی، عمران جوان ہے لڑائی بھڑائی کا عادی ہے۔ اس لیے وہ پہل کرے۔ اندر کود جائے پھر ہم بھی آ جائیں گے۔'' پروفیسر نے کہا۔

غلام رسول جھک گیا۔ عمران اس کی پیٹھ پر چڑھ کر اندر کودا پھر غلام رسول نے پروفیسر کے سہارے دیوار پر چڑھ کر ہاتھ لٹکایا۔ پروفیسر عثمان نے ہاتھ کا سہارا لیا کچھ زور انہوں نے دکھایا۔ کچھ غلام رسول نے کھینچا۔ وہ بھی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر دونوں اندر کودے۔ اندر آنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ عمران کسی سے لپٹا ہوا ہے۔ وہ دونوں گتھم گتھا ہیں۔ پروفیسر اور غلام رسول دونوں پر اس حقیقت کا انکشاف ہو چکا تھا۔ شاید عمران وہیں پر کودا تھا جہاں کوئی موجود تھا۔ پروفیسر نے کچھ دیر تک یہ اندازہ لگایا یہاں کوئی اور تو موجود نہیں ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں گھاس کے علاوہ پودے بھی تھے۔ آسمان پر ستارے نہیں تھے، بدلی بھی تھی اسی لیے اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ غلام رسول نے جھپٹ کر عمران کے مقابل کا گلا پکڑ لیا اور دبانے لگا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ شخص بری طرح مچل رہا تھا مگر آواز نکالنے سے قاصر تھا کیونکہ اس کے منہ پر عمران کی ہتھیلی ڈھکن بنی ہوئی تھی۔ غلام رسول نے تھوڑا سا زور لگایا اور وہ شخص ٹھنڈا ہو گیا۔ عمران اسے چھوڑ کر کھڑا ہوا پھر بولا۔ ''ان لوگوں نے اپنی حفاظت کا بھرپور بندوبست کیا ہے۔ یقیناً اسے ہم سے خطرہ لاحق ہو گا تبھی اس نے چوکیدار پر تکیہ نہیں کیا یہاں اور بھی محافظ ہو سکتے ہیں۔''

''ہاں ہمیں بھی اندازہ ہے۔'' عمران نے سرگوشی میں کہا۔ عین اسی وقت عمران کو کیاری کے پیچھے کوئی چیز ہلتی ہوئی نظر آئی اور اس نے بڑی تیزی سے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا غضب کا پھرتیلا تھا فوراً ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ عمران کی مدد کے لیے غلام رسول نے بھی چھلانگ لگائی۔ اس کا جمپ کامیاب ٹھہرا۔ وہ ایک شخص کو ساتھ لے کر نیچے گرا تھا۔ عمران نے اپنا داہنا پیر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ غلام رسول نے ایک ہاتھ سے اس کے جبڑے پر گھونسہ مارا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی کو پکڑا تھا تب اس پر انکشاف ہوا کے ہاتھ میں پستول ہے۔ غلام رسول نے اس شخص کی کلائی مروڑ دی۔ یہ کام اس نے بجلی کی سی تیزی سے کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے گھٹنے سے مدِمقابل کے پیٹ میں کئی ضربیں بھی لگا دیں۔ اس کے حلق سے کراہیں نکلتی تھیں مگر وہ چیخا نہیں تھا، یا پھر اس کے چیخنے کی کوشش بھی کراہوں کی صورت میں سنائی دی تھی کیونکہ پروفیسر عثمان نے اس کے منہ کو بند کر رکھا تھا۔ اس کی مزاج پُرسی کے بعد غلام رسول نے اس کے پستول بردار ہاتھ کی انگلیوں کو اپنی ضربات سے کچلنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پستول پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ غلام رسول نے اس سے پستول چھینا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اب تک ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ شاید اس کی کوئی ہڈی اپنی جگہ سے کھسک گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دبا رکھا تھا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے اور اب وہ ان کے کہے بغیر اپنی مرضی سے حرکت نہیں کرے گا۔

''اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔'' غلام رسول نے اسی کے پستول کو اس کی کنپٹی پر رکھ کر کہا۔ ''اگر آواز نکالنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔''

اس نے دونوں ہاتھ ٹیک کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ غلام رسول بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ تبھی اس شخص نے ایک عجیب حرکت کی۔ بجائے کھڑے ہونے کے اس نے غلام رسول کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ غلام رسول سنبھلتے سنبھلتے بھی پیٹھ کے بل گر

پڑا۔ غلام رسول کو اس سے اتنی جرأت مندی کی توقع نہ تھی۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کی جتنی مرمت ہو چکی ہے وہ کافی ہے مگر اس حرکت سے اندازہ ہوا کہ اس میں ابھی کس بل باقی ہیں اور ابھی اسے اچھی خاصی تواضع کی ضرورت ہے۔ حملہ اسی شخص نے کیا تھا اس لیے اس کی طرف سے پھرتی کا مظاہرہ ہونا قدرتی بات تھی۔ غلام رسول کے گرتے ہی اس شخص نے تیزی سے اٹھ کر چھلانگ لگائی تھی۔ اس کے خیال میں یہ غلام رسول کو چھاپ لینے کا نادر موقع تھا مگر اس کے اور غلام رسول کے درمیان میں پروفیسر کی ٹانگیں آ گئی تھیں کیونکہ لیٹے لیٹے پروفیسر نے اپنے پیر اٹھا دیے تھے جن سے الجھ کر وہ گر پڑا تھا۔ غلام رسول نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور پوری قوت سے اس کے پیٹ میں لات ماری۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ اسے تارے نظر آ گئے ہوں گے۔ قیامت گزر گئی ہو گی۔ اس کے حلق سے انتہائی کربناک قسم کی کراہ برآمد ہوئی۔ اس بار آواز ذرا تیز تھی۔ غلام رسول نے پستول اٹھایا اور بڑی تیزی سے رینگتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ اپنا سینہ پکڑے لوٹ رہا تھا اور تکلیف کی شدت سے دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ غلام رسول نے پستول کی نال کو دوبارہ اس کے سر سے لگا دیا۔

''زندگی عزیز ہے تو ساکت ہو جاؤ۔'' غلام رسول نے غرا کر کہا۔ ''اب کوئی حرکت کی تو ذرا سی بھی رعایت نہیں کروں گا۔ بھیجا اڑا دوں گا۔''

''کیا بات ہے راشد؟'' اندر کا دروازہ کھول کر برآمدے کی طرف آنے والے کی آواز آئی۔ ''ابھی میں نے کسی قسم کی آواز سنی تھی۔'' شاید وہ کوئی پہریدار تھا جو ادھر ہی چلا آ رہا تھا۔

''اسے اپنے قریب بلاؤ۔'' غلام رسول نے سفاکانہ سرگوشی کی۔ ''لیکن اس طرح کہ اسے بالکل شک نہ ہو، اسے ذرا بھی شبہ نہ ہونے پائے کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے ورنہ چھ کی چھ گولیاں تمہارے سر میں گھس کر ڈنڈ لگائیں گی۔''

''میرے سینے میں شدید درد ہو رہا ہے۔ گھٹنے کی ضرب نے شاید میری پسلیوں کو توڑ دیا ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں درد کا حقیقی تاثر موجود تھا اور یہ اس نے جھوٹ نہیں کہا تھا اس لیے اپنے سینے پر پروفیسر کے پیروں کی بھرپور ضرب برداشت کی تھی۔ اس کی تڑپ میں بھرپور کرب تھا جیسے کسی مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو۔

راشد کے اس بری طرح تڑپنے کی وجہ سے ہی آنے والا پہریدار بوکھلا گیا تھا اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے بوکھلاہٹ میں یا تو غلام رسول اور پروفیسر کو دیکھا ہی نہیں تھا یا دیکھنے کے باوجود نظرانداز کر دیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود خودکار گن اپنے کندھے سے لٹکا لی تھی اور بڑی تیزی سے راشد کی طرف لپکا تھا۔ غلام رسول نے اس پر زقند لگانے کے لیے خود کو پوری طرح تیار کرلیا تھا تاکہ وہ پہلی ہی جست میں اسے چھاپ لے۔

پہریدار کے راشد تک پہنچنے سے قبل ہی غلام رسول نے چیتے کی طرح اس پر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ اس پر کیا آفت نازل ہوئی ہے۔ وہ اسے لیے ہوئے گھاس پر گرا۔ اس کی گردن کو غلام رسول نے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا اور اس پر پوری قوت صرف کر رہا تھا۔ وہ جاندار آدمی تھا اور اگر ہوشیار ہوتا تو غلام رسول کے لیے اس سے لپٹ پڑنا بہت مہنگا پڑتا مگر اس نے اسے بےخبری میں چھاپ لیا تھا اس لیے وہ غلام رسول کے خلاف اپنی جسمانی طاقت کا ذرا بھی استعمال نہیں کر سکا تھا۔ دوسری طرف اسے راشد سے بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ پیچھے سے وار نہ کر دے مگر ادھر پروفیسر اور عمران تھے اس لیے امید بھی کم تھی پھر وہ دونوں کی طرف یکساں انداز میں متوجہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس کے گلے کو دبانے کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت لگاتا جا رہا تھا۔

نووارد پہریدار دوسری مصیبت میں تھا اس کا ایک ہاتھ پہلو میں دبنے کی وجہ سے عملاً بیکار ہو گیا تھا اور اس کے پہلو سے لٹکی ہوئی گن اس کے جسم میں چبھ رہی تھی۔ غلام رسول کو اندازہ تھا کہ وہ کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ اسی لیے وہ اپنی گرفت کو نرم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگی تھیں۔ سانس بھی رکنے لگا تھا۔ غلام رسول نے دو تین انتہائی شدید قسم کے جھٹکے دیے اور اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز سن کر اسے چھوڑ کر ہٹ گیا۔ وہ مر چکا تھا۔ غلام رسول نے اسے سیدھا کیا اور اس کی گن کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ راشد نامی پہریدار ابھی تک تکلیف میں تھا۔ اب عقبی لان میں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے غلام رسول نے سوچا کہ وہ اٹھے اور بنگلے میں گھس جائے مگر یہ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا کہ ہاتھ آئی نعمت سے فائدہ نہ اٹھانا بےوقوفی ہے۔ اندر داخل ہونے کے لیے راشد کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وہ تکلیف میں ضرور مبتلا ہے مگر دیکھ سکتا ہے کہ اس کے ساتھیوں کا کیا حشر ہو چکا ہے۔ دونوں مردہ حالت میں پڑے ہیں۔ چنانچہ جیسے ہی غلام رسول اس کے پاس پہنچا وہ اپنی تکلیف کو بھلا کر ساکت ہو گیا۔

''مجھے بنگلے کے اندر داخل ہونا ہے۔'' غلام رسول نے گن کی نال اس کے سر سے لگا

کر کہا۔ ''اس کے ذمہ دار تم ہو گے کہ مجھے باحفاظت اندر لے جاؤ نہ صرف لے جاؤ بلکہ باہر بھی بلاؤ گے۔''

''نہیں...... وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' خوف کی شدت سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''اور اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' غلام رسول نے نال کا دباؤ بڑھا کر کہا۔ ''تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ کس کے ہاتھ سے مرنا پسند کرو گے میرے یا ان لوگوں کے، وہ شاید بخش بھی دیں مگر میں ان میں سے نہیں ہوں جو اپنی بات کے ٹھکرائے جانے پر چھوڑ دیتے ہیں، میں تو پورے خاندان کو اڑا دینے والوں میں سے ہوں۔''

''مجھ پر رحم کرو۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔ ''مجھ پر رحم نہیں آ رہا ہے تو کچھ اپنا ہی خیال کرلو۔ یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر قتل کر دیتے ہیں۔''

''یہ لوگ کرائے کے غنڈوں کی قوت پر اکڑتے ہوں گے مگر میں اپنی صلاحیتوں پر انحصار کرتا ہوں اگر اپنی زندگی کو طویل کرنا مقصود ہے تو اٹھو ورنہ تمہیں میں ابھی ٹھکانے لگا دیتا ہوں۔ بنگلے میں تو میں بہرحال داخل ہوں گا۔''

اس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے بولا کہ وہ ان سے تعاون کرنے پر تیار ہے۔ ''مگر اس کے بعد میرے لیے کوئی جگہ نہیں رہ جائے گی۔''

''بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ فی الحال تم اٹھو اور مجھے کسی محفوظ راستے سے اندر لے چلو۔'' پروفیسر عثمان بولے۔

وہ کراہتا ہوا اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک سمت چلنے لگا۔ وہ تینوں اس کے پہلو سے لگے چل رہے تھے۔ گن غلام رسول نے کاندھے سے لٹکا لی تھی اور اس کا ہاتھ جیب میں پڑے پستول کے دستے پر تھا۔ وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔

''میں تمہیں آخری بار وارننگ دے رہا ہوں کہ اگر تم نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں گولی چلانے میں ذرا بھی تامل نہیں کروں گا اور تم خود اپنے ہی پستول کی گولی کا شکار ہو جاؤ گے۔''

اسے خود بھی اندازہ تھا کہ وہ پار نہیں نکل سکے گا بنگلے کی عقبی دیوار کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا پھر بولا۔ ''میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"لیکن میں تم سے کوئی سودا نہیں کرنا چاہتا۔ تم اس وقت میرے پستول کی زد میں ہو پھر میں تم سے سودے بازی کیوں کروں۔" غلام رسول نے غراتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے زیادہ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔" راشد بولا۔ "میں تو اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکا ہوں۔ صاحب لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے، ہر حال میں مروا دیں گے۔" اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

"میں نے تم سے کہا تھا مجھے محفوظ راستے سے کوٹھی کے اندر پہنچا دو اور تم فضول باتوں میں لگ گئے۔" غلام رسول گرجا۔

"پوری کوٹھی میں خفیہ کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا تو تم لوگوں کو خاموشی سے پکڑوا دیتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم سے سودے بازی کر کے میں نقصان میں نہیں رہوں گا۔"

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" پروفیسر نے دھیرے سے کہا۔

"صرف اتنا کہ اگر تم بچ گئے تو مجھے پاکستان سے باہر نکلنے میں بھرپور مدد دینا۔"

"یہ کوئی ایسا سودا نہیں ہے جو مجھے منظور نہ ہو جس حد تک ہو گا میں تمہیں تحفظ دوں گا۔"

"میں تمہیں مرکزی کنٹرول روم میں لے چلتا ہوں، جہاں سے خفیہ کیمرے اور سپیکر کنٹرول ہوتے ہیں۔ اگر تم نے وہاں موجود عملے پر قابو پا لیا تو پھر خطرات نہ ہونے کے برابر رہ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" عمران بولا۔ "لیکن یہ ذہن میں رکھنا کہ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر چالاکی دکھائی تو تمہارا انجام بہت بھیانک ہو گا۔"

"کنٹرول روم کے دروازے پر دو مسلح پہریدار ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ کیا تم ان سے نمٹ سکتے ہو؟"

"ہمیں خون کی ندیاں بہانی پڑیں تو اس سے بھی گزر سکتے ہیں۔ اس گوری چمڑی والے کو جہنم تک پہنچانا میرا مشن ہے۔ اس کے لیے میری جان بھی چلی جائے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہو گی بس مجھے یہ بتا دو کہ کنٹرول روم کدھر ہے۔"

"ادھر کونے والا دروازہ کنٹرول روم کا ہے۔ یہیں وہ دونوں پہریدار مستعد رہتے ہیں۔ اس دروازے سے داخل ہو کر سیڑھیاں اترنا ہو گا جو ہمیں تہہ خانے تک لے جائیں گی۔ جہاں کنٹرول روم ہے۔ اس تہہ خانے میں ایئر کنڈیشننگ کا نظام نصب ہے جو پوری عمارت کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔"

راشد پوری طرح تعاون کرنے پر آمادہ تھا۔ عمران نے اسے سرگوشی میں بریفنگ کر دی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ پھر وہ انہیں لے کر اس جگہ پہنچا جہاں سے سیڑھیاں نیچے تہہ خانے میں اترتی تھیں۔ برآمدے نما جگہ پر پہنچے جہاں دو دروازے تھے اور دو ہی محافظ ٹہلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ چہرے کے نقوش دیکھنا ممکن نہ تھا۔

وہ سب ٹہلتے ہوئے ان کے قریب پہنچے۔

راشد مکمل طور پر ان کی مدد کر رہا تھا۔ وہ آگے آگے تھا پھر اس نے دونوں پہریداروں کو قریب بلایا اور تبھی عمران نے پستول نکال کر انہیں اتنی پھرتی سے کور کیا کہ وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ ساتھ ہی ساتھ غلام رسول نے کراٹے کا ایسا بھرپور وار دکھایا تھا جسے کھا کر وہ پہریدار اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا اور تیورا کر زمین پر گر پڑا تھا۔ دوسرے نے حرکت کرنے کی کوشش کی تھی کہ پروفیسر نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اب اس کے پاس اتنا موقع نہیں تھا کہ وہ اپنے کندھے سے گن اتارے۔ پروفیسر کے دونوں انگوٹھے اس کے نرخرے پر دباؤ بڑھاتے چلے جا رہے تھے۔ اس نے ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی مگر انہیں کوئی مؤثر ضرب نہ لگا سکا۔ اچانک افتاد اور شدید تکلیف نے اس کا ذہن ماؤف کر دیا تھا۔ ورنہ وہ کچھ تو کر ہی سکتا تھا۔

ان لمحات میں بھی وہ تینوں راشد کی طرف سے غافل نہ تھے جیسے ہی عمران نے دوسرے محافظ پر حملہ کیا تھا وہ گرے ہوئے محافظ کی طرف جھپٹا تھا اور اس کے کندھے پر لٹکتی ہوئی گن اتارنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ عمران نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اور قبل اس کے کہ وہ گن اپنے قبضے میں لے پاتا عمران نے پوری قوت صرف کر کے اس کے محافظ کی گردن کو جھٹکا دیا تھا، شدید جھٹکا۔ اس جھٹکے کے ساتھ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ عمران نے اس کی بے جان لاش کو پیچھے دھکیل دیا تھا پھر وہ بڑی پھرتی سے دو قدم پیچھے ہٹ کر الٹے پیر کی ایڑی پر گھوما اور اس کے دائیں پیر کی بھرپور قوت والی ٹھوکر راشد کے منہ پر پڑی۔ وہ پہریدار کی گن پر قبضہ کر کے کھڑا ہونے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ منہ پر پڑنے والی بوٹ کی ٹھوکر نے اسے چت گرا دیا۔ اس کے دہانے سے خون بہنے لگا تھا۔ شاید کئی دانت ہل گئے تھے۔ اس کے منہ سے ایک کربناک چیخ بھی نکلی تھی۔ گن اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر دور تک پھسلتی چلی گئی تھی۔ اتنی دیر میں غلام رسول اس دوسرے پہریدار کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اسے سنبھلنے کا موقع دینا بے وقوفی تھی۔ اس نے پہریدار کی طرف دیکھتے ہوئے ہوا میں اچھل کر اس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے منہ پر فلائنگ کک ماری تھی۔ اس ضرب پر وہ اچھل کر پیچھے جا گرا تھا۔ وہ خود بھی پہلو کے بل گرا تھا مگر فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بدن میں جیسے اسپرنگ لگی ہوئی تھی۔ راشد فرش پر لوٹ رہا تھا۔ اس کی خبر لینا بھی ضروری تھا اس نے انہیں دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی۔ عمران جھپٹ کر اس کے سر پر پہنچا اور اس کے پہلو میں تابڑ توڑ کئی ٹھوکریں رسید کر دیں۔ ہر ٹھوکر پر اس کا جسم جھٹکا کھاتا تھا۔ مگر منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس کے لیے زندہ رہنے کا کوئی موقع ہو سکتا ہے تو خاموشی سے پٹنے کی قیمت پر ہی ہو سکتا ہے۔ منہ سے آواز نکالنے کی صورت میں تو وہ اسے فوراً ہی مار دیتا۔ خود اس کے لیے جو خطرہ پیدا ہو جاتا۔

راشد کے پہلو میں تابڑ توڑ کئی ٹھوکریں لگانے کے بعد وہ پھر پہریدار کی طرف متوجہ ہوا جو اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اپنے کندھے سے لٹکی گن کو اتارنے ہی والا تھا۔ عمران برق سرعت سے اس کے عقب میں پہنچا اور اس کی گدی پر بوٹ سے ایک نپی تلی ٹھوکر ماری۔ اس کی حالت پہلے ہی خراب تھی اس لیے وہ ضرب سے بچنے کی کوشش بھی نہیں کر سکا۔ ضرب چونکہ نپی تلی تھی اس لیے وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔

اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ راشد کی طرف بڑھا۔ راشد لرز کر رہ گیا۔

''مم...... مجھے مت مارنا۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور ہاتھوں کو جوڑ دیا۔

عمران اس کی طرف بڑھا اور اس کا گریبان پکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کر دیا۔

''میں تمہیں کیوں ماروں گا پیارے!'' اس نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں تمہاری پرستش کروں گا تم میرے ہمدرد ہو ناں؟''

''میں...... وعدہ کرتا...... ہوں...... تم سے...... مکمل تعاون کروں گا۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''بکواس بند کرو۔'' وہ غرایا۔ ''اس سے پہلے بھی تم مجھ سے اسی قسم کا وعدہ کر چکے ہو مگر اس کا انجام کیا ہوا۔ تم سمجھ رہے تھے کہ میں تمہاری طرف سے آنکھیں بند کیے ہوں۔''

''مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔'' وہ گڑگڑایا۔ ''جان کے خوف نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔''

''میں نے تمہیں پہلے ہی سمجھا دیا تھا، تنبیہہ کر دی تھی لیکن تمہیں عقل نہیں آئی۔ اب میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' کہہ کر عمران نے اس کے گریبان کو چھوڑ دیا۔

''نہیں...... مجھ پر رحم کرو۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخا۔ ''میری جان مت لو۔''

''تم جیسے لوگوں پر رحم کھانا کیچڑ میں گھی ڈالنا ہے۔ پھر بھی میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ اب اگر تم نے کوئی حرکت کی تو میں کچھ نہیں سنوں گا۔'' عمران نے اس کے گریبان کو چھوڑ دیا۔

''میں تمہارا...... تمہارا شکر گزار ہوں۔'' اس نے اپنے گلے کو سہلاتے ہوئے سکون کا سانس لیا اور بولا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ تمہارا یہ احسان چکا دوں، تمہارے کسی کام آ سکوں۔''

''میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' عمران نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر تم تعاون نہیں کرو گے تو میں اپنا راستہ خود بنانا بھی جانتا ہوں۔''

''میرا منہ بری طرح زخمی ہے میرے لیے بولنا مشکل ہے۔'' راشد نے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ کر کہا۔ ''سامنے کنٹرول روم کا دروازہ ہے۔ میں نے جو وعدہ کیا ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔''

''تم مجھ پر کوئی احسان نہیں کر رہے ہو میں بہ زور قوت یہ حکم منوا رہا ہوں۔ اب جلدی سے آگے بڑھو۔ میں تمہارے پیچھے رہوں گا۔ تم ایک بار مجھے دھوکہ دے چکے ہو اس لیے میں تم پر اعتبار بھی نہیں کر سکتا۔ میرے ہاتھ میں پستول موجود ہے جس کا رخ تمہاری طرف ہے۔ تم نے ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تمہاری گدی میں روشن دان کھل جائے گا۔'' عمران نے کرخت لہجے میں کہا۔

راشد کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے پلٹا اور سامنے نظر آنے والے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ تینوں بھی محتاط انداز میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔

''امکان یہی ہے کہ دروازے کے پیچھے کوئی نہ کوئی محافظ ہو گا تم ہوشیار رہنا۔''

''بے فکر رہو میں ہر دم محتاط رہتا ہوں کیونکہ تمہارے جیسے نہ جانے کتنے میرے پیچھے لگے رہتے ہیں۔'' عمران نے طنزیہ انداز میں کہا۔

راشد نے اس کے لہجے کے طنز کو نظر انداز کر کے کہا۔ ''کنٹرول روم تک پہنچنے کے لیے ہمیں سیڑھیاں اتر کر نیچے جانا پڑے گا۔ ممکن ہے وہ ہمیں دیکھ لیں اور یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ اس وقت ان کا کیمرا اس دروازے کا احاطہ کیے ہوئے نہ ہو اور ہم اسکرین پر نظر نہ آ رہے ہوں۔ اس لیے تم ہوشیار رہنا۔ بتانا میرا فرض تھا، میں نے بتا دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عمران سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی بات معقول تھی۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ لوگ انہیں دیکھ رہے ہوں۔ اس مسئلے کو کیسے حل کیا جائے۔ کس قسم کا توڑ کیا جائے۔ فوری طور پر اسے کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

''اگر تم مجھ پر اعتبار کرو تو میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔'' راشد بولا۔

''تم نے خود کو اعتبار کے قابل کہاں چھوڑا ہے۔ پھر بھی بتاؤ دیکھوں گا کہ تمہارا مشورہ کس حد تک قابلِ قبول ہے۔'' عمران نے کہہ کر نظریں اٹھائیں تو اسے اپنے سر پر کیمرا نظر آیا جو گھومتا ہوا انہیں فوکس میں لینے کی سعی کر رہا تھا۔

کیمرے کو دیکھ کر عمران ساکت رہ گیا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کی ایک ایک حرکت اندر کنٹرول روم میں بیٹھے ہوئے انچارج نے دیکھ لی ہو گی اور تمام راستے بند کر دیے ہوں گے۔ ان لوگوں کو گھیرنے کا پورا انتظام ہو چکا ہو گا۔ تمام دروازے لاک ہو چکے ہوں گے۔ اب کیا کیا جائے وہ یہی سوچ رہا تھا۔

عمران کی نظروں کے زاویہ کے تعاقب میں پروفیسر عثمان نے بھی چھت کی طرف دیکھا تھا اور ایک لمحے میں ہی فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے پستول کی نال کا رخ کیمرے کی طرف کیا اور ٹریگر دباتے چلے گئے چند لمحوں میں کیمرا کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔

''جتنی جلدی ممکن ہو اس کمرے سے باہر نکلو۔ دشمن ہماری پوزیشن کو دیکھ چکا ہے۔'' کہتے ہوئے وہ اس کمرے سے باہر کی جانب بڑھے۔ عمران اور غلام رسول بھی ان کے پیچھے تھے۔ وہ تینوں قیدی کو ساتھ لیے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ان سب کی نظریں چھت اور ہر اس جگہ کا طواف کر رہی تھیں جہاں کسی کیمرے کے ہونے کا امکان تھا۔ وہ سب اس طرح سے ایک ایک جگہ کا جائزہ لے رہے تھے جیسے وہ سوئی کو تلاش کر رہے ہوں۔ ان کی یہ کوشش کامیاب رہی اور ایک فلاور پاٹ کے پیچھے پروفیسر کو شیشے کی چمک نظر آئی۔ انہوں نے اس پاٹ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ سائیلنسر ڈ پستول سے ٹک کی آواز نکلی اور فلاور پاٹ کے ٹکڑے اڑ گئے۔ اس کے پیچھے کیمرے کے لینس کا اگلا حصہ تھا۔ عمران نے اس حصے کو اپنے پستول کا نشانہ بنایا پھر وہ آگے بڑھے۔ ابھی وہ سب گلیارے میں ہی چکرا رہے تھے کہ انہیں بھاری بوٹ کی ٹھک ٹھک سنائی دی شاید کوئی آ رہا تھا۔

''میں اسے روکتا ہوں، آپ لوگ اس کمرے میں چلے جائیں۔'' عمران نے ایک کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ پروفیسر اور غلام رسول قیدی کو کھینچتے ہوئے اس

کمرے میں داخل ہو گئے۔ عمران وہیں گلیارے میں زمین پر لمبا ہو کر لیٹ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پیر کو اس طرح پھیلا لیا تھا جیسے وہ مر چکا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر کے پلکوں میں اتنی جھری رکھی تھی کہ آنے والے کو دیکھ سکے۔ آنے والا دھیرے دھیرے قریب آتا جا رہا تھا۔

جوتے کی ٹھک ٹھک قریب آ کر رک گئی۔ غیر محسوس انداز میں عمران نے پلکوں کی جھری سے دیکھا۔ آنے والا گارڈ تھا اور وہ جھک کر یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے۔ جیسے ہی اس نے اسے ہلانے کی کوشش کی تھی کہ عمران نے جھپٹ کر اس کی گردن پکڑ لی۔ خوف یا حیرت سے نووارد کی چیخ نکل گئی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے گردن چھڑانے کی بھی کوشش کی تھی۔ وہ زور لگا رہا تھا۔ جب وہ اس کوشش میں ناکام رہا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا مکا بنا کر عمران کی ناک پر دے مارا۔

عمران کی ناک پھٹ گئی اور خون بہنے لگا۔ اسے کمزور پڑتے دیکھ کر نووارد نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑا لی اور سیدھا ہو گیا۔ وہ اپنا ہاتھ شانے سے لٹکتی ہوئی ٹامی گن کی طرف لے جانا چاہتا تھا کہ غلام رسول کمرے سے نکلا اور اس نے اپنی پنڈلی سے بندھے خنجر کو نکال کر نووارد کی طرف پھینکا۔ خنجر سنسناتا ہوا گیا اور اس کی گردن میں پیوست ہو گیا۔

غلام رسول نے خنجر اتنی قوت سے اس کی طرف پھینکا تھا کہ وہ دستے تک اس کی گردن میں پیوست ہو گیا تھا۔ نووارد کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی اور وہ حلق سے خرخراہٹ والے انداز میں آواز نکالتا ہوا گر گیا۔ غلام رسول پھرتی سے آگے بڑھا اور اس نے نووارد کی لاش گھسیٹ کر کمرے میں ڈالی پھر پروفیسر کو باہر آنے کا اشارہ دیا۔ عمران کی ناک سے بہتے خون کو آستین سے پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور وہ سب آگے بڑھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرف جائیں، تبھی عمران نے قیدی کی گدی پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''ابے تو خاموش کیوں ہے۔ بتاتا کیوں نہیں کہ کنٹرول روم تک ہم کیسے جائیں گے؟''

''آپ نے مجھ سے پوچھا کب ہے۔ واپس اسی کمرے میں چلیں جہاں سے نکلے تھے۔ اسی کمرے سے وہ راستہ ہے جو اوپر کی طرف جاتا ہے۔ وہاں لفٹ ہے۔ خفیہ لفٹ۔''

''کیا لفٹ کسی ڈبے میں پیک ہے۔ ہمیں نظر کیوں نہیں آئی تھی؟'' عمران بولا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اس کمرے میں ایک سوئچ ہے اسے دباتے ہی کمرے کی ایک دیوار ہٹ جاتی ہے۔ اسی دروازے کے پیچھے لفٹ ہے۔" قیدی نے کہا۔

وہ سب مڑ گئے اور تیز تیز قدموں سے اس طرف بڑھنے لگے۔ جس طرف وہ کمرا تھا۔ جہاں سے وہ سب آئے تھے۔

وہ سب دوڑنے کی حد تک تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ابھی انہوں نے آدھا ہی راستہ طے کیا تھا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور تین خوفناک نسل کے کتے بھونکتے ہوئے ان پر جھپٹے۔ وہ جرمن نسل کے ڈوبر مین کتے تھے جو شکاری کہلاتے ہیں۔

غلام رسول سمجھ گیا تھا کہ یہ کتے اپنی فطرت کے مطابق اچھل کر گردن پکڑیں گے اس لیے وہ چاقو کھول کر تیار ہو گیا تھا۔

اتفاق تھا کہ ان تینوں کے حصے میں ایک ایک کتا آیا تھا یعنی ایک شخص پر ایک کتا جھپٹا تھا۔ پروفیسر نے پیچھے ہٹتے ہوئے پستول نکال لیا تھا۔ پروفیسر نے ٹریگر بھی دبا دیا تھا۔ ٹک کی آواز کے ساتھ گولی نکلی تھی لیکن اتفاق سے کتے نے اسی وقت جست لگا دی تھی اور ان کے اوپر آ پڑا تھا۔ ان کا داہنا ہاتھ جس میں پستول تھا اس کے جبڑے میں تو نہیں گیا لیکن وہ اس کے دھکے سے گر پڑے تھے۔

عام حالت میں وہ کتا اتنا وزنی نہیں ہوتا کہ 80 کلو کے آدمی کو لے کر گر جائے لیکن وہ کتا یقیناً زیادہ کھانے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے وہ دھکے سے گر پڑے تھے۔

تاہم انہوں نے اپنے حواس برقرار رکھے تھے اور کتے کو خود پر حاوی ہونے نہیں دیا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے ہی وہ انہیں بھنبھوڑنے کے لیے دانت نکوس کر جھکا انہوں نے اس کی گردن پر ایک فائر کر دیا۔ گولی لگتے ہی وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور اچھل کود مچانے لگا پھر اس کے غیظ وغضب میں کمی آنے لگی پھر وہ بتدریج مضمحل سا ہو گیا۔ اس کے خون سے گلیارے کا فرش کافی دور تک سرخ ہو گیا تھا۔

اس کے بعد وہ دوڑتا ہوا گیا اور گلیارے کے اختتامی سرے پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

پروفیسر عثمان سمجھ گئے تھے کہ گولی اس پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

وہاں بیٹھے بیٹھے وہ کوں کوں کرتا رہا پھر اس نے گردن ایک طرف ڈال دی اور آنکھیں بند کر کے سر پیروں میں چھپا لیا۔

پروفیسر عثمان نے ایک گہری سانس لی اور غلام رسول کی طرف متوجہ ہوئے۔

غلام رسول نے خنجر نکال لیا تھا مگر کتا اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا تھا اور اس نے

غلام رسول کا وہی ہاتھ جس میں خنجر تھا اپنے جبڑے میں دبا لیا تھا۔

غلام رسول نے خنجر کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا اور کتے کی گردن پر وار کر دیا۔ اس کی گردن سے خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور غلام رسول کی قمیض تر کر گیا۔ کتے نے ایک لمبی جست لگائی اور وہاں سے دور چلا گیا تھا مگر اپنی اذیت سے چھٹکارہ پانے کی کوئی ترکیب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ آہ و بکا کے طرز پر ہاؤ ہاؤ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ لوٹیں بھی لگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی گردن کے قریب فرش پر خون کا ایک تالاب سا بن گیا تھا۔

پروفیسر عثمان نے ایک گہری سانس لی اور عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کتے کے جبڑے تھام رکھے تھے۔ وہ مخالف سمت میں زور لگا رہا تھا یعنی کتے کے اوپری جبڑے کو دائیں جانب اور نچلے کو بائیں جانب کھینچ رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد اس کی کوشش نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ مثبت نتیجہ نکلا۔ کتے کا جبڑہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے جبڑے کو چیرنے کے بعد عمران نے اسے ایک طرف اچھال دیا۔ کتا چند لمحوں تک غل مچاتا رہا پھر اس نے گردن ایک طرف ڈال دی اور ساکت ہو گیا۔

پھر وہاں پُر ہول سناٹا طاری ہو گیا جس میں وہ سب اپنے اپنے دلوں کی دھڑکن واضح انداز سے سن سکتے تھے۔ موت ان کے قریب سے ہو کر لوٹ چکی تھی۔ انہیں زندگی کی مسرت بخش نوید مل گئی تھی۔ یہ سناٹا زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ پروفیسر عثمان نے کہا۔ "یہ شخص اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ دانستہ ہمیں موت کے منہ میں لے جا رہا ہے۔"

"تو یہ لیجیے۔" کہہ کر عمران نے گولی چلا دی۔ قیدی کی دونوں آنکھوں کے درمیان میں سوراخ بن گیا اور وہ سلوموشن میں گرتا چلا گیا۔

پروفیسر کی فطرت میں ایسی عذاب پسندی نہ تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی چیونٹی کو بھی مارنے کی کوشش نہ کی تھی مگر حالات نے ان کے دل کو پتھر کا بنا دیا تھا کہ وہ کسی جلاد کی طرح ایک کے بعد ایک قتل کرتے جا رہے تھے اور قتل ہوتے دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے ایک نظر لاش پر ڈالی پھر سب کو آگے بڑھنے کا حکم دیا تھا۔ وہ سب کتوں کے خون سے آلودہ فرش پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ اب وہ کمرا نزدیک آ چکا تھا جس میں بقول قیدی لفٹ موجود تھی۔ ابھی وہ اس کمرے میں داخل ہونا ہی چاہتے تھے کہ ایک دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا اور دو آدمی گن سیدھی کیے باہر نکلے اور انہیں اپنے بالکل مقابل دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ شاید انہیں اس کی امید نہ تھی۔ عمران نے انہیں سنبھلنے کا موقع

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیے بغیر حملہ کر دیا۔

وہ طوفانی انداز میں ان پر جھپٹا تھا اور ایک کے پیٹ پر بھرپور انداز میں ٹھوکر رسید کر دی تھی۔ اس آدمی کے حلق سے دردناک کراہ خارج ہوئی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ کر اسے دباتے ہوئے جھک گیا تھا۔ عمران کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کے کندھے سے جھولتی ٹامی گن اتار لی تھی لیکن ابھی وہ ٹامی گن اتار کر سیدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کے ساتھی نے عقب سے اس پر حملہ کر دیا۔ یقیناً وہ ٹرینڈ لڑاکا تھا۔ اس نے عمران کے ہاتھ پر جاپانی کشتی کے خطرناک داؤ جو جسٹو کا ہاتھ مارا تھا۔ ٹامی گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ اس نے برق رفتاری سے ٹامی گن جھپٹنے کی کوشش کی تھی مگر عمران نے اس سے بھی زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی اور اس کا سر قابو میں کر کے پوری قوت سے اسے گھما دیا۔ یہ بھی ریسلنگ کا ایک داؤ تھا۔ وہ چاروں شانے چت گرا۔ اس اثناء میں دوسرا شخص سنبھل چکا تھا۔ اس نے عمران پر چھلانگ لگائی مگر وہ غافل نہیں تھا۔ وہ اس کے ساتھی کو چھوڑ کر ہٹ گیا اور حملہ آور اس کی بجائے اپنے ساتھی پر جا گرا اس کے ساتھی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

حملہ آور نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ اس کا ساتھی بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اب وہ ان دونوں کے مقابل تھا۔ ٹامی گن جہاں پڑی تھی وہ حصہ عمران کے عقب میں تھا اور اگر وہ پلٹ کر ٹامی گن اٹھانے کی کوشش کرتا تو وہ دونوں اس پر ٹوٹ پڑتے۔

پروفیسر عثمان اور غلام رسول کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں کیسے عمران کی مدد کریں۔ ایک بار غلام رسول نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی مگر عمران نے منع کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اکیلا ہی ان کے لیے کافی ہوں۔ پروفیسر کو اب اس کی بچکانہ خواہش پر غصہ آنے لگا تھا کیونکہ وہ کسی مقابلے کے رنگ میں نہیں تھے، دشمن کی کچھار میں تھے اور ایک خاص مقصد سے آئے تھے۔

''بس کرو عمران!'' انہوں نے پستول سے ایک کا نشانہ لے کر کہا۔

''نہیں سر! بس کچھ منٹ اور۔'' کہہ کر اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں پینترے بدل رہے تھے اور عمران پر حملہ کرنے کے لیے مناسب زاویہ تلاش کر رہے تھے کہ دفعتہ عمران نے فضا میں اچھل کر ایک کے سینے پر فلائنگ کک رسید کر دی۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا اور دیوار سے جا ٹکرایا لیکن اس دوران میں اس کے ساتھی نے عمران پر حملہ کر دیا۔ وہ عقب سے اس پر حملہ آور ہوا تھا اور اس نے دونوں ہاتھ اس کی بغل میں ڈال کر اس کی گردن میں قینچی لگا دی تھی۔ عمران نے فوری طور پر اپنے دونوں پیر زمین سے اٹھا دیے تھے اور اپنا پورا بوجھ اس کے دونوں ہاتھوں پر اٹھا دیا تھا۔ حملہ آور اس اچانک بوجھ کو سنبھال نہ سکا اور گر پڑا تھا اس طرح اس کی گرفت بھی کمزور پڑ گئی تھی۔ عمران نے جھٹکے سے خود کو چھڑایا تھا پھر بڑی پھرتی سے پلٹا تھا اور اس کے دونوں پیر پکڑ کر گھسیٹ لیے تھے۔ وہ پہلے ہی کی طرح ایک بار پھر گر پڑا مگر عمران نے اس کا ایک پیر نہ چھوڑا اور اسے موڑنا شروع کر دیا۔ وہ الٹ گیا۔ اس کے الٹتے ہی وہ اس کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھا اس کی ٹانگ بدستور عمران کے قبضے میں تھی اور یہ ایک خطرناک داؤ تھا جسے ریسلنگ میں بوسٹن کریب کہا جاتا ہے اور اس سے ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی ہے لیکن عمران کو بوسٹن کریب جاری رکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے عمران پر چھلانگ لگا دی تھی۔ اس نے بوسٹن کریب چھوڑا اور برق سرعت سے ایک طرف ہٹ گیا۔

حملہ کرنے والے کی قسمت خراب تھی کہ وہ بار بار کی کوشش کے باوجود عمران کا کچھ نہیں بگاڑ پا رہا تھا۔ اس بار بھی یہی ہوا تھا۔ اس کے اچانک ہٹ جانے سے وہ اپنے ہی ساتھی کی پشت پر گرا اور عمران نے ان دونوں کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ان کی گردنیں پکڑ لیں اور ان کے سر پوری قوت سے آپس میں ٹکرا دیے۔ وہ یہ عمل ایک بار کر کے رک نہیں گیا بلکہ اسے بار بار دہراتا رہا یہاں تک کہ ان دونوں کے کس بل نکل گئے اور ان دونوں کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ بظاہر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اب ان دونوں میں لڑنے کی سکت نہ رہی ہو۔

''چھوڑ دو...... چھوڑ دو......'' ان میں سے ایک کی درد بھری کراہ سنائی دی مگر وہ جملہ پورا نہ کر سکا۔ اس کے ساتھی کے منہ سے تو اتنی آواز بھی نہیں نکل سکی تھی۔ وہ بالکل ہی بے جان محسوس ہو رہا تھا۔

عمران نے دونوں کی گردنیں چھوڑ دیں اور وہ بے جان ہو کر گر گئے۔ حملے میں پہل کرنے والا اوندھا پڑا تھا۔ جس بے دردی سے عمران نے ان کے سر ٹکرائے تھے اس کے بعد انہیں بے ہوش ہو ہی جانا تھا لیکن عمران سے اندازے کی غلطی ہو چکی تھی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اپنی غلطی کا احساس اسے اس وقت ہوا جب حملہ آور کو اس نے ٹامی گن پر ہاتھ ڈالتے دیکھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عمران نے اسے ہاتھ بڑھاتے دیکھ لیا تھا مگر اس نے یہی سمجھا تھا کہ تشنجی کیفیت میں اس کے ہاتھ پیر پھیل رہے ہیں۔

اس نے بڑی چالاکی سے عمران کو دھوکہ دیا تھا اور وہ دھوکہ کھا گیا تھا۔ حملہ آور نے بڑی تیزی سے عمران کا نشانہ لے کر فائر کیا تھا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں عمران کی کسی کوشش کا دخل نہیں تھا بس قسمت ہی تھی یا شاید قدرت اس کی مدد پر آمادہ تھی۔ ہوا یہ کہ جس دوران حملہ آور عمران کا نشانہ لے رہا تھا اسی دوران میں اس کا ساتھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حملہ آور کے حواس بجا نہیں تھے اس لیے وہ دیکھ نہ سکا کہ اس کا ساتھی اٹھ رہا ہے اور اس نے ٹامی گن کا ٹریگر دبایا اور اس کا ساتھی اٹھ کھڑا ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ٹامی گن سے نکلا ہوا برسٹ خود اس کے ساتھی کا جسم چھلنی کر گیا اس کی کریہہ چیخ نے حملہ آور کے اعصاب کشیدہ کر دیے اور وہ حواس باختہ سے انداز میں اپنے ساتھی کو دیکھنے لگا جو فرش پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔

یہ عمران کے لیے سنہری موقع تھا۔ اس حادثے نے حملہ آور کو بھونچکا کر دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ سنبھلتے ہی اس کا نشانہ لے گا اور اس کے دوسرے وار سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ عمران نے تڑپ کر چھلانگ لگائی اور حملہ آور کے ہاتھ پر ٹھوکر مارتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ ٹھوکر نپی تلی تھی اور چونکہ جان بچانے کے لیے تھی اس لیے اس پر قوت بھی کچھ زیادہ ہی صرف ہو گئی تھی۔ حملہ آور کے ہاتھ سے نہ صرف ٹامی گن نکل گئی بلکہ اس کی کلائی کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔

حملہ آور چیختا ہوا اپنی کلائی پکڑ کر لوٹنے لگا اور عمران نے اطمینان سے ٹامی گن اٹھا لی پھر اس نے حملہ آور کے ساتھی کو دیکھا وہ مر چکا تھا۔ اس کا جائزہ لے کر عمران نے سرد لہجے میں کہا۔ ”جو کچھ بھی ہوا ہے محض تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ ہم دوست بھی بن سکتے تھے۔“

”ہائے میرا ہاتھ۔“ حملہ آور نے اسی جگہ بیٹھے ہوئے اپنے بائیں ہاتھ پر داہنے ہاتھ کو رکھ کر کہا۔ ”شاید میری کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔“

”اچھا ذرا میں بھی دیکھوں۔“ کہہ کر عمران آگے بڑھا اور اس پھرتی سے اس نے ٹوٹی ہوئی کلائی پر ٹھوکر ماری کہ پروفیسر بھی دنگ رہ گئے۔ حملہ آور کے منہ سے دردناک چیخیں نکلیں اور وہ اپنے دوسرے ہاتھ کی مدد سے پیچھے کھسکنے لگا۔

”مزاج درست ہوا یا نہیں؟“ عمران نے کہا۔

”خدا تمہیں غارت کرے۔“ حملہ آور چیخا۔ ”میں مر رہا ہوں مجھ پر رحم کرو مجھے چھوڑ دو۔“

”میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا، تمہاری رہائی صرف ایک شرط پر ہو سکتی ہے کہ تم مجھے الفرڈ کے اڈے تک پہنچا دو۔“ عمران نے سفاک لہجے میں کہا۔

”تم یقین نہیں کرو گے۔“ حملہ آور نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”مجھے خود نہیں معلوم کہ اس نام کا کوئی آدمی بھی یہاں ہے۔“

”پھر یہاں اتنی پہریداری کیوں ہے؟“

”یہ ہمارا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ملک کے اس کونے سے اس کونے تک جہادی تنظیموں کا ایک نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔ ان شوریدہ سروں کو قابو میں رکھنے کے لیے ہم یہ سب کچھ کر رہے ہیں کیونکہ وہ اپنے آگے کھڑی ہوئی دیوار کو کب برداشت کریں گے۔ یہاں حملہ کر سکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ایسا زبردست انتظام کیا ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ کنٹرول روم کدھر ہے؟“

”تم یقین نہیں کرو گے۔“ حملہ آور بولا۔ ”مجھے خود بھی کنٹرول روم کا راستہ معلوم نہیں ہے۔“

”تم بکواس کر رہے ہو۔ اس بنگلے میں رہتے ہو اور تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں ہے؟ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ راستہ کدھر سے ہے۔“

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم یقین نہیں کرو گے۔“ اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم نے شرافت سے بتا دیا تو میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا لیکن اگر میں نے تشدد کے ذریعہ راستہ معلوم کر لیا تو میں ایسے نہیں جاؤں گا۔ تمہیں مار کر ہی جاؤں گا۔“

”تم چاہے میری بوٹی بوٹی الگ کر دو مگر میں تمہیں راستہ نہیں بتاؤں گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اسے راستہ معلوم ہے۔ وقت ضائع مت کرو، عمران اسے موت دے کر آگے بڑھ جاؤ ہم خود ڈھونڈ لیں گے۔“ غلام رسول نے کہا۔

”مجھے چوہے بلی کا کھیل پسند ہے۔ میں اسی کے منہ سے اگلواؤں گا۔“ کہہ کر عمران نے اس کے منہ پر ٹھوکر ماری اور اس نے کربناک چیخ ماری۔ اس کے منہ سے بے تحاشہ خون بہنے لگا تھا۔ اس کا سالم ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ اس کے بعد عمران نے اس کے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا فریاد کر رہا تھا مگر عمران نے گویا اپنے کان بند کر لیے تھے وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر ٹھوکر مارے

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جا رہا تھا۔

چیختے چیختے حملہ آور کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا ہتھیار ڈال چکا ہوتا، مگر وہ بڑی سخت جانی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''اب بولو، کیا کہتے ہو؟'' عمران نے ٹھوکریں برسانا بند کر کے کہا مگر ایسا لگا جیسے اس نے عمران کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ درد وکرب سے بلبلاتا رہا۔

''کیوں وقت برباد کر رہے ہو، اسے راستے سے ہٹاؤ اور آگے بڑھتے چلو ہم خود راستہ ڈھونڈ لیں گے۔'' پروفیسر نے کہا۔

''تم مارنا چاہتے ہو تو مجھے مار دو میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو یہ لو۔'' کہہ کر عمران نے ٹامی گن اٹھا لی۔

اس شخص نے چندھائی آنکھوں سے عمران کی طرف دیکھا اور پھر اپنا سر ادھر اُدھر پٹکنے لگا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ابھی تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں آیا۔'' عمران نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس اب بالکل وقت نہیں ہے مگر میں یوں نہیں جاؤں گا۔ تمہاری دونوں ٹانگیں اور دونوں بازوؤں کو گولیوں سے چھید کر جاؤں گا تاکہ اگر تم زندہ بچ بھی گئے تو زندگی بھر کے لیے اپاہج بن کر زندگی گزارو۔'' عمران نے ٹامی گن سے اس کے گھٹنے کا نشانہ لیا پھر بولا۔ ''میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں۔ اگر اب بھی تمہاری زبان نہ کھلی، جواب نفی میں ملا تو میں اپنا کام شروع کر دوں گا۔''

''ٹ...... ٹھہرو۔'' وہ بوکھلا کر چیخا۔ ''میں بتاتا ہوں...... بتا رہا ہوں۔''

''ہری اپ، جلدی کرو۔''

''وہ...... وہ سامنے والا دروازہ۔'' اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ''اس کمرے میں...... سوئچ بورڈ پر سرخ نشان والا...... کال بیل بٹن ہے۔ اسے دبا دینا...... لفٹ کا دروازہ خود کھل جائے گا...... اب مجھے سر میں گولی مار دو...... تاکہ اذیت سے...... نجات مل جائے...... وہ لوگ کیمرے سے دیکھ اور سن چکے ہوں گے...... اب میں ان کے ہاتھوں...... اذیت برداشت...... نہیں کر سکتا۔''

عمران اس کے الفاظ پر غور کر رہا تھا اور لمحاتی طور پر اس کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ اس نے عمران کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اچانک اس کی پنڈلی میں دانت گاڑ دیے۔

اس نے کچکچا کر دانت گاڑے تھے۔ درد کی ایک لہر عمران کے پورے جسم میں دوڑ گئی لیکن اپنی یہ حرکت اسے بہت مہنگی پڑی۔ عمران کی انگلی ٹریگر پر تھی اس اچانک تکلیف کے باعث ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بے ساختہ بڑھ گیا اور گولی چل گئی۔ ٹامی گن کا رخ چونکہ زخمی شخص کی طرف تھا اس لیے وہ گولی کی زد میں آ گیا۔ یکے بعد دیگرے تین گولیاں اس کے سینے کو چھلنی کرتی چلی گئی تھیں۔ وہ آخری بار اچھلا تھا اور عمران کی پنڈلی اس کے دانتوں کی گرفت سے آزاد ہو گئی تھی۔

''لعنت ہے۔'' عمران کے منہ سے غراہٹ نکلی اور اپنا لباس خون کی پھوار سے بچانے کے لیے وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

زخمی شخص کا جسم تشنجی کیفیت سے گزر رہا تھا اور پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے ساکت ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں تکلیف کی شدت سے پھٹی ہوئی تھیں، گلیارے میں کئی عدد لاشیں تھیں مگر اب ان سے کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ پروفیسر اور غلام رسول جو اب تک لاتعلق سے ایک خالی کمرے کے دروازے میں تماشائی بنے کھڑے تھے وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

''تم نے خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع کیا۔'' غلام رسول نے کہا۔

''میں نے جو کیا صحیح ہے۔ اس کی فطرت کو میں سمجھ چکا تھا۔ وہ مر جاتا مگر لفٹ کے دروازے کے بارے کبھی نہ بتاتا اور ہم اسی طرح گلیارے میں بھٹکتے رہتے اور کسی نہ کسی جگہ شکار ہو جاتے کیونکہ کیمرے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ پانچ چھ منٹ کی اس فائٹ کو بھی انہوں نے دیکھا ہو گا اور اب یا تو لفٹ کو روکے ہوئے ہوں گے یا میکنزم خراب کر چکے ہوں گے۔'' عمران نے کہا۔

''اگر لفٹ بیکار کر دی گئی تو پھر دوسرا کون سا راستہ ہو گا؟ یقیناً کہیں نہ کہیں سیڑھیاں بھی ہوں گی۔'' غلام رسول نے خیال ظاہر کیا۔

''سیڑھیاں ضرور ہوں گی مگر وہ بھی کسی نہ کسی خفیہ جگہ پر ہوں گی۔''

''میرا خیال ہے کہ سیڑھیاں اس کمرے میں ہوں گی جس سے یہ دونوں نکلے تھے۔ اس لیے کہ کتے اسی کمرے سے نکلے تھے جس کے بارے میں اس شخص نے بتایا ہے۔ یقیناً کتوں کو اوپر سے بھیجا گیا ہو گا۔'' پروفیسر عثمان بولے۔

''ہاں یہ صحیح ہے۔ میرا بھی دل یہی کہتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''ایسا کرتے ہیں کہ میں سیڑھیوں کو تلاش کرتا ہوں اور آپ دونوں لفٹ کو۔ ہمارا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک ساتھ اوپر جانا مناسب نہیں ہے۔''

''ہاں یہ درست ہے۔ لفٹ تلاش کرنے کے بعد بھی ہم اوپر نہیں جائیں گے بلکہ میں غلام رسول سے کہلوا دوں گا۔''

''میں بھی سیڑھیاں تلاش کر کے آپ کو بتانے آ جاؤں گا پھر ہم ایک ساتھ دونوں راستوں سے اوپر جائیں گے۔''

''نہیں جناب یہ غلط ہے آگے بڑھنے اور لوٹنے کا چکر نہ پالیں۔'' غلام رسول نے کہا تو عمران نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا خدا حافظ'' کہہ کر پروفیسر عثمان آگے بڑھ گئے۔ عمران کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں سے وہ دونوں باہر نکلے تھے۔ وہ لاشوں کو پھلانگتا ہوا گلیارے کے اس موڑ سے مڑ کر اس کمرے میں پہنچا جس سے وہ دونوں برآمد ہوئے تھے۔

اس نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس لاش کی طرف دیکھا جو اپنے ہی ساتھی کی گولی کا نشانہ بنا تھا پھر وہ اسے گھسیٹ کر دروازے پر لے آیا اور اسے دروازے کے درمیان میں رکھ کر اندر داخل ہو گیا۔ اسے یہ خطرہ تھا کہ کہیں یہ دروازہ آٹومیٹک نہ ہو اور اس کے داخل ہوتے ہی اوپر بیٹھے لوگوں میں سے کوئی بٹن دبا کر بند کر دے اس حالت میں تو یہ کمرا اس کے لیے چوہے دان بن جائے گا۔

اس خطرے کے پیش نظر وہ لاش کو دروازے پر رکھ کر اندر گھسا پھر اس نے سوئچ بورڈ کے ہر بٹن کو آزمایا مگر اسے کوئی نئی بات نظر نہ آئی۔ وہ واپس ہونا چاہتا تھا کہ کمرے کی دیوار پر ایک جگہ اسے ابھار سا نظر آیا۔ پورے کمرے میں ڈیپ کلر والا پیپر لگا ہوا تھا اسی لیے پہلے وہ جگہ نظر نہیں آئی تھی۔ اب جو اس نے اس ابھار کو ٹٹولتے ہوئے دبایا تو بغیر آواز کیے سامنے والی دیوار ہٹ گئی۔ یقیناً وہ دیوار لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی تھی کیونکہ اس کے ہٹنے کے بعد وہاں لکڑی کا باریک برادہ نظر آیا تھا شاید اس لکڑی کو گھن لگ رہا تھا۔

دیوار کے عقب میں ایک چھوٹا سا کیبن تھا۔ اس کیبن کے اندر ایک جانب اسی طرح کے سوئچ بورڈ لگے ہوئے تھے جس طرح کے بٹن عام طور سے لفٹ میں لگے ہوتے ہیں۔ اس نے اندر داخل ہو کر اپ کا بٹن دبا دیا نہایت خفیف سا جھٹکا لگا اور وہ کیبن اوپر اٹھتا چلا گیا پھر جب رکا تو سامنے تین آدمی کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں لوہے کی راڈ جبکہ تیسرا خالی ہاتھ تھا۔

پستول والے نے اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ہم کافی دیر سے تمہارے منتظر تھے۔ آنے میں بڑی دیر لگا دی۔''

''ہاں نیچے والوں کی خاطر داری کر رہا تھا۔'' عمران نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

''تو اب میں تمہاری خاطر داری کروں، ذرا اپنے دونوں ہاتھ اوپر تو اٹھا دو۔'' اس نے اسی لہجے میں کہا۔

''مگر کیوں، ہاتھ اٹھا لینے سے ایسا کیا فرق پڑ جائے گا۔'' کہتے ہوئے وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ پستول بردار اس کی باتوں میں پھنسا ہوا تھا اس لیے کچھ غافل بھی تھا۔ عمران نے بس اسی غفلت کا فائدہ اٹھایا اور داہنے پیر کی ٹھوکر اس زور سے ماری کہ پستول اڑ کر کیبن میں آ گرا۔ ساتھ ہی ساتھ عمران نے باہر کی طرف چھلانگ لگائی تھی۔ اسی وقت پستول بردار کے پیچھے کھڑے شخص نے راڈ چلایا تھا۔ یہ عمران کی خوش قسمتی تھی یا خالی ہاتھ کھڑے شخص کی بدقسمتی۔ عمران کھڑا بھی نہ ہوا تھا کہ یہ وار ہو گیا۔ راڈ اپنی متحرک قوت کے ساتھ خالی ہاتھ کھڑے شخص کے سر سے ٹکرایا تھا۔ اس کی کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی تھی پھر وہ نیچے گر گیا۔

اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی اس کے چہرے پر خوف کی علامات ظاہر ہو گئیں تھیں۔ شاید اس نے اپنے سے بڑے کو مارا تھا۔

اس لمحے جبکہ راڈ چلانے والا شخص حیرت سے بت بنا کھڑا تھا عمران نے فائدہ اٹھا لیا تھا۔ اس نے راڈ والے کے ہاتھ پر ٹھوکر ماری تھی۔ اس ٹھوکر کی ضرب نے کام کر دکھایا تھا۔ اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ بلبلا اٹھا تھا۔ راڈ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ عمران نے ایک اور لات رسید کر دی تھی۔ ضرب کی شدت سے وہ بیٹھتا چلا گیا تھا۔ جیسے ہی وہ جھکا تھا عمران نے ایک لات اور رسید کر دی تھی۔ نتیجتاً وہ شخص فرش پر گر کر ساکت ہو گیا تھا۔

عمران نے اب اس شخص کی طرف دیکھا جس نے اس پر کیے جانے والے وار کی سزا قبول کی تھی۔ خون اور اس کے سر کا مغز مل کے فرش پر بہہ رہے تھے اور وہ کھلی آنکھوں سے عمران کو گھور رہا تھا یوں جیسے اب بھی کہہ رہا ہو کہ دیکھا، میں ٹھیک کہہ رہا تھا ناں تم بہت خطرناک قسم کے آدمی ہو۔

عمران نے اس کی طرف سے نظریں ہٹا کر تیسرے شخص کو دیکھا۔ وہ شاید بزدلی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں سب سے آگے تھا کیونکہ عمران کو اپنی طرف مڑتے دیکھ کر وہ سرپٹ بھاگا تھا۔ عین اسی وقت سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور پروفیسر عثمان باہر نکلے ان کے ساتھ غلام رسول بھی تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے دیکھ کر مسکرا اٹھے۔

''آخر آپ نے سیڑھیاں تلاش کر ہی لیں؟'' عمران بولا۔

''نہ صرف سیڑھیاں تلاش کیں بلکہ مین سوئچ بھی بند کرتا ہوا آیا ہوں تا کہ پاور سپلائی بند ہو جائے۔''

''تبھی میں جگہ جگہ لگے ٹیوب کو بجھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ جب میں لفٹ سے باہر آیا تھا تو ٹیوب لائٹ جل رہی تھی پھر بجھتی چلی گئی۔''

''یہ بہت ضروری تھا۔ تا کہ ان کی کمر ٹوٹ جائے۔'' پروفیسر عثمان نے کہا۔ ان کے انداز سے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اتنے بڑے سائنسدان ہیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ ہمیشہ لڑائی بھڑائی میں ہی رہے ہیں۔

اب وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے ایک کے بعد ایک کمرے کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ عمران نے کہا۔ ''پروفیسر صاحب! اب زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہم نے تقریباً آدھا گھنٹہ یہاں گزار لیا ہے۔ آدھے گھنٹے سے ان لوگوں سے لڑائی کر رہے ہیں۔ اب تک ان لوگوں نے باہر سے مدد طلب کر لی ہو گی۔''

''ہاں یہ ناممکن نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اس کی اطلاع اپنے سرپرستوں کو دے دی ہو گی۔ پھر ان کی اصلی لیڈر جو عورت ہے وہ بھی تو باہر ہے۔''

''ہاں یہاں والوں سے نمٹنے کے بعد اسے بھی تو گھیرنا ہے تا کہ یہ بات ظاہر ہو سکے کہ اس نے دوسرے جنم کا کھڑاگ کیوں پھیلایا تھا۔ اس کا اصل مقصد کیا تھا۔'' عمران نے کہا۔

''اصل مقصد کے بارے میں الفرڈ کے ساتھی نے تو بتایا ہی تھا۔''

''وہ لوگ دوسرے نمبر والے تھے۔ اصل سربراہ پر ہاتھ ڈالنے ہی سے حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔''

وہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ان کے سامنے والے کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور ایک ساتھ پانچ آدمی باہر نکلے ان میں ڈیوڈ بھی تھا۔ ان تمام افراد کے ہاتھ میں ہتھیار تھے۔ کسی کے ہاتھ میں پستول تھا تو کوئی روایتی ہتھیار لیے ہوئے تھا۔ پروفیسر عثمان، عمران اور غلام رسول دونوں طرف سے گھر گئے تھے۔ نکلنے کی کوئی جگہ انہیں نظر نہیں

آ رہی تھی۔

☆======☆======☆

عمران سے پٹ کر بھاگنے والا بھی اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر لوٹ آیا تھا۔ گویا وہ دونوں طرف سے گھر کر گلیارے میں محصور ہو گئے تھے۔

''سر! اب کیا کیا جائے؟'' عمران نے پوچھا۔

''جیسے ہی میں اشارہ کروں تم دونوں پستول والے کو سنبھال لینا۔ باقی کو دیکھ لیا جائے گا۔'' پروفیسر نے صلاح دی۔

نوواردوں نے گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ تینوں بھی اپنا دفاع کرنے کے لیے تیار تھے اور پوزیشن لے چکے تھے۔ تبھی پروفیسر نے اشارہ دیا۔ عمران نے دونوں پیروں کو جوڑ کر اچھال بھری۔ اس کی فلائنگ کک بروقت مگر شدت کے ساتھ پستول والے کے سینے پر پڑی۔ کک ایسی تھی کہ زندہ کو بھی مُردے میں بدل دے۔ اتنی زوردار تھی کہ دیوار پر پڑتی تو وہ بھی چیخ جاتی۔ اس کا مقابل پیٹھ کے بل زمین پر گرا۔ عمران نے گرتے گرتے کمال پھرتی سے داہنا ہاتھ دوسرے پستول والے کے ہاتھ پر مارا تھا نتیجتاً اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ چکنے فرش پر پستول گرا تو پھسلتا ہوا کافی دور چلا گیا۔ عمران کے ساتھ ہی ساتھ غلام رسول نے بھی بوٹ کی بھرپور کک اپنے مقابل کے ہاتھ پر ماری تھی۔ اتفاق کی بات ہے اس کے ہاتھ سے بھی پستول نکل کر دور جا گرا تھا۔ تبھی عمران کو کھٹ کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ آواز غلام رسول کے سر سے ابھری تھی۔ راڈ اٹھائے ہوئے شخص نے راڈ چلایا تھا۔ غلام رسول سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا تبھی پروفیسر نے اس شخص کی کنپٹی پر گھونسہ رسید کیا جو اپنے ہاتھ میں کھلا ہوا خنجر لیے کھڑا تھا۔ وہ شخص کسی لڑاکا مرغے کی طرح بازو پھیلائے آگے بڑھ رہا تھا مگر گھونسہ پڑتے ہی سلوموشن میں زمین پر گرتا چلا گیا تھا۔ عمران نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور مقابل کے سینے پر فلائنگ کک ماری تھی۔ کک مارنے کے چکر میں وہ پیٹھ کے بل گرا تھا مگر برق رفتاری سے اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ٹرینڈ لڑاکا تھا اس کے ہاتھ اور پیر دونوں چل رہے تھے۔ اس کا ناپا تلا گھونسہ کبھی کسی کے سینے پر پڑتا تو کسی کے چہرے پر لات پڑتی اس کے اس جارحانہ موڈ کو دیکھ کر پانچوں نے ایک ساتھ اس پر حملہ کیا۔ اس کی مدد کے لیے پروفیسر اور غلام رسول بڑھ آئے پھر وہ سب ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ اب عالم یہ تھا کہ کس کی لات کسے لگی اور کس کا گھونسہ کہاں پڑا خود مارنے والے کو بھی پتا نہ تھا۔ بس وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب بھڑے ہوئے تھے۔ ہتھیار کب کے کہاں گر گئے تھے کسی کو خبر نہ تھی۔ ایسی اندھی لڑائی کا نتیجہ توقع کے برعکس ہی نکلتا ہے اس لیے پروفیسر نے آہستہ آہستہ پیچھے کھسکنا شروع کر دیا۔ ان کے ساتھ ان کے دونوں مقابل بھی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ یہ بات غلام رسول سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے بھی پروفیسر عثمان کی تقلید کی اور وہ بھی پیچھے ہٹنے لگا۔ کچھ پیچھے ہٹتے ہی یکایک اس نے خود کو زمین پر گرایا اور تیزی سے پھسلتا ہوا اپنے مقابل کی ٹانگوں سے ٹکرایا وہ دونوں اس اچانک آئی افتاد پر سنبھل نہ سکے اور پیچھے کی طرف گرتے چلے گئے۔ خود بھی گرے اور سنبھلنے کی کوشش میں اپنے دو ساتھیوں کو بھی لے گرے۔

گرے ہوئے دشمن پر وار کرنا بزدلی ہے مگر جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ غلام رسول اور پروفیسر نے ان تینوں پر ٹھوکریں برسانا شروع کر دیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دونوں باقی تینوں جو کھڑے تھے ان کے حملوں سے بھی خود کو بچا رہے تھے۔

اب پروفیسر غلام رسول اور عمران کو سہ طرفہ وار کرنا پڑ رہا تھا۔ کبھی وہ پیروں کا استعمال کرتے تو کبھی گھونسوں کا۔ وہ تھکن محسوس کرنے لگے تھے، مقابل کے گھونسوں اور لاتوں کی چوٹ کا بھی شدت سے احساس محسوس کر رہے تھے۔ پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا مگر یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ ذرا سی بھی سستی دکھاتے تو مقابل موت کی نیند سلا دیتے اسی لیے وہ تینوں اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ تبھی عمران نے دیکھا کہ ایک شخص نے پروفیسر کو زمین پر گرا دیا ہے اور ان کا گلا دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ عمران تماشائی بنا رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ پروفیسر سائنس دان ہیں وہ دماغی طور پر بہت قوی ہیں۔ بڑے سے بڑے گنجلک مسئلے کو منٹوں سیکنڈوں میں حل کر لیتے ہیں۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں سیمناروں میں لمبی لمبی تقریریں کر لیتے ہیں مگر ہاتھ پیر چلانے میں قوت کا استعمال کرنے میں بہت پیچھے ہیں۔ لڑائی بھڑائی کے معاملے میں بالکل کورے نہ سہی مگر اس میدان کے کھلاڑی بھی نہیں ہیں۔ ان کی فیلڈ بالکل الگ ہے۔ وہ ننھی چڑیا کی طرح ہیں، جذبات میں آ کر دشمنوں سے ٹکر لینے لگے ہیں، ان میں زیادہ جان بھی نہیں ہے۔ جس طرح وہ دشمن ان کا گلا دبا رہا ہے وہ زندہ نہیں بچیں گے۔

انہیں بچانے کے لیے ہی وہ اپنی جگہ سے اچھلا تھا اور سیدھا اس دشمن پر جا پڑا تھا جو پروفیسر کے سینے پر سوار تھا۔

عمران کی کھڑی لات کھا کر وہ دور جا گرا تھا اور اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ عمران

نے سامنے سے ایک اور لات ماری تھی۔ عمران کی لات اس کی پیٹھ پر پڑی تھی۔ لات ایسی زبردست تھی کہ وہ کھڑا نہ رہ سکا، بیٹھتا چلا گیا اس کی چیخ میں کرب تھا اور اب وہ بن پانی کی مچھلی بن چکا تھا۔ عمران نے لات پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ اس نے پے در پے کئی گھونسے بھی مارے تھے۔ اس کا نتیجہ بھی جلد سامنے آ گیا۔ وہ بے ہوش ہو کر لمبا لمبا لیٹ گیا تھا۔ اب ان تینوں کے مقابلے میں پانچ آدمی تھے۔

''کھیل لمبا ہو رہا ہے۔'' غلام رسول نے مقابل پر گھونسے برساتے ہوئے کہا تبھی اس کی نظر پروفیسر پر پڑی۔ وہ بیک وقت دو آدمیوں میں گھر گئے تھے۔ دشمنوں نے تاڑ لیا تھا کہ وہ عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں ایسے محنت طلب کام نہیں ہو سکتے۔ لڑائی بھڑائی کا بھی انہیں تجربہ نہیں ہے اسی لیے ان دونوں نے انہیں گھیرا تھا اور دو طرفہ حملہ کر رہے تھے۔ پروفیسر عثمان ان کے مقابل ٹھہر نہیں پا رہے تھے۔ لگاتار پٹ رہے تھے۔ غلام رسول نے اپنے مقابل کی ناک پر گھونسہ مارا اور لمبی چھلانگ لگا کر پروفیسر کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے داہنے پیر پر وزن ڈال کر بائیں پیر کو سیدھا کر دیا تھا اور پھر پھرکی کی طرح گھوم گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس کے بدن پر اس کی لات پڑی تھی وہ اچھل کر عمران کے مقابل پر جا گرا تھا۔ عمران نے لگے ہاتھوں اسے بھی سمیٹ لیا تھا۔ ایک ساتھ دو لاشیں رسید کر دی تھیں۔ پروفیسر جو زمین پر گر گئے تھے۔ اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے تبھی ان کی نظر وہیں پڑے پستول پر پڑی اور انہوں نے پھرتی سے اسے اٹھا لیا۔ وہ پستول اٹھا کر کھڑے ہونا چاہتے تھے، ابھی پچھتر ڈگری کا زاویہ بنا پائے تھے کہ اسی وقت ان کی کمر پر ایک قوی ہیکل شخص کی گرز جیسی لات پڑی اور وہ پھر سے زمین بوس ہو گئے۔ انہیں پٹتے دیکھ کر غلام رسول کو پھر تاؤ آ گیا اور اس نے دوبارہ اچھال بھری اور اس شخص پر پڑا جس نے پروفیسر پر حملہ کیا تھا۔ اس نے ساتھ ہی ساتھ اس شخص کے جبڑے پر پوری قوت سے گھونسہ مارا تھا۔ گھونسہ اتنا شدید تھا کہ وہ لڑکھڑا کر پروفیسر پر جا گرا تھا۔ پروفیسر نے سنبھلنے کے نام پر صرف اتنا کیا کہ ہاتھ اٹھا دیا اور گولی داغ دی۔ فائر اتنے نزدیک سے ہوا تھا نتیجہ بھی خاطر خواہ نکلا، اس شخص کی کھوپڑی پرخچے میں بدل گئی تھی۔ اس کا دماغ دور تک بکھر گیا تھا۔

گولی کے سماعت شکن شور نے سب کو چونکا دیا تھا۔ لڑائی رک گئی تھی کہ پروفیسر نے ایک دوسرے شخص کو نشانہ بنایا۔ وہ بھی سینے پر گولی کھا کر تڑپنے لگا۔ اب وہاں صرف تین آدمی باقی بچے تھے جو سکتے کے عالم میں کھڑے تھے کہ پروفیسر نے تیسرے آدمی کو نشانہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بنایا۔ اسے خون میں نہایا دیکھ کر باقی دو تیزی سے گلیارے میں دوڑ گئے۔ پروفیسر نے نظر انداز کر کے بے ہوش پڑے ہوئے کی طرف دیکھا اور اس کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ بے چارا ہوش میں بھی نہ آسکا اور موت کے بھیانک سفر پر روانہ ہو گیا۔

''خس کم جہاں پاک۔'' عمران نے کہا۔''اصل مجرم تو گیا کام سے اب کیا کیا جائے؟''

''کرنا کیا ہے۔فوری طور پر یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرو۔'' پروفیسر بولے۔

وہ سب سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگے۔ چلتے چلتے رک کر غلام رسول نے کہا۔''وہ دونوں جو میدان چھوڑ کر بھاگے ہیں انہیں کیا یونہی چھوڑ دیا جائے؟''

''پھر کیا ان کا اچار ڈالا جائے گا۔ بے وقوف، وہ کرائے کے ٹٹو ہیں اصل مجرم تو مارا ہی گیا۔ ان کا یہ اڈا بھی تباہ ہو گیا۔ اب اس عورت کو تلاش کرنا ہے تاکہ اصل بات کھل کر سامنے آئے کہ یہ لوگ کون ہیں؟ کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں؟''

''خیر یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں اب یہ سوچیے کہ ہم لوگ ٹھہریں گے کہاں؟''

''ایسا کرتے ہیں پھر سے ہوٹلوں کا رخ کرتے ہیں۔'' غلام رسول نے کہا۔

''یہ مت بھولو کہ پورے شہر کی پولیس ہماری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''یہ بھی ٹھیک کہا۔ مگر اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ ایک کام کرتے ہیں میرے اور پروفیسر کے ہاتھ میں جو گھڑی دیکھ رہے ہو یہ معمولی گھڑی نہیں ہے۔ وائرلیس ہے۔ اس سے ہم ایک دوسرے سے رابطہ کرتے تھے۔ پروفیسر کو تجربہ گاہ سے باہر لانے کے لیے میں اسی گھڑی کا استعمال کرتا تھا۔ انہیں وقت گزرنے کا احساس کراتا اور باہر لے آتا تھا۔''

''تو کیا میرے لیے تیسری گھڑی کا انتظام کرو گے؟''

''نہیں میرا خیال ہے کہ تم میری گھڑی لے جاؤ۔ آگے آگے ہم رہیں گے۔ جس ہوٹل میں ٹھہریں گے اسی ہوٹل میں تم بھی آ جانا مگر اجنبیوں کی طرح الگ الگ کمرے میں ٹھہرنا۔ اگر ضرورت پڑی تو تم سے گھڑی کے ذریعے رابطہ کر لیں گے۔''

وہ سب بڑی آسانی سے اس عمارت کے باہر آ گئے۔ باہر ایسے کوئی آثار نہ تھے جن سے پتا چلتا کہ اندر گولیاں چلی ہیں۔ سڑک پر پہنچتے ہی انہیں ٹیکسی مل گئی اور وہ تینوں اس میں سوار ہو کر صدر بازار کی طرف چل پڑے۔ پروفیسر عثمان بالکل خاموش تھے۔ ان کی خاموشی اس بات کی طرف اشارہ تھی کہ وہ غلام رسول کی باتوں سے متفق ہیں۔

یہ سفر بالکل خاموشی سے کٹا، اور وہ لوگ بازار پہنچ گئے۔ ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور کے

باہر انہوں نے گاڑی رکوائی اور اتر کر ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ کچھ وقت وہاں گزار کر وہ سب باہر آئے اور الگ الگ سمت میں چلنے لگے۔ کچھ دور جا کر غلام رسول نے ٹیکسی لی اور اس ڈرائیور سے باتیں کرنے لگے تاکہ باتوں کے درمیان عمران کو موقع مل جائے اور وہ بھی ٹیکسی لے لے۔

عمران کے ٹیکسی لیتے ہی غلام رسول نے ٹیکسی والے کو کسی بڑے ہوٹل میں چلنے کے لیے کہا۔ ٹیکسی چل پڑی۔ ڈرائیور نے ٹیکسی ہوٹل ایکسیلنسی کی روش پر روکی۔ غلام رسول نے نیچے اتر کر بل ادا کیا اور چند لمحوں بعد وہ پروفیسر کے ساتھ ہوٹل کے گیٹ سے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔ وہ سٹار فسیلٹی ہوٹل تھا۔ اس نے پروفیسر کو باہر رکنے کا اشارہ دیا اور خود کمپاؤنڈ سے گزر کر ہال میں داخل ہو گیا ہال میں بیشتر میزیں آباد تھیں اور گاہک لوازمات سے دل بہلا رہے تھے۔ بائیں جانب کاؤنٹر تھا۔ اس کے ساتھ کے بار پر بارٹینڈ سٹولوں پر بیٹھے چند گاہکوں کو کافی سرو کر رہا تھا۔ کاؤنٹر پر ایک آدمی کھڑا کلرک سے باتیں کر رہا تھا۔ شام ہونے کے باوجود اس نے آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ یہ بات اسے کچھ عجیب سی لگی۔

غلام رسول نے ہال کا جائزہ لیا، ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی تاریک شیشوں کی عینک والا وہاں سے ہٹا اور ہال کے آخری سرے پر واقع زینوں کی طرف بڑھ گیا۔

''حکم سر!'' کلرک رجسٹر بند کر کے غلام رسول کی طرف متوجہ ہوا۔

''مجھے ڈبل بیڈ کا ایک کمرا چاہیے، مل جائے گا؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''کیوں نہیں؟'' کلرک نے سر گھما کر عقب میں لگے کی بورڈ کی طرف دیکھا پھر بولا۔''آپ کس فلور پر قیام کرنا پسند کریں گے؟''

''کسی بھی فلور پر۔ فرسٹ فلور پر ہو تو کیا بات ہے؟''

''سیکنڈ فلور روم نمبر ٹو تھرٹی ٹو۔'' کلرک نے رجسٹر کھول کر کہا۔''پلیز نام و پتا بتائیں...... شناختی کارڈ دکھائیں۔''

''شناختی کارڈ...... وہ تو میں بریف کیس میں بھول آیا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں میرا دوست آ جائے گا اسی کی گاڑی میں ہے۔''

''کوئی بات نہیں نام و پتا بتا دیں شناختی کارڈ نمبر بعد میں لکھا دیجیے گا۔''

غلام رسول نے فرضی نام بتا کر کراچی کا پتا لکھا دیا۔ آمد کے خانے میں بھی اس نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کراچی لکھایا اور ایڈوانس کرایہ جمع کر کے چابی لے لی۔ کلرک نے بٹن دبا کر ویٹر کو بلا کر کہا۔ ''صاحب کو روم نمبر ٹو تھرٹی ٹو میں پہنچا دو۔''

ویٹر نے سر ہلایا اور غلام رسول کو ساتھ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا سیکنڈ فلور پر پہنچ کر اس نے ایک کمرے کا تالا کھولا۔ اسی وقت غلام رسول نے دیکھا کہ وہی چشمے والا شخص ایک کمرے سے نکلا اور نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

اندر پہنچ کر ویٹر نے خواہ مخواہ مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سر کچھ چاہیے؟''

''نو...... تھوڑی دیر بعد فون پر آرڈر دوں گا۔'' غلام رسول نے پرس سے ٹپ کے پیسے نکال کر دیے۔ ویٹر سلام کر کے چلا گیا۔ اب اسے نیچے جا کر گیٹ کے باہر کھڑے پروفیسر عثمان کو اشارہ کرنا تھا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے اس کمرے تک آ جائیں۔ وہ اسی خیال سے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ خود ہی رک گیا۔ اسے خیال آ گیا تھا کہ عمران کو واچ ٹرانسمیٹر پر کال کر کے اپنے کمرے کا نمبر بتا دے۔ اب تک وہ بھی باہر ہی کھڑا انتظار کر رہا ہوگا یا پھر کمرا حاصل کر کے آرام کر رہا ہوگا۔ اس خیال سے اس نے باتھ روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔ باتھ روم میں جا کر اس نے چابی کو باہر کھینچا جو ایریل کی طرح لمبا ہو گیا تھا پھر اس نے کال کرنے کی کوشش کی مگر اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جلدی سے چابی کو پھر سے اندر کر دیا اور باہر نکل آیا۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

''کون؟'' اس نے پوچھا۔

''سر ایک منٹ کے لیے دروازہ کھولیں۔'' باہر سے آواز آئی۔

ویٹر کا سوچ کر اس نے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔

باہر وہی عینک والا شخص کھڑا تھا اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تکلیف کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ آپ کے ساتھی آئے نہیں؟''

''جی نہیں۔''

''بس میں دو منٹ لوں گا۔'' کہہ کر وہ زبردستی اندر آ گیا۔ پھر بولا۔ ''جناب آپ اپنا شناختی کارڈ دکھائیں گے؟''

''شناختی کارڈ گاڑی میں رہ گیا ہے۔ میرا ساتھی آتا ہی ہوگا۔ میرا نام پتا آپ نے رجسٹر میں دیکھ لیا ہوگا۔''

''وہ پتا غلط ہے۔ تم نے جو بلاک نمبر لکھا ہے وہ اس علاقے میں ہے ہی نہیں۔

کراچی میں ہر جگہ بلاک نمبر نہیں، کہیں سیکٹر تو کہیں صرف نمبر چلتا ہے۔ جس علاقے کا نام لکھا ہے وہاں سیکٹر نمبر ہے۔''

غلام رسول کا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر بھی وہ خود کو مضبوط قوت ارادی والا ظاہر کرنے کے لیے بولا۔ ''نہیں جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مگر آپ ہیں کون؟''

''میرا تعلق محکمہ خفیہ سے ہے۔'' اس نے کہا۔

''مگر آپ مجھ پر کس قسم کا شک کر رہے ہیں؟''

''شک نہیں یقین ہے۔ تم پروفیسر عثمان کے ساتھیوں میں سے ہو۔ جلدی بتاؤ وہ کہاں ہے؟''

''کس پروفیسر کی بات کر رہے ہیں؟ میں کسی پروفیسر کو نہیں جانتا؟''

''ابھی جان جاؤ گے سیدھے کھڑے رہو۔'' کہہ کر اس نے جھٹکے سے ریوالور نکال لیا۔ اب غلام رسول بے بس ہو چکا تھا۔

''دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔'' اس نے دوسرا حکم دیا۔

غلام رسول دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بھی اٹھا دیے تھے مگر نظریں نووارد پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھا۔ نووارد نے بائیں ہاتھ سے ریسیور اٹھا کر ٹیبل پر رکھا اور اسی ہاتھ سے نمبر ملانے لگا۔ نمبر ملا کر اس نے بائیں ہاتھ ہی سے ریسیور اٹھا لیا اور ماؤتھ پیس میں بولا۔ ''سر میں امجد بول رہا ہوں۔ ہوٹل ایکسیلنسی میں ایک مشکوک آدمی نظر آیا ہے۔ اس کے پاس شناختی کارڈ بھی نہیں ہے...... جی ہاں مگر وہ اکیلا ہے۔ شاید پروفیسر کسی دوسرے ہوٹل میں چلا گیا ہو گا...... نہیں ابھی تک اس نے کچھ نہیں بولا ہے۔ ٹھیک ہے میں شمیم کا انتظار کر لوں گا۔''

پھر اس نے رابطہ منقطع کر کے غلام رسول سے کہا۔ ''دیکھو مسٹر! شرافت سے سیدھی طرح بتا دو پروفیسر کہاں ہے؟''

''میں نے کہا ناں میں کسی پروفیسر کو نہیں جانتا۔''

''میرا ساتھی آ جائے پھر میں ہیڈ کوارٹر لے جا کر پوچھوں گا۔'' اس نے رعونت سے کہا۔

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس ہوٹل میں اس طرح سے غنڈہ گردی ہوتی ہے تو میں کبھی یہاں نہ آتا۔''

''تم کسی بھی ہوٹل میں جاتے میرے آدمی تلاش کر لیتے۔ یہاں کے ہر ہوٹل میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمارے آدمی کھڑے ہیں۔ ایک ایک مسافر کو چیک کر رہے ہیں۔"

"تم آخر میری باتوں پر یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں ایک سیدھا سادا بزنس مین ہوں۔"

"اپنا شناختی کارڈ دکھا دو تو میں یقین کر لوں گا۔"

"کیا ڈرائیونگ لائسنس سے کام نہیں چلے گا؟"

"ہاں وہی دکھا دو۔"

"میرے کوٹ کے اندرونی جیب میں ہے کہو تو دکھا دوں؟"

"خبردار" وہ غرایا۔ "کوٹ میں ہاتھ مت ڈالنا" وہ ریوالور اٹھائے آگے بڑھ آیا پھر اس نے غلام رسول کے کوٹ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ غلام رسول نے ہاتھ دکھا دیا۔

☆======☆======☆

عمران نے جس ٹیکسی کو پکڑا تھا وہ کچھ دور جاتے ہی بند ہو گئی۔ کچھ دیر تو وہ اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتا رہا مگر جب زیادہ دیر ہو گئی تو اس نے اکتا کر دوسری ٹیکسی لے لی تھی۔ ابھی وہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ہی تھا کہ واچ ٹرانسمیٹر پر دوبارہ کال آ گئی۔ اس سے پہلے بھی ایک بار جب وہ ٹیکسی والے کو کام کرتے دیکھ رہا تھا تو اسے سگنل ملا تھا لیکن فوراً ہی سگنل بند ہو گیا تھا۔ اس بار سگنل ملا تو اس نے ڈرائیور کی نظر بچا کر ٹرانسمیٹر آن کر دیا۔ ٹرانسمیٹر آن ہوتے ہی وہ گویا اچھل پڑا۔ غلام رسول کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ سوال جواب سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ غلام رسول خطرے میں ہے۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ "ہری اپ جلدی چلو۔ مجھے فوراً ہوٹل ایکسیلنسی پہنچنا ہے۔"

"اگر آپ پہلے بتا دیتے تو میں دوسری طرف سے آپ کو وہاں پہنچا دیتا۔" ڈرائیور نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

اگلے سگنل سے ٹیکسی سیدھے ہاتھ پر مڑ گئی۔ دس منٹ بعد ٹیکسی ہوٹل ایکسیلنسی کے گیٹ پر رکی اور عمران جھٹکے سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ اس نے ٹیکسی والے کے ہاتھ پر سو روپے کا نوٹ رکھا اور بقایا واپس لیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ وہ ہال میں پہنچا اور نارمل انداز میں چلتا ہوا ہال کے دوسری جانب واقع زینوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسی لمحے اس کے عقب میں اسکائی کلر کے سوٹ میں ایک آدمی آیا اور اس کے برابر سے گزرتا ہوا بہت تیزی کے ساتھ زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ عمران اس کی تیزی پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ زینوں کے پاس پہنچا تو وہ اسکائی بلیو سوٹ والا کئی زینے چڑھ چکا تھا۔

عمران نے بھی اپنی رفتار بڑھا دی۔ وہ فرسٹ فلور پر پہنچا تو اسے وہ شخص نظر نہ آیا۔ وہ مزید اوپر چڑھتا چلا گیا کیونکہ اوپر اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ عمران نے رسیونگ واچ پر کمرے کا نمبر سن لیا تھا۔ فلور بھی اسے معلوم ہو چکا تھا اسی لیے وہ سیکنڈ فلور پر آیا تھا۔

جب وہ سیکنڈ فلور پر پہنچا تو وہ گلیارا ابھی خالی پڑا تھا۔ ابھی وہ اس گلیارے میں بڑھ ہی رہا تھا کہ اسے ہلکی سی دبی دبی چیخ سنائی دی۔

☆======☆======☆

غلام رسول کے مقابل کے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ غلام رسول ریوالور کی نال سینے پر لگی ہونے کے باوجود رسک لے لے گا۔ جیسے ہی اس شخص نے غلام رسول کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا کہ غلام رسول نے گھٹنا چلا دیا تھا۔ نپا تلا وار اس شخص کے پیٹ کے نچلے حصے پر پڑا تھا۔ اس نازک حصے پر چوٹ پڑتے ہی وہ درد سے کراہتا ہوا بیٹھتا چلا گیا تھا۔ غلام رسول نے بجلی کی سی پھرتی سے اس کے ریوالور پر ہاتھ مارا تھا اور ریوالور چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہیں سکا تھا کہ غلام رسول نے پوری قوت سے اس کے سر پر گھونسہ مارا تھا۔ وہ چیخ کر گر پڑا تھا۔ غلام رسول نے موقع ضائع نہیں کیا تھا اور ریوالور پر جھپٹا تھا۔ وہ ریوالور اٹھا کر پلٹا ہی تھا کہ اس شخص نے سنبھل کر غلام رسول پر چھلانگ لگا دی تھی۔ غلام رسول کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا تھا۔ اس شخص نے غلام رسول کو دبوچنے کی کوشش کی تھی مگر غلام رسول نے اس کے جبڑے پر مکا رسید کر دیا تھا۔ وہ شخص کراہتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹا تو غلام رسول نے اچھل کر اس کے پیٹ پر ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ شخص درد سے ڈکراتا ہوا دونوں ہاتھ سے پیٹ دبائے جھکا ہی تھا کہ غلام رسول نے اس کے منہ پر گھونسہ دے مارا۔ وہ سیدھا ہوا اور پیچھے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا جا گرا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس سے خون بہنے لگا تھا۔ اس نے خونخوار نگاہوں سے غلام رسول کی طرف دیکھا اور اس پر چھلانگ لگا دی۔

غلام رسول نے پھرتی سے دونوں بازو دراز کر کے اسے ہاتھوں پر روکا اور دوسرے ہی لمحے اس کی ناک پر مکا رسید کر دیا۔ وہ شخص درد سے پھر بلبلا اٹھا اور پیچھے ہٹتے ہوئے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ غلام رسول نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر چھلانگ لگا دی۔ ٹھیک اسی لمحے دروازہ کھلا اور دوڑنے کے انداز میں وہی اسکائی سوٹ والا شخص اندر آیا۔ اس نے اندر کا منظر دیکھتے ہی فوراً اپنی جیب سے پستول نکال لیا تھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غلام رسول نے اپنے مقابل کو دبوچا اور اسے گھما کر اس کی گردن کے گرد اپنا بازو لپیٹ دیا پھر اس کی پشت اپنے سینے سے لگا دی۔

''خبردار اسے چھوڑ دو۔'' اسکائی سوٹ والا غرایا۔

''میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔'' غلام رسول نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔''اس کی زندگی چاہتے ہو تو ریوالور پھینک دو۔''

ساتھ ہی اس نے اپنے مقابل کی گردن پر بازو کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی سانس رکنے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر اسکائی سوٹ والے نے پستول پھینک دیا۔

''تم بچ کر نہیں جا سکو گے مسٹر!'' وہ غلام رسول کو گھورتے ہوئے بولا۔ ٹھیک اسی لمحے پہلے والے نے یکدم تڑپ کر اپنی کہنی سے غلام رسول کے پیٹ پر وار کیا۔ غلام رسول کے حلق سے بے ساختہ ہلکی سی چیخ نکل گئی اور مقابل کی گردن پر اس کے بازو کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے تیزی سے اپنی گردن آزاد کراتے ہوئے پلٹ کر غلام رسول کے جبڑے پر مکا رسید کر دیا۔ غلام رسول کراہتا ہوا پیچھے ہٹا ہی تھا کہ اسکائی سوٹ والے نے اس پر چھلانگ لگا دی اور دونوں گتھم گتھا ہو کر فرش پر آ رہے۔ اس لمحے باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آہٹیں ابھرنے لگیں۔ غلام رسول سے پٹنے والے نے باہر کی طرف دیکھا پھر اپنے ریوالور کی طرف لپکا۔

غلام رسول نے فرش پر گرتے ہی کروٹ بدل لی اور اسکائی سوٹ والے کو لات ماری نتیجتاً وہ فرش پر لڑھک گیا۔ غلام رسول تیزی سے اس پر سوار ہو کر اس کے جبڑے پر مکا رسید کرنے لگا۔ پہلا شخص جو ریوالور اٹھا چکا تھا اس نے ریوالور کو غلام رسول پر تان لیا۔

''ہٹ جاؤ ورنہ بھیجا اڑا دوں گا؟''

غلام رسول نے دھمکی سنتے ہی اس کی جانب مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ ریوالور والے کے حلق سے سسکاری نکلی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر دور جا گرا۔ غلام رسول نے بے ساختہ دروازے کی طرف دیکھا۔ بڑی سی پگڑی اور لمبی مونچھوں والا ایک جوان ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔ وہ پہلی نظر میں افغانی لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو پستول تھا اس کی نال کافی لمبی تھی جسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ نال پر سائیلنسر لگا ہوا ہے اسی لیے اس کے پستول نے شور نہیں مچایا تھا۔ اسکائی کلر کے سوٹ والا بھی اب اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور حیرت سے اسی نوجوان کو دیکھ رہا تھا جس کے پستول کا رخ زخمی ہاتھوں والے کی طرف تھا۔

زخمی ہاتھوں والا اپنے زخمی ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے پکڑے ہوئے خونخوار نظروں سے پگڑی والے کو دیکھ رہا تھا۔

غلام رسول نے پہلی نظر میں ہی افغانی نظر آنے والے کو پہچان لیا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں عمران تھا۔ عمران نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور چند سیکنڈ میں ہی دو گولیاں اور چلائیں، پہلی گولی نے زخمی ہاتھ والے کی پیشانی کے درمیان کھڑکی کھول دی جس کے بعد وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ کراہتے ہوئے زمین پر گرتا چلا گیا تھا۔

اس کی چیخ سن کر اسکائی کلر کے سوٹ والے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا کہ اس کی کنپٹی سے بھی خون کا فوارہ ابل پڑا تھا اور وہ بھی زمین پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔

☆======☆======☆

''ویل ڈن عمران!'' غلام رسول نے کہا۔

''یہ تعریف کرنے کا موقع نہیں ہے جتنی جلد ممکن ہو باہر نکلیں۔ جس تیزی سے آپ کو گھیرا گیا ہے یہ بتا رہا ہے کہ دشمنوں نے گھیرا تنگ کر رکھا ہے۔'' کہہ کر وہ مڑ گیا تھا۔

وہ دونوں کمرے سے باہر نکلے اور دروازے کو کھینچ کر بند کرتے گئے۔ دروازہ خود کار نظام کے تحت لاک ہو چکا تھا۔ وہ دونوں سر جھکائے ہوئے ٹہلنے کے انداز میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے نیچے اتر گئے تھے۔

باہر لان میں پروفیسر عثمان ٹہلتے ہوئے نظر آ گئے تھے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر سڑک پر آ گئے۔

''ہم تینوں کا ایک ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' پروفیسر نے عمران سے کہا۔''غلام رسول کا کافی دیر تک مجھ سے رابطہ نہ کرنا مجھے شک میں مبتلا کر چکا تھا کہ میں نے تمہیں دیکھا۔ تم جس عجلت میں اندر داخل ہوئے تھے اسے دیکھ کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ غلام رسول خطرے میں ہے اور اس نے واچ ٹرانسمیٹر پر تم سے رابطہ کیا ہے۔ تم اس کی مدد کے لیے اندر گئے ہو۔ کچھ دیر اور تم لگا دیتے تو میں اندر جا کر ضرور پتا کرتا۔ اب بتاؤ اندر کیا ہوا تھا؟''

''میں کچھ خاص نہیں جانتا بس اتنا علم ہے کہ انہوں نے مجھے بلایا۔ میں اندر پہنچا تو یہ ایک دشمن سے بھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا رول ادا کیا۔ دو شخص کو موت کے گھاٹ اتارا اور انہیں باہر لے آیا۔ وہ دونوں کون تھے اس بارے میں غلام رسول ہی بتا سکتے ہیں۔''

پروفیسر نے غلام رسول کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''وہ مجھ سے خفیہ ایجنسی کا بندہ بن کر ملا تھا مگر میں نے جب تلاشی لی تو اس کے پاکٹ سے کوئی کارڈ وغیرہ نہیں نکلا۔ مزیدار بات یہ ہے کہ اس کی گردن میں ایک تعویذ تھا میں نے اسے اس لیے کھول لیا تھا کہ اگر وہ کسی ایجنسی کا ہوگا تو اس میں کوئی خاص چیز ہو سکتی ہے مگر وہ تعویذ سنسکرت میں تھا جس کے معنی ہیں کہ وہ ہندو تھا اپنے مذہب پر اندھا اعتماد کرنے والا۔''

''یعنی دشمن نے ہر طرف جال پھیلا رکھا ہے۔ اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اس عورت تک جلد سے جلد پہنچ کر اپنا ٹاسک پورا کیا جائے۔''

''مگر وہ عورت ملے گی کہاں؟'' عمران نے تجسس سے سوال کیا۔

''بہت آسان سوال ہے۔'' پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔ ''ہم نے ایک مہرے کو ابھی تک چھیڑا نہیں ہے اسی سے معلوم ہوگا۔''

''کون سا مہرہ؟'' عمران نے سوال کیا۔

''سفارت خانے کا افسر۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''وہ ہر روز صبح شام جوگنگ کرنے پارک میں آتا ہے وہیں اسے گھیر لیں گے۔''

''شام تو ہو رہی ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب لوگ جاگنگ کرنے نکلتے ہیں۔''

''تو پھر دیر کیسی نکل چلتے ہیں۔''

''چلو۔'' کہہ کر پروفیسر نے ایک ٹیکسی کو اشارہ دیا۔ اس ٹیکسی پر بیٹھ کر وہ لوگ سفارت خانہ کے سامنے والے پارک میں پہنچے۔

اتفاق کی بات ہے جس وقت وہ تینوں اس اوپن پارک میں داخل ہوئے وہ افسر انہیں ایک بینچ پر بیٹھا نظر آ گیا۔ عمران نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''وہ بیٹھا ہے۔''

پروفیسر نے اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی پھر بولے۔ ''اندھیرا بڑھنے سے پہلے کام دکھانا ہے۔ تم ایسا کرو کہ کسی گاڑی کا انتظام کرو۔ ہم اسے کسی ویرانے میں لے کر چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اتنی دیر میں سفارت خانے کا وہ افسر جس کا نام سموئیل تھا اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے پھر سے دوڑ لگانا شروع کر دیا تھا۔ پروفیسر عثمان اور غلام رسول بھی آہستہ آہستہ جوگنگ کے انداز میں دوڑ رہے تھے تبھی انہیں عمران نظر آیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔ غلام رسول نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کامیاب لوٹا ہے اس لیے اس نے سرگوشی میں پروفیسر پوچھا۔ ''سر!

قتلِ موذی قبل ایذا۔''

پروفیسر عثمان نے اشارہ سمجھ لیا اور کہا۔ ''اب میرا کمال دیکھو تم اپنی رفتار سست رکھنا۔'' پھر اس نے کمال کی اداکاری دکھا دی۔ وہ اپنے حلیے بشرے سے ہی کسی کالج کے پروفیسر یا کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے ڈائریکٹر نظر آتے تھے اسی لیے جب وہ جاگنگ کرتے کرتے سموئیل پر گرے تو وہ ''او کے سوری!'' کہہ کر انہیں سہارا دینے کی کوشش کرنے لگا۔ پروفیسر عثمان اپنا سینہ مسلتے ہوئے کراہ رہے تھے۔ سموئیل نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اتنی دیر میں غلام رسول ان تک پہنچ گیا تھا۔ وہ بھی رک کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

''ینگ مین! ذرا سہارا دو۔ لگتا ہے دل کا دورہ پڑا ہے۔'' سموئیل نے غلام رسول سے کہا۔

''ادھر میری گاڑی کھڑی ہے آپ آئیں میں انہیں ہسپتال لے چلتا ہوں۔'' غلام رسول بولا۔

''نہیں میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے دفتر جانا ہے۔ تم ہی پہنچا دو۔'' سموئیل بولا۔

''کوئی بات نہیں گاڑی تک تو پہنچانے کے لیے سہارا دے دیں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' کہہ کر اس نے پروفیسر عثمان کے بائیں بازو کو اپنے سر سے گزار کر کندھے پر رکھ لیا۔ دوسری طرف سے غلام رسول نے وزن سنبھالا اور دونوں انہیں اٹھائے ہوئے پارک کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔

عمران نے دور سے دیکھا سموئیل کو ساتھ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ پروفیسر نے بڑی خوبصورتی سے اسے گھیرا ہے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس گاڑی کی طرف بڑھنے لگا جس کی پچھلی سیٹ پر اس نے اس کار کے مالک کو بے ہوش کر کے اس طرح بٹھا دیا تھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا ہو۔ کار کے پاس پہنچ کر وہ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

سموئیل اور غلام رسول، پروفیسر عثمان کو سہارا دے کر باہر لائے۔ غلام رسول نے عمران کو دیکھ لیا تھا وہ اسی طرف بڑھنے لگا پھر وہ کار کے نزدیک پہنچتے غلام رسول نے بائیں ہاتھ سے پروفیسر کو تھام رکھا تھا دائیں ہاتھ سے اس نے دروازہ کھولا۔ سموئیل انہیں لٹانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ عمران نے آگے بڑھ کر اس کی کمر سے ریوالور کی نال لگا دی اور غراتی آواز میں بولا۔ ''چپ چاپ اندر بیٹھ جاؤ۔''

سموئیل نے جھٹکے سے کھڑا ہونا چاہا تھا مگر پروفیسر نے اتنی مضبوطی سے اس کے گلے

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو پکڑ لیا تھا کہ وہ ہل بھی نہ سکا۔ غلام رسول نے بھی دیر نہ کی اور دوسری طرف سے اس کی کمر میں اپنا پستول لگا دیا۔

"پیارے سموئیل خاموشی سے اندر بیٹھ جاؤ ورنہ انجام موت ہے۔" پروفیسر نے دھیمی آواز میں کہا۔

سموئیل مجبور ہو چکا تھا۔ فرار کا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ وہ چپ چاپ اندر بیٹھ گیا۔ پروفیسر نے بھی سائیلنسر لگا ریوالور نکال لیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان سموئیل بیٹھ گیا۔ پچھلی سیٹ پر وہ تینوں گویا ٹھونس دیئے گئے تھے۔ کیونکہ پہلے سے بھی ایک شخص وہاں بیٹھا تھا یعنی اس کار کا مالک۔

ڈرائیونگ سیٹ پر عمران تھا اسے ایک ایک راستہ معلوم تھا اس لیے وہ بغیر کچھ پوچھے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ لوگ شہر سے باہر آئے۔ اب ویران علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ عمران نے کچھ آگے جا کر کار کو کچے میں اتار دیا۔ پتھریلے راستے پر اچھلتی کودتی کار آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک جگہ اس نے گاڑی روک لی۔ پھر نیچے اتر کر بولا۔ "مسٹر سموئیل! سیدھے سیدھے جو کچھ پوچھا جائے بتا دو ورنہ تمہاری لاش کو سفارت خانے والے بھی ترس جائیں گے۔"

"کک...... کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" سموئیل نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔

"صرف اتنا بتا دو کہ مشن اے کے لیے کتنے افراد یہاں آئے ہیں؟"

سموئیل نے چونک کر اسے دیکھا پھر لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تم...... تم لوگ کون ہو؟"

"ہم خدائی فوجدار ہیں جو پوچھا جا رہا ہے وہ بتاؤ۔"

"میں...... میں کسی...... میں کسی مشن وشن سے واقف نہیں ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو ورنہ انجام اتنا برا ہوگا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہم دشمن کو مارنے کے قائل نہیں ہیں کیونکہ مرنے والا کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ ہم اذیت دے دے کر جوابات وصول کرتے ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کس طرح جواب دینا پسند کرو گے۔ ابھی نہایت آسانی سے یا ایذا سہہ کر۔" عمران نے ایک ایک لفظ کو چبا کر کہا۔ اس کے لہجے سے سفاکی مترشح تھی۔

"میں نے کہا ناں میں کسی مشن وشن سے واقف نہیں ہوں۔"

"اچھا تمہاری مرضی مت بتاؤ...... بھائی غلام رسول ذرا انہیں اپنی سوئی کا کمال تو

دکھاؤ۔" عمران کا جملہ ختم ہونے سے پہلے غلام رسول نے انجکشن جیب سے نکالا اور نیڈل کو پھرتی سے اس کے بازو پر مار کر نکال لیا۔ وہ "سی" کر کے رہ گیا۔

"یہ نمونہ ہے...... غلام رسول سوئی چبھونے میں ماسٹر ہے۔ ایک سیکنڈ میں تین بار سوئی چبھوتا ہے۔ یہ پیروں سے شروع کرتا ہے اور پیشانی تک لے جاتا ہے اس راہ میں آنکھیں بھی آتی ہیں۔" عمران نے سفاک لہجے میں کہا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ مجھے مارنا چاہتے ہو؟ مار دو۔"

"ہم نے پہلے ہی کہا ناں، ہم جان سے نہیں مارتے۔ سسکا سسکا کر زندہ رکھتے ہیں انسان خود اپنی موت مانگنے لگتا ہے۔" عمران نے سموئیل کو جواب دیا پھر غلام رسول کی طرف مڑ کر بولا۔ "ایسا کرو آنکھ سے شروع کرو، پھر سے شروع ہو جاؤ۔"

غلام رسول نے نیڈل اٹھائی اس کا ہاتھ بلند ہوا اور سلائی مشین کی طرح چلنے لگا۔ ایک منٹ میں تیس سے پینتیس بار اس نے سوئی چبھوئی ہو گی کہ سموئیل چیخا "میں...... میں بتاتا ہوں۔" غلام رسول کا ہاتھ رک گیا۔

"کل چار افراد آئے تھے۔ تین مرد اور ایک عورت...... سوائے عورت کے سب مارے گئے۔"

"اس عورت کا نام کیا ہے؟"

"کیتھرائن!"

"کہاں ملے گی؟"

"وہ آفیسر سوسائٹی میں ہو گی۔"

"آفیسر سوسائٹی میں کس طرف؟" اس نے سوال کیا۔

"ٹرائی اینگل پارک کے پاس ایک دومنزلہ بنگلہ ہے۔ وہ بنگلہ ایک بہت بڑے تاجر کا ہے مگر خود اسے پتا نہیں ہے کہ اس بنگلے میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے ایک بہت بڑے ریٹائرڈ آفیسر نے کرائے پر لے کر ہمیں دے رکھا ہے اور ہم اسے بطور ہیڈ کوارٹر استعمال کرتے ہیں۔ یہ تیسرا ہیڈ کوارٹر ہے اور اسے ہی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں ایک خفیہ تہہ خانہ بھی ہے اور اس تہہ خانے کو ہم بطور اسپیشل گیسٹ روم کے استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے مرکزی عہدیدار جب بھی آتے ہیں اسی میں ٹھہرتے ہیں۔ کیتھرائن بھی اس میں ٹھہری ہوئی ہیں۔"

"کتنے دنوں سے؟"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''تقریباً ایک سال ہو چکا ہے مگر زیادہ تر وہ دورے پر رہتی ہیں۔ کیونکہ پورا نیٹ ورک ان کی ذمے داری ہے۔ وہی اس مشن کی انچارج ہیں۔''

''معلومات فراہم کرنے کا بہت بہت شکریہ! اب ایسا کرو کہ تم سو جاؤ۔ موت کی نیند میں کھو جاؤ۔'' کہہ کر عمران نے اس کی کنپٹی پر نال رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ ہلکی سی کلک کی آواز ہوئی اور سائیلنسر لگے ریوالور کی گولی اس کے دماغ میں اترتی چلی گئی۔ خون کا فوارہ سا اچھل کر نکلا اور خود عمران کے چہرے کو بھگو گیا۔

عمران نے اس لاش کو کھینچ کر کار سے نکالا اور پہاڑیوں کے درمیان پھینک دیا۔

''میاں بھائی! ان صاحب کو بھی یہیں آرام کرنے کی اجازت دو۔'' غلام رسول نے گاڑی کے مالک کی طرف اشارہ کیا جو بے ہوشی کے عالم میں گاڑی میں پڑا ہوا تھا۔

''کیا ہمیشہ کے لیے؟'' عمران نے پستول کو پھر سے باہر نکال لیا۔

''نہیں......صرف کچھ دیر کے لیے۔''

عمران نے دوسری طرف کے دروازے کو کھول کر اسے بھی باہر نکال لیا اور وہیں ایک بڑے سے پتھر پر لٹا کر اس کی کنپٹی پر ریوالور کے دستے سے ایک اور وار کر دیا۔ تاکہ وہ مزید کچھ دیر بے ہوش رہ سکے۔ پھر وہ تینوں شہر کی طرف لوٹ چلے۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد عمران نے پوچھا۔ ''سر! اب ہمیں کہاں جانا ہے؟''

''اور کوئی جگہ بھی نہیں ہے ایسا کرتے ہیں سیدھے اسی بنگلے پر چلتے ہیں۔'' پروفیسر نے کہا۔

''لیکن یہ بھی یاد رکھیں کہ آفیسر سوسائٹی میں سکیورٹی بہت سخت ہوتی ہے، بس یوں سمجھ لو کہ کنٹونمنٹ ایریا جیسے انتظامات ہیں کل پچاس ساٹھ بنگلے ہوں گے۔ سوسائٹی کے گرد چار دیواری ہے۔ گیٹ پر چیک پوسٹ ہے جس میں مسلح پہرے دار ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اندر جانے والوں کو چیک پوسٹ پر رک کر اپنی شناخت کرانی پڑتی ہے۔ گارڈ بتائے گئے بنگلے سے فون پر کنفرم کرتا ہے۔ کنفرم ہو جانے کے بعد وہ وزیٹر کے پاس ایشو کرتا ہے جب تک تصدیق نہ ہو اندر جانے نہیں دیا جاتا ہے۔ رات کے وقت چار دیواری کے ساتھ ساتھ جیپ پر راؤنڈ لگایا جاتا ہے تاکہ کوئی اندر چھلانگ لگا کر نہ گھسے۔ دیوار پھاندنے کی کوشش نہ کرے۔

''یاد رکھو کتنی ہی ٹائٹ سکیورٹی کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں اس میں شگاف ضرور ہوتا ہے۔''

''اچھی بات ہے شگاف تلاش کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر عمران نے کار کا رخ آفیسر سوسائٹی جانے والے راستے پر موڑ دیا۔ اس کالونی کے گیٹ سے کچھ پہلے عمران کار سے نیچے اتر گیا اور آگے بڑھنے لگا۔ وہ گیٹ پر پہنچا پھر رک کر خود ہی بولا۔ ''کار کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا۔ اتنی مشکل سے اسے گیراج پہنچا کر آ رہا ہوں۔'' وہ اس طرح سے بول رہا تھا جیسے گارڈ سے اس کی بڑی اچھی دوستی ہے۔

''ارے تم چپ کیوں ہو، صوفی صاحب دکھائی نہیں دے رہے ہیں، کہیں گئے ہیں کیا؟'' دراصل اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ واچ مینوں میں ایسے بہت سے ہوتے ہیں جن کی داڑھیاں ہوتی ہیں۔ ان میں بھی ایک نہ ایک شخص کی داڑھی ضرور ہوگی۔

''آج ان کا آف ہے۔'' گارڈ نے جواب دیا۔

''اچھا! اچھا! ہاں ایک اچھی فلم لایا ہوں۔ دیکھنا ہو تو بنگلے پر آ جانا۔ اچھا چلتا ہوں۔'' کہہ کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ واچ مین اب بھی اسے ہی دیکھ رہا ہے کیونکہ اس کی آنکھوں میں تیرتے استعجاب کو اس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ شاید اس مخمصے میں تھا کہ یہ صاحب کس بنگلے میں رہتے ہیں۔

عمران تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اسے ایک بنگلہ نظر آیا۔ اس بنگلے کا لان خشک پتوں سے اٹا ہوا تھا۔ یقیناً یہ بنگلہ خالی ہے۔ عمران نے سوچا اور آگے بڑھتا چلا گیا یہ سوچتا ہوا کہ اگر کہیں اور شیلٹر نہ ملا تو یہ بنگلہ چھپنے کے لیے بہت بہتر ہے۔ کچھ اور آگے بڑھنے کے بعد اسے ٹرائی اینگل پارک نظر آ گیا۔ وہ تین کونے کا پارک تھا شاید اسی لیے اسے ٹرائی اینگل پارک کہتے تھے۔ اس پارک کے اردگرد کے بنگلوں کا اس نے جائزہ لیا سامنے ہی اسے ایک دو منزلہ بنگلہ نظر آ گیا۔ اس بنگلے کی جانب بڑھتے ہوئے عمران سوچ رہا تھا کہ اس میں داخل کیسے ہوا جا سکتا ہے۔ تبھی اس کی نظر اس کے برابر والے بنگلے پر پڑی۔ اس بنگلے کی حالتِ زار اچھی نہ تھی وہ اسی بنگلے کی طرف بڑھتا چلا گیا پھر دروازے پر پہنچ کر اس نے بیل بجائی اندر کہیں دور گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ پرانے انداز کی ہے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک بڑی بی نظر آئیں۔ عمران نے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پڑھ لی تھی جس پر میجر اکرام اللہ بنگش لکھا تھا۔ اسی مناسبت سے اس نے بڑی بی کو سلام کر کے کہا۔ ''کرنل فرخ کا بیٹا ہوں، کراچی والے فرخ، انہوں نے مجھے میجر اکرام سے ملنے کو کہا تھا۔''

''مگر بیٹا میجر اکرام کا تو چھ ماہ پہلے انتقال ہو گیا۔ میں ان کی بیوہ ہوں۔ آؤ اندر آ جاؤ۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عمران اندر آ گیا۔ ڈرائنگ روم کے صوفے بھی انتہائی پرانے ڈیزائن کے تھے۔ ایسے صوفے اب شاید ہی نظر آتے ہوں۔ عمران اس جہازی سائز صوفے پر بیٹھ گیا۔ بڑی بی بھی بیٹھ چکی تھیں۔ وہ دونوں ہی خاموش تھے۔ تبھی بڑی بی بولیں۔ ''تمہارا کیا خیال ہے چائے پی جائے۔''

''اگر آپ کو تکلیف نہ ہو۔ بلکہ رہنے دیں۔ صبح میں ہوٹل سے نکلتے وقت پی کر نکلا تھا۔''

''لیکن بیٹا کرنل فرخ کس رجمنٹ کے تھے مجھے ان کے دوستوں میں ایسا ایک نام بھی نہیں معلوم۔''

عمران اندر ہی اندر گھبرا اٹھا کیونکہ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ خود بنگش کس رجمنٹ کے تھے۔ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ ''میرے ابو جب لاہور چھاؤنی میں تھے تو......''

''سنو بیٹے!'' بڑی بی اس کا جملہ کاٹ کر بولیں۔ ''ٹھہرو میں چائے بنا ہی لیتی ہوں۔ دراصل نوکرانی بڑی کام چور تھی میں نے اسے نکال باہر کیا ہے نئی ملنے تک مجھے خود اپنے ہاتھوں سے کام کرنا ہے۔'' کہہ کر وہ صوفے کے ہینڈل کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''رہنے دیں آنٹی دراصل میرے انکل اور بڑے بھائی بھی میرے ساتھ آئے ہیں، کچھ دیر بعد وہ مجھے لینے آ جائیں گے۔''

''کوئی بات نہیں میں دوبارہ بنالوں گی۔'' کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔

وہ ادھر گئیں اور عمران اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ اس نے واش بیسن کا نل کھول دیا پھر اس نے واچ ٹرانسمیٹر پر رابطہ کیا۔ دوسری جانب سے فوراً کال ریسیو کر لی گئی۔ ''ہیلو میں برابر والے بنگلے میں ہوں، میجر بنگش کے بنگلے میں۔ میں نے بڑی بی کو بتا دیا ہے میرے چچا احمد طاہر اور بھائی جمال الدین آ رہے ہیں۔ جی اچھا آ رہے ہیں......'' کہہ کر اس نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔

باتھ روم سے نکل کر اس نے صوفے پر خود کو گرا لیا۔ تبھی بڑی بی چائے کا کپ لیے ہوئے داخل ہوئیں۔

''لو بیٹے چائے پیو۔''

چائے کا اس نے پہلا سپ لیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ بڑی بی فون کی طرف بڑھیں

کہ عمران نے کہا ''شاید میرے انکل اور بھائی ہیں۔'' پھر اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری جانب سکیورٹی گارڈ تھا۔ اس نے کہا۔ ''آپ کے دو مہمان آئے ہیں۔''

''ہاں ہاں احمد طاہر...... جمال الدین نام کے دو شخص آنے والے تھے۔'' عمران بولا۔

''لیکن جناب ان کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں میں ضمانت لے رہا ہوں۔''

بڑی بی بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی جلدی سے ریسیور لے کر ماؤتھ پیس میں بولیں۔ ''ہاں احمد طاہر اور جمال الدین کو بھیج دو۔''

کچھ دیر بعد پروفیسر عثمان اور غلام رسول آ گئے۔ ان دونوں کو بھی بڑی بی نے چائے لا کر دی پھر بولیں۔ ''آپ لوگ کھانا کھا کر جانا میں بنا رہی ہوں۔''

''جب آپ ضد کر رہی ہیں تو یہی سہی۔''

بڑی بی انہیں بٹھا کر کچن کی طرف جا رہی تھیں کہ عمران نے کہا۔ ''آنٹی اگر آپ اجازت دیں تو ہم گھوم پھر کر خود ہی اس عمارت کو دیکھ لیں۔''

''کیوں......عمارت میں ایسی کیا خوبی نظر آ گئی؟''

''ایک جگہ بیٹھے بیٹھے بوریت ہو گی۔'' یہی سوچ کر میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے جاؤ۔''

اجازت ملتے ہی وہ تینوں سیدھے چھت پر پہنچے اور ٹہلتے ہوئے کن انکھیوں سے برابر والی بلڈنگ کا جائزہ لینے لگے۔ بلڈنگ کی دیوار خاصی نیچی تھی۔ اسے با آسانی پار کر سکتے تھے۔

''یہاں سے داخل ہوا جا سکتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''ہاں یہی مناسب ہے۔ کچھ اور اندھیرا پھیلنے دو۔'' کہہ کر پروفیسر واپسی کے لیے مڑ گئے۔

وہ لوگ نیچے آئے تو بڑی بی کچن کی بجائے بیڈ پر لیٹی تھیں۔

''کیا ہوا آنٹی!'' عمران نے پوچھا۔

''سر چکرانے لگا تھا۔ بھئی بڑھاپے سے زیادہ بڑی بیماری اور کون سی ہو گی؟'' بڑی بی نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

''میرے پاس دوا ہے اگر کہیں تو میں دے دوں؟'' پروفیسر نے کہا۔ ''ابھی آپ توانائی محسوس کریں گی میں خود بھی اسے استعمال کرتا ہوں۔'' کہہ کر پروفیسر نے جیب

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے پرس نکالا اور پرس میں رکھی دو گولیاں بڑھا دیں۔

بڑی بی نے گولیاں پانی سے نگل لیں۔

''اب آپ کچھ دیر کے لیے لیٹ جائیں۔'' پروفیسر نے کہا اور باہر نکل آئے۔ دوسرے کمرے میں پہنچ کر بولے۔ ''بڑی بی کو میں نیند کی گولیاں دے آیا ہوں۔ ان کی طرف سے تو اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آؤ باہر چلتے ہیں۔''

وہ سب باہر لان میں آئے۔ شام رات میں بدل چکی تھی۔ اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ لان میں ٹمٹماتا سا ایک بلب جل رہا تھا۔ انہوں نے برابر والی عمارت کی طرف دیکھا وہاں بھی سناٹے کا راج تھا۔ عمران نے لان میں پڑی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کو لا کر دیوار کے سہارے کھڑا کیا پھر اس پر چڑھ کر اس نے دیوار کی منڈیر پکڑ لی اور دونوں ہاتھوں پر وزن ڈال کر اٹھتا چلا گیا پھرتی سے دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے پروفیسر اور غلام رسول بھی کود گئے۔

وہ تینوں ایک کے بعد ایک کودے تھے۔ جہاں پیر زمین سے مس ہوئے تھے بس وہیں کے ہو رہے۔ سینوں کو زمین سے چپکائے سینے کے بل لیٹے رہے اور گھڑی کی سوئی کھسکتی رہی پھر انہیں اندازہ ہو گیا کہ گیٹ پر موجود چوکیدار اپنی جگہ بیٹھا اونگھ رہا ہے یا اتنا غفیل ہو چکا ہے۔ یوں بھی کالونی کے گرد جیسا سخت انتظام تھا جتنی کڑی سکیورٹی تھی ایسے میں تو پرندے کو بھی پر مارتے ہوئے خوف آتا ہوگا۔

اب ان تینوں نے سانپ کی نقل شروع کر دی۔ سینے کے بل زمین پر رینگنے لگے۔ رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ پھولوں کی کیاریوں کے درمیان سے ہو کر وہ اس مقام پر پہنچے جہاں سے برآمدہ شروع ہو جاتا تھا۔ برآمدہ کچھ اونچا تھا۔ سب سے پہلے عمران اچھل کر اوپر چڑھا پھر باقی دونوں۔

وہ تینوں برآمدے کے پکے فرش پر بھی رینگنے لگے۔ رینگتے ہوئے دروازے پر پہنچے پھر اسے کھول کر اندر داخل ہوئے۔

وہ کمرا ہال نما تھا۔ اس میں صوفے پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کمرے کو پار کیا اور ایک دوسرے کمرے میں آئے۔ اس کمرے میں ایک بیڈ بچھا ہوا تھا اس پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ لیٹی ہوئی ہستی پر نظر پڑتے ہی وہ تینوں بری طرح چونک گئے۔ چونکنے کی بات ہی تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سے یوں دشمنوں کی کچھار میں ملاقات ہوگی۔ اس نے بھی ان تینوں کو دیکھ لیا تھا اور اس کے چہرے پر حیرت ابھر آئی تھی۔ وہ ہستی اٹھ کر بیڈ پر

بیٹھ گئی تھی۔ اس نے حیرت بھری آواز میں کہا تھا۔ ''تم...... تم لوگ یہاں تک کیسے پہنچے؟''

''اپنے پیروں سے چل کر۔'' غلام رسول نے کہا۔

''آ تو گئے ہو مگر اب زندہ واپس نہیں جا سکو گے۔'' اس نے ان تینوں کو مخاطب کر کے کہا۔

''اب میں سمجھا تم ہی کیتھرائن ہو۔'' پروفیسر بولے۔

''جی ہاں کیتھی میرا نک نیم ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے تکیے کے نیچے سے ایک چھوٹا سا ریوالور نکال لیا تھا۔

''اس کھلونے کو نیچے رکھ دو۔'' پروفیسر نے سمجھانا چاہا۔

''تا کہ تم لوگ مجھے زیر کر لو۔''

''زیر تو تم ہو چکی ہو۔'' عمران نے کہا۔ ''تمہارا چوکیدار مارا جا چکا ہے اور پوری عمارت ہمارے آدمیوں کے نرغے میں ہے۔''

''بالکل غلط! اس عمارت کے تمام دروازے خودکار ہیں۔ ہر دروازے پر کیمرا ہے۔ تم لوگوں کی پوری فلم بن چکی ہوگی۔''

''اچھی بات ہے پورے پاکستان میں نمائش کے لیے پیش کر دینا۔'' عمران نے کہا۔ اس نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اسے باتوں میں لگا کر اس نے چھلانگ لگائی تھی۔ چھلانگ اس طرح کی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکی۔ عمران اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہوا دوسری جانب کود گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا بے عقلی ہوتی۔ غلام رسول نے موقع ضائع نہ کیا اور کیتھی کے بوائے کٹ بالوں کو پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔ وہ بیڈ پر کافی آگے تک گھسٹ گئی تھی۔ غلام رسول نے اس کی قوت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ کیتھی لمحہ بھر میں سنبھل گئی تھی۔ اس نے خود کو گیند کی طرح اچھالا تھا۔ اس حیرت انگیز کمال کے ساتھ وہ بیڈ سے نیچے اتر گئی تھی۔ پھر اس نے جسم کو موڑ کر زبردست قسم کی اچھال بھری۔ اس جمپ کے ساتھ وہ پروفیسر کے پیچھے آ گئی تھی۔ پیچھے آتے ہی اس نے پروفیسر کے گلے میں ہاتھ ڈال کر آرم لاک لگا دیا تھا۔ یہ سب کچھ لمحے بھر میں ہو گیا تھا۔ پھر وہ غرائی آواز میں بولی تھی۔ ''خبردار! اب کسی نے مجھ پر حملہ کیا تو پروفیسر کی گردن توڑ دوں گی۔''

کیتھی کا لاک اتنا سخت تھا کہ پروفیسر کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگی تھیں۔ سانس رکنے لگی تھی اور چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ کیتھی کچھ بھی ہو، عورت تھی۔ نادانستگی میں پروفیسر نے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہاتھ چلایا تھا ان کا ہاتھ اس کے جسم پر دباؤ کا باعث بنا تھا کہ کیتھی کا ذہن منتشر ہو گیا۔ بس یہی ایک لمحہ پروفیسر کے کام آ گیا اور انہوں نے دوسرے ہاتھ سے بھی وہی حرکت کی ساتھ ہی ساتھ جسم کو جھٹکا دیا اور وہ جھٹک کر دور جا پڑی۔ کیتھی دوبارہ ان پر جھپٹی مگر راستے میں ہی غلام رسول نے اسے روک لیا۔ روکنے کے لیے اس نے صرف اپنا پیر بڑھا دیا تھا اور کیتھی اس کے پیروں سے الجھ کر گری تھی اس کے گرتے ہی عمران نے اسے فٹ بال بنا دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک کئی کک لگا دی تھیں۔

ایسی زبردست کک سیمنٹ کی دیوار پر پڑتی تو وہ چیخ جاتی۔ کیتھی تو پھر بھی عورت تھی۔ اپنی چیخوں کو روک نہ سکی۔ سر کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا اور خون رسنے لگا تھا۔ عمران نے اس پر بس نہ کیا کسی ریسلر کی طرح پھرتی سے اسے اٹھایا اور ہوا میں اچھال کر گھٹنا کھڑا کر کے خود بیٹھ گیا۔ کیتھی سیدھی اس کے گھٹنے پر گری۔ اس کی تیز چیخ گونجی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ عمران نے وقت ضائع کیے بغیر پیڈسٹل فین کے تار کو جھٹکا مار کر توڑا اور اسی الیکٹرک وائر سے اسے باندھ دیا پھر اسے پنکھے سے لٹکا دیا۔ یہ سب کچھ بمشکل پانچ منٹ میں اس نے کر دکھایا تھا۔

وہ تینوں اب اسے ہوش میں لانے کی ترکیب کر رہے تھے تاکہ ضروری معلومات حاصل کی جا سکے۔

''سر میں ایک راؤنڈ لگا کر آتا ہوں۔ ویسے مجھے قوی امید ہے کہ یہ بنگلہ پوری طرح خالی ہے پھر بھی دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔'' کہہ کر عمران باہر نکل گیا۔

عمران کے باہر جاتے ہی غلام رسول نے جگ میں بھرے پانی کو کیتھی کے چہرے پر انڈیل دیا۔ پانی کے چھینٹوں نے اسے ہوش میں لا دیا۔ وہ آنکھیں جھپکا کر بولی۔

''یہ...... یہ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔''

''ہم نے برا کیا کب ہے۔ جو کچھ کرتے ہیں اچھا ہی کرتے ہیں۔'' غلام رسول بولا۔

''ہاں تو بی بی اب ذرا ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنا شروع ہو جاؤ۔ تم کون ہو کیا کرنا چاہتی تھیں۔ کیوں ہمارا پیچھا کر رہی تھیں۔''

''ہمارا تعلق ''شی'' سے ہے۔ یہ مافیا سے بھی بڑی تنظیم ہے۔ مافیا والے غنڈہ گردی، منشیات وغیرہ کا کاروبار کرتے ہیں اور ہم ان سے بھی اونچا کام کرتے ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے ملکوں کی حکومت گراتے بناتے ہیں۔ بلیک میل کرتے ہیں۔ لڑاتے ہیں۔ بڑی حکومتیں ہماری خدمات حاصل کرتی ہیں اور ہم ان کے مفاد کی جنگ بھی لڑتے ہیں۔'' کیتھی بول رہی تھی۔ واقعی وہ ٹرینڈ ایجنٹ تھی۔ دیکھنے میں دھان پان سی۔ مگر اندر سے اتنی

مضبوط کہ اتنی دیر سے پنکھے سے بندھی لٹکی تھی مگر اس کی پیشانی پر شکن نہ تھی۔ وہ رک رک کر بتا رہی تھی۔ ''دراصل اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر ملک میں سپر پاورز کا عمل دخل رہتا ہے۔ اس وقت دنیا کے نقشے پر دو ہی ملک ایسے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ وہ واحد سپر پاور بن کر رہیں۔ اس سلسلے میں سازشوں کا جال تیار ہوتا رہتا ہے۔ دونوں ممالک کے سپر برین اس سلسلے میں سازشیں بنتے رہتے ہیں جن پر عمل کرانے کی ذمے داری ان کے ایجنٹوں کی ہے۔ یہ ایجنٹ ہر ملک کی اہم ہستیوں کے گرد گھیرا ڈالے رہتے ہیں۔ اس ملک میں بھی ہیں۔ جس طرح یہ دونوں سپر پاورز تمام ترقی پذیر ممالک میں اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ یہاں بھی یہی چاہ رہی ہیں۔'' وہ نہایت نپے تلے انداز میں بول رہی تھی۔ ''دونوں بڑی طاقتوں کے سیاسی نظریات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، یوں کہ یہ افراد چاہے برسراقتدار ہوں یا اقتدار سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو کسی نہ کسی نظریے سے ضرور اثر قبول کرتے ہیں ممکن ہے کہ اس وقت بھی مختلف نظریات کے حامل افراد صدر مملکت کے اردگرد ہوں۔ یہ فطری بات ہے کہ ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسرے کو بھی اپنا ہم خیال بنا لے یا بہ الفاظ دیگر اس کی فکر کا رخ اپنے نظریات کی طرح موڑ دے۔ ان دنوں ایوان حکومت میں یہی کشمکش جاری ہے۔ نتیجتاً کسی بھی نظریے کے حامل گروپ کو اس سلسلے میں بہرحال برتری حاصل ہو جائے گی۔ اس کا انحصار ان افراد کی صلاحیت، خلوص نیت اور صدر مملکت سے قربت پر ہے بائیں بازو کا پلہ بھاری رہتا ہے یا دائیں بازو کا؟ ملک کی خارجہ پالیسی اسی ایک سوال کے گرد گھومتی ہے۔ ہم لوگ اسی کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ جس قوت نے ہماری سروس حاصل کر لی ہم اسی ملک کے لیے کام کرتے ہیں۔''

''ہماری راہ میں کیوں آئی تھیں؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''ہمیں اسرائیل سے یہ ٹاسک ملا تھا کہ آپ کو تلاش کیا جائے آپ اسی ملک میں ہیں۔ ہمارے آدمیوں نے بالآخر آپ کو ڈھونڈ لیا اور ہم نے نہایت خاموشی سے آپ کو الجھا لیا۔ ہم نے بیک وقت تین محاذ کھولے تھے۔ پہلا محاذ ہپناٹزم کا تھا یعنی آپ کو دوسرے جنم کی تھیوری میں الجھا لیا جائے۔ آپ جینین پر کام کر ہی رہے تھے اس لیے اس مسئلے میں با آسانی الجھ جاتے اور الجھ گئے کہ جس بات کا ذکر قرآن میں نہیں ہے وہ سچ کیسے ہو گیا۔ دوسرا محاذ آپ کو یہاں سے آؤٹ کرا کر بھارت بھیجنے کا تھا تاکہ آپ کو وہاں مروا دیا جائے۔ آپ کی لاش ملتی تو پوری دنیا میں ہلچل مچ جاتی اور تمام دنیا کی میڈیا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوب واویلا مچاتے اور پورا الزام پاکستانی حکومت پر ڈال کر بدنام کیا جاتا۔ اس طرح پاکستانی حکومت کو بھی بلیک میل کرنے کا ہمیں موقع مل جاتا۔''

''اور تیسرا؟'' غلام رسول نے پوچھا۔

''تیسرا محاذ میں خود تھی۔ یعنی میں جو آپ کے ساتھ آٹھ سال سے تھی دراصل اپنی تنظیم کے اشارے پر آپ کے پاس تھی اسی لیے مجھے یہاں کا انچارج بنا کر بھیجا گیا جبکہ یہاں ہماری تنظیم کے بڑے بڑے عہدیدار موجود تھے مگر میری وجہ سے انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔''

''ہمیں مطلق احساس نہ تھا کہ تم آستین میں پل رہی ہو۔'' پروفیسر نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ شاید انہیں واقعی بہت دکھ ہوا تھا کہ ان کی شاگرد بن کر اس نے انہی کی پیٹھ میں چھری ماری تھی۔

''آخر کو یہودی ہے ناں، یہ تو ان لوگوں کی فطرت کا حصہ ہے۔'' غلام رسول بولا۔ ''میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ اس پر بھروسہ نہ کریں۔ سانپ ڈسنا بھول سکتا ہے مگر یہودی نہیں۔''

غلام رسول کے طنز پر کیتھی نے اپنا سر جھکا دیا۔ پروفیسر یہی سمجھے کہ وہ پشیمان ہے مگر بات کچھ اور تھی۔ سر جھکا کر اس نے زبان نکال لی تھی اور گلے میں پڑے ہوئے تعویذ کو زبان سے پکڑنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ تیسری کوشش میں دھاگہ کچھ اوپر اٹھا تھا اور پھر تعویذ اس کے منہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے تعویذ کو دانتوں تلے دبا کر کہا۔ ''سر! میں نے آپ سے کوئی غداری نہیں کی صرف اپنی ڈیوٹی دی ہے۔ اچھا خدا حافظ!'' پھر اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔

''ارے اس نے سائنائیڈ کھا لیا۔'' پروفیسر بولے۔ تب تک دیر ہو چکی تھی۔ سائنائیڈ نے اپنا اثر دکھا دیا تھا۔

اس کی لاش کو نیچے اتار کر عمران نے کہا۔ ''سر! اب کیا پروگرام ہے؟''

''نکل چلو۔''

''لیکن جائیں گے کہاں؟''

''اس شہر سے ہی نہیں اس ملک سے بھی دور نکل جانا ہے۔'' پروفیسر نے دکھ بھرے لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔